کلام اقبال میں انبیاء کرام کا تذکرہ

زیب النساء سرویا

کلامِ اقبال میں انبیاے کرامؑ کا تذکرہ

(تحقیقی و توضیحی مطالعہ)

ڈاکٹر زیب النساء سرویا

اقبال اکادمی پاکستان

ناشر

پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
حکومت پاکستان
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن
چھٹی منزل، ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور
Tel: 92-42-36314510, 99203573
Fax: 92-42-36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allmaiqbal.com

ISBN 978-969-416-451-9

طبع اول	:	۲۰۱۰ء
طبع دوم	:	۲۰۱۲ء
طبع سوم	:	۲۰۲۲ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۱۲۰۰روپے
مطبع	:	ایچ آئی ٹریڈرز، لاہور

محل فروخت: گراؤنڈ فلور، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

انتساب:

والد محترم حبیب اللہ سرویا (شہید)

کے نام

جنھیں جرائم پیشہ گروہ نے ۲۹/جون

۲۰۰۸ء کو نماز فجر کی ادائیگی سے روک کر

تاوان کے لیے اغوا کیا اور تاوان لینے

کے باوجود شہید کر کے نہر اپر چناب میں

بہا دیا۔

فہرست

اظہار تشکر

۳۰؍دسمبر کو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی شعبہ اقبالیات کی طرف سے ایم ۔فل اقبالیات کی ڈگری کے حصول کے لیے تحقیقی مقالہ پر کام تفویض ہوا اور ۲۳؍دسمبر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ننھے محمد شہیر سپرا کی نگہداشت و دیکھ بھال کی ذمہ داری عطا ہوئی۔ دونوں کام اہم اور ہمہ وقت توجہ کے متقاضی تھے۔ میرے لیے پریشان کن پہلو یہ تھا کہ ننھے منے کو گھر چھوڑ کر طویل وقت تک لائبریری کتب سے استفادہ ممکن نہ تھا گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہ تھا اور لائبریری کے قواعد وضوابط اسے ساتھ لانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ میں نے اپنی اس پریشانی کا ذکر نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر وحید عشرت (مرحوم) سے کیا۔ انھوں نے میری اس پریشانی کو ذاتی دلچسپی سے اس طرح ختم کروایا کہ بیٹے کو لائبریری لانے کی اجازت دلوادی یوں دو ماہ کا محمد شہیر Carry Basket میں میرے ساتھ تحقیقی کام میں شامل رہا اور میں اطمینان سے نوٹس بناتی رہی۔ اقبال اکادمی پاکستان لائبریری کے لائبریرین حافظ خادم صاحب، اسسٹنٹ محمد اختر صاحب اور دیگر تمام عملہ نے مجھ سے تعاون کیا جس کے لیے میں تہہ دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔

علاوہ ازیں میں شعبہ اسلامیات پنجاب یونی ورسٹی کی سربراہ ڈاکٹر ثمر فاطمہ اور قائد اعظم لائبریری کے چیف لائبریرین جناب محمد تاج کی بھی شکر گزار ہوں۔ دونوں ارباب اختیار نے لائبریری سے استفادہ کی اجازت مرحمت فرمائی اور لائبریری قواعد وضوابط کے برخلاف مجھے بیٹے کو بھی ساتھ لانے کی اجازت دی۔ ایسے ہی میں مدرسہ اسلامیہ کامونکی کے شعبہ خواتین کی تمام اساتذہ کرام بالخصوص رضیہ نیازہ، صائمہ صدف اور طالبات کی بھی شکر گزار ہوں۔ اُنھوں نے آیات کے حوالے تلاش کرنے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ مدرسہ اسلامیہ ضلع گوجرانوالہ کے اُن مدارس میں سے ایک ہے جس میں ایک لائبریری بھی ہے۔ اس لائبریری میں اسلام پر بے شمار کتب اور تفاسیر کا ایک ذخیرہ ہے۔ میں نے تمام وقت اس مدرسہ کی بہت سی کتب سے استفادہ

کیا اور یہ سب لائبریری کے انچارج جناب محمد مختار صاحب (مرحوم) کی وجہ سے ممکن ہوا۔ میں اس تعاون کے لیے مدرسہ اسلامیہ کی انتظامیہ کی شکرگزار ہوں۔

میں بالخصوص گورنمنٹ کالج برائے خواتین کامونکی کی لائبریرین اور دیگر عملہ کی بھی شکر گزار ہوں۔ محترمہ پرنسپل مسز شاہین خالد کی خصوصی اجازت سے کالج لائبریری کی بے شمار کتب طویل عرصہ میرے زیرِ مطالعہ رہیں اور ان کی مہربانی کے سبب ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ علاوہ ازیں اس تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میرے والدین کی دعائے نیم شبی اور بہن بھائیوں کا عملی تعاون میرا شریکِ حال رہا۔ ان تمام ہستیوں نے ہر لمحہ میرے حوصلہ کو بڑھایا اور میری ہر ممکن مدد کی اور میرے شریکِ زندگی جنھوں نے ایک طویل عرصہ تحقیقی کام کے لیے مجھے نہ صرف گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا بلکہ والدین کے ہاں رہنے کی بھی اجازت دیے رکھی۔ تبھی اس کام کو بروقت پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن ہوا اور میرے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر وحید عشرت (مرحوم) جنھیں میں نے ایک مہربان اور شفیق استاد و رہنما پایا۔ انھوں نے تمام وقت میری رہنمائی فرمائی۔ میں ملاقات کا وقت طے کر کے اور بسا اوقات وقت طے کیے بغیر بھی اُن کے پاس رہنمائی کے لیے جاتی رہی لیکن انھوں نے ہمیشہ ہنستے مسکراتے خوش آمدید کہا۔ میں بعض اوقات سخت پریشانی میں گئی لیکن رہنمائی پانے کے بعد شاداں وفرحاں واپس آئی۔ انھوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود بار بار میرے تحقیقی کام کو جانچا۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ یہ تحقیقی مقالہ اُن کی رہنمائی اور شفقت کی بدولت ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے لیے میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُن کی شکرگزار ہوں۔ اس کے علاوہ میں اُن تمام احباب کی شکرگزار ہوں جنھوں نے کسی بھی انداز سے میری مدد و رہنمائی فرمائی۔

آخر میں میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی شعبہ اقبالیات کے سابق چیئرمین جناب ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (مرحوم) کی بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے اتنے خوبصورت اور اہم عنوان پر کام کرنے کی ترغیب دی۔ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

میں شعبہ اقبالیات کے موجودہ چیئرمین جناب ڈاکٹر شبلی صاحب اور اُن دیگر احباب کی بھی شکرگزار ہوں جن کی طرف سے عنوان کی منظوری کی بدولت مجھے اس موضوع پر تحقیق کی سعادت نصیب ہوئی۔

آخر میں ان تمام ہستیوں سے بڑھ کر میں خالق کون و مکان، اللہ رب العزت ذوالجلال والاکرام کی شکر گزار ہوں جس کے کرم سے میں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اور تمام مسلمین کو انبیاء کرامؑ بالخصوص رسول پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش پا پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

زیب النساء سرویا

دیباچہ طبع ثالث

پیش نظر کتاب اپنی اشاعت کے تیسرے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ ممکن حد تک اس کے مشمولات پر نظر ثانی کر لی گئی ہے۔ اس کے پروف بھی دیکھے ہیں تا کہ کتاب ہر حوالے سے مستند ہو سکے۔ اصحاب نظر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کتاب میں موجود کسی کوتاہی کی نشان دہی میں تامل نہیں کریں گے۔

اس ایڈیشن میں فارسی متن کے تراجم کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن بھی اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام شایع ہو رہا ہے جس کے لیے راقمہ اقبال اکادمی پاکستان کے ارباب علم کی ممنون ہے۔

ڈاکٹر زیب النساء سرویا
گورنمنٹ گریجوایٹ اسلامیہ کالج
برائے خواتین کوپر روڈ، لاہور

مقدمہ

فکر و دانش انسانی اور علم کے ذریعے کے طور پر نبوت کا مقام سب سے بلند اور مقدم ہے۔ نبوت کے مطالعے کے بغیر ہم اس اہم ذریعہ علم کی پوری طرح تفہیم نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کائنات کے علم، علم کے مابعد الطبیعیاتی ذرائع، اس کی وسعتوں اور حدود کا علم ہمیں نبوت کے مطالعے ہی سے ہوسکتا ہے۔ نبوت نورِ خدا سے مستنیر ہے اور اس کی اساس یقینیات پر ہے۔ جبکہ دیگر تمام ذرائع علم اور ان سے حاصل شدہ علم احتمالی، ظنی اور غیر یقینی ہے۔ علامہ اقبال نے نبوت یعنی وحی کو ایک برتر ذریعہ علم کے طور پر عصرِ حاضر میں اپنی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں پیش کیا، اس دعوے کے ساتھ کہ یہ بھی دوسرے ذرائع علم کی طرح سائنسی اور علم کے حسّی اور تجربی معیارات پر پورا اُترتا ہے۔ یوں اقبال نے اسلامی ثقافت کے جزوِ اعظم وحی اور نبوت کو برتر اور اعلیٰ مقام دیا۔

علامہ اقبال نے اپنی تقریر و تحریر کی تمام تر قوتیں قرآنی تعلیمات یعنی انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کو عام کرنے پر صرف کر دیں۔ انھوں نے امتِ مسلمہ کو نبوت، اُس کے امکانات و مضمرات اور وسیع اُفق، اُس کی گہرائیوں اور زندگی کے اندر اُتری ہوئی جڑوں، قلب و نظر، اخلاق، رجحانات پر اس کے اثر و سیرت سازی، معاشروں اور تمدنوں کی تشکیل و قیادت بلکہ ایک مخصوص و ممتاز اور جاہلیت کے مقابل متوازی تہذیب کی بنیاد رکھنے کے سلسلہ میں بنیادی کردار پر غور کرنے کی دعوت دی۔

نبوت اور انبیاء کرامؑ قرآن پاک کی روشنی میں، اقبال کا محبوب اور شوق انگیز موضوع رہا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیاں اور انسانیت کے ایسے کامل، شاہکار نمونے ہیں جن سے زیادہ خوبصورت تخلیق اس کائنات میں کوئی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنے کلام میں جہاں ان

ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کا اُسلوب زندگی سے لبریز، بشارت و مسرت سے بھرپور اور محبت سے سرشار نظر آتا ہے۔ گویا وہ انبیاء کرامؑ کے ذکر کو ایک محبوب کی داستان شوق اور ذکر جمیل سمجھتے ہیں کہ جس کو جتنا بھی طول، وسعت، تنوع اور شاخ درشاخ کی کیفیت دی جائے کم معلوم ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے انبیاء کرامؑ کی حیات اور سیرت و کردار کی جو امثال بطور نمونہ پیش کی ہیں اور جس انداز سے پیش کی ہیں کسی ذہین سے ذہین انسان، بڑے سے بڑے عالم اور بہت بڑے دانا کے لیے بھی ان کو جھٹلانا ممکن نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ نے انبیاء کرامؑ کو خلاصۂ مخلوقات اور انسانیت کے کامل نمونے اور خدا کی پیامبری و دعوت دین کے لحاظ سے سب سے زیادہ باصلاحیت اور باہمت افراد کے طور پر پیش کیا ہے اور امت کے افراد کو اُن کی پیروی کی دعوت دی ہے۔ یہ سب قرآنی بیان کے عین مطابق ہے یوں علامہ نے اشعار میں قرآنی آیات کی تفسیر و تعبیر اور تعلیم بھی پیش کر دی ہے جو صبح کے اُجالے کی طرح واضح چمک دار اور روشن ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہ انبیاء کرامؑ ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کے احکام، اس کی مرضیات اور عقائد و اعمال کی خاصیات، صحیح اور غلط، بد اور نیک اخلاق کے نتائج کا علم، آخرت میں انجام، ثواب و عذاب اور جنت و جہنم کی معرفت کے علم کا سرچشمہ ہیں۔ زمانے کے علما و محققین دواؤں کے خواص دریافت کر سکتے ہیں، اشیا کی طبائع اور ان کی پوشیدہ قوت کے بارے میں معلومات کا قیمتی خزانہ جمع کر سکتے ہیں، لوگوں کو دنیاوی نفع دے سکتے ہیں لیکن دنیا اور آخرت کے متعلق حقیقی نفع کے حصول کا وسیلہ انبیاء کرامؑ کی ہستیاں ہیں۔ کیونکہ اس زندگی کے بعد کے حالات اور اُس دنیا میں ہونے والے حشر ونشر، انعام و عذاب، نعمت و نقمت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے صرف انبیاء کرامؑ کو عطا فرمایا۔ قرآن حکیم میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1]

ترجمہ: غیب کا جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے۔

یہ انبیاء کرامؑ جبلِ نبوت پر کھڑے ہو کر عالم موجود و عالم غیب کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انسانوں کو مستقبل قریب یا بعید میں رونما ہونے والے اُن واقعات کی خبر دیتے ہیں جن سے تہذیب و تمدن کو خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ نیز یہ ہستیاں توحید کا پرچار کرتی اور معرفت کے صحیح

راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ جہاں نہ تنہا عقل رہنمائی کرسکتی ہے؛ نہ ذہن و ذکاوت کی تیزی کام آ سکتی ہے؛ نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے؛ نہ دماغ کی بلند پروازی وہاں راہ پاسکتی ہے؛ نہ عقل وخرد کی کوششیں اُس منزل تک پہنچا سکتی ہیں؛ نہ تجربات کا خزینہ مدد کا سبب بن سکتا ہے۔[۲] اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا بیان سچے صاحب تجربہ، اہل جنت کی زبانی بیان کیا ہے فرمانِ الٰہی ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا قف وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ ج[۳]

ترجمہ: اور کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی اور ہم راہ نہ پاتے اگر ہمیں اللہ راہ نہ دکھاتا۔

اللہ تعالیٰ اہل جنت کی زبانی اعتراف کروانے کے بعد یہ بھی کہلواتا ہے کہ انبیاء کرامؑ ہی نے انھیں ہدایت دی اور وہ اس منزل تک پہنچے ہیں۔

لَقَدْ جَآءَ ت رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ط[۴]

ترجمہ: بے شک ہمارے رب کے رسول حق لائے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انبیاء کرامؑ ہی اللہ کی معرفت کے حصول کا وسیلہ اور اس کی مرضی و احکام جاننے کا ذریعہ ہیں اور اُنھی کی تعلیم و رہنمائی دنیا و آخرت میں کامیابی کا وسیلہ ہے اور مخلوق سے خالق کا صحیح تعارف بھی اُنھی کی بدولت ممکن ہوا کہ یہی ہستیاں عقیدۂ توحید کی صحیح تعلیم کے ذریعے لوگوں کے درمیان عدل قائم کرتی ہیں۔[۵]

انبیاء کرامؑ کی سیرتوں کے مطالعے سے یہ عیّاں ہوتا ہے کہ اُن کے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہی آئندہ وقت میں ملنے والے منصب کی نشانیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ حسب ونسب، شکل وصورت اور سیرت وکردار میں بلند مرتبہ اور منفرد مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ قدرتِ حق شرک وکفر سے اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ اخلاق حسنہ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ امین، دیانت دار اور سچے ہوتے ہیں۔ غلطیوں سے بچائے جاتے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ نبوت کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہونے کے بعد لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے ہو۔ انبیاء کرامؑ کے نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے کے واقعات کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے، مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا نبوت ملنے سے پہلے تلاش حق کی خاطر، شمس وقمر اور نجوم پر متفکرانہ نظر ڈالنا، بت پرستی کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کس بات کی گواہی دیتا ہے؟ حضرت اسماعیلؑ کا بے آب و گیاہ وادی میں

پروان چڑھنا، آبِ زم زم کا جاری ہونا اور قافلوں کا اس وادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہونے کے بعد مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لیے جانا اور کم عمری کے باوجود باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آمادہ ہونا، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس آنے والے وقت کی خبر دیتا ہے؟ حضرت یوسفؑ کا بچپن میں سچا خواب دیکھنا، صبر و شکر اور پاکدامنی کا اظہار کس امر کی گواہی ہے؟ حضرت موسیٰ کا خطرے میں جنم لینا، حفاظت، دیکھ بھال اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے مجاہدانہ آویزش کس آنے والے واقعہ کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا اوائل عمر میں علم و فہم سے مقدمات کا فیصلہ کس نتیجہ کی نشانیاں ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش، بچپن ہی میں نیکی، سعادت مندی، نرم گفتگو کس مقصد کا نقطۂ آغاز ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بچپن میں نیکی، سلامت روی، تورات کی حقیقت رسی کس روشن صبح کی علامت ہے؟ اور خود رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کے لیے دعائے ابراہیمیؑ، نوید عیسیٰؑ، رویائے آمنہ اور پیدائش کے احوال، ولادت، دیکھ بھال و نگرانی، شرک سے اجتناب، اخلاقِ حسنہ، دیانت امانت، خیر و برکت کی نشانیاں، نبوت سے پہلے ہی تنہائی سے محبت، خلوت گزینی، حق کی تلاش اور غور و فکر کس تابناک سورج کا مطلع انوار ہے؟

انبیاء کرامؑ کے احوالِ مبارکہ کے یہ جزئیات آپس میں مل کر خود ہی ایک کلیہ پیش کرتے ہیں[6] کہ یہ ہستیاں عام انسانوں سے بالاتر اخلاق، روحانیت، ذہنی استعدادِ علم اور اعلیٰ و ارفع اعمال کی مالک ہوتی ہیں۔ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، ان کی آنکھیں سوتی اور دل جاگتا ہے۔[7] عام انسان ان کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ عام انسان تو دور کی بات کوئی قوی اور بلند پایہ ولی اور صدیق بھی اُن کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا[8] یہ توحید الٰہی اور ایمان باللہ کے ساتھ پرورش پاتے ہیں بلکہ معرفت و انوار کی برسات میں ان کی پرورش و نگہداشت ہوتی ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ کوئی ہستی دینی و دنیاوی امور و معاملات میں ان سے زیادہ واقفیت والی نہیں گزری اور نہ ہی کسی کافر و مشرک کو کوئی ایسا موقع ملا کہ وہ ان مقدس حضرات کے اقوال و افعال کو ہدفِ ملامت بنائے اگر کبھی اس کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو وہ اس کی تشہیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے اور وہ بات سب کے سامنے آشکارا ہو جاتی۔ اس کی مثال تحویل کعبہ کے موقعہ پر ملتی ہے جب رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ ابراہیمیؑ کی طرف رُخ فرمالیا تو اُن کو یہ بات پسند نہ آئی اور انھوں نے ہاتھ آئے اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔[9] اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انسانی معاشرے میں انبیاء کرامؑ کا مقام انتہائی نازک رہا ہے۔ ایک معمولی بات

عام آدمی کو پیش آ جائے تو وہ غیر اہم لیکن اگر کسی نبی یا رسول کو پیش آ جائے تو وہ قانون کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام ہستیوں کی حیات پر ایسی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل بھی اللہ کی رضا سے ہٹا ہوا نہ ہوتا کہ اسلام اور اُس کے قوانین اپنی اصلی اور صحیح حالت میں خدا کے بندوں تک پہنچیں اور ان میں رضائے الٰہی سے مطابقت نہ رکھنے والی ذرّہ بھر بھی کوئی شے شامل نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ان ہستیوں کو ان کے منصب کی مناسبت سے ملکوتِ ارض وسمٰوٰت کا مشاہدہ کرواتا ہے تاکہ وہ ان تمام حقائق کو جو ایمان بالغیب لانے کے لیے ضروری ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور لوگوں کو بتا سکیں کہ وہ جن حقائق کی تعلیم دے رہے ہیں وہ انھیں دیکھ چکے ہیں اور اُن کا براہ راست علم و مشاہدہ رکھتے ہیں۔ اُن کا درجہ فلسفیوں کے مقام سے بہت بلند ہے جو قیاس اور گمان کی بنیاد پر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت اُس بلند ترین معیارِ کمال پر ڈٹے رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی حاجات اللہ کے حضور پیش کیں۔ آغاز میں خواہ انھیں کیسے ہی مصائب پیش آئے ان کی تمام دُعائیں معجزانہ طور پر پوری ہوتی رہیں۔[۱۰]

انبیاء کرامؑ ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں یہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے بولے ہوئے الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت والہام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تقریر ان کا شوق نہیں بلکہ فرض ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ان کی تقریر سراسر روحانیت ہوتی ہے کیونکہ خود اللہ ان کو سکھاتا ہے تاکہ اپنا پیغام ان کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچائے[۱۱] گویا ان ہستیوں کے ذریعے انسانی دائرہ علم و فضل سے آشنا اور مستفید ہوتا ہے۔ ان کے گوناگوں کمالات و کرامات ہیں جن کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ تمام انبیاء کرامؑ میں یہ صفات کمال اپنے اپنے درجہ میں جامعیت کے ساتھ موجود رہیں۔ لیکن ہر ایک نبی کے کمالات کا ایک مخصوص رنگ اور اُس کی پاکباز زندگی کی ایک نئی شان ہے جو اسے دوسرے انبیاء کرامؑ سے ممتاز کر رہی ہے۔ کسی کی نبوت سطوت و شوکت اور سلطنت وحکومت کی قبا میں نمایاں ہوئی اور کسی کی درویشی اور فقر وفاقہ کی کملی میں، کسی میں جاہ وجلال کا ظہور ہے اور کسی میں محبوبیت و جمال کا، کسی نے خلوت و انقطاع کی صورتوں میں اعلانِ حق کیا ہے اور کسی نے جلوتوں اور تعلقات کی کثرت میں بنی نوع انسان کی تربیت کی ہے۔ غرض تمام صفاتِ کمال کی جامعیت کے باوجود ہر نبی میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور غالب رہی ہے جو اُس کے لیے مابہ الامتیاز بنی رہی ہے۔ جب اُن کی تمام صفات

کمال عطائے حق اور صفات ربانی کا پرتو ہیں تو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر نبی کے لیے اصل منبع فیض کوئی خاص صفتِ ربانی ہے۔ جس کے تحت اس نبی کے افعال و اعمال اور خصوصیات اخلاق نے تربیت پائی ہے۔ اُس صفت کی تشخیص و تعین کہ یہ نبی خداوندِ حکیم کی کون سی صفت سے مستفید ہے اور اُس کی کون سی شان اس نبی کی مقدس زندگی میں ظہور کر رہی ہے؟ سو یہ خود اس مقدس طبقے کے آثار اور کاروبار سے ہویدا ہو جاتی ہے مثلاً انبیاء کرامؑ اولوالعزم میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی مخصوص شان قدوسیت و سلامیت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی مخصوص شان تقلیب و تبدیل انواع ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح اللہؑ کی مخصوص شان مردوں کو زندہ کرنا اور بیماروں کی مسیحائی ہے۔ حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی مخصوص شان رحمت اور علم و حکمت ہے۔[۱۲]

اس خطۃ الارض کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اس میں بسنے والے تمام افراد کسی نہ کسی نبی کی بتائی ہوئی ہدایات کے زیر اثر اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسانی رہنمائی کے لیے انبیاء کرامؑ کے گروہ سے زیادہ کوئی اور گروہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بھی اس کائنات میں بسنے والے زیادہ افراد تعلیماتِ انبیاءؑ کی روشنی و پیروی ہی میں فلاح و کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے انبیاء کرامؑ کے وضع کردہ قوانین کی حکمتوں پر غور و خوض کرنے پر زور دیا ہے تاکہ مختلف حالات میں ان کو مدنظر رکھ کر ان سے رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ اقبال ''شریعتِ اسلامیہ میں مرد اور عورت کا رتبہ'' میں رقم طراز ہیں:

''ہمیں دیکھنا ہوگا کہ جو قوانین انبیاء نے وضع کیے ہیں وہ کن حکمتوں پر مبنی ہیں۔ قرآن پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں فرماتا ہے:

یعلمھم الکتٰب و الحکمۃ۔

آپ کو غور کرنا چاہیے کہ حکمت کے کیا معنی ہیں احکام انبیاءؑ کے اندر کیا حکمتیں مضمر ہیں۔ انبیاءؑ نے زندگی کے جس قدر احکام ہمیں دیے ہیں وہ مختلف حالات کو مدِنظر رکھ کر وضع کیے گئے ہیں''۔[۱۳]

چنانچہ علامہ نے نہ صرف امت مسلمہ کے افراد کو انبیاءؑ کی تعلیمات کی حکمتوں کو جاننے کی دعوت دی بلکہ خود بھی انبیاءؑ کی حیات اور حیات کے بارے میں اُن کے احکام و تعلیمات اور اُن میں مضمر حکمتوں اور خصائص کو موضوع سخن بنایا اور تشریح و تعبیر و تفسیر اور پوشیدہ حقائق کو نمایاں کرنے اور امت مسلمہ کے سامنے پُر تاثیر انداز میں پیش کرنے کا ذمہ اٹھایا اور خوب نبھایا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت آدمؑ تا حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات ایک ہی ہیں۔ لہٰذا

اسلام شروع ہی سے ایک ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایک رسول یا نبی کو جھٹلاتا ہے مگر کسی دوسرے نبی و رسول کو مانتا ہے تو وہ ایسا عصبیت یا تقلید آبائی کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس لیے وہ نفس پیغام رسالت کو تسلیم نہیں کرتا ورنہ کبھی بھی ممکن نہ ہوتا وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اُسے تسلیم کر لے اور وہی حق دوسرا پیش کرے تو وہ ماننے سے انکار کر دے۔[۱۴]

علامہ اقبال نے رسالت اور سیرت و تعلیمات انبیاء کرامؑ کو موضوع سخن بنایا ہے اور سلسلہ رسالت کو آدمؑ تا محمد خاتم النبیین ﷺ ایک ہی بتایا ہے جو اس بات کا واضح اعلان ہے کہ وہ نفس پیغام رسالت کو مانتے ہیں۔ وہ وحدت ادیان کے نہیں بلکہ وحدت دین کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک اسلام شروع سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ اُن کا پورا کلام و فلسفہ اسی کا عکاس ہے۔ انھوں نے اس بیان و اظہار اور تشریح کے لیے بوقلموں صورتیں اور انداز اپنائے ہیں تاہم روح اور اصل کے اعتبار سے ان میں پوری پوری فکری و نظری یکسانی، ربط و نظم اور ہم آہنگی ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ تمام امت مسلمہ اپنی ذاتی و انفرادی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر صرف اُس راستے پر چلے جو اللہ کے یہاں محبوب ہے اور جسے دوسرے تمام راستوں پر ترجیح حاصل ہے۔ اُن کے نزدیک وہ راستہ تعلیمات الانبیاءؑ کی اطاعت کا راستہ ہے کہ اسی راستے پر چل کر انبیاء کرامؑ کی سی خصوصیات اور اخلاق کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ضروری جانا کہ امتِ مسلمہ کے افراد انبیاء کرامؑ کی تعلیمات اور دعوت حق کے مرکزی نکات کو جان کر اپنے شعور و احساس، اعصاب اور قوت فکریہ کو سلسلہ نبوت کی ان تعلیمات کے زیر اثر پروان چڑھائیں۔ لہٰذا انھوں نے ان تعلیمات کو عام کرنے کے لیے تلمیحات کا خوبصورت سہارا تلاش کیا۔ کلامِ اقبال میں ہر نوع کی تلمیحات بکثرت ملتی ہیں جو اُن کے وسعتِ مطالعہ پر دال ہیں۔[۱۵]

ان تمام تلمیحات کی اہمیت اپنے طور پر مسلم، لیکن انبیاء کرامؑ کی حیات، سیرت و کردار اور تعلیمات و حکمتوں پر مبنی تلمیحات منفرد مقام کی حامل ہیں۔ کیونکہ علامہ ان تلمیحات کو صرف واقعاتی بیان کے لیے نہیں لائے بلکہ ان کے ذریعے انھوں نے حقائق اسلام کو واضح کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ انبیاء کرامؑ کی حیات، سیرت و کردار اور تعلیمات کی وضاحت بھی درحقیقت حقائق اسلام کی تشریح و تفسیر ہے اور علامہ کے نزدیک حقائق اسلام کی نشر و اشاعت سب سے بڑی خدمت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ہی طبیعتوں میں انقلاب رو پذیر ہوتا ہے۔[۱۶] اقبال اس انقلاب کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ جانتے ہیں۔ اصلاح کے پروگرام کے لیے نمونہ ہستیاں انبیاء کرامؑ

کے علاوہ اور کون ہو سکتی ہیں کہ ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر مسلمان اپنے بچھڑے ہوئے محبوب شریعت اسلامیہ سے کماحقہٗ مل سکتے ہیں اور یہ ان کے بحیثیت مذہبی جماعت قائم رہنے کے لیے از حد ضروری ہے[۱۷] علامہ اقبال نے انبیاء کرامؑ کی تلمیحات کے ذریعے ایک اور اٹل پیغام دیا ہے کہ امتِ مسلمہ کے افراد داخلی نفسیاتی عوامل کے سامنے جھکیں، نہ خارجی وقتی حادثات کے سامنے اور نہ ہی اپنی فکر کو اس رخ پر موڑیں جدھر حالات و ماحول رواں دواں ہے یا جدھر معاشرہ چاہتا ہے بلکہ اپنی فکر کو فکر انبیاء کرامؑ کے رنگ میں رنگ کر حالات و معاشرہ کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کریں۔ توحید و رسالت کے کامل و اکمل عقیدہ کی ہر اعتبار سے تبلیغ کریں۔ مصلحت اور ضرورت وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اصولوں کو ترک نہ کریں اور نہ ہی حالات کے سامنے جھکیں بلکہ انبیاء کرامؑ کی پیروی کرتے ہوئے باطل کا ڈٹ کر سامنا کریں اور حالات کے دھارے کو وحی و نبوت کے حامل افراد مصدقہ کی تعلیمات کے مطابق موڑنا سیکھیں۔ اسلامی شعائر اور حدود اللہ کو قائم رکھنے میں فولاد سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو جائیں۔ کمزوری و نرمی نہ دکھائیں اور نہ ہی کسی قسم کا سمجھوتہ کریں کیونکہ تقاضائے شریعت کے مطابق یہ سب نفس کو قوی تر بنانے کے لیے اشد ضروری ہے۔[۱۸]

علامہ کے نزدیک اُمتوں کی تقدیریں بھیجے گئے انبیاء کرامؑ کی اطاعت و پیروی، ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے، ان کی سیرت کی پیروی اور عزت و ذلت، ہر حال میں ان کی رکاب سے وابستہ رہنے سے متعلق ہوتی ہیں۔ چنانچہ کوئی امت اپنی تمام قوت و طاقت، عقل و وسائل کے ہمراہ زمانے، تہذیب، فلسفوں اور حالات و حوادث کی تمام ترقی کے باوجود کامیابی و کامرانی کا زینہ طے نہیں کر سکتی جب تک وہ انبیاء کرامؑ کی اتباع، اُن سے محبت اور ان کی دعوت کے لیے ہر حال میں سعی نہ کرے اور جو امت بھی اس طرز سے ہٹ کر جاہ و مرتبہ، حشمت و قوت کے حصول کے لیے اپنی عقل مندانہ سیاست یا کسی بڑی طاقت کی پشت پناہی پر بھروسہ کرتی ہے تو اس کا انجام داخلی انتشار اور صبح و شام ذلت و رسوائی اور ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں۔

علامہ نے بتایا ہے کہ عالمِ اسلام میں شریعت پر عمل میں کوتاہی اطاعات سے غفلت، نفس پر بھاری گزرنے والی اشیاء سے وحشت اور نبی کی سنت کے معاملے میں نئے تعلیم یافتہ طبقے کی غفلت، سب اسی عظمتِ انبیاء کرامؑ کا احساس نہ ہونے کا نتیجہ ہے جس پر قرآن نے بہت زور دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں انبیاء کرامؑ بالخصوص رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے محبت کے جذبہ میں کمی

کو بہت عمل دخل ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو پہلے اوراب بھی حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ بھی رہا ہے اور تاریخ کے عجائبات و معجزات کے لیے مشہور بھی۔ اس جذبہ کی کمی، عقل وعزم اور کسی نظام کی بڑی سے بڑی مقدار سے بھی پوری نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی صرف اور صرف انبیاء اکرمؑ کی سیرت و کردار کی اطاعت و پیروی سے ممکن ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے حسنِ کردار اور کمال سیرت سے تاریخ عالم کا رُخ بدلا۔ انسانوں کو جینے کا رنگ ڈھنگ سکھایا۔ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ایسے روشن اور دائمی اصول مہیا کیے، جو زمان و مکان کی قید سے آزاد تمام نسل انسانی کے لیے تا قیامت سرچشمۂ ہدایت و رہنمائی ہیں۔ علامہ نے نبوت کے اصولوں اور پیغام کو اپنے تخیل کی قوت، جذبات کی شدت، فکر کی رعنائی اور ندرت خیال سے اس طرح لوگوں تک پہنچایا ہے کہ وہ اُن کے قلوب میں جاگزیں ہوگیا اور اقبال صرف مصلح ہی نہ رہے ایسے شاعرِ رنگین نوا بن گئے جس نے دیدۂ بینائے قوم کے فرائض بھی ادا کیے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- الجن:۷۲ آیت:۲۶، ۲۷

۲- ندوی، مولانا ابوالحسن علی، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سن ندارد، ص:۳۰، ۳۱

۳- الاعراف:۷ آیت:۴۳

۴- ایضاً

5- Draz, Muhammad Abdullah, The origin of Islam included in *Islam the Straight Path* by Moti Lal Banaras Dass, Edited by Kenneth W Morgan Dehli india Ist Edition: 1987, p:5

۶- نعمانی، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، ج:۴ مکتبہ مدنیہ، لاہور، بار ندارد، ۸ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ، ص:۴۰، ۴۱

۷- عبدالمجید، آخری نبی ﷺ اور ان کی تعلیمات، فضلی سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۴۰۰، ۴۰۱

۸- بشیر حسین ناظم (مترجم)، شواہد النبوۃ، جامی، نورالدین عبدالرحمٰن، مکتبہ نبویہ، لاہور، بار چہارم،

۱۹۸۴ء، ص: ۲۶۔
۹- عیاض، حافظ ابوالفضل بن موسیٰ الحصینی، مولانا محمد اظہر نعیمی (مترجم)، الشفاء، حصہ دوم، مکتبہ نبویہ، الاہور، رجب ۱۳۹۹ھ، ص: ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۳۔
۱۰- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، (مرتبین)، نعیم صدیقی، عبدالوکیل علوی، سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۰ء، ص: ۶۷، ۷۶، ۸۱
۱۱- عبدالحمید خواجہ، اقبال کے چند جواہر ریزے، اقبال اکادمی، لاہور، بار وس۔ن، ص: ۲۷
۱۲- محمد طیب، قاری، تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام، بک پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۵، ۶، ۷، ۱۳، ۱۴، ۳۶
۱۳- افضل، محمد رفیق، گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص: ۷۹
۱۴- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد: ۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار سترھواں، ۱۹۸۰ء، ص: ۵۱۰
۱۵- احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب؛ ج: ۵، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰۹
۱۶- اقبال، ڈاکٹر محمد، مرتب مظفر حسین برنی (مرتب)، مکاتیب اقبال، ج: ۴، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۶۵۵
۱۷- حوالہ مذکورہ بالا، ص: ۹۶۰
۱۸- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۳ء، ص: ۵۴۷، ۵۴۸

☆☆☆☆

باب اوّل

وحی و نبوت فکرِ اقبال کے ماخذ کی حیثیت سے

علامہ اقبال کی فکر کا منبع و ماخذ قرآن حکیم تھا اور قرآن اُس وحی پر مشتمل ہے جو نبی پاک ﷺ پر اُتری۔ یوں نبوت ہی فکرِ اقبال کا اوّلین ماخذ ہے۔ اس ماخذ سے وابستگی اور عشق ہمیں اقبال کے ہاں عشقِ رسول ﷺ کی صورت میں ملتا ہے۔ رسول پاک ﷺ ایک نبی تھے۔ لہٰذا ان کی نبوت کی تفہیم کے لیے انبیاء کرامؑ کے پورے نظم اور تسلسل کا مطالعہ ضروری ہے۔ قرآن پاک میں متعدد انبیاء کرامؑ کا ذکر آیا ہے مگر یہاں ہم ان انبیاء کرامؑ کا ذکر کر رہے ہیں جن کا ذکر کلامِ اقبال میں ہے تاکہ ان کے خصائص کے مطالعے سے ہم نبوت و قرآن حکیم کی صحیح تفہیم حاصل کر سکیں۔ انبیاء کرامؑ کی سیرتوں، اُن کی دعوتوں اور اُن پر اُترنے والی وحی کے مطالعہ سے وحی کے تسلسل، اس کے مقاصد، منہاج اور تاریخ و تہذیب انسانی پر اس کے اثرات سے ہم اقبال کی فکر کی باطنی کوششوں تک رسائی حاصل کر سکیں اور جان سکیں کہ اُنھوں نے پورے نظامِ نبوت کے مطالعہ سے کیا نتائج مرتب کیے ہیں اور ان سے اپنی فکر کو کس طرح تقویت دی ہے۔ کیونکہ کسی بھی مفکر کے پیغام کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کی فکر کے منبع و ماخذ کے بارے میں درست معلومات فراہم کی جائیں۔ اس لیے کہ جب تک اس کی اصل حقیقت کا پتہ نہ چلے جس سے اس کی فکر کے سوتے پھوٹے ہیں۔ اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اکثر مفکر اپنی فکر کی اساس کو اس طرح غیر واضح اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والے اس کی اصل و اساس کا تعین ہی نہیں کر پاتے۔ لہٰذا ناقدین و شارحین کی قیاسی سراغ رسانیوں سے یہ مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کچھ وقت کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے گہرے اور دبیز پردے پڑ

جاتے ہیں کہ حقیقت چھپ جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکرین کا پیغام سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے ناقدین وشارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ بھی قرار نہیں پاتا۔لیکن اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال کی شخصیت منفرد دکھائی دیتی ہے۔[۱] آپ گنتی کے اُن چند فلاسفہ میں سے ہیں جنھوں نے اپنی فکر اور تخلیقی سوچ کا ایک دائرہ مقرر کیا۔ اپنی فکر کے کچھ اساسی تصورات قائم کیے[۲] اور ان اساسی تصورات کے منبع و ماخذ اور اپنے پیغام کی اساس کو اتنا واضح اور غیر مبہم بنا کر پیش کیا کہ اس میں کسی قیاس آرائی اور ظن وتخمین کی گنجائش ہی باقی نہ رہنے دی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ محمد اقبال نے مشرقی و مغربی علوم قدیم و جدید کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور فلسفہ میں دلچسپی کے سبب مغربی مفکرین کے افکار وتصورات کو بھی بدقت نظر دیکھا تھا۔لیکن اس سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ ان کے فکر کی بنیاد ان مفکرین کے تصورات و نظریات پر اُستوار ہوئی تھی۔ان کے فکر کی اساس ایک مضبوط اور پائیدار حقیقت پر تھی جو نہ مشرق سے متاثر ہے اور نہ مغرب سے۔ وہ اپنی اس فکر کی اساس کو قیاسات میں ملوث ہی نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ جس مقام سے وہ گفتگو کر رہے ہیں وہ حکمت وفلسفہ حدود سے بالاتر ہے:

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں[۳]

موجودہ دور کے علوم وفنون کے بارے میں علامہ اقبال نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ انھوں نے اس میں سے صرف اور صرف حقیقت ثابتہ کے مطابق پائی جانے والی باتوں کو اپنی فکر کی وضاحت کی تائید کے طور پر لیا ہے اور خلافِ حقیقت اشیا کے فریب کا پردہ چاک کیا ہے:

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم
بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم![۴]

ترجمہ: میں نے دور حاضر کے علم کا طلسم توڑ دیا۔اس کے جال کے نیچے سے دانہ اٹھالیا۔
خدا جانتا ہے کہ ابراہیمؑ کی مانند میں اس کی آگ میں کس بے پروائی سے بیٹھا ہوں۔

کوئی بھی انسان موجودہ دور کے علم وحکمت کو آتش نمرود قرار دے کر اُس پر اپنے علم و

حکمت کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔علوم قدیم وجدید دونوں کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک مسلک تھا کہ غلط نظریات وتصورات حیات کو رد کر دیا جائے۔ وہ ان غلط نظریات زندگی اور تصورات کو ملا و صوفی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں:[۵]

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را
بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند
کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را[۶]

ترجمہ: ساقی اٹھ اور جام مے آگے بڑھا، دونوں جہانوں پر اپنا دامن جھاڑ دے۔
(اس دور میں) مجھ جیسے رند پر حقیقت فاش کی گئی ہے۔ کیونکہ مُلّا رازِ دیں سمجھنے سے قاصر ہے۔

وہ علوم قدیم وجدید کے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں:

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد![۷]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبال نے اپنی فکر کو کہیں سے مانگے ہوئے افکار وخیالات سے اثر نہیں لینے دیا تو وہ کون سی حقیقت کاملہ تھی جس پر انھوں نے اپنی فکر کی بنیادیں استوار کیں اور جس سے اُن کے شخصی عناصر کی تشکیل ہوئی۔علامہ اقبال ۱۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

شخصی عنصر سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں مصنف کے ذاتی حالات واکتساب فیوض کا اشارہ ہے یا ذکر ہے۔ میں نے یہ لفظ خود ہی وضع کیا تھا اردو زبان میں مروج نہیں ہے انگریزی میں اس مطلب کو Personal Eliment سے واضح کرتے ہیں۔[۸]

جیسا کہ آغاز میں بیان کر دیا گیا ہے کہ علامہ نے اپنی فکر کی اساس کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہنے دیا۔ ان کا یہ پیغام سب سے پہلے اپنی جامع صورت میں ان کی فارسی تصنیف رموز بیخودی میں سامنے آتا ہے۔علامہ اقبال کے مذکورہ بالا قول کی روشنی میں رموز بیخودی کے یہ اشعار دیکھیے:

اے ظہورِ تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تابِ روئے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تو

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب و ام گشتۂ محبوب تر
عشق در من آتشے افروخت است
فرصتش بادا کہ جانم سوخت است[9]

ترجمہ: آپ ﷺ کی تشریف آوری سے زندگی اپنے شباب کو پہنچی۔ آپ ﷺ کا ظہور خواب زندگی کی تعبیر ہے۔ آپ ﷺ مقصود کائنات ہیں۔

اس زمین نے آپ ﷺ کی بارگاہ کے سبب شرف پایا۔ آسمان نے آپؐ کی بارگاہ کے بام کو بوسہ دے کر بلند مرتبہ حاصل کیا۔

آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کے نور سے شش جہت روشن ہیں۔ ترک تاجیک اور عرب سب آپ ﷺ کے غلام ہیں۔

اس کائنات کا مرتبہ آپ ﷺ کی وجہ سے بلند ہوا۔ آپ ﷺ کا فقر کائنات کی دولت ہے۔ آپ ﷺ نے جہاں میں زندگی کی شمع روشن کی اور غلاموں کو آقائی سکھائی۔

جب سے میری نظر آپ ﷺ کے چہرے مبارک پر پڑی ہے۔ آپ ﷺ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے۔

آپ ﷺ کے عشق نے میرے اندر آگ بڑھکا دی ہے۔
عشق کو فرصت مبارک۔ کیونکہ اب میری جان جل چکی ہے۔
اس کے بعد آج کے مسلمانوں کی حالت بیان کی ہے۔ پھر کہتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
در بحر فم غیر قرآں مضمر است[۱۰]
پردہ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن[۱۱]

ترجمہ: اگر میرے دل کا آئینہ جوہر کے بغیر ہے۔ اگر میرے اشعار میں قرآن پاک کے علاوہ کچھ پوشیدہ ہے تو آپ میرے فکر کے شرف کا پردہ چاک کر دیجیے۔ اور خیابانِ (دنیا) کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔

یعنی اگر میرے پیغام میں کتاب پاک، قرآن مجید کے علاوہ کچھ اور ہے تو اے آقائے دو جہاں ﷺ اس دنیا کو مجھ سے پاک کر دیں:

وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۱۲]

ترجمہ: مجھے روزِ قیامت خوار و رسو کیجیے۔ یعنی اپنے بوسۂ پا سے محروم رکھیے۔

وہ لوگ جو اقبال کے قلب پر نگاہیں جما سکتے ہیں۔ اس امر کا اندازہ لگانے میں دقت محسوس نہ کریں گے جس کے تحت انھوں نے اتنی بڑی سزا کو جائز قرار دیا کہ اگر میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہوں تو مجھے ختم کر دیا جائے اور قوم کی میرے شر سے حفاظت کی جائے۔ نیز مجھے قیامت میں رسوا کیا جائے اور اپنی پابوسی سے بھی محروم کر دیا جائے۔ ڈاکٹر وحید اختر عشرت اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

یہ ایک ایسی بددعا ہے جو کوئی مسلمان اپنے لیے نہیں مانگ سکتا اور صرف اسی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود اقبال بھی اپنے فکر و شعر کا ماخذ قرآن ہی قرار دیتے ہیں بلکہ اپنے فکر و شعر کو اس کی تفسیر سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۳]

پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر میرا پیغام قرآن پاک کی ترجمانی کرتا ہے تو اللہ کے حضور میرے عشق کو عمل سے ہم کنار کرنے کی عرض پیش کر دیجیے:

عرض کن پیش خدائے عزو جل
عشق من گرد دہم آغوشِ عمل[۱۴]

ترجمہ: خدائے عزوجل کے سامنے عرض کیجیے کہ میرا عشق عمل سے ہمکنار ہو۔

اتنے واضح الفاظ کے بعد اس بات کی تحقیق کی گنجائش نہیں رہتی کہ معلوم کیا جائے کہ علامہ اقبال کی فکر اور شخصی عناصر کا سر چشمہ کیا ہے۔ ان کی نگاہیں کس آفتاب حقیقت سے نور حاصل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ اپنی کتاب اقبال اور قرآن میں لکھتے ہیں:

عشق رسول ﷺ اور قرآن مجید ہی سے علامہ اقبال کے شخصی عناصر (Personal elements) کی تشکیل ہوئی ہے اور اس اجمال کی تفصیل ان اقوال و احوال میں پیش کی جاتی ہے جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔[۱۵]

ڈاکٹر تسکینہ فاضل نے اپنے مضمون اقبال اور قرآن میں اقبال کے شخصی عناصر کی تشکیل میں مذکورہ بالا عناصر کے کردار کو اہم جانا ہے۔[۱۶]

اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کہتے ہیں کہ اقبال کی شخصیت کو پروان چڑھانے والے پانچ تخلیقی عناصر ہیں جن کے سبب اقبال کی شخصیت زندہ جاوید ہو گئی۔ ان پانچ عناصر میں سے پہلا ایمان و یقین ہے۔ شخصیت کو بنانے والا دوسرا عنصر وہ ہے جو آج ہر مسلم گھرانے میں موجود ہے مگر دکھ کی بات ہے کہ خود مسلمان اس کی روشنی سے محروم، اس کے علم و حکمت سے ناآشنا ہیں۔ یہ دوسرا عنصر قرآن پاک ہے۔ تیسرا عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا وہ عرفانِ نفس اور خودی ہے۔ اقبال کی شخصیت کو پروان چڑھانے والا چوتھا عنصر آہ سحر گاہی ہے۔ رات کے آخری وقت میں بیدار ہو کر اپنے اللہ کے حضور سر جھکانا، گڑگڑانا اور گریہ زاری کرنا، یہی شے تھی جس نے اقبال کی روح کو ایک نئی خوشی، دل کو ایک نئی روشنی اور فکر کو ایک نئی غذا عطا کی۔ اور پانچواں عنصر جو اقبالی فکر کی اساس بنا وہ مثنوی رومی کا مطالعہ ہے۔[۱۷]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ قرآن پاک کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور مسلسل غور و فکر ان کی وہ کسوٹی تھی جس پر وہ قدیم و جدید تمام فلسفوں اور نظریات کی جانچ پرکھ کرتے رہے۔ چنانچہ اُنھوں نے قرآن کے قریب محسوس ہونے والی تعلیمات کو مومن کی گم شدہ حکمت سمجھ کر قبول کر لیا

اور جو شے انھیں اس فکری دھارے سے پرے اور علیحدہ محسوس ہوئی اس کو مسترد کر دیا۔ بقول ڈاکٹر وحید اختر عشرت:

اقبال نے قرآن کی غوّاصی کی اور اس کو اپنی تمام تر فکریات کی اساس اور معیار بنایا۔[۱۸]

اُن کے نزدیک ہر انسان کے لیے اساسِ فکر اور اساسِ عمل قرآن ہی ہے۔[۱۹] اُن کے کلام میں اس بات کے واضح شواہد ملتے ہیں کہ وہ عصرِ حاضر کے پیدا شدہ تمام مسائل کا حل قرآن ہی سے تلاش کرتے ہیں۔ سید نذیر نیازی نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے مقدمہ میں فکرِ اقبال کا منبع وماٰخذ قرآن پاک کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دراصل اس فکر کا حقیقی سرچشمہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کر دیا گیا ہے، قرآن مجید ہے اور قرآن مجید ہی سے ہمیں ان سب مسائل یا مشکلات میں جو اس کی تشریح وتوضیح میں پیدا ہوں رجوع کرنا پڑے گا...... صاحبِ خطبات نے اگر عہدِ حاضر کے الفاظ اور مصطلحات سے کام لیا تو ہم گرفتارانِ فرنگ کی خاطر، اس لیے کہ ان کا خطاب دراصل ہمیں سے ہے اور ہماری وساطت سے جدید علمی دنیا سے۔[۲۰]

اقبال کے ایک اور محقق ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب روح اقبال کے مقدمہ میں لکھا:

اقبال کا کلام شاعرانہ پیرایۂ بیان میں اور جدید علوم کی روشنی میں سراسر قرآن کریم کی تشریح ہے۔ اگر مثنوی روم کو آٹھ سو برس قبل قرآن در زبان پہلوی سمجھا گیا تھا تو ہم کلامِ اقبال کو بھی الف ثانی میں وہی رتبہ دے سکتے ہیں۔[۲۱]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی خطباتِ اقبال پر ایک نظر میں یہی کہا:

اس میں شبہ نہیں ہوسکتا کہ خطبات جس فکر کے حامل ہیں اس کا اصل سرچشمہ قرآن مجید ہے۔[۲۲]

علامہ عرشی امرتسری نے اپنے مضمون ''عظمتِ قرآن بنظرِ اقبال'' میں لکھا:

ان کی عمیق ودقیق فکر کو پناہ ملی تو قرآن حکیم میں ملی۔[۲۳]

لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا، قرآن پاک سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا، قرآن پاک ہی سے سمجھایا۔ ان کی ''مے سخن'' بغیر کسی وسیلے کے ''خمکدہ حجاز'' سے سربمہر آبگینے تک رسائی حاصل کر لیتی تھی۔ اس لیے اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہوسکی۔[۲۴]

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم[۲۵]

ترجمہ: میں انگور سے شراب لیتا ہوں اور (بغیر کسی ملاوٹ کے) ساغر میں اُنڈیل دیتا ہوں۔

گویا اگر ہم کسی ایک چیز کو ان کے فکری نتائج کا منبع و ماخذ قرار دے سکتے ہیں تو وہ قرآن پاک ہی ہے۔ کیونکہ علامہ کے باقی تمام ذہنی حاصلات اسی ایک ایمانی نکتہ کی تفسیر ہیں۔[۲۶]

اقبال کی فکر کا منبع و ماخذ، قرآن حکیم ایک ایسی کتاب ہے جس کی تمام تعلیمات جامع و اکمل ہیں۔ اگر ان کی تشریح و توضیح کی جائے تو دفتر کے دفتر ناکافی ہوں گے۔ کیونکہ ہر ''رطب'' اور ''یابس'' اس کتاب مبین میں موجود ہے پھر قرآن پاک کی تعلیمات ان گنت خصوصیات اور عظمتوں کی حامل ہیں۔ مثلاً:

۱- یہ تعلیمات ساری دنیا اور اس کی تمام مخلوقات کے لیے ہیں اور رہتی دنیا تک رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتی رہیں گی۔

۲- یہ تعلیمات انسانی زندگی اور اس کائنات کے تمام شعبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

۳- اس کی تعلیمات اخلاق و فضائل کی اعلیٰ ترین تعلیم و ترغیب پر مشتمل ہیں۔

۴- اس میں علوم عقلی و علوم اُخروی پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔

۵- عملی زندگی کی ہدایات اور مطالب عامی و خاص کے لیے آسان اور قابل فہم ہیں۔

۶- اس کی تعلیمات دین و دنیا کے لیے بہترین ہدایت نامہ ہیں اور اس میں ملک و ریاست کے لیے بھی عمدہ قانون پایا جاتا ہے۔

۷- اس کے تمام احکام انسانی فطرت کے عین مطابق اور انسانی عقل کے لیے عام فہم و قابل قبول ہیں۔

۸- اس کے تمام احکام انفرادی و اجتماعی طور پر انسانیت کے لیے قابل عمل ہیں۔

۹- یہ کتاب مقدس، قوم، نسل اور ملک وغیرہ کے امتیازات مٹاتی ہے۔

۱۰- اس کتاب میں انسانی حقوق مفصل انداز میں ملتے ہیں۔

۱۱- اس کتاب میں عمرانی و تمدنی، تمام حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔

۱۲- راعی و رعایا، حاکم و محکوم، خادم و آقا کے امتیازات اور حقوق و فرائض متعین کیے گئے ہیں۔

۱۳- یہ کتاب، مساوات، اخوت، صداقت، انصاف، امن اور سلامتی کی تلقین و تعلیم دیتی ہے۔

۱۴- یہ کتاب حسن بیان، فصاحت و بلاغت، تہذیب و عمدگی، اثر و تاثیر، اعجاز بیانی اور معجز نمائی میں تمام الہامی کتب پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس کتاب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کے سامنے مذہب کی عالمگیر صداقت کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے صرف یہی واضح نہیں کیا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ واضح طور پر بتا دیا کہ

تمام مذاہب سچے ہیں۔ دین اللہ تعالیٰ کی عام بخشش ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی ایک جماعت کو عطا ہو لیکن دوسروں کا اس میں حصہ نہ ہو۔

(ب) قرآن نے بتایا کہ اللہ کے تمام قوانین فطرت کی مانند انسانیت کی روحانی خوش بختی کا قانون بھی ایک اور سب کے لیے یکساں ہے۔ پس مذہب کے پیروکاروں کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کی وحدت کو بھلا کر علیحدہ علیحدہ گروہ بندیاں بنالی ہیں اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے برسر پیکار ہے۔

(ج) اس نے بتایا کہ دین الٰہی نوع انسانی کا تفرقہ واختلاف ختم کرنے کے لیے تھا نہ کہ تفرقہ و نزاع کی علت بننے کے لیے۔ اس سے بڑھ کر جہالت وگمراہی کیا ہے کہ تفرقہ ختم کرنے کے لیے آنے والی چیز کو تفرقہ کی بنیاد بنالیا گیا ہے۔

(د) قرآن پاک نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے اور ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور سب کو ایک ہی طرح عطا کیا گیا ہے۔ البتہ شرح ومنہاج میں اختلاف ہوا، یہ اختلاف ہر قوم وعہد کے جداگانہ تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضروری تھا۔ لہٰذا شرح ومنہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہوسکتا۔ تم نے دین کی اصل سچائی کو فراموش کر کے محض شرح ومنہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلانا شروع کر دیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

(ہ) قرآن پاک نے تعلیم دی کہ تمھاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر ورسوم کو انسانی نجات وسعادت میں عمل دخل نہیں ہے۔ یہ گروہ بندیاں تمھاری خودساختہ ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا دین حقیقی ایک ہی ہے۔ یعنی ایمان اور عمل صالح کا قانون۔

(و) اس نے بداہتاً اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ تمام مذاہب حق ہیں۔ لیکن ان مذاہب کے پیروان اس حق سے پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے دین کی اصل صورت مسخ کر دی ہے۔ اگر وہ اپنی بھولی ہوئی سچائی کو از سرِ نو منتخب کر لیں تو میرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے قبول کیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ ''الدین'' اور ''الاسلام'' کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

(ز) وہ کہتا ہے کہ دینِ الٰہی ایک انسان کو دوسرے سے نفرت سکھانے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو انسانوں کو آپس میں محبت کا درس دیتا ہے اور یہ کہ سب ایک ہی اللہ سے رشتہ عبودیت باندھ لیں اور ایک ہو جائیں کیونکہ سب کا پروردگار ایک ہے۔ جب سب کا پروردگار ایک ہے اور سبھی کا مقصود اس کی اطاعت وبندگی ہے تو پھر اللہ اور مذہب کے نام پر یہ جنگ وجدل کیوں؟

قرآن تو بتاتا ہے کہ خدا پرستی کا ناطہ ہی ایک ایسا ناطہ ہے جس کی بدولت انسانیت کا اُجڑا ہوا گھرانہ پھر بس سکتا ہے۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ایک ہے اور ہم سب اسی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں یک جہتی اور یگانگت کے ایسے جذبے کو جنم دے دیتا ہے جس کے سبب انسان کے بنائے ہوئے تمام تفرقے کسی صورت بھی اس پر غلبہ نہیں پا سکتے۔[۲۷]

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال قرآن پاک کو وہ آئین اور ضابطہ حیات جانتے ہیں جو ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر رہنمائی کی ضمانت دیتا ہے۔ درحقیقت فرد اور جماعت کے وجود اور پائیداری واستحکام کے لیے کسی بنیادی قانون و ضابطہ کا ہونا لازم ہے جو ان کی فکر اور اعمال و افعال کی درست خطوط پر رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے لیے یہ ضابطہ و قانون قرآنِ پاک ہے جو اس کی تعلیمات سے مستفید ہونے کا ارادہ کر لیں۔ بقول ڈاکٹر طاہر فاروقی:

> جتنے اصول، قوانین، ضابطے اور آئین انسان اپنی عقل وفہم سے بناتا ہے یا بنائے گا، ان کا حشر ہم روز دیکھتے ہیں کہ وہ قطع و برید کے محتاج اور ترمیم و تردید کے مستحق ہوتے ہیں۔ وحی الٰہی ہی وہ چیز ہے جو ایسا اٹل اور کبھی تبدیل نہ ہو سکنے والا اور ہر دور میں صادق آنے والا قانون و ضابطہ اور آئین عطا کرے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر ملک، ہر دور ہر زمانہ، ہر قوم میں اس کی زندگی کے تمام گوشوں اور سارے شعبوں میں رہنمائی کا ضامن ہو۔ قرآن حکیم ایسا ہی ضابطہ حیات اور آئین زندگی ہے۔ جو ابدالآباد تک جاری و نافذ رہے گا۔[۲۸]

علامہ اقبال نے رموزِ بے خودی میں ایک مستقل عنوان "درمعنیٔ ایں کہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملّتِ محمدّیہ قرآن است" قائم کیا ہے۔ پھر اس سے کچھ آگے دوسرا عنوان "درمعنیٔ ایں کہ پختگی سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئین الٰہیہ است" ہے۔ ان دونوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال قرآن پاک کو بحیثیت آئین الٰہی اور ضابطہ حیات کتنا اہم درجہ دیتے ہیں۔

علامہ اقبال نے قرآن پاک کا مطالعہ بہت غور وفکر اور تدبّر سے کیا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کے وہ واقعات بیان کیے ہیں جن کا تذکرہ موقع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کے مطابق سفر کابل سے واپسی کے دوران علامہ اقبال اور وہ روحانیت پر

گفتگو کر رہے تھے۔ ارباب دل کا ذکر جاری تھا کہ علامہ نے بڑے تاثر کے ساتھ اپنی حیات کے دو واقعات بیان کیے جو اُن کی زندگی کے تمام کارناموں کی اصل بنیاد تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اُٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ آپ کے والد مرحوم اوراد و وظائف سے فرصت پانے کے بعد آتے اور دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو فرمایا کہ فرصت ملنے پر ایک بات بتائیں گے۔ علامہ نے بات بتانے پر اصرار کیا تو کہنے لگے کہ امتحان سے فرصت کے بعد دریافت کریں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر گھر واپس آ گئے تو حسب دستور تلاوت میں مشغول تھے کہ اُن کے والد نے قریب آ کر فرمایا:

بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اُتر رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق یہ فقرہ اُن کے قلب میں اُتر گیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ وہ اُس کی پڑھائی کی محنت کا معاوضہ چاہتے ہیں۔ پوچھنے پر کہنے لگے کہ پھر کسی وقت بتائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ:

میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے تمام عمر جو پیغام دیا وہ انھی دو متنوں کی شرح تھی۔[۲۹]

علامہ اقبال کو قرآن پاک سے بے حد شغف تھا۔ یہ شغف اور جذب دروں ان کے کلام سے جا بجا ظاہر ہے۔ وہ ابتدائی عمر ہی سے بلند آواز میں قرآن پاک پڑھتے ہوئے بے حد متاثر دکھائی دیتے تھے۔ تلاوتِ کلام پاک کرتے ہوئے غور و فکر کرنا اور گریہ زاری کرنا ان کا شیوہ تھا۔[۳۰] مطالب پر نظر رکھتے۔ نماز کے دوران بھی آیات قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رونا شروع کر دیتے۔[۳۱] وہ قرآن حکیم کی تعلیمات میں شرکت باطنی و معنوی سے لبریز تھے۔[۳۲] اصلاً فلسفہ اور اس کے بعد قرآن پاک کے طالب علم تھے۔[۳۳] ان کے نزدیک اسلام کی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن پاک ہے۔ یہی سبب ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پیغام میں قرآن پاک کی تلاوت اور اس سے نورِ ہدایت حاصل کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ نیاز الدین خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیے تا کہ قلب محمدیؐ نسبت پیدا کرے۔ اس نسبت محمدیہ کی تولید کے لیے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معنی بھی آتے ہوں۔ خلوص و محبت کے ساتھ محض قرات کافی ہے۔[۳۴]

اقبال کے نزدیک قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو مکمل مجموعہ ہدایت ہے اور ہر حال میں ہماری رہنما۔ اس کتاب سے بڑھ کر کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔[۳۵]

مذکورہ بالا بحث کے بعد جب اس نقطہ نظر سے کلام اقبال کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ علامہ نے اپنے سارے کلام میں جگہ جگہ اسی علمی سرمائے (قرآن وحدیث) کا ذکر کیا ہے۔ وہ قرآن وحدیث کے علاوہ کسی بھی شے کو علم نہیں بلکہ جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ عقل کی کوتاہ دستی کو نمایاں کرتے ہیں اور دل کی روشنی میں قرآن وحدیث سے حاصل کردہ علم پر فخر کرتے ہیں[۳۶] اور اسی علم کی تبلیغ کو منتہائے مقصود جانتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب انسان کے دل ودماغ میں انقلاب لا کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کا باعث بنتی ہے۔[۳۷] اسی لیے انھوں نے اسی کتاب اور حدیث کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے لیے ایک مکمل پروگرام ترتیب دیا تاکہ مسلمانوں کا سفینہ طوفان سے بحفاظت سلامتی کے ساتھ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔[۳۸]

علامہ اقبال کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ قرآن پاک ہی دورِ جدید کے استقرائی طریقہ تحقیق کا رہنما ہے۔ اُن کے مشاہدے نے اُن پر یہ حقیقت عیاں کی ہے کہ اہل مغرب کو ترقی وعروج علوم قرآنی سے فیض کی بدولت نصیب ہوا۔ وہ قرآن میں فکر کرنے اور اس سے علم، حرکت، طاقت وقوت، تسخیر کائنات، تخلیق، ایجاد واختراع اور انسانیت کے فروغ وارتقا کو ہی مقصودِ خدا اور مقصودِ ہدایتِ مصطفیٰ ﷺ جانتے ہیں۔ وہ اُمتِ مسلمہ کو کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب دیکھنے کے متمنی ہیں[۳۹] وہ تو ان لوگوں سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے جن کے عقائد واعمال کا سرچشمہ قرآن پاک تھا نیز وہ ان کی محبت میں گزارے ہوئے لمحات کو دنیا کی عزت ووقار پر برتری دیتے تھے۔[۴۰] دیکھیے:

قلبِ مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبلُ الورید ملّت است[۴۱]

ترجمہ: حضور ﷺ پر نازل شدہ کتاب قلبِ مومن کے لیے قوت ہے اور آپ ﷺ کے حکیمانہ اقوال ملت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں:

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است[۴۲]

ترجمہ: مسلمان وحدت آئین ہی سے زندہ ہے اور وہ آئین قرآن ہے۔ملّت کا پیکر قرآن ہی سے زندہ ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک ابھی قرآن کے معنی میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازؔی ، نہ صاحبِ کشاف [۴۳]

ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال خود قرآن کے معنی میں غوطہ زن ہوئے۔ لگا تار اس کا مطالعہ کرتے رہے اور اس کی بدولت ، درست اور عمیق حقائق و نتائج تک پہنچے۔[۴۴] ان کو نورِ معرفت، اعلیٰ بصیرت اور شاعری میں بے مثال عظمت قرآن کی بدولت ملی۔[۴۵]

بقول ملک حسن اختر:

انھوں نے مشرقی اور مغربی فلسفوں کے علاوہ قرآن حکیم سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔[۴۶]

اس مقام پر ذہن میں دو سوال اُبھرتے ہیں:

(۱) علامہ اقبال کو عربی زبان پر کس قدر عبور تھا؟

(۲) قرآن پاک کے مطالب تک اُن کی رسائی بالواسطہ تھی یا بلا واسطہ

پہلے سوال کا جواب اُن کے خطوط میں وضاحت سے موجود ہے۔ مہاراجہ سر کشن بہادر شاد وزیر اعظم ریاست حیدرآباد دکن کے نام ایک خط میں عربی کے امتحان میں اوّل آنے کا ذکر کرتے ہیں۔[۴۷] پھر پروفیسر شجاع منعمی کے نام ایک خط میں اپنے عربی دان ہونے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔[۴۸] نیز اُن کے فارسی اور اردو کلام میں قرآنی آیات کے مختلف صورتوں میں موجود اثرات، اُن کے مکتوبات اور مطبوعہ بیانات و مضامین میں موجود مباحث بھی اُن کی عربی زبان پر غیر معمولی دسترس کی روشن دلیل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ شواہد بھی ملتے ہیں کہ علاوہ ازیں اقبال عربی زبان میں شایع ہونے والے مذہبی اور ادبی جرائد کا مطالعہ کرتے تھے۔[۴۹]

دوسرے سوال کا جواب داخلی اور خارجی شہادتیں ہیں کہ علامہ اقبال نے قرآن پاک کے مطالب تک بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں صورتوں میں رسائی حاصل کی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء تک ایک عام مسلمان مذہبی گھرانے کے فرد کی طرح علامہ اقبال کا قرآن پاک سے تعلق تلاوت تک محدود رہا۔ اس دور کے کلام میں وہ کہیں بھی قرآن کے مطالب کو پیش کرنے کی کوشش کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ۱۹۰۵ء تک کے اشعار میں لفظ قرآن بھی صرف ایک مرتبہ ہی ملتا ہے:

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے![50]

لیکن جب اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان پہنچے تو انھیں اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کرنے کے لیے مسلمان ایرانی مفکرین اور شعرا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہوئے قرآن کے افکار و تعلیمات سے واقفیت کی بہت ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے کہ مسلمان مفکرین اور شعرا کرام نے قرآن پاک کے مطالب اور تلمیحات کو اپنی کتابوں میں کثرت سے پیش کیا تھا۔ ضرورت کی دوسری صورت ممکن ہے تدریسی ہو۔ سر آرنلڈ کی جگہ تدریس عربی کے دوران اُنھیں عربی زبان اور قرآن کے مطالب سے غیر معمولی واقفیت حاصل کرنا پڑی ہو۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا ایک خط بہت اہم ہے۔ یہ خط اسی دور سے تعلق رکھتا ہے جس دور میں اقبال قرآن کے افکار سے آگاہی کی کوشش میں منہمک تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے نام ۱۹۰۵ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

اب ایک تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں۔ ان کا پتہ دیجیے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھیے ۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔ قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجیے اور بعد التماس دعا عرض کیجیے کہ میرے لیے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔ اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدۃ الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے۔ تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور اُن کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔ کیا حضرت علی مرتضٰی کو کوئی خاص تعلیم دی گئی تھی؟ غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔[51]

اس خط کو سامنے رکھیں تو یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے قرآن پاک کو اپنے افکار کا ماخذ چُنا اور مذہبی عالم حضرات اور فارسی تصانیف کے وسیلے سے قرآن پاک کے مفہوم سے آگاہ ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ مذہبی علماء میں سے خواجہ حسن نظامی اور سید سلیمان ندوی زیادہ اہم ہیں اور فارسی تصانیف میں سے فلسفہ اور اخلاق کی فارسی کتب بالعموم اور رومی، سعدی، حافظ، سنائی، عطار اور محمود شبستری کی شاعری کی کتب خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

اس سلسلے میں علامہ کے مجموعی کلام کے جائزہ کے بعد جو نتائج نکلتے ہیں۔ ان میں سے پہلا

تو یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کے کچھ افکار اور تلمیحات کو مذکورہ بالا شعرا کے کلام سے بھی اخذ کیا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اُن کے فارسی کلام کے مقابلہ میں اردو کلام میں قرآن سے ماخوذ تلمیحات اور افکار زیادہ نہیں ہیں۔ تیسرا یہ ہے کہ انھوں نے بمرورِ ایّام وسائل کو ترک کر دیا۔ بلا واسطہ خود قرآن پاک سے تصورات ڈھونڈنے لگے اور جدید سیاسی اور معاشی مسائل کا حل قرآن پاک کے افکار میں تلاش کرنے لگے۔ یہ رجحان ۱۹۱۴ء سے بہت ہی نمایاں ہو گیا۔ اس سال انھوں نے اسرار خودی میں واضح طور پر قرآن پاک کے بیان کردہ نظام حیات کو اپنانے کی تلقین کی۔ اسی دور میں انھوں نے قرآنی تلمیحات کو اتنا زیادہ استعمال کیا کہ اپنے نظام فکر کا حصہ بنا ڈالا۔ قرآن پاک سے یہ لگاؤ آخری عمر میں اتنا شدید ہو گیا کہ بقول سید افتخار حسین شاہ:

وہ عاشق قرآن بن گئے۔[۵۲]

اس عشق ہی کا نتیجہ تھا کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں قرآن پاک پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے سر راس مسعود کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ وہ قرآن حکیم پر موجودہ دور کے زیر غور افکار کی روشنی میں نوٹ تیار کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ایسا محسوس کرتے تھے کہ اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔[۵۳]

یہ خط ۲۶؍اپریل ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا ہے۔ بعد ازاں ۳۰؍مئی ۱۹۳۵ء کو دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن پاک سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔[۵۴]

اقبال نے اعلیٰ حضرت نواب بھوپال سے اس کتاب کو لکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن افسوس کہ اس تصنیف کا کام آگے نہ بڑھ سکا اور وہ اس خواہش کو دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔[۵۵]

چوتھا یہ کہ اُن کے کلام میں فارسی شاعری کے مقابلہ میں عربی کے اثرات اتنے پرزور نہیں ہیں۔ بعض لوگ اسی بات کو بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ علامہ عربی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے جو کہ درست نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اقبال نے فلسفۂ ایران کا مطالعہ کرتے ہوئے رومی کی قیادت میں اسلامی فکر یا قرآن تک رسائی حاصل کی۔ پھر اس منزل پر پہنچ کر وہ قرآن

کے ہو گئے۔ نہ صرف خود اس مقدس کتاب کی غوطہ زنی کی بلکہ اس کے اصولوں کے نفاذ کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ اور وہ لوگ جو قرآنی روایات کے خلاف مگن تھے اُن کو بھی اس کتاب میں غوطہ زن ہونے کا سبق دیا۔[۵۶] اس کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے اسی سے تلمیحات کو شاعری کا حصہ بنایا جو ایک وسیع ذخیرہ کی شکل میں موجود ہے۔ اور یہی خصوصیت اقبال کو دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔[۵۷]

یہ امر واضح ہے کہ تلمیح اپنے ساتھ خیالات و جذبات اور تصورات کا ایک معین سلسلہ بھی وابستہ رکھے ہوتی ہے۔ شاعر کے کسی مناسب موقع پر اس کے استعمال سے قاری کے ذہن میں خیالات و جذبات اور تصورات کا ایک وسیع سلسلہ بیدار ہو جاتا ہے۔ گویا تلمیح شاعر اور اس کے قاری کے درمیان ذہنی قربت جنم دینے کا ایک بہت ہی پُر اثر وسیلہ ہے۔ تلمیح شاعر کی ذاتی یا انفرادی اختراع کا نتیجہ قرار نہیں پاتی بلکہ یہ قوم کے ثقافتی ورثے اور اس لحاظ سے شاعر اور قاری دونوں کے اجتماعی شعور کا حصہ ہوتی ہے اور دونوں مشترک طور پر اس سے وابستہ جذبات و خیالات اور تصورات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی شاعر کے ہاں تلمیحات کا استعمال یہ ثبوت مہیا کرتا ہے کہ اپنی قوم کی مذہبی، تاریخی، فکری اور دوسری روایات سے اس کا رشتہ مستحکم ہے۔ وہ شاعر جو تلمیحات سے شغف رکھتا ہے۔ یقیناً ماضی پر نگاہ دوڑائے گا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ماضی پر نظر رکھنے والے شاعر کے ہاں تلمیحات بکثرت ملیں گی۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں عام و متداول شاعرانہ تلمیحات کے ساتھ ساتھ قرآن کی تلمیحات کو بھی بہت زیادہ برتا ہے۔ یہ تلمیحات اُن کے فلسفیانہ مقاصد سے بہت گہرا رشتہ رکھتی ہیں اور مختلف الجہت ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کئی معنی بھی رکھتی ہیں۔[۵۸]

علامہ اقبال کو ماضی پرست کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی نظر ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جو زمانے کی قید سے آزاد ہے۔ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد:

> اس کا دل و دماغ جہاں اپنی قوم کے ماضی کی داستانوں سے معمور ہے، وہاں اس کے ناساز گار حال پر رنجور بھی ہے اور نئی صبح کے لیے تابناک بھی۔[۵۹]

علامہ اقبال کی شاعری کی وسعتوں کو حد میں لائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماضی اُن کی شاعری میں ایک بنیادی رجحان کا درجہ رکھتا ہے۔ خود علامہ کا اپنا کہنا ہے:

ع میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو۔[۶۰]

علامہ کی ذہنی تربیت اور شاعرانہ شخصیت کی نشو ونما میں تاریخ اسلام، اسلام کے خیالات و افکار اور تصورات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسلام کے تابناک ماضی سے اُن کی دل بستگی کی گونج تمام کاوشوں میں سُنائی دیتی ہے۔ چنانچہ جب وہ عہدِ حاضر کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہیں یا نئی تہذیب کی شیشہ گری کے سحر کو توڑتے ہیں تو اس کی بنیاد یہی دل بستگی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی تلمیحات، مسلمانوں کی مذہبی تاریخی اور فکری روایات سے اخذ کردہ ہیں۔[۶۱] ان میں سے زیادہ تر قرآن واحادیث سے ماخوذ ہیں۔ اس لحاظ سے جائزہ لیں تو اقبال نے بزبانِ شعر قرآن کی تفسیر کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ وہ قرآن پر علیحدہ کتاب تو نہ لکھ سکے لیکن اپنے کلام میں قرآنی آیات اور افرادِ مصدقہ کی تلمیحات لا کر اپنے کلام کو بھی زندہ جاوید بنا لیا اور قوم کی بیداری کے لیے قرآنی شخصیات و آیات کی تلمیحات سے وہ کام لیا جو بعض مفسرین بڑی بڑی ضخیم تفاسیر لکھ کر بھی شاید نہ کر پائے۔

بقول ابوالاعلیٰ مودودی:

وہ جو کچھ سوچتا تھا۔ قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اُس کی نظر میں شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا۔ اقبال بلاشک وشبہ گذشتہ چار سو برسوں کے تمام مفسرین کا لیڈر نظر آتا ہے۔[۶۲]

علامہ اقبال اپنے کلام میں دلکش انداز میں انبیاء کرامؑ کی سیرت وشخصیت اور کارناموں کا لطیف تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں اور واقعہ کے تمام اجزا قاری کے سامنے اس طرح سے لاتے جاتے ہیں کہ وہ تازگی کے ایک نئے احساس سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر توقیر احمد:

ذبحِ عظیم، شق از انگشت او، ید بیضا، ضربِ کلیم، ضربِ خلیل، آتش نمرود، اولادِ ابراہیمؑ، کشتیِ مسکین جانِ پاک، دیوارِ یتیم وغیرہ ایسے ہی تاریخی اور واقعاتی پیکر ہیں جن سے شعر پڑھنے کے بعد واقعہ کے تمام اجزا قاری کے سامنے آ جاتے ہیں اور تازگی کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے۔[۶۳]

علامہ اقبال کا داؤدؑ، خلیل اور کلیمؑ ہم معنی الفاظ اور منتظر شخصیت کے کرشمہ ہائے حیات کے اسما ہیں۔ وہ مختلف النوع کرشمے جو کسی ایک شخصیت میں بیک وقت اپنے جمال وجلال اور ہیبت ناک جبیں کے ساتھ دکھائی دیں تو اُسے ''محمد ﷺ'' کا نام دے دیا جائے۔ علامہ نے اس داؤدؑ، اس ابراہیمؑ، اس موسیٰؑ یا اس محمد ﷺ کے بے تابانہ انتظار کا اظہار اپنے کلام میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار کیا

ہے اور اس کے اظہار کے لیے ایک اندازِ بیاں نہیں منتخب کیا بلکہ سینکڑوں انداز اپنائے ہیں۔[۶۴]

افعال عباد کے خالق نے انسان کو آزاد خود مختار پیدا کر کے بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اُس کی رہنمائی کے لیے اور اُس تک حق کی پیغام رسانی کے لیے انبیاء کرامؑ کو معبوث فرمایا۔ گویا انبیاء کرامؑ کا سب سے بڑا فعل خلقِ خدا تک خالق کی پیغام رسانی، اُن کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور اپنے فکرِ خلاق کی بے مثال صفات سے لوگوں کو ایک متوازن و متعال حیات کا نمونہ عطا کرنا قرار پایا۔ انھوں نے یہ فریضہ شاندار طریقے سے سر انجام دیا۔ اس لحاظ سے انسانی تہذیب و تمدن پر اس مقدس طبقے کے بے شمار احسانات ہیں۔ اگر انبیاء کرامؑ نہ ہوتے تو انسانیت کا سفینہ اپنے تمام علم و فلسفہ سمیت طوفان کی نذر ہو جاتا اور روئے زمین پر انسانوں کی بجائے جانور اور وحشی درندے نظر آتے۔ آج معاشرے میں بلند انسانی اقدار، لطیف و نازک احساسات، بہترین و اعلیٰ اخلاقی تعلیمات، درست نفع بخش علوم اور باطل سے ٹکر لینے کا جو عزم ہے اس کی تاریخ کا سلسلہ وحیِ آسمانی اور انبیائے کرامؑ کی تعلیمات پر ختم ہوتا ہے۔ انبیاء کرامؑ کی پھیلائی ہوئی روشنی ہی میں انسانیت آگے قدم بڑھا رہی ہے اور اپنے قافلے کو درست راستے پر گامزن کر کے منزل مقصود تک پہنچانے کی سعی میں مصروف ہے۔[۶۵]

انسانیت کی اصلاح کا یہ فریضہ دیگر تمام انبیاء کرامؑ نے محدود پیمانے پر سر انجام دیا لیکن حضرت محمد ﷺ نے افعالِ ثلاثہ عالمی پیمانے پر سر انجام دیے۔[۶۶] ایک اندازے کے مطابق حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلینؑ تشریف لائے مگر قرآن پاک میں صرف کچھ انبیاء و مرسلینؑ کے اسمائے مبارک کا ذکر ملتا ہے۔ بعض کا کسی قدر مجمل اور بعض کا مفصل حال بھی بیان ہوا ہے۔

حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد ﷺ کے اسما و سیرت اور کارناموں کا اجمالی یا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ تفاسیر اور اسرائیلی روایات و قصص کو چھوڑ کر، قرآن مجید اور معتبر احادیث نبوی ﷺ میں جس قدر انبیاء کرامؑ کی پاکیزہ زندگیوں اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے وہ لائق تحسین و قابل رشک اور قابل تقلید ہے۔ حضرت آدمؑ کی توبہ و رجوع، حضرت نوحؑ کی انتھک تبلیغ توحید، حضرت ابراہیمؑ کی بے مثال قربانی، بت شکنی، آتش نشینی

اور کعبۃ اللہ کی تعمیر، حضرت اسماعیلؑ کی تسلیم و رضا اور صبر و استقامت، حضرت یعقوبؑ کا تحمل و بردباری، حضرت یوسفؑ کا عفوو درگزر اور قابلیت و صلاحیت (کنویں سے لے کر مصر کے تخت تک) حضرت سلیمانؑ کی غیر معمولی سلطنت میں بھی عاجزی اور خاکساری، حضرت موسیٰؑ کا بھیڑیں چرانا اور حق کے لیے جنگ و جدل سے بھرپور حیات اور رسول پاک ﷺ کی ہر لحاظ سے قابل تقلید و قابل نمونہ حیات میں آج بھی حق پرستوں کے لیے سامانِ عبرت و ہدایت پایا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلم مصنفین اور شعرا کی کاوشات میں انبیاء کرامؑ کا تذکرہ اور اُن کی حیات کی تلمیحات کا وجود ایک بدیہی فعل رہا ہے مگر نکات آفرینی، نتیجہ گیری کا انحصار اپنی کوشش و صلاحیت پر ہے۔ علامہ اقبال ایک اسلامی و دینی ذہن رکھنے والے مفکر اور شاعر تو تھے ہی مگر ان کا زاویۂ نظر اور نتیجہ گیری کا انداز منفرد و یکتا ہے۔ انبیاء کرامؑ کی تلمیحات میں بھی انھوں نے انوکھے اور دلفریب نکات تخلیق کیے ہیں۔ ان کے بیانات میں قصہّ گوئی کا شائبہ معمولی درجے کا ہے، زیادہ مواد مستند ہے اور اسلوب مبتکر۔ ہاں البتہ کہیں کہیں انبیاء کرامؑ کے اسمائے مبارکہ کو ایک ''مثالی مردِ مومن'' کے بیان کی خاطر مرادف کے طور پر بھی لیا ہے۔[٦٧] مثلاً:

مردِ حق از آسماں افتد چو برق
ہیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق
او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ
او محمدؐ، او کتاب، او جبرئیل![٦٨]

ترجمہ: مردحق آسمان سے بجلی کی طرح گرتا ہے اور مغرب و مشرق کے شہر و صحرا کو ایندھن کی طرح جلا دیتا ہے۔
وہی کلیمؑ ہے، وہی مسیحؑ ہے، وہی خلیلؑ ہے، وہی محمد وہی کتاب ہے، وہی جبرئیلؑ ہے۔

حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے کا واقعہ بھی کلام اقبال میں منفرد انداز میں جلوہ گر ہے۔ آدمؑ کے جنت سے نکلنے کی دوسرے شعرا، مفکرین اور مفسرین نے جو بھی توجیہات کی ہوں، علامہ اسے بلندی، ترقی اور شعور کی بیداری قرار دیتے ہیں:[٦٩]

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذرا ے پردگیاں پردہ درے پیدا شد[۶]

ترجمہ: عشق نے نعرہ بلند کیا کہ ایک خونیں جگر پیدا ہو گیا ہے۔ حسن شرما گیا کہ صاحب نظر آ پہنچا۔
فطرت چیں بجبیں ہوئی کہ (اس) جہانِ مجبور کی خاک سے ایسی با اختیار ہستی وجود میں آئی جو اپنے آپ کا شعور رکھتی ہے۔ جو اپنے آپ کو توڑ کر نئے سرے سے بنا سکتی ہے۔
آسمان سے شبستان ازل تک یہ خبر پہنچی کہ پردوں میں رہنے والو ہوشیار ہو جاؤ! پردے چاک کر دینے والا آ موجود ہوا۔

بانگِ درا میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قِصّۂ پیمانِ اوّلیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے[۱]

علامہ اقبال حضرت نوحؑ کی تبلیغ اور قہارانہ دُعا کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ دُنیا کفار سے پاک ہو گئی تھی۔ پھر وہ حضرت نوحؑ کی شدید طوفان میں محفوظ رہنے والی کشتی کے حوالے سے اللہ سے دعا گو ہوتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اُن کا سفینہ بھی گرداب حوادث میں ویسے ہی محفوظ رہے جیسے کہ کشتی نوحؑ محفوظ رہی:

دیکھ اے نوحؑ کی کشتی کو بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینا اپنا
اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا[۲]

حضرت ابراہیمؑ کے منفرد مقام و مرتبہ کا ذکر مختلف پیرائیوں میں ہے۔ علامہ کو حضرت ابراہیمؑ کا توحید کی تعلیم دے کر تمام انسانوں کو ایک قوم بنانے کا پہلو بہت پسند ہے کہ انھوں نے مظاہر پرستی کے عہد میں تمام اشیا کی پرستش سے انکار کیا اور ایک خدا کو معبود بنایا۔ اسی سبب سے بعد میں آنے والے انبیاء و رُسلؑ انھی کے نقش قدم پر چلے۔ علامہ حضرت ابراہیمؑ کے وجود کو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا زبردست نشان گردانتے ہیں:

تارکِ آفل براہیم خلیلؑ
انبیا را نقشِ پائے او دلیل
آں خدائے لم یزل را آیتے
داشت در دل آرزوئے ملّتے [۴۳]

ترجمہ: غروب ہو جانے والوں کو ترک کر دینے والا ابراہیم خلیل اللہ جن کا نقش پا انبیا کے لیے رہنما ہے وہ جو خدائے زوال ناپذیری کی آیت تھے۔ وہ بھی اپنے دل میں ملت کی آرزو رکھتے تھے۔

پھر حضرت ابراہیمؑ کی بے مثال قربانی اور تطہیر و تعمیر کعبہ کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی آگ نشینی اور دعا سے نئے نئے معنی اخذ کرتے ہیں اور اسے عشق کی بے خوفی و بے خطری قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ سب اہم کارنامے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی [۴۴]

حضرت اسماعیلؑ کے آدابِ فرزندی، صبر اور تسلیم و رضا کا ذکر بھی ایک انوکھے انداز میں ملتا ہے۔ علامہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو باپ، بیٹے کے علاوہ معلم اور متعلم کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں اور اسلام کی داستانِ حرم کی ابتدا حضرت اسماعیلؑ کو ٹھہراتے ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کِس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟ [۴۵]

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اِس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ! [۴۶]

حضرت یعقوبؑ کلامِ اقبال میں ''پیر کنعان'' کے نام سے جگہ پاتے ہیں۔ ان کی آہ و نالہ اور گریہ زاری کو علامہ عشق کی معراج کے لیے ضروری جانتے ہیں۔ وہ موجودہ مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ کائنات کی تسخیر کے فریضہ سے عہدہ برآں ہونے کے لیے عشقِ یعقوبؑ کے اسرار سے شناسائی کریں:

عشقِ یعقوب کا تو محرم اسرار تو ہو
پیرہن دے گا دکھا تجھ کو پسر کی صورت [۴۷]

حضرت یوسفؑ کا ''حسن'' مشہور ہے۔ علامہ نے سورۃ یوسف میں بیان کردہ زیادہ

واقعات کو اشعار کا روپ دیا ہے۔ علاوہ ازیں عزیزِ مصر کی بیوی، زلیخا کی محبت کی کہانیاں بھی ہمارے ادب کی روایات کا حصہ ہیں۔ یہ کہانیاں بھی تلمیحات کی شکل میں کلام میں موجود ہیں:

یوسف ما را اگر گرگے برد
بہ کہ مردے ناکسے او را خرد[۷۸]

ترجمہ: ہمارے یوسف کو اگر کوئی بھیڑیا لے جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی ناکس مرد اُسے خرید لے۔

رہ و رسم فرمانروایاں شناسم
خراں بر سرِ بام و یوسف بچاہے[۷۹]

ترجمہ: مَیں فرمانرواؤں کے طور طریقے پہچانتا ہوں، وہ گدھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں اور یوسف کو کنویں میں پھینکتے ہیں۔

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں[۸۰]

حضرت شعیبؑ بحیثیت مرشدِ کامل کلام میں جگہ پاتے ہیں۔ علامہ کا انداز بیاں بڑا دل موہ لینے والا ہے۔ وہ حضرت شعیبؑ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ایک صحیح عارف کی محبت حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں:

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے
اِسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کِلیمی دو قدم ہے[۸۱]

حضرت موسیٰؑ کے کلیمی معجزات شان و شوکت کی علامت ہیں اور قوت و سطوت کے مظہر، جن کی استمداد سے مخالفین دبتے ہیں اور قوانینِ حق جاری ہوتے ہیں۔ عصا سے چشمے جاری کرنا، کائنات کی تسخیر کا فریضہ اور نفس پر ضبط کرنا یہ تمام کامل خودی کی علامتیں بھی ہیں جو مومن کو بے خوف زندگی گزارنے کے آداب بھی سکھاتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ''ارنی'' کا تقاضا ہر مومن کے دل کی تمنا ہے:[۸۲]

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طُور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی[۸۳]

حضرت موسیٰؑ کی سیرت وکردار کلامِ اقبال کا ایک مستقل باب ہے۔اس کا یہی ثبوت کافی ہے کہ انھوں نے اپنے ایک مجموعۂ کلام کا نام ضربِ کلیم رکھ دیا ہے۔اقبال نے اپنے اشعار میں جس کثرت سے حضرت موسیٰؑ کا ذکر کیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی حیات کے واقعات سے آپ کو بہت تعلق تھا۔[۸۴]

حضرت الیاسؑ کا ذکر حضرت خضرؑ کے ساتھ بھی اور علیحدہ بھی ملتا ہے۔علامہ نے آپ کی رہنمایانہ شان نمایاں کی ہے۔[۸۵] علاوہ ازیں آپ کفر ودین کے امتیاز کی علامت کے طور پر بھی جلوہ گر ہیں:

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا[۸۶]

حضرت داوٗد کے دل کو موہ لینے والے شیریں لحن، اور الہامی کتاب زبور سے علامہ اتنے متاثر ہیں کہ اپنے ایک مجموعہ کا نام ہی زبورِ عجم رکھ دیا۔اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے ''نغمہ داوٗدؑ'' کا سوز پانے کے لیے دستِ دعا دراز کیے ہیں۔اگرچہ کہیں کہیں وہ ''نغمۂ داوٗدؑ'' سے گریزاں بھی نظر آتے ہیں۔کیونکہ اُنھیں ایک مردہ اور غلام قوم کو زندہ کرنا تھا جس کے لیے ''نغمۂ داودی'' کافی نہ تھا۔[۸۷]

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داوٗد[۸۸]

ترجمہ: ہند کی خاک میں زندگی (کے گیت) کی آواز بے اثر ہے۔(کیونکہ) نغمۂ داوٗد بھی مردہ کو زندہ نہیں کرسکتا۔

حضرت داوٗدؑ کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کی حکومت، فیصلہ فہمی اور دیگر منسوب واقعات و قصص کی تلمیحات بھی موجود ہیں۔روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ہوا میں پرواز کرنے والا ایک تخت تھا جس پر بیٹھ کر وہ جہاں چاہیں جاسکتے تھے۔وہ جن وبشر اور پرندوں وغیرہ پر بھی حکومت کرتے تھے۔ان واقعات کو بھی اقبال نے اپنے خاص رنگ میں دکھایا ہے۔وہ استعارۃ موجودہ مسلمان کو سلیمان کہہ کر پکارتے ہیں:[۸۹]

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں[۹۰]

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی[۹۱]

حضرت ایوبؑ کے درد اور بدن میں کیڑے پڑنے کا تذکرہ بھی ملتا ہے:

حضرت زکریاؑ کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ کفار نے آپ کو آرے سے دو ٹکڑے کر کے شہید کر دیا۔ اقبال نے اس مشہور واقعہ کو بھی نظم کیا ہے لیکن وہ ان تمام مصائب کو عشق کی آبرو و معراج گردانتے ہیں۔ دیکھیے:

عشق را در خوں تپیدن آبروست
ارّہ و چوب و رسن عیدینِ اوست
زہرہا در بادۂ گلفامِ اوست
ارّہ د کرم و صلیب انعام اوست[۹۲]

ترجمہ: خون میں تڑپنے ہی سے عشق کی آبرو ہے، آرہ اور دار و رسن اُس کی عیدیں ہیں۔
اس کے بادۂ گلفام کے اندر زہر بھرے ہیں، اس کے انعامات آرہ، کٹہرے اور صلیب ہیں

حضرت عیسیٰ کی مسیحائی کا ذکر بھی دل پسند تعبیریں سمیٹے ہوئے ہے کہ مغرب اگر اُن کی تعلیمات کی پیروی کر لے تو اُن کے مفاسدِ اخلاقی میں کمی آ جائے:

عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است[۹۳]

ترجمہ: تعجب اس پر نہیں کہ تو اعجاز مسیحا رکھتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تیرے (علاج سے) مریض کا مرض اور بڑھ گیا۔

علامہ اقبال نے حضرت محمد ﷺ کی براہ راست مدح کی ہے اور اُن کے جلیل مقاصد کو جدید حیات کے حوالے سے بھی پیش کیا ہے جس کے ذریعے حیات کو نیا روپ ملا ہے۔ اقبال کے تمام بنیادی تصورات و فکر میں بنیادی حوالہ رسول پاک ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا حوالہ ہے۔ یہ رسول پاک ﷺ کا بنیادی حوالہ ہوتے ہوئے جدید دور سے بھی تعلق رکھتا ہے وہ مجازی و حقیقی عشق کی تخصیص نہیں کرتے۔ اس کے بغیر ہی ان کے ہاں قلب مصطفیٰ بن جاتا ہے:

عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام[۹۴]

درحقیقت اقبال کی شاعری روح محمد ﷺ کے اظہار اور اعلان کی شاعری ہے۔ اسی کی بدولت

اقبال کے کلام میں تخلیقی قوت نے جنم لیا ہے اور اسی سے ان کے اشعار میں شاعرانہ سحر انگیزی پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کی شاعری کا بنیادی حوالہ اسلام اور قرآن ہے جو رسول پاک ﷺ پر اُترا:[95]

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا[96]

اُن کے نزدیک عشق رسول کا درست مفہوم اطاعتِ رسول ﷺ ہے۔ اگر عشقِ رسول ﷺ اطاعت رسول ﷺ سے عاری ہے تو وہ عشق کہلانے کا مستحق نہیں ہے اس لیے وہ مسلمانوں کو اطاعت و پیروی مصطفیٰ ﷺ کی شدت سے تلقین کرتے ہیں کہ اُن کی اطاعت و پیروی کی تمام انبیاء و رُسل کی اطاعت و پیروی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے زورِ قلم کی توانائیاں سلسلہ نبوت کی تعلیمات کو عام کرنے میں صرف کیں۔ مسلمانوں نے اس کا گہرا اثر لیا اسلام کی روح پھر سے اُن کے بدن میں جذب ہوگئی۔ اس طرح سے وہ غیر محسوس طریقے سے قرآن حکیم کے بالکل قریب لا کھڑے کر دیے گئے۔ خصوصاً برصغیر کے مسلمان پھر سے متحد و منظّم ہوگئے جس کے نتیجے میں وہ پاکستان کی تشکیل و تکمیل اور حصول میں کامیاب ہوئے اور یہی اقبال کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ہے۔

مآخذ و مصادر

۱- پرویز، اقبال اور قرآن، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، بار دوم ۱۹۷۵ء، ص:۳۴

۲- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون فلسفہ اقبال کے مآخذ و مصادر، مشمولہ اقبالیات (اقبال ریویو) ج:۲۸، شمارہ:۴، مارچ ۱۹۹۸ء، ص:۳۹۳

۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغانِ حجاز فارسی کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۴۳/۶۸۵

۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغانِ حجاز اردو کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص:۵۲/۹۳۴

۵- پرویز، اقبال اور قرآن، ص:۳۵

۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغانِ حجاز فارسی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۹۴۸/۶۶

۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل اردو کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۶۲/۷۰

۸- سید مظفر حسین برنی (مرتب) کلیات مکاتیبِ اقبال، جلد اول، اردو اکادمی دہلی، طبع پنجم ۱۹۹۹ء، ص:۳۳۴

۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۲۶/۱۲۶

۱۰- حوالہ مذکورہ بالا، ص:۱۶۸/۱۶۸

۱۱- حوالہ مذکورہ بالا

۱۲- حوالہ مذکورہ بالا

۱۳- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون فلسفۂ اقبال کے مآخذ و مصادر، مشمولہ اقبالیات (اقبال ریویو)، ص:۴۰۲

۱۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص:۱۶۸/۱۶۸

۱۵- غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء، ص:۶

۱۶- تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، مضمون اقبال اور قرآنی تلمیحات، مشمولہ اقبال اور قرآن، (مرتب) ڈاکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۰

۱۷- ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی، نقوشِ اقبال، مجلس نشریات اسلام، کراچی، بارششم، ۱۹۷۸ء، ص:۶۰-۶۷

۱۸- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون فلسفۂ اقبال کے مآخذ و مصادر، ص:۴۰۱

۱۹- نیازی، سید نذیر، مضمون اقبال اور قرآن مشمولہ حکمتِ قرآن، ج:۷، شمارہ:۱۱ نومبر ۱۹۸۸ء، ص:۴۴

۲۰- نذیر نیازی، سید، (مترجم) تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، بارسوم، ۱۹۸۶ء، ص:۳۵

۲۱- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روحِ اقبال، ادارہ اشاعت اردو وحیدرآباد دکن، باردوم، ۱۹۴۴ء، ص:۹

۲۲- اکبرآبادی، مولانا سعید احمد، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، باردوم، ۱۹۸۷ء، ص:۱۹

۲۳- امرتسری، علامہ عرشی، تصدق حسین راجا، ڈاکٹر (مرتب) اقبال پیامبرِ اُمید، فیروزسنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۵۱

۲۴- پرویز، اقبال اور قرآن، ص:۳۶، ۳۷

۲۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۸۲/۲۱۲

۲۶- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون فلسفۂ اقبال کے مآخذ و مصادر، مشمولہ اقبالیات (اقبال ریویو)، ص:۴۲۰

۲۷- آزاد، مولانا ابوالکلام، ام الکتاب، بساطِ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص: ۲۸۳-۲۹۸

۲۸- فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، اقبال اور محبت رسول، اقبال اکادمی، لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۹۳

۲۹- ندوی، مولانا سید سلیمان، مضمون اقبال کے پیغام کا متن اور شرح، (مشمولہ) جوہر اقبال، (اقبال نمبر) ۱۹۳۸ء، ص: ۱۹، ۲۰، ۲۱۔ نیز دیکھیے: ندوی، مولانا سید سلیمان، سیر افغانستان، نفیس اکیڈیمی، حیدرآباد، دکن، ۱۹۴۵ء، ص: ۱۷۹

۳۰- فاروقی، پروفیسر محمد طاہر، سیرتِ اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص: ۹۹، ۱۰۰

۳۱- نظامی، محمود، (مرتب) ملفوظاتِ اقبال، اشاعت منزل، لاہور، باردوم، س-ن، ص: ۱۲۱، ۱۲۲

۳۲- فاروقی، عباداللہ، کلام اقبال میں تلمیحات قرآنی، مشمولہ، سہ ماہی اقبال، جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۲، مجلّہ بزم اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۲ء، جنوری ۱۹۷۳ء، ص: ۵۰

۳۳- ندوی، مولانا سید ابوالحسن، نقوشِ اقبال، مجلس نشریات اسلام، کراچی، بار ششم، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۹۳

۳۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مکاتیبِ اقبال بنام نیاز الدین خاں، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص: ۶۰

۳۵- نیازی، سید نذیر، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بارسوم، ۲۰۰۰ء، ص: ۵۷

۳۶- عمر، احمد خالد، مضمون اقبال اور مقام رسالت ﷺ، مشمولہ انتخاب مقالات معارف ۱۹۹۰ء، ص: ۱۷۰

۳۷- احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب، انگریزی عہد میں، ج: ۵، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰۳

۳۸- چشتی پروفیسر، یوسف سلیم، شرح بانگ درا، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س-ن، ص: ۲۴۹، ۲۵۰

۳۹- بارہووی، کرنل سید نواب عالم، بصیرت اقبال، آرمی ایجوکیشن پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۶۸

۴۰- شاہد، تنویر قیصر، قرآن سے اقبال کی عقیدت، (مشمولہ) حکمتِ قرآن، ج: ۸، شمارہ نمبر: ۱، جنوری ۱۹۸۹ء، ص: ۶۰

۴۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۱/۱۰۱

۴۲- حوالہ مذکورہ بالا، ص: ۱۲۵/۱۲۵

۴۳- حوالہ مذکورہ بالا، بال جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۷۸/۳۷۰

۴۴- ندوی، مولانا سید ابوالحسن، نقوشِ اقبال، ص: ۲۹۴

۴۵- شاہد، تنویر قیصر، قرآن سے اقبال کی عقیدت، مشمولہ حکمتِ قرآن، ص: ۶۳

۴۶- اختر، ملک حسن، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۴۶

۴۷- برنی، سید مظفر حسین، (مرتب)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال اردو، ج: اوّل، اردو اکادمی دہلی، بار پنجم، ۱۹۹۹، ص: ۵۹۰

۴۸- برنی، سید مظفر حسین، (مرتب)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال اردو، ج: اوّل، ص: ۲۹۳، ۲۹۴

۴۹- شاہ، سید افتخار حسین، اقبال اور پیروی شبلی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۸۸

۵۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۷۳/۴۳

۵۱- برنی، مظفر حسین برنی، (مرتب)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد اوّل، ص: ۱۰۷، ۱۰۸

۵۲- شاہ، سید افتخار حسین، اقبال اور پیروی شبلی، ص: ۹۰، ۹۲

۵۳- اقبال، عطا اللہ شیخ (مرتب)، اقبالنامہ حصہ اوّل، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص: ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۱، ۳۶۲

۵۴- حوالہ مذکورہ بالا، ص: ۱۹۹

۵۵- شاہ، سید افتخار حسین، اقبال اور پیروی شبلی، ص: ۹۰، ۹۲

۵۶- تعمیر انسانیت، ماہنامہ، اداریہ یومِ اقبال اور قرآن حکیم، ماہنامہ تعمیر انسانیت، اپریل، ۱۹۸۸ء، ص: ۶

۵۷- احمد، ڈاکٹر آفتاب، مضمون، اقبال کی تلمیحات، مشمولہ فکر اقبال کے منور گوشے، سلیم اختر (مرتب)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن، ص: ۲۲۱

۵۸- تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، مضمون اقبال کی تلمیحات، ص: ۱۱۹، ۱۲۴

۵۹- احمد، ڈاکٹر آفتاب، مضمون اقبال کی تلمیحات، ص: ۲۲۳

۶۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۱۱۳/۴۰۵

۶۱- احمد، ڈاکٹر آفتاب، مضمون، اقبال کی تلمیحات، ص: ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳

۶۲- شاہد، تنویر قیصر، مضمون، قرآن سے اقبال کی عقیدت، ص: ۶۲

۶۳- احمد، ڈاکٹر توقیر، اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی، انجمن ترقی، اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۰۰، ۱۰۱

۶۴- حسین، چوھدری محمد، زبور عجم، (مشمولہ) ماہنامہ ادبی دُنیا، لاہور، بابت ماہ اپریل، ۱۹۷۰ء، بحوالہ ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ امم اور اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۵۱

۶۵- ندوی، مولانا ابوالحسن علی، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن، ص: ۵۱

۶۶- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیر امم اور اقبال، ص: ۲۵۱

۶۷- حوالہ مذکورہ بالا،ص:۲۵۲

۶۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۲۰۷/۷۹۵

۶۹- نذیر نیازی،سید،(مترجم)تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ۱۲۹،۱۳۰،۱۳۱

۷۰- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۸۵/۲۵۵

۷۱- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگ درا، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۸۱/۸۱

۷۲-عبدالغفار شکیل،(مرتب)،نوادرِ اقبال،سرسید بک ڈپو،علی گڑھ،۱۳۷۷ھ،ص:۱۰۲

۷۳- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،اسرار و رموز،کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۱۰۰/۱۰۰

۷۴- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگ درا ، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۲۷۸/۲۷۸

۷۵- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل ، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۱۴/۳۰۶

۷۶- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل ، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۶۳/۳۵۵

۷۷- سید عبدالواحد معینی، (مرتب)،ترجمہ واضافہ،محمد عبداللہ قریشی،باقیاتِ اقبال،آئینہ ادب ، لاہور بار سوم،۱۹۷۸ء،ص:۴۱۴

۷۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۸/۸۰۴

۷۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،زبور عجم، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۷۴/۴۶۶

۸۰- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگ درا، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۶۴/۶۴

۸۱- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل ، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۸۸/۳۸۰

۸۲- ریاض،ڈاکٹر محمد،تقدیر امم اور اقبال،ص:۲۷۱

۸۳- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگ درا، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۱۰۲/۱۰۲

۸۴- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین،مضمون تلمیحاتِ اقبال،مشمولہ منشوراتِ اقبال، بزم اقبال،کلب روڈ، لاہور،۱۹۸۸ء،ص:۸۴

۸۵- ریاض،ڈاکٹر علامہ محمد،تقدیر امم اور اقبال،ص:۲۵۷

۸۶- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل ، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۱۴۴/۴۳۶

۸۷- ریاض،ڈاکٹر محمد، تقدیر امم اور اقبال،ص:۲۵۵،۲۵۶

۸۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۴۴/۳۱۴

۸۹- احمد، پروفیسر نذیر،تشبیہاتِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور،۱۹۷۷ء،ص:۲۹۱

۹۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۲۱/۲۲۱

۹۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۵۱۳/۵۱

۹۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۳۷/۴۹، ۶۳۸/۵۰

۹۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبور عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۵۸/۱۸۸

۹۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۸۶/۹۴

۹۵- جالبی، ڈاکٹر جمیل، مضمون، مدحت رسول، (مرتب) خاور جمیل، ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۴۸-۱۵۰

۹۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص:۳۱۷/۲۵

☆☆☆☆

ا: اقبال کا شعورِ ولایت، شعورِ نبوت اور شعورِ ختم نبوت

حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے اپنی فکریات کی شاہکار کتاب تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے پانچویں خطبے کا آغاز مشہور صوفی عبدالقدوس گنگوہی کے قول ''محمد مصطفیٰ ﷺ در قاب قوسین اوادنیٰ رفت و باز گردید، واللہ ما باز نہ گردیم'' سے کیا ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ عبدالقدوس گنگوہی کے یہ الفاظ ایسے ہیں جن کی مثال تصوف کے سارے ذخیرۂ ادب میں مشکل سے ملے گی۔ اُن کا خیال ہے کہ ان الفاظ سے شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت کا نفسیاتی فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یہ فرق کیا ہے؟ اقبال نے اس کی وضاحت جس طرح کی ہے اس سے پہلے یہ دیکھ لینا بہتر ہوگا کہ نبوت کیا ہے؟ اور ولایت کیا ہے؟

نبوت اُس شخص کی لغت میں جو اس کو ہمزہ سے ادا کرتا ہے ''نَبَا'' سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب خبر یا خبرِ مفید ہے۔ کبھی اس پر ''ء'' نہیں دیتے بلکہ اسے ''واوٗ'' سے بدل دیتے ہیں۔ اس وقت اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیبی باتوں پر اطلاع دی اور بتا دیا بلاشبہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اس اعتبار سے نبی مَنَبَّا کے معنی میں ہوگا، یعنی ''وہ جسے خبر دی گئی''۔

اور جو شخص ''نَبَا'' کو ہمزہ سے ادا نہیں کرتا۔ اس کے مطابق نبی ''نبوۃ'' سے نکلا ہے جس کا مطلب ''زمین کے اونچے حصہ'' کا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مولا کے نزدیک نبی و رسول کا درجہ بلند ہوا۔[1]

نبوت و رسالت چونکہ ہم معنی ہیں۔ اس لیے نبوت کا مفہوم جان لینے کے بعد رسالت کے مفہوم سے بھی آگاہ ہونا ضروری ہے۔ ''رسالت''، ''رَسَالَۃٌ'' سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ''پیغام'' کے ہیں۔ پیغام پہنچانے والے کو رسول کہتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس لفظ کو اُس پیغام

پہنچانے والے کے لیے استعمال کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دین و دنیا کے مصالح کے بارے میں پیغامات اس کی مخلوق تک پہنچائے۔[۲] بعض کے مطابق اس کے معنی میں تتابع پایا جاتا ہے۔ تتابع کا مطلب ہے پے در پے کسی فعل کو سرانجام دینا۔ گویا رسول پر بار بار تبلیغ کرنا لازم ہوتا ہے اور اُمت پر بار بار رسول کی پیروی لازم۔

نبی اور رسول ہم معنی ہیں یا مختلف، اس میں اختلاف ہے۔ بعض دونوں کی اصل ''اِنبَا'' قرار دے کر اس کا مطلب خبر دینا پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور دلیل کے لیے قرآنی آیت وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ[۳] بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبی اور رسول ایک ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے لیے ارسال ثابت ہے۔ بعضوں کے نزدیک نبوت کے اعلیٰ درجات کا حامل ہونے کی وجہ سے تو دونوں ایک ہیں لیکن انداز و تبلیغ کے لحاظ سے دونوں میں تفاوت ہے۔ اس لیے کہ دو ناموں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ ہی اس پر دال ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر دونوں ایک ہوتے تو دونوں کا ذکر ایک بلیغ کلام میں الگ الگ نہ کیا جاتا۔[۴]

بعض کے نزدیک رسول وہ ہے جو نئی شریعت لائے اور جو نئی شریعت نہ لائے وہ نبی ہے۔ اس لیے رسول کا درجہ نبی سے بڑا ہوتا ہے۔ اس فرق سے قطع نظر دونوں کا کام انسانیت کی اصلاح و رہنمائی کے فریضہ سے عہدہ برآں ہونا ہے اور دونوں کی رہنمائی کا منبع و ماخذ وحی الٰہی ہے جس کی اہمیت یکساں ہے۔ آیئے دیکھیں ولایت کیا ہے؟

از روئے لغت ولایت کا مطلب حکومت، امارت، سلطنت، حاکم کا زیرِ نگیں علاقہ، رشتہ داری، قربت، محافظ، تصرف اور ربوبیت ہے۔ ولایت اصل میں عداوت کی ضد ہے اور عداوت غصے اور دوری کو کہا جاتا ہے۔ ولایت زیر اور زبر دونوں سے مستعمل ہے۔ ولایت امارت کا مفہوم دیتی ہے اور[۵] اس سے مراد وہ کمالات بھی لیے جاتے ہیں جن کے وسیلے سے اللہ کے ولی پر ظاہری کشف و کرامات ظاہر ہوتے ہیں۔[۶] جبکہ ولایت بمعنی تصرف بھی ہے[۷] علاوہ ازیں اس سے مراد وہ چیز بھی لی جاتی ہے جس کے ذریعے شیخ کامل کی توجہ سے سالک و مرید کے باطن میں تبدیلی آتی ہے اور وہ قرب کی منازل میں ترقی پاتا ہے۔ یہ نعمت تزکیۂ نفس سے ملتی ہے۔ نیز اس کے حصول میں عبادت اور مجاہدہ کے علاوہ شیخ کامل کی باطنی توجہ بھی مدد کرتی ہے[۸] ولایت کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔ ولایت عام ایمان کو کہتے ہیں۔ جس شخص نے اسلام قبول کیا اور ایمان لے آیا وہ اولیاء اللہ سے ہوا۔ اس میں تمام مومنین شامل ہیں۔[۹] ولایت خاص سے مراد یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ سے بغیر کسی امید و بیم کے دل کا تعلق اس قدر مضبوط ہو کہ کسی حال میں بھی اُس کی یاد سے غافل نہ ہو۔ اصطلاح صوفیہ میں یہ نسبت اور مشاہدہ کہلاتا ہے۔[۱۰] یہ ولایت اربابِ سلوک میں سے واصلین کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مطلب ہے بندے کا حق کے لیے فنا ہو جانا اور اُس کی ذات کا مشاہدہ کرنا، اسی بنیاد پر وہ فانی و باقی کہلاتا ہے، فنائے مطلق کے بعد وہ زندگی کے حادثات کے لوث سے نجات پا لیتا ہے اور اوصافِ الٰہیہ سے متصف ہو کر اخلاق ربانی میں آگے بڑھتا ہے۔ اتباع رسول ﷺ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اُس کا صلہ اسے یہ ملتا ہے کہ وہ مرتبہ وصول پر فائز ہو جاتا ہے اور اُسے دعوتِ خلق کا اذن حاصل ہو جاتا ہے۔[۱۱] یہ ولایت عموماً دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہبی جو بغیر مجاہدے کے حاصل ہو جاتی ہے اور دوسری کسبی جو مجاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔

ولایت کے ان تمام کمالات کے بالفعل حصول کے لیے ہر ولی کو جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ منشائے ولایت کے مطابق مجاہدہ، ریاضت، اعمالِ مقبول، الہام اور مشاہدہ کی قابلیت از حد ضروری ہے۔[۱۲] لہٰذا ولی منشائے ولایت کے مطابق جدوجہد کرتے ہوئے معاشرے سے کٹ جاتا ہے اور خلوت پسند کرتا ہے۔ کیونکہ ولی کی ولایت کا تعلق صرف اور صرف اس کی ذات سے ہوتا ہے۔ اُسے معاشرے سے کوئی نسبت اور واسطہ نہیں ہوتا۔ حاملِ ولایت (ولی یا صوفی) جب انتہائی لذت اور قرب حاصل کر لیتا ہے تو اس لذت و سرود میں گم ہو کر سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔[۱۳] حاملِ ولایت (ولی) کئی اوصاف کا مالک ہوتا ہے۔ یہ اپنے حال سے فانی اور مشاہدۂ حق کے ساتھ باقی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا اپنے حال کے بارے میں کچھ بھی بتانا ناممکن ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی شے میں آرام و سکون نہیں ملتا۔

ولی کے لیے چونکہ حال ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ مستقبل کچھ بھی نہیں۔ اس لیے وہ بے خوف ہوتا ہے اور ہر لمحہ اپنے احوال میں درستی و تبدیلی کے لیے کوشاں۔ یہاں تک کہ اُس کے باطن پر اُس کی حقیقت از خود آشکار ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ پوشیدہ رہنا چاہتا ہے۔ مشہوری سے گریز کرتا ہے۔ اُسے شہرت میں فتنہ نظر آتا ہے۔ وہ جھوٹ سے گریز کرتا ہے اور اوامر و نواہی پر صبر کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ سے دوستی رکھتا ہے۔[۱۴] وہ گناہوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نگاہ اپنی بڑائی پر نہیں جاتی۔ وہ اپنے اچھے اعمال کو بھی کوئی وقعت نہیں دیتا۔ تمام صوفیہ و اولیاء کی ہمت کا تقاضا صرف اور صرف ایک ہی ذات ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ ان کو

معاشرے اور اُس کی اصلاح سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

انبیاءؑ و مرسلین اگرچہ نبوت و رسالت سے پہلے نبی و رسول نہیں ہوتے مگر ولی اور صدیق ہر حال میں ہوتے ہیں۔ ان کی ولایت مکمل و حتمی ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے ولی اور صدیق کو ان کی ولایت سے اتنا سا تعلق بھی نہیں جتنا قطرہ کو دریا کے ساتھ یا ذرے کو سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔[۱۵] خاص طور پر اللہ کا ارشاد: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ[۱۶] ''بیشک ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے اس کی نیک راہ عطا کر دی اور ہم اس سے خبردار تھے''۔ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ[۱۷] ''اور اگر تو مجھ سے ان کا مکر نہ پھیرے گا تو میں ان کی طرف مائل ہوں گا'' اور حق تعالیٰ شانہٗ کا حضرت یحییٰ کے بارے میں فرمان وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّاۙ وَّ حَنَانًا[۱۸] ''اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی اور اپنی طرف سے مہربانی''۔ اسی پر دال ہیں کہ انبیاء کرامؑ نبوت سے پہلے ہی بلند درجے کے ولی اور صدیق ہوتے ہیں[۱۹] اور مقام نبوت پر فائز ہو جانے کے بعد ان کے مرتبہ تک کوئی غیر نبی چاہے وہ کتنا بڑا ولی اور صدیق کیوں نہ ہو، کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔

یہ بات واضح ہے کہ نبوت ملنے سے قبل تمام انبیاء کرامؑ کا گزر بھی مختلف احوال و واردات سے ہوتا رہا۔ اصطلاح میں ان احوال و واردات کو روحانی ہی کہا جائے گا تاکہ بیان میں سہولت رہے۔ یہی اصطلاح ہے جو انبیاء کرامؑ و صوفیہ کے احوال و واردات میں تھوڑی بہت مشابہت کا باعث ہے بلکہ غلط فہمی کا باعث ہے۔ حالانکہ انبیاء کرامؑ کے ہاں وہ اعمال و افکار، مشقتیں اور ریاضتیں نہیں ہیں جن کا تعلق صوفیہ کی روحانی تربیت اور اکتساب کے مدارج سے ہے۔ نبوت تو ایک وہبی شے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اس پاک، اعلیٰ اور برتر منصب کے لیے منتخب کر لے۔ اس کی استعداد کیا ہونی چاہیے یہ عام انسانوں کو معلوم نہیں اللہ تعالیٰ ہی اسے بہتر جانتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ[۲۰]

ترجمہ: اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے۔

اَللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَاءُ[۲۱]

ترجمہ: اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں جسے چاہے۔

انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمانا ایک واقعی امر ہے اور اس بعثت کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ[۲۲]

ترجمہ: لوگ ایک دین پر تھے پھر اللہ نے انبیاءؑ بھیجے۔ خوشخبری دینے اور ڈر سنانے والے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اُتاری کہ وہ لوگوں میں اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دیں۔

بہرحال نبوت کے منصب پر سرفراز کرنے کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر کیسے؟ اس کے بارے میں قرآن پاک میں جابجا اشارے ملتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے سورج کے طلوع و غروب کا بغور مشاہدہ کیا۔ ''آفلین'' کے مقابلے میں ''غیر آفل'' کا سوچا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ملکوت السموٰت والارض دکھائے اور منصب نبوت پر فائز کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو طرح طرح کی آزمائشوں کے بعد منصب نبوت سے نوازا گیا۔ حضرت یحییٰؑ کو بچپن ہی میں یہ منصب عطا ہوا۔ حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں داخل کر کے آزمائش کی گئی۔ رسول پاک ﷺ کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝[۲۳]

ترجمہ: انھیں نہایت قوت والے نے سکھایا۔

رسول پاک ﷺ اور دیگر انبیاء کرامؑ کو جو تعلیم دی گئی اس کے متحمل وہی ہو سکتے تھے۔

مذکورہ بالا بیان پر غور کریں اور صوفیانہ واردات و حالات پر (جس کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آ رہا ہے) تو پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرامؑ کا گزر جن احوال و واردات سے ہوتا ہے۔ ان میں اور صوفیہ کے احوال و واردات میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ نبوت وہبی ہے اور ولایت کسبی۔ دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں۔ نبوت کا منصب اپنے سامنے ایک مقصد رکھتا ہے جس کے لیے انبیاء کرامؑ کی تربیت ہوتی ہے جبکہ ولایت سرتاسر نجی ہوتی ہے اور صاحب ولایت کے حالات اور ذہنی استعداد سے مخصوص۔ لہٰذا یہ حتمی اور آخری نہیں ہو سکتی۔ نبوت و ولایت صوری مماثلت کے باوجود نوعاً و اصلاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اصلاً جداگانہ۔ اسی کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ میں عبدالقدوس گنگوہی کے قول کے حوالے سے کی ہے۔[۲۴]

اقبال فرماتے ہیں کہ نبی اور صوفی دونوں واردات اتحاد کے روحانی تجربے سے گزرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل کرتے ہیں لیکن صوفی جب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اس لذت و سرود میں گم ہو کر سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ واپس لوٹنا نہیں چاہتا۔ نبی بھی اللہ

تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل کرتا ہے۔ اُسے بھی لذت و سرور حاصل ہوتا ہے لیکن وہ زمانے کی تخلیقی قلمرو میں داخل ہونے کے لیے لوٹ آتا ہے۔[۲۵] اب اس لمحہ کو جس میں صوفی کا اتصال اللہ کی ذات سے ہوا 'اتحادِ ذات' سے تعبیر کریں اور اس سے انقطاع کو 'باز آمد' سے تو یہاں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ صوفی کا یہ تجربہ کسی بھی نوع کی جسمانی یا نفسیاتی بیماری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایسا ہی حقیقی ہے جیسے کہ معمول کے دوسرے تجربات اور مشاہدات ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ انھیں صوفیہ کے احوال و واردات کی سچائی کا اعتراف ہے۔ ان تجربات و مشاہدات میں حقیقت کے ادراک کے متعلق کوئی فرق نہیں۔ اُن کے نزدیک یہ بھی شعور کا ویسا ہی تار و پود ہیں جیسے طبعی مرتبے میں محسوسات و مدرکات اس کا منبع و مآخذ ہیں۔ لہٰذا یہ علم کا قابلِ اعتماد اور یقینی ذریعہ ہیں۔[۲۶] اس علم سے مرتب ہونے والی شعور کی دُنیا کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہمیں علم کے تقاضوں اور زندگی کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے مرتب شدہ نتائج کے نقد و عمل کا مطالعہ جاری رکھنا چاہیے تا کہ غلط راہ پر لے جانے والے نتائج کی قبولیت سے بچاؤ ممکن ہو۔[۲۷]

علم شعور کی منظّم شکل کا دوسرا نام ہے۔ اس کا وظیفہ زندگی میں آسانی پیدا کرنا ہے نہ کہ زندگی کے کاروبار کی مشکلات میں الجھانا۔ ہمیں خیال رکھنا چاہیے کہ علم کی ہر شکل کے ردّ و قبول میں محتاط رہیں اور پاکیزگی و تہذیب کے عمل کو جاری رکھیں۔

اب جہاں تک صوفی کے شعور ولایت کا تعلق ہے اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح شعورِ ولایت کی نسبت سے شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ یہ تو پتہ چل چکا کہ شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت دونوں کا سرچشمہ روحانی و باطنی احوال و واردات ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق ان دونوں کا تعلق غور و فکر کی دُنیا سے ہو گا نہ کہ مدرکاتِ حواس سے جو عام طور پر ہمارے تجربات و مشاہدات کا سرچشمہ ہیں۔ ان تجربات و مشاہدات کا ابلاغ ناممکن ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر نجی ہیں اور ان کی کیفیت بھی بیان میں نہیں آ سکتی۔[۲۸] وہ اپنے اس حال کی نسبت کو ظاہر نہیں کرتے۔ ایسا کرنے سے وہ سمجھتے ہیں گویا اُنھوں نے غیر کو محبوب کے بھید سے آگاہ کر دیا۔ دوسروں کو اپنی اس وارداتِ اتحاد سے آگاہ کرنا اُن کے لیے محال ہوتا ہے۔[۲۹]

صوفیہ کی اس وارداتِ اتحاد سے شعور کی جو دنیا تشکیل پاتی ہے اس کا مقابلہ فلسفی یا سائنسدان کے شعور سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا مقابلہ صرف شعورِ نبوت ہی سے ممکن ہے۔ کیونکہ دونوں میں ایک صوری مماثلت موجود ہے اور وہ یہ کہ دونوں کا سرچشمہ روحانی تجربات و

مشاہدات ہیں۔[۳۰] لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دونوں کے روحانی تجربات و واردات کی نوعیت اصلاً فرق ہے۔ دونوں طبعی واردات کی دنیا میں واپس آ جاتے ہیں[۳۱] ولی یا صوفی کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اسے کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے[۳۲] جبکہ نبی کی بازگشت سے نوعِ انسانی کے لیے بڑے دور رس نتیجے تشکیل پاتے ہیں[۳۳]
علامہ اقبال نبوت کی ہیت ترکیبی کو دو اجزا پر مشتمل قرار دیتے ہیں۔ سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

نبوت کے دو اجزا ہیں: (۱) خاص حالات و واردات جن کے اعتبار سے نبوت، روحانیت کا ایک مقام خاص تصور کی جاتی ہے (مقام تصوف میں ایک اصطلاح ہے)۔ (۲) ایک Socio-Political institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔ اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے......
دونوں اجزا موجود ہوں تو نبوت ہے صرف پہلا جزو موجود ہو تو تصوف۔ اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے اس کا نام ولایت ہے۔[۳۴]

علامہ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ نبوت کے دو جز ہیں غلطی ہے۔ قرآن پاک سے نہ تو اس کی کوئی سند ملتی ہے اور نہ ہی نفسیات کی رو سے اس کا کوئی جواز ہے۔

سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

ولایت اور نبوت گو بظاہر روحانیت کے مقام ہیں لیکن با اعتبار نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ میری رائے میں تو نبوت اور ولایت کے بارے میں یہ طریق گفتگو ہی سرے سے غلط ہے۔[۳۵]

علامہ اقبال نے خطبات میں ذکر کیا ہے کہ ولایت اور نبوت میں صفات میں کوئی فرق نہیں تو اس لحاظ سے کہ دونوں میں حواس کے ادراک کا عمل دخل نہیں ہے۔ وگرنہ شعورِ نوعیت کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اللہ سے تعلق اور لوگوں سے تعلق کا بالکل غلط تصور ہے۔ کیونکہ نفسیات کی رو سے بھی یہ دونوں ایک ہی تعلق کے رُخ ہیں۔[۳۶]

سچ تو یہ ہے کہ انبیاءؑ کی واردات اتحاد اور صوفیہ کی وارداتِ اتحاد مکمل طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ صوفی کی وارداتِ اتحاد سے تشکیل پانے والے نتیجہ کا تعلق صرف اور صرف اُس کی ذات تک ہوتا ہے۔ اُسے بنی نوع انسان سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جبکہ نبی وارداتِ اتحاد کے بعد لوٹ کر لوگوں کو حق کی دعوت دینے اور اُن کی اصلاح پر مامور ہو جاتا ہے۔ وہ مکلّف

ہے جبکہ صوفی اللہ کی طرف سے اس کا مکلّف نہیں۔ وہ اگر اپنی ذات ہی کی تہذیب کر لیتا ہے تو یہ اس کے لیے مقام بلند ہے۔ جبکہ دعوت و اصلاح کا فریضہ سرانجام دینا نبی کا منصب برتر۔ گویا صوفی کی بازآمد صرف اور صرف اُس کی ذات تک تخلیقی حیثیت رکھتی ہے، تمام بنی نوع انسان کے لیے نہیں۔ اس کی ذات میں وہ قوتیں بھی جنم نہیں لیتیں جو ایک نبی کی ذات میں پیدا ہو جاتی ہیں اور جن کے ذریعہ وہ نئی دُنیا کی تخلیق اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اس بازآمد سے صوفی کے دل و دماغ پر جو نقوش اثرات چھوڑتے ہیں، وہ موضوعی ہوتے ہیں۔ اُن کا تانا بانا معاشرے کے حالات، اقدار اور تعلیم و تربیت کے اسالیب و نہج سے تشکیل پاتا ہے اور اُن میں کچھ معروضیت ہوتی ہے لیکن اس سے حاصل شدہ تعبیر کو شریعت نبوی کے مطابق جانچنے پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ نبوت کے تمام حقائق معروضی ہوتے ہیں جنھیں کسی پیمانے پر جانچنے پرکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔[۳۷] نبوت محض فضل اور خالص وہب ہے۔ اس میں اکتساب کا کوئی عمل دخل نہیں جبکہ ولایت میں کسب کو دخل ہے۔ نبوت کا خاصہ صحو خالص ہے جبکہ ولایت کا خاصہ سُکر ہے۔ نبوت کے تمام معارف حقائق نفس الامر کے ادراکات ہیں جبکہ ولایت کے معارف باطنی کیفیات کے ادراکات ہیں۔ نبوت کے تمام معارف تبلیغ کے لیے ہیں جیسا کہ قرآنی آیات سے ثابت ہے جبکہ ولایت کے معارف ''حال'' ہیں۔ اس وجہ سے یہ اظہار و ابلاغ سے ماورا ہیں۔ صاحبِ نبوت یعنی نبی کی توجہ اللہ کے حکم سے لوگوں کے حال کی اصلاح پر مرکوز ہے اور صوفی کی توجہ الوہیت اور اُس کی صفات پر مرکوز ہے۔ کیونکہ اُس پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت نازل نہیں ہوتی۔[۳۸]

علاوہ ازیں انبیاءؑ کے ہاں:

۱- سیر و سلوک، سفر و حضر اور احوال مقامات کی اصطلاحیں نہیں ہیں جبکہ صوفیہ کے ہاں ہیں۔

۲- باطن اور ظاہر کا امتیاز، علم و عرفان کی دوئی، فوق الادراک اور غیر فوق الادراک حقائق کا فرق بھی نہیں ہے۔

۳- شریعت اور طریقت کی گفتگو، صحو و سکر، اور قبض و بسط کی حالتیں بھی نہیں ہیں۔

۴- انبیاء کرامؑ کے ہاں شطحیات اور اسرار و رموز بھی نہیں ہیں جو بات بھی ہے واضح، قطعی اور حتمی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ صوفی کے لیے تو احوال و واردات اتحادِ ذات کی ایک ساعت ہیں لیکن انبیاء کرامؑ کے لیے ایک فیصلہ کن لمحہ اور ایک ایسی بنیادی تبدیلی ہیں جس میں اُن پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ زندگی کا ایک حیاتی عمل بھی ہے جس میں انھیں بغیر اکتساب اور دانش

کے یقین و ایمان کی وہ دولت ملتی ہے جس سے انسانی زندگی میں یک لخت تبدیلی آتی ہے۔ انبیاء کرامؑ ایک پیغام، ایک دعوت اور ہدایت لے کر لوٹتے ہیں۔ انھیں منصب اور حکم میسر آتا ہے جسے وہ بنی نوع انسان تک پہنچاتے ہیں اور زندگی جس راہ کی آرزومند ہوتی ہے اسے اُسی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔[۳۹] اسی افادی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے ہی تو علامہ اقبال نبی کی بازگشت کو تخلیقی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ واپس آ کر نئی دنیا کی تخلیق کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اس فریضہ سے عہدہ برآں ہونے کے لیے وہ عالمِ تاریخ کی قوتوں پر صرف غلبہ ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ اُسے مصرف میں لا کر لوگوں کی زندگیوں میں شعوری انقلاب لانے کی سعی کرتا ہے۔ اس صورت میں دیکھا جائے تو اس کی نوعیت مکمل تخلیقی ہوتی ہے اور اس سے ایک نیا جہانِ اخلاق جنم لیتا ہے۔[۴۰]

علامہ اقبال پانچویں خطبہ ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں رقم طراز ہیں:

انبیاء کے لیے اس کا مطلب ہے ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری جو دُنیا کو زیروزبر کرسکتی ہیں اور جن سے کام لیا جائے تو جہانِ انسانی دگرگوں ہو جاتا ہے۔[۴۱]

اقبال کے نزدیک اس منصب سے نبی کی دو شانیں ولایت اور نبوت نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں ولایت و نبوت کی ان شانوں کا ذکر بڑے دل پذیر انداز میں کرتے ہیں:

جلوۂ حق چشمِ من تنہا نخواست
حسن را بے انجمن دیدن خطا است
چیست خلوت؟ درد و سوز و آرزو ست
انجمن دید است و خلوت جستجو است
عشق در خلوت کلیم اللّٰہی است
چوں بجلوت می خرامد شاہی است!
خلوت و جلوت کمالِ سوز و ساز
ہر دو حالات و مقاماتِ نیاز
چیست آں؟ بگذشتن دیر و کنشت
چیست ایں؟ تنہا نہ رفتن در بہشت!
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا ست
خلوت آغاز ست و جلوت انتہاست

گفتۂ پیغمبری دردِ سر است
عشق چو کامل شود آدم گراست!
راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است![۴۲]

ترجمہ: میری آنکھ اکیلی جلوہ حق کو نہیں دیکھنا چاہتی۔ حسن کو انجمن کے بغیر دیکھنا غلطی ہے۔
خلوت کیا ہے؟ درد و سوز اور آرزو۔ خلوت (حسن مطلق کی) جستجو ہے اور جلوت (اس کا) دیدار۔
عشق خلوت میں گم ہو تو وہ کلیم اللہ جب وہ جلوت میں آتا ہے تو پادشاہت ہے۔
خلوت و جلوت دونوں سوز و ساز کا کمال ہیں۔ دونوں نیاز کے احوال (کیفیات) و مقامات ہیں۔
خلوت کیا ہے؟ دیر و کشت سے گزر جانا۔ جلوت کیا ہے؟ بہشت میں اکیلے نہ جانا۔
اگرچہ اللہ تعالیٰ خلوت اور جلوت دونوں میں ہے مگر خلوت آغاز ہے اور جلوت انتہا۔
کیا کہا؟ کہ پیغمبری دردِ سر ہے عشق جب کامل ہوتا ہے تو شخصیت ساز بن جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کی راہ میں کاروان کے ساتھ چلنا اور جہان کے اندر جانِ جہان بن کے رہنا کتنا خوش آئند ہے۔

پیغمبر تنہا جلوۂ حق سے لطف اندوز ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق اللہ کی طرف سے عطا کردہ اس نعمت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ اسی جذبہ کی بنیاد پر وہ تبلیغ حق پر تیار ہوتا ہے اور حق کی خاطر تمام دُنیا سے جنگ کرتا ہے ہر طرح کے مصائب سہہ کر اُس جلوہ کو عام کرنے کی سعی کرتا ہے جس سے وہ تنہا لطف اندوز ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جلوہ مادی نہیں بلکہ روحانی چیز ہے لہٰذا تقسیم اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

علامہ کے نزدیک خلوت درد و سوز اور آرزو کا نام ہے یعنی محبوب کو پانے کی جستجو کرنا اور جستجو ہمیشہ خلوت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ محبوب حقیقی کا پانا خیال کی درستی پر منحصر ہے۔ درست خیال (تصورِ جاناں) کے سبب اس میں بے پناہ قوت و طاقت جنم لے لیتی ہے اس لیے خلوت لازم ہے۔

یوسف سلیم چشتی اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے شرح جاوید نامہ میں رقم طراز ہیں:

پیغمبر جب دیدار کی دولت سے بہرہ یاب ہوتا ہے تو وہ خلوت سے باہر نکل آتا ہے اور انجمن آراستہ کرتا ہے یعنی ایک قوم بناتا ہے جو اس کے ساتھ دیدار کی دولت سے متمتع ہوتی ہے۔[۴۳]

علامہ اقبال کے نزدیک جلوت و خلوت دونوں عشق کے کمال کے نام ہیں۔ یعنی جب عشق کمال کے مرتبہ تک رسائی پا لیتا ہے تو اُس میں یہ دونوں شانیں جنم لے لیتی ہیں۔ پیغمبر کبھی خلوت

میں اللہ سے راز و نیاز میں مصروف ہو جاتا ہے تو کبھی جلوت میں اُس کی مخلوق کی راہنمائی کے فرض سے عہدہ برآں ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں پیغمبر کا مقصد حق ہوتا ہے وہ کبھی بھی اس حق سے غفلت نہیں برتتا۔ اُس کی پوری حیات پاک معیت الٰہی کے سائے میں گزرتی ہے۔ پیغمبر کی پیغمبرانہ زندگی کی ابتدا خلوت سے ہوتی ہے اور اس کا انجام جلوت پر ہوتا ہے یعنی جب وہ خلوت میں جستجو کے بعد اللہ کو پالیتا ہے تو پھر باہر نکل کر دُنیا میں بسنے والوں کو اس کا یقین عطا کر دیتا ہے۔

پیغمبر چونکہ اللہ تعالیٰ کا سچا عاشق ہوتا ہے۔ اس لیے عشق کو مرتبۂ کمال تک پہنچا کر وہ انسان کی عقلی و جذباتی زندگی میں ایک انقلاب عظیم جنم دیتا ہے۔ پیغمبری کا لطف بھی اسی میں ہے کہ پیغمبر تنہا نہ چلے بلکہ دوسروں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔[۴۴] نبی کے اسی افادی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے ہی تو علامہ اقبال نبی کی بازگشت کو تخلیقی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ نبی واپس آتا ہے اور مقاصد کی نئی دُنیا کی تخلیق کا فریضہ اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اس فریضہ سے عہدہ برآں ہونے کے لیے وہ علم تاریخ کی قوتوں پر صرف غلبہ ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ اُنھیں مصرف میں لا کر لوگوں کی زندگیوں میں شعوری انقلاب لانے کی سعی کرتا ہے۔

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا بیانات پر غور کریں تو ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ نبی کو نتائجیت پیدا کرنا چاہیے۔ انقلاب لانا چاہیے۔ پرانے جہاں کو مٹا کر ایک نیا جہاں بسانا چاہیے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اگر ایک رسول تمام عمر تبلیغ کے باوجود ایک شخص کو بھی توحید کا قائل نہ کر سکے اور اپنے نظریات سے کوئی مثبت نتائج جنم نہ دے سکے تو نعوذ باللہ یہ اقبال کی نتائجیت کے حوالے سے باطل قرار پائے گا۔

ڈاکٹر وحید عشرت تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا منہاج میں رقم طراز ہیں:

> نتائجیت کا مذہب پر اطلاق بجائے خود ایک مغالطہ ہے جو اقبال نے مذہب کی صداقت کا معیار بنا ڈالا۔[۴۵]

ہمیں بھی اقبال کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبے ''علم اور مذہبی مشاہدات'' میں صوفیانہ مشاہدات کی پانچ اقسام بیان کی ہیں:

۱- صوفیانہ مشاہدات کی حضوریت

۲- صوفیانہ مشاہدات کی ناقابل تجزیہ کلیت

۳- صوفی کا حال ایک لمحہ ہے کسی ایسی فردِ وحید اور یکتا ہستی سے گہرے اتحاد کا جو اس کی ذات سے

ماورا مگر اس کے باوجود اس پر محیط ہو۔

۴۔ صوفیانہ مشاہدات براہ راست تجربے میں آتے ہیں۔ لہٰذا ان مشاہدات کو بالکل ویسے پہچاننا ممکن نہیں ہوتا۔

۵۔ صوفیانہ احوال تادیر قائم نہیں رہتے۔ نبی جب صوفیانہ مشاہدے سے لوٹتا ہے تو اس کے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں جب کہ صوفی کا لوٹنا ذاتی اور نجی ہوتا ہے۔[۴۶]

علامہ اقبال نے ولایت یا صوفیانہ تجربہ کے جو خواص بیان کیے ہیں وہ زوردار نہیں ہیں۔ ان سے تو صوفیانہ تجربہ مبہم، نجی، ذاتی اور ناقابل ابلاغ قرار پاتا ہے۔ علامہ اقبال نے نبی کے مذہبی مشاہدے سے دور رس نتائج کا ذکر کیا ہے وہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ تاریخِ انبیاء کرامؑ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر نبی کا مذہبی اور باطنی تجربہ نتائج کے لحاظ سے دور رس نہیں رہا۔ لہٰذا مذہبی تجربہ ناقابل ابلاغ ٹھہرا۔ اس لحاظ سے تو یہ علم کی کوئی بنیاد بھی فراہم نہیں کرتا اور نہ ہی یہ کسی بڑے اجتماعی اور تہذیبی انقلاب کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ علامہ اقبال کو چاہیے تھا کہ علم کی اساس کسی نبی یا صوفی کے مذہبی تجربے پر رکھنے کی بجائے قرآنِ پاک پر رکھتے کیونکہ صرف وہی حرفِ خدا اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ وہ ایک ایسا فریم ورک فراہم کرتا ہے جو انسان کو ایک اجتماعی نظام حیات سے ہر زمان میں اصول اور اساس میں رہنمائی دیتا ہے۔ مذہبی تجربہ صرف انفرادی عمل ہے اور یہ صرف اپنی ذات اور نفس کے عرفان کی اساس بن سکتا ہے، اس سے کسی تمدن اور کلچر یا اجتماعیت کی تخریج ممکن نہیں ہے۔[۴۷]

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ رسول پاک ﷺ کا ذاتی مذہبی تجربہ نہیں۔ علامہ اقبال مذہبی مشاہدے سے علم کی معروضیت کی وضاحت نہیں کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے علم کی تعلیم خود آدمؑ کو دی، قرآن اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ یہ ہمیں ایک فریم ورک مہیا کرتا ہے جس سے ہم اپنے حالات، دُنیاؤں کی تفہیم اور اس کے وسیلے سے اپنے لیے ہر زمانے کے لیے زندگی کا نظام تیار کر سکتے ہیں۔ مذہبی مشاہدہ ہماری ذات کی وحدت اور روحانی بالیدگی کی بنیاد ہر حال میں ہے مگر علم کی بنیاد اور مکمل نظام حیات کی تشکیل کی اساس صرف قرآن پاک پر رکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہی ہمارے لیے حکم ہے۔ مذہبی مشاہدات کو اگر علم کی بنیاد بنا دیا گیا تو اس سے قرآن پاک کے اوّلیت ہونے پر زد آئے گی۔ ہر انسان یہ کوشش کرے گا کہ وہ اپنے مذہبی مشاہدے کے دوسروں پر حکم بنوائے اور یہ ایک انتہائی خطرناک بات ہے جس سے بچنا لازم ہے۔[۴۸]

انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا منبع تجربہ نہیں وحی ہوتی ہے۔ وحی ایک علم ہے اور رسالت کا سب

سے اہم پہلو ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انبیاء کرامؑ کو اپنے احکام سے آگاہ کرتا ہے اور یہ ہستیاں اس بات کی مکلّف ہوتی ہیں کہ وحی الٰہی کے الفاظ کو من وعن انسانوں تک پہنچائیں۔ وحی اتنی فعال، مؤثر اور انقلاب آفریں طاقت ہے جو انبیاء کرامؑ کے پورے نظام فکر کو بدل کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ نبی وحی سے متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ اسی کے مطابق سوچ سمجھ کر سیرت و زندگی کے بچے تلے قدم اُٹھاتا ہے۔[۴۹] علامہ اقبال غالباً اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے پانچویں خطبہ میں ولایت و نبوت میں فرق کی وضاحت کی اور ختمِ نبوت کی فضیلت و برتری کے ثبوت فراہم کیے۔ نبوت کے ذریعہ علم وحی کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اسے عام زندگی کی طرح خاصۂ حیات قرار دیا۔[۵۰] تمام ذرائع علم میں وحی کے برابر کوئی نہیں۔[۵۱] یہ ایک ایسا ذریعہ علم ہے جس میں زمانی عنصر موجود نہیں ہوتا۔ یہ ایک لمحے یا ''طرفۃ العین'' میں ان حقائق کا انکشاف ہے جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے غالباً ہزار سال کی مدت میں بھی نہیں معلوم کر سکتے۔[۵۲] وحی کے ذریعے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کی پابندی ہر انسان پر لازم ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے بندے نبی و پیغمبر پر انسان کی ہدایت و رہنمائی کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اُتاری جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نبی و پیغمبر کی حیثیت اجتماعی ہوتی ہے اور اس کا وجود ہمارے لیے حجت ہوتا ہے۔ لٰہذا ہمارے لیے عقلی طور پر اس کی تمام مصلحتوں کی تفہیم ضروری نہیں۔[۵۳] کیونکہ انبیاء رُسلؑ ہمیشہ وہی حکم دیتے ہیں جن کا انھیں حکم دیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰىo اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى[۵۴]

ترجمہ: اور وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے مگر وہ جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

چنانچہ وحی کے علم کے بعد انسان کو خود کسی چیز پر حکم نہیں لگانا پڑتا۔ اِسے یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ زندگی گزارنے کے لیے کیا راہ عمل اختیار کرے کہ وہ اس کے لیے مضرت رساں نہ ہوں۔ وہ احکامِ الٰہی اور اس کے اوامر و نواہی کا پابند ہوتا ہے اور خود حلت و حرمت کا تعین کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی عقل کسی عمل یا شے کے متعلق یقین کامل مہیا نہیں کرسکتی۔ وہ ہر شے کو شک کی نظر سے دیکھ کر بالآخر اس کو رد کر دیتی ہے۔ کسی بھی نوع کے نصب العین کے لیے یقین کامل از حد ضروری ہے۔ کیونکہ یقین کامل کے بغیر آرزو، ولولہ، جدوجہد کچھ بھی نہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک شعورِ نبوت کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں زمانے کی تمام وسعتیں اکھٹی ہو کر

ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے پیش آئندہ بات پہلے ہی سے ''شعورِ نبوت'' کے علم میں ہوتی ہے جیسے یہ ظہور پذیر ہو۔ یہی سبب ہے کہ انبیاء کرامؑ ہر اصلیت و حقیقت کو اپنے سامنے کھلا دیکھتے ہیں اور وحی الٰہی میں ان کے یقین کامل کا سبب بھی یہی ہے۔ لہٰذا وہ علم جس کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے اس میں یقین ہی یقین ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس عقل اور فکر کی دُنیا ہے۔ ہم اس میں قدم بہ قدم آگے چلتے ہیں۔ اس میں اثبات کے ساتھ نفی اور یقین کے ساتھ ظن کا پہلو بھی موجود رہتا ہے۔ فلسفہ انسان کی دماغی کاوشوں کا نام ہے لیکن یہ کاوشیں چونکہ انسانی ہیں۔ اس لیے ان میں یقینی رنگ جنم نہیں لے سکتا۔ خصوصاً وہ یقین جو ہمارے نزدیک علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین سے عبارت ہے۔ فکر میں یقین کا رنگ وحی الٰہی کی بدولت ہی پیدا ہوتا ہے اور وہ اسی کی رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔[۵۵] جبکہ عقل کا ''قابلِ رحم'' پجاری خالق عقول سے دریافت کرنے کی بجائے صدیاں اپنے ذہن تھکا تا رہتا ہے۔ تب اُس کے علم میں وہ بات آتی ہے جو اللہ کے نبی کے ذریعے چند لمحات میں جانی جا سکتی ہے۔[۵۶]

مذکورہ بالا وضاحت کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انبیاء کرامؑ کے احوال و واردات اور صوفیہ کے احوال و واردات میں بہت فرق ہے۔ دونوں نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مکمل مختلف ہیں۔ نبوت تو ایک منصب ہے جس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انبیاء کرامؑ کو تیار کیا جاتا ہے۔ انبیاء کرامؑ جب وارداتِ اتحاد کے لمحوں سے واپس لوٹتے ہیں تو زمانے کی رو میں داخل ہو جاتے ہیں اور تمام قوتوں کو تصرف میں لاتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے وہ تاریخ کی صورت گر قوتوں کو استعمال میں لا کر مقاصد کی ایک نئی دُنیا کو جنم دے دیں اور جس روحانی تجربہ و مشاہدہ سے اُن کا گزر ہوا ہے وہ ایک عالمگیر قوت کی شکل اختیار کر لے۔ گویا انبیاء کرامؑ کا لوٹنا ایک طرح سے اُن کے روحانی مشاہدے کا امتحان ہوتا ہے۔ اس تخلیقی عمل میں انبیاء کرامؑ نہ صرف خود کو جانچتے ہیں بلکہ محسوس حقائق کی اس دنیا کو بھی جس میں ان کا دل چاہتا ہے کہ اپنے ارادے کو خارجی طور پر متشکل دیکھ لیں۔ پھر جب وہ اس اثر ناپزیر میں جو اُن کے سامنے ہوتا ہے نفوذ کر جاتے ہیں تو اس سے ان کی اپنی ذات ہی ان پر منکشف نہیں ہوتی بلکہ وہ اُسے چشم تاریخ پر بھی بے نقاب کر دیتے ہیں۔[۵۷] علامہ اقبال مزید لکھتے ہیں:

انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی قدر و قیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زیرِ اثر کس قسم کے انسان پیدا ہوئے۔ علیٰ ہذا یہ کہ تہذیب و تمدن کی وہ کیا دُنیا تھی جس کا ظہور

ان کی دعوت سے ہوا۔[۵۸]

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ انبیاء کرامؑ واپس آتے ہیں ایک فریضہ کی ادائیگی کے لیے تو اس سے جہاں ہماری توجہ عالمِ تاریخِ انبیاء کرامؑ کی ایک نئی عالمگیر قوت کی کارفرمائی کی طرف لوٹتی ہے وہاں انبیاء کرامؑ کی شخصیت ان کے قوائے نفسی، دعوت و عزیمت اور اُن کی اپنی ذات سے باہر محسوس حقائق کی دُنیا میں انقلاب آفرینی کی طرف بھی لوٹتی ہے۔ پھر جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ انبیاء کی دعوت نے کسی قسم کے انسانوں کو پیدا کیا اور تہذیب و ثقافت نے کیا شکل اختیار کی، اس کے لیے تاریخ نبوت سے رجوع کرنا پڑے گا۔

سورۃ الاعراف ایک لحاظ سے انبیاء کرامؑ کی تاریخ ہے۔ اس میں مکمل تو نہیں لیکن مجملاً تاریخ نبوت پر اشارات مہیا کیے گئے ہیں۔ اس تاریخ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آنے والے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے۔ ان کا ذکر ہمیں بعثتِ انبیاء کرامؑ کی سنینی تاریخ مہیا کرتا ہے۔ پھر جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر اس سورۃ میں نہیں اُن کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ تاریخِ نبوت بآسانی سمجھ آ جاتی ہے۔ حضرت نوحؑ کا ظہور آج سے چھ ہزار سال پہلے ہوا۔ انھوں نے بھی توحید کی دعوت دی۔ پھر حضرت ہودؑ آئے۔ اُنھوں نے عاد کو ان کی عسکری طاقت پر تنبیہ کی۔ ان کے جانشین حضرت صالحؑ نے ثمود کو زمین پر فساد کرنے سے روکا۔ حضرت شعیبؑ نے معاشی دست برد پر قوم کی مذمت فرمائی۔

غور کریں یہ کفر کی مذمت، طاقت کے استعمال پر سرزنش، ہوس دولت میں غضب و استحصال پر احتجاج، زمین پر فساد کے مقابلے میں اصلاح کا عزم، انبیاء کرامؑ کا لب و لہجہ، اُن کا خوشخبری دینے اور ڈرانے کا انداز، اُن کی دعوت کی سیاسی، اجتماعی اور انقلابی نوعیت، شر کی قوتوں سے تصادم یہ سب اس امر کا ثبوت ہیں کہ انبیاءؑ نے زمانے کی رو میں داخل ہو کر اُن کا رُخ تبدیل کیا اور عالم انسانی کی اصلاح اور تعمیر کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔ وہ انسانیت کی صورت گری کرنے والے تھے۔ انھوں نے آدم گری کا کام کیا۔ اُن کی حقیقت پسندی کا ایک پہلو انداز ہے دوسرا تبشیر یعنی زندگی کے لیے ہلاکت بھی ہے اور عافیت بھی۔ انداز و تبشیر سے ہمارا ذہن دوسرے مقصد یعنی نزولِ کتاب کی طرف رخ کرتا ہے۔ اس حکم کی طرف جس سے زندگی کا اثبات و حفظ مقصود ہے۔ ثبات دستورِ حیات کے کسی سرچشمہ کا تقاضا کرتا ہے۔ کوئی اصول، کوئی اساسِ فکر و عمل، کوئی نصب العین جس کے حصول کی جدو جہد کے کچھ لوازمات موجود

ہوں گے کچھ شرائط۔ اس کے لیے دعوتِ ابراہیمی پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ حضرت ابراہیمؑ جو امام الناس ہیں۔ ایک عالمگیر سوسائٹی، انسانی اتحاد و ارتباط اور صلح و امن کے داعی و پیامبر۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کا آغاز آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے ہوا۔ آپؑ کی اس مکانی دعوت کا آغاز حرمِ کعبہ سے ہوا۔ کعبہ اس اُمت کا مشہور مرکز ہے۔ یہ اس سیاسی، اجتماعی، روحانی اخلاقی اور ثقافتی نصب العین کی علامت ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے سامنے ہے اور جس کے لیے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کو تیار کرتے رہے۔ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ دعوتِ ابراہیمی نبوت کی تاریخ کا وہ مرحلہ ہے جس میں نوع انسانی کی غایت مقصود نمایاں طور پر سامنے آ گئی۔ اس کے بعد دعوتِ موسوی ہے جو دعوتِ ابراہیمی کا ایک جزوی اور وقتی مظہر بن کر اُبھرتی ہے۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود مگر جسے نسلی برگزیدگی کے زعم نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حقیقی اور اصلی نصب العین سے بدل دیا۔ بایں ہمہ یہود کی تاریخ سیاست اور اجتماع کی تاریخ کہلاتی ہے۔ اقتدار اور اختیار کی تاریخ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں ہی سے نہیں بلکہ تاریخِ عالم کے نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُمتِ محمدیہ ﷺ کو اس حوالے سے بار بار تنبیہہ کی گئی۔ دعوتِ ابراہیمی، دعوتِ اسلامی کی بدولت مکمل ہوئی۔ یہ نبوت کا تیسرا مرحلہ ہے۔ جس سے اس واحد امت کی شیرازہ بندی کی ابتدا ہوئی۔ انداز و تبشیر کا فرق مکمل ہوا اور حکم کا سرچشمہ قرآن پاک آن پہنچا۔ تمام انبیاء کرامؑ کی بعثت کا جو مقصد تھا، اسلام نے اسے مکمل کر دیا۔

نبوت کی تاریخ کے اس اجمالی خاکہ سے چند نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ شعورِ نبوت کی اہمیت اور کمال نوعیت کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لیے ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱- نبوت کی تاریخ کے مطالعہ سے پہلی بات یہ سامنے آئی ہے کہ نبوت کو عالم کی تاریخ سے براہ راست تعلق ہے، تاریخ کا آغاز نبوت سے ہوا۔ نبوت کا حصہ انسانیت کی تکمیل و تشکیل میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کے دُنیا میں قدم رکھتے ہی، انفرادی و اجتماعی کرن کے پھوٹتے ہی نبوت کا آغاز ہوا۔ یہ انبیاء کرامؑ ہی تھے جو کائنات میں مصالحِ حیات کے منافی قوتوں سے متصادم ہوتے رہے اور زمانے کی رو میں داخل ہو کر اس کے عمل کو بدلنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ زندگی میں رونما فساد کی قول و فعل سے اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔

۲- تاریخ کا تعلق زمانی عمل سے ہے۔ انداز اور تبشیر اور کتاب کا نزول وقت کا متقاضی تھا تا کہ بنی نوع انسان اُس آئینِ حیات، اساسِ فکر اور اساسِ عمل کو پا سکے اور یقین و ایمان کی وہ دولت

حاصل کر سکے جس سے اس کی قسمت اور مستقبل جڑا ہوا ہے اور جن سے فرد اور جماعت کے تعلقات منضبط ہوتے ہیں۔ نیز اُن میں مصافِ حیات میں کامیابی سے آگے بڑھنے کی صلاحیت جنم لیتی ہے۔ لیکن تہذیب وتمدن کی بڑھوتری اور اظہار ذات کی فطری خواہش کہ انسانی روح پوری شان سے جلوہ گر ہو ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے جو کسی رہنما کے ذریعے ہی پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ انسان ہدایت کا محتاج ہے۔ انبیاء کرامؑ کے آنے سے اُسے یہ ہدایت میسر آ گئی۔ اسلام نے اس ہدایت کو دین سے عبارت قرار دیا ہے۔ اس ہدایت کی ابتدا ہے تو انتہا بھی ضروری تھی۔ یہ نہیں کہ یہ سلسلہ تا قیامت چلتا اور انسان کبھی بھی سکھ کا سانس نہ لیتا۔ نبوت کی بدولت اسے ہدایت ملی اور اسلام نے اس کی تکمیل کی۔

٣۔ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد نوعِ انسان کی تعلیم وتربیت اور اُسے زندگی کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ اپنی غایت سے آگاہ ہو جائے۔ اُسے زندگی، پیش آمدہ مسائل اور اُن کے حل کا علم ہو اور ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل جو حفظ نوع کی ضمانت دے جو سیاسی، معاشی، ذہنی، اخلاقی ہر لحاظ سے زمینی فساد کا سدِ باب کرے۔ جس کے اقدامات مصالح حیات کی تقویت کا سبب ہوں۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور تعلیم نے ان تمام ضرورتوں کو بدرجہ احسن پورا کیا۔

٤۔ فرائض حیات یعنی زندگی کو درست راستے پر ڈالنے کی جدوجہد کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا انحصار سچائی پر ہے۔ انبیاء کرامؑ اس سچائی کو لے کر آئے۔ انبیاء کرامؑ کی اس صداقت کے سامنے فلسفی کی فکر، شاعر کا وجدان، سائنس دان کا علم، ارباب عمل کے اقدامات، عقل مندی وغیرہ سب کمتر ہیں لیکن نبوت کے دو پہلوؤں انذار وتبشیر یا کتاب کے نزول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ دین جو آہستہ آہستہ پہنچ رہا تھا۔ جب بنی نوع انسان میں اس کی قبولیت کی صلاحیت نے جنم لے لیا تو ایک قطعی اور حتمی ہدایت لے کر آیا۔ قطعیت اور خاتمیت لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا دین کا ابلاغ جس مرحلے پر ہوا ایک قطعی اور حتمی ہدایت کے ساتھ ہوا۔ جو بھی بات کہی گئی فیصلہ کن لیکن نبوت کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ دین کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا۔ دین مکمل ہوا تو نبوت کا باب بھی بند ہو گیا۔ اس لیے کہ جس مقصد کے لیے نبوت کی ابتدا ہوئی تھی مکمل ہو گیا۔ اگر نبوت کا سلسلہ جاری رہتا تو نبوت پر یہ حرف آتا کہ وہ انسانیت کی رہنمائی کے فریضہ سے عہدہ برآں نہیں ہو سکتی۔ نوعِ انسانی اندھیروں اور سایوں میں اپنی راہ تلاش کرتی، سہاروں سے چلتی، یقین وایمان سے بے بہرہ رہتی۔ مقصدِ حیات سے بے خبر ہوتی۔ کبھی ایک طرف جاتی کبھی دوسری طرف۔ نہ شعور ذات ہوتا نہ انسان اور انسانیت کا کوئی واضح تصور نہ اس امر کا علم کہ مصافِ حیات میں کس طرح

قدم بڑھائے۔انبیاء کرامؑ نے آ کرحق وصداقت کا سبق دیا۔مختلف النوع درجہ بندیوں کی شکار انسانیت کو اُمتِ واحد میں ضم کیا کیونکہ تقاضائے فطرت یہی تھا کہ خالصتاً ایک انسانی معاشرہ قیام پذیر ہو۔اس معاشرے کی اطاعت کا محور ایک ہو، زندگی کا آئین ایک ہو۔راہِ عمل، نصب العین، قیادت سب ایک ہی ہو اور سب کا مقصود انسانیت کا فروغ اور احترام ہو۔توحید و رسالت نے یہ ضرورت پوری کر دی۔[۵۹] وہ سلسلہ جس کا آغاز نبوتِ آدمؑ سے ہوا تھا اُس کے نقطۂ کمال کا وقت آن پہنچا۔اقبال کہتے ہیں کہ آغاز میں جب عقلِ انسانی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی سہولت کے لیے مسلسل انبیاء کرامؑ کو بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ وہ بذریعہ وحی انسانیت کی رہنمائی کے احسن فریضہ سے عہدہ برآں ہو سکیں اور انھیں کم وقت میں اوامر ونواہی کا علم دے کر اُن کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کے فریضہ سے سبکدوش ہوسکیں۔اس لحاظ سے دیکھیں تو اقبال شعور نبوت کو کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس وجہ سے شعورِ نبوت کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی موجودگی میں انسان کو فرداً فرداً زندگی کے امور کے بارے میں فیصلہ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔حیات کی خارزار گزرگاہوں میں نبی کی طرف سے مہیا کی گئی ہدایت اور رہنمائی نے اُن کی مدد و محافظت کا فریضہ سرانجام دیا۔لیکن جب عقلِ انسانی ترقی کرتے کرتے ایک خاص مرحلے پر ٹھہر گئی جس کے لیے اُسے تیار کیا جا رہا تھا اور جہاں پہنچنے کے بعد وہ اپنی جدوجہد سے حصول علم کی صلاحیت سے مالا مال ہو گئی تو نبوت کے سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ضروری ہو گیا تا کہ عقلِ استقرائی ترقی کے مواقع حاصل کر سکے۔[۶۰] چونکہ نبی کی ترقی لامحدود ہے اس لیے عام انسان کی ترقی بھی لامحدود ہوگئی۔ارتقا جاری ہے اور جاری رہے گا۔لیکن مقصدِ نبوت حقیقتِ حیات کی وضاحت کے بعد مکمل ہو گیا۔ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے یہی معنی ہیں۔فرقان حکیم میں رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی نہ بھی کہا جاتا تو بھی وضاحت مقصود دین کے بعد کسی اور نبی کا تشریف لانا تحصیل حاصل (بے فائدہ) ہوتا۔علامہ اقبال عقیدۂ ختم نبوت کو بڑی شدت سے تسلیم کرتے تھے۔ وہ ارتقائے لامتناہی اور اس کے لامحدود ممکنات کو واضح کرنا ہی نبوت کا منتہٰی گردانتے تھے۔اس فعل کی تکمیل کے ساتھ ہی نبوّت بھی ختم ہوگئی۔[۶۱]

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ ایماں کردہ[۶۲]

ترجمہ: آپ ﷺ کے بعد نبوّت کا دعوی ہر رنگ اور ہر مفہوم میں شرک ہے۔آپ ﷺ ہی نے محفلِ ہستی کو

معرفت کی روشنی سے نورانی کر دیا۔

ختم نبوت کے معنی بڑے سادہ ہیں کہ محمد ﷺ کے بعد کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر نہ جھکایا جائے۔ یہی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔[۶۳] اور اس امر کے لیے فیصلہ کن کہ کوئی فرد ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ گویا ختم نبوت ایک ضروری اور لازمی شے ہے۔ سلسلۂ نبوت و رسالت کو لا انتہا نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کسی نہ کسی کو تو خاتم النبیین ماننا پڑے گا خواہ اس ذات کو جو بھی فرض کریں اور اس کے لیے عمرِ عالم کا جو بھی حصہ تجویز کریں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ جسے خاتم النبیین تسلیم کریں اسے کمالات نبوت و رسالت کا فرد مانیں اور اس کے فیوض و برکات کو بہترین اور اعلیٰ ترین تصور کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کریں کہ اس کامل نبی کے ذریعے نوعِ انسانی کو بحیثیت نوع جو روحانی کمالات حاصل ہوں گے ان کی مثال گذشتہ اُمتوں میں نہ ملے گی۔

اگر یہ فرض کر لیں کہ سلسلۂ نبوت قیامت تک چلتا رہے گا تو خاتم النبیین کو عالم کی عمر کے آخری حصے میں فرض کرنا لازم ٹھہرے گا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کی قلیل تعداد اس عظیم نعمت سے فیض یاب ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز نوعِ انسانی کی مصلحت کے برعکس اور ارحم الراحمین کی رحمت سے دور ہے۔

بے شک عقل یہ نہیں بتا سکتی کہ فلاں وقت نبی کی بعثت کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس کے مبعوث ہونے کے بعد عقل اس حقیقت کا ادراک کرنے کے قابل ہوتی ہے کہ فلاں نبی کی بعثت موزوں ترین وقت میں ہوئی تھی۔ اس قاعدے کے تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلی طور پر رسولِ پاک ﷺ کی بعثت ایک ایسے وقت پر ہوئی جو موزوں ترین تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب انسانیت عقلی اعتبار سے بلوغت کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ بنو اسرائیل کی دینی امامت اختتام کو پہنچ چکی تھی مگر بنی اسرائیل کے انبیاءؑ کی تعلیمات نے انسان کی عقلِ معاد میں ایسی صلاحیت و قابلیت کو جنم دے دیا تھا کہ وہ دین اکمل کو سمجھ کر اس پر عمل کر سکے۔ اس کے ساتھ عقلِ معاش یعنی دنیاوی امور کی سمجھ بوجھ بھی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی جس کے بعد اس کے ارتقا کی رفتار میں برابر تیزی جنم لیتی رہی اور وہ جمود و وقوف کو خیر باد کہہ کر حرکت و تکمیل کی طرف راغب ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا اس وقت کے تقاضے کے تحت انسانیت کے لیے دین کامل کی تعلیم کی اشد ضرورت تھی تا کہ عقل معاد لگا تار عقل معاش کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے کر اُسے حدوں سے بڑھنے سے محفوظ رکھے۔ اس

لیے ختم نبوت از حد ضروری تھی تاکہ عقل معاد کمال کو پہنچ کر عقل معاش کا ساتھ دے سکے[۶۴] اسی لیے علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام میں چونکہ نبوت اپنے معراج کمال تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ اسلام نے اس نکتہ کو بخوبی جان لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں کے ذریعے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے وسائل سے کام لینے کے عمل کو سیکھنا از حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال مزید فرماتے ہیں کہ اس سے یہ سمجھنا جائز نہ ہوگا کہ اب نبوت کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس ضرورت کے پورا ہونے کا اہتمام خود اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کی بعثت سے کیا ہے آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد مزید کسی نبی پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ آپ ﷺ ہدایت میں کامل ہیں اور ساری دُنیا کے تمام انسانوں کے رہنما ہیں۔ آپ ﷺ پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کے نزدیک فطری اور عمرانی لحاظ سے حضورؐ کی قیادت کے بعد کسی نئی قیادت کی ضرورت نہیں۔[۶۵]

لیکن اس سے یہ سمجھنا نادانی ہوگی کہ اب زندگی میں عقل کا عمل دخل ہی کافی ہے۔ جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اب بھی واردات باطن کو عقل و فکر کی کسوٹی پر آزادی سے جانچا جا سکتا ہے۔ عقیدۂ ختم نبوت کو ماننے کے بعد ہم پر کسی بھی ایسے شخص کی اطاعت لازم نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ اُسے الہام یا القا ہوتا ہے۔ یہ کسی کے لیے حجت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نبوت کی خاتمیت کا تصور ایک نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوؤں کا خاتمہ کرتی ہے اور جس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ انسان کے باطنی واردات واحوال کی دُنیا میں علم کی نئی نئی راہیں کھلیں اور مسلمان صوفیانہ واردات کو چاہے وہ کتنی ہی اہم اور فطرت سے ہٹ کر ہو۔ دوسری واردات کی طرح فطری سمجھے اور اس کا جائزہ بھی ویسے ہی تنقیدی اور تحقیقی زاویۂ نگاہ سے لے جیسا طرزِ عمل رسول پاک ﷺ نے ابنِ صیاد کے احوال نفسی کا جائزہ لینے کے لیے اختیار کیا۔[۶۶]

اقبال کے نزدیک مذہبی واردات ایک ذریعہ علم اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس واردات کے ذریعے حقیقت تک رسائی میں نقطۂ نظر کا انفرادی ہو جانا لازمی امر ہے۔ اس لیے اس فعل میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دوسروں تک ویسے پہنچایا جا سکتا ہے لیکن یہ لا حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اس واردات کی ''انفرادیت'' ہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے صاحب واردات اپنی خودی کی حقیقت کا سراغ پاتا ہے۔ پھر مذہبی زندگی کا معراجِ کمال بھی یہی

ہے کہ خودی اپنے اندر زیادہ گہری انفرادیت کے احساس کو جنم دے۔ اس کی بہ نسبت جو عادتاً اس کے تصور میں آتی ہے۔ درحقیقت وجودِ حقیقی سے اتصال ہی میں خودی کو اپنی یکتائی اور مابعد الطبعی مرتبہ و مقام کا علم ہوتا ہے اور اُسے سمجھ آتی ہے کہ اس مرتبہ و مقام میں کہاں تک اصلاح ممکن ہے اور کیا کیا اضافے ہو سکتے ہیں۔ خودی کی یہ روش ہمارے اندرون ذات میں زبردست حیاتی تغیرات کا نتیجہ ہے۔ منطق کے معقولات اسے اپنے دام میں لانے کی سعی میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کا اظہار عمل کے ذریعے ممکن ہے۔ ایسا عمل جو کائنات کو زیر و زبر کر دے یا پھر ان سے ایک نئی دُنیا تخلیق کرے۔ چنانچہ اسی ایک صورت کے ذریعے لازمانی واردات کا مشمول زمانے کی رو میں نفوذ کرتا ہے اور ایک ایسا مرئی روپ اختیار کرتا ہے کہ تاریخ اس کے مشاہدے پر مجبور ہو جاتی ہے۔[۶۷] اسی لیے اقبال اس واردات مذہبی کا جائزہ لینے اور تحقیق پر زور دیتے ہیں ماضی میں انھی صفات کی بدولت غلاموں میں اُن صفات نے جنم لیا جن کے ذریعے انھوں نے دُنیا کی امامت و رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان غیر معمولی تجربات، واردات کی حقیقی ماہیت اور کہنہ کا پتہ چلا کر مسلمان ماضی کے مسلمانوں کی طرح ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔[۶۸] لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صوفیہ کی واردات اور انبیاء کرامؑ کی واردات میں فرق ہے جو صوری مشابہت ہے اس کی بنیاد پر مطلق یا اضافی نبوت کا کوئی بھی دعویٰ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کا کوئی امکان ہی نہیں جس سے انکار پر کفر لازم ہو جائے۔ ایسے الہام کا دعویٰ کرنے والا اسلام کا غدار ہے۔[۶۹]

نبوت ولایت سے بالکل مختلف ہے۔ نبوت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے بھی نبوت کو صرف نبوت کہا ہے اس کی اقسام نہیں گنوائیں۔ یہ ایک یگانہ اور یکتا مظہر ہے جس کی دوسری شکل کا امکان نہیں ہے۔ اب یہی انسان کی رہنما ہے۔ نبوت چونکہ رسول پاک ﷺ پر ختم ہوئی اس لیے آپ ﷺ ہی انسانیت کے دائمی رہنما، مرشد اور معلم ہیں۔ آپ ﷺ کی قیادت اور امامت انسانی تقدیر کی امین ہے اور آپ ﷺ کی رہنمائی میں تمام رہنمائیاں اکٹھی ہیں۔ یہی رہنمائی حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کی وارث ہے اور یہی رہنمائی ہے جس کا دوسرا نام ختم نبوت ہے۔ یہ وحدت انسانی کی بنیاد ہے۔ اسی وحدت کی بنیاد پر اُمت اسلامیہ کی تشکیل ہوئی ہے جو جمعیت بشری کی تمہید ہے اور انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے ایک ایسے اجتماع کی جسے خیر امت کہا گیا۔ یہ کسی سرزمین یا قوم اور نسل سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایک نصب العین پر قائم ہے جس کی بنیاد ختم نبوت پر

استوار ہے اور یہی حقیقت اس کی تقویم اور تقویت کا راز ہے۔ اگرچہ اس کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔[۷۰] علامہ اقبال نے اس باب میں انتہائی معنی خیز اشارے مہیا کیے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا شعورِ نبوت و رسالت اور تصورِ ختم نبوت و رسالت، شعورِ ولایت سے ارفع و بلند تر ہے۔ اقبال کے نزدیک وہی تصوف صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکتا ہے جو شعورِ نبوت سے متاثر ہو اور انسانی معاشروں میں روحانی و تمدنی انقلاب برپا کرنے کا مقصد اعلیٰ اپنے سامنے رکھتا ہو۔[۷۱] حاصل بحث یہ ہے کہ:

۱- ولایت جاری ہے جبکہ نبوت کا خاتمہ ہو چکا۔

۲- دونوں ذریعہ علم ہیں لیکن علم نبوت کو ہر لحاظ سے علمِ ولایت پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔

۳- ولایت کے تجربات و مشاہدات اور واردات قابلِ تنقید ہیں کیونکہ ان کا انحصار ذہن پر ہوتا ہے۔ اگر ذہن میں ذرا سی کجی آ جائے، دل میں تھوڑا سا فساد جنم لے لے، نظر میں معمولی سی خیرگی آ جائے تو واردات کی شکل بالکل بدل جاتی ہے۔ لہٰذا اس پر اسرار اور نازک مقام پر معمولی غلطی بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔[۷۲] علامہ نے اسی مقام کے بارے میں خبردار کیا ہے:

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش![۷۳]

نبوت کے تجربات و مشاہدات تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا منبع و مصدر وحی الٰہی ہوتی ہے نہ کہ ذہن۔

۴- ولایت کا تعلق فرد کی ذات سے ہے جبکہ نبوت کا ہیت اجتماعیہ انسانیہ سے۔

۵- ولایت کا تجربہ معاشرہ کے لیے لازم تقلید نہیں ہے جبکہ نبوت کے احکامات کی بلا چون و چرا پیروی لازم ہے۔ اس کا انکار کفر، انکار کرنے والا کافر اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

۶- ولایت میں خالق کی طرف توجہ ہوتی ہے جبکہ نبوت میں مخلوق کی طرف۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ نے صرف نبوت اور ولایت کے فرق کو ہی واضح نہیں کیا بلکہ ختم نبوت کی عقلی و فلسفیانہ توجیہہ کر کے ولایت پر نبوت کی برتری ثابت کی ہے اور اُن لوگوں کی توجیہات پر کاری ضرب لگائی ہے جو دینی ذہن رکھنے کے باوجود اس واضح فرق کو قبول نہیں کرتے۔ جن کا کہنا ہے کہ نبوت ولایت ہی کے اس مقام سے متعلق ایک سچائی کا نام ہے، جہاں پہنچ کر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد سالک کا دل یہ قابلیت حاصل کر لیتا ہے کہ اس پر وحی و تنزیل کی

تجلیات کا آغاز ہو جائے۔ بالفاظ دیگر جو یہ کہتے ہیں کہ نبوت اور ولایت میں جو فرق ہے وہ نوعیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ درجہ کے لحاظ سے ہے۔[۷۴]

اس بحث نے اُن افراد کے غیر مدلل نظریہ کا بھی خاتمہ کیا ہے جو ولایت کو نبوت سے افضل قرار دینے کے لیے حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کے قصّہ کی مثال دیتے ہیں کہ حضرت خضرؑ کا علم ''لدنّی'' تھا، جس کی بدولت اُن کو بعض ان باتوں کا بھی علم تھا جو حضرت موسیٰؑ نہیں جانتے تھے جبکہ یہ درست نہیں ہے۔ حضرت خضرؑ کا علم ''لَدُنّی'' یا ''فضل من لَدُنِّی'' مقید تھا جبکہ موسیٰؑ کا فضل مطلق۔ فضل مقید کبھی بھی فضل مطلق پر غالب نہیں آ سکتا۔[۷۵] علامہ کے اس نظریہ فوقیت کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ منصب نبوت سے بہرہ ور ہونے سے پہلے ہر نبی نے سلوک ومعرفت کی تمام منزلیں طے کی ہوں۔ جن کی نشاندہی انبیاء کرامؑ واولیا کرام کرتے چلے آئے ہیں۔ اس طرح تو عقیدۂ ختم نبوت کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ کسب کے ذریعے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص سلوک ومعرفت کی تمام راہوں کو عبور کرنے کے بعد تعلق باللہ کی اس منزل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جسے سلوک ومعرفت کی اصطلاح میں آخری منزل کہنا چاہیے اور نبوت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کوئی بھی راسخ العقیدہ مسلمان ان کا قائل نہیں ہو سکتا۔[۷۶]

علامہ کے ان خیالات سے اس نظریہ یا عقیدہ کی بھی تقویت ملتی ہے کہ ایک نبی دنیا کے تمام اولیا پر بھاری ہے۔ نبی کے مقابلہ میں ولی کی ہستی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ولایت ایک سِرّ ہے اللہ کے اسرار سے۔ ریاضت پر بھی اس کا مکمل وقف نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ شانِ ولایت تو اس قدر پردہ میں رہتی ہے کہ ولی کو ولی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں پہچان سکتا۔ کیونکہ اظہار ولایت کے سب پر عقلاً جائز ہونے سے دوستی دُشمنی میں تفاوت واضح ہو جاتا اور واصل وغافل میں امتیاز آسان ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ولایت کے موتی کو عام لوگوں سے پوشیدہ رکھ کر گونا گوں امتحانات کے دریا میں پھینک دیا۔ سچا طالب اس تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی جان پر کھیلتا ہے اور تہہ میں اُتر کر گوہرِ مقصود کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اُسے دُنیا میں اپنے حال کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی جبکہ نبوت سراسر عطیۂ خداوندی ہے۔ لطفِ قدیم ناگاہ خلعتِ نبوت سے آراستہ کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اپنی اہلیہ کو تنہا جنگل میں چھوڑ کر آگ کی تلاش میں نکلے اور خلعتِ نبوت

سے آراستہ ہو کر واپس آئے۔[۷۷]

مذکورہ بالا جائزہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال نے صرف نبوت و ختم نبوت کی اہمیت ہی بیان نہیں کہ بلکہ اُس کا رشتہ ثقافت سے جوڑا ہے۔ دراصل اُن کی خواہش ہے کہ مومن کا دل انوارِ رسالت سے اس طرح روشن ہو جائے اور وہ حضور ﷺ کی ذات سے ایسی دلی، روحانی اور ذہنی دلبستگی اختیار کرلے جو اس کی فطرت کا حصہ بن جائے۔ اگر اس طرح ہو جائے تو اس عالم کی کوئی اور شخصیت بحیثیت رہنما اُسے بھلی نہ لگے گی اور وہ کسی اور نبوت کا سوچ بھی نہ سکے گا۔[۷۸]

دراصل علامہ نے مثبت طور پر یہ امر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرتی اعتبار سے رسالت کے بغیر ملتِ اسلامیہ اپنا مستقل وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ اُنھوں نے نظم و نثر کے ذریعے اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ جدید اداروں کے پرورش کردہ انسانوں اور مغربی سوچ رکھنے والے افراد کے سامنے پیار بھرے لہجے میں لطیف انداز میں حقائق کو بیان کرنا علامہ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

ب: مقصودِ نبوت اور رسالت محمدی ﷺ

رسالت اور عشق رسول ﷺ ہر مسلمان کے دل میں راسخ ہے لیکن عظمتِ رسول ﷺ سے واقفیت اور رسالت کی ضرورت واہمیت سے آ گاہی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اقبال اس معرفت سے سرشار ہیں۔ وہ عقیدۂ رسالت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اس کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے:

علمِ حق غیر از شریعت، ہیچ نیست
اصلِ سنّت جز محبت، ہیچ نیست[۱]

ترجمہ: سچا علم شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور سنت رسول پاک کی بنیاد محبت ﷺ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اقبال کا خیال ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت اور آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی کو تسلیم کرنے ہی سے عقیدۂ رسالت کامل اور واضح شکل اختیار کرتا ہے۔ یعنی اصولی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا رسول تسلیم کیا جائے جیسے دوسرے انبیاء کرامؑ و رُسلؑ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسرے انبیاء کرامؑ اور رُسلؑ کو بھی اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آپ ﷺ کو۔ لیکن جہاں تک عملی پیروی کا تعلق ہے اُس کے لیے انتخاب آپ ﷺ کا ہونا چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اب پیروی صرف آپ ﷺ کی ضروری ہے۔ دوسرے تمام انبیاء کرامؑ اور رُسلؑ اللہ کے رسول تھے اور آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝[۲]

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی ہے گواہ۔

تاریخ انسانی کے جہالت پر مبنی فکری اور اعتقادی پستی کے عہد میں تمام انسانیت کو نعمت اسلام کا حصول دو ذرائع سے ہوا۔ ایک قرآن پاک اور دوسرا حضرت محمد ﷺ کی سیرت پاک و احادیث

نبوی ﷺ۔اس لیے حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لائے بغیر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔

علامہ اقبال اس حقیقت کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر صرف اعتقاد ہی نہیں رکھتے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا وسیلہ بھی قرار دیتے ہیں [۳۲]

تاریخ کا جائزہ یہ حقیقت عیاں کرتا ہے کہ عرب میں حضور ﷺ سے قبل کوئی ایسی شخصیت صفحۂ ہستی پر موجود نہ تھی جو معرفتِ الٰہی کے حصول کے بعد لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دے اور انسان کو یہ بتائے کہ کائنات میں اُس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس کا سبب یہ تھا کہ انسان کے ذہن سے خالق کی حقیقت بالکل مٹ چکی تھی۔ باوجود اس کے کہ مختلف ادوار میں انبیاءؑ و رسلؑ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے، لیکن ان کے پیغام توحید و تعلیمات کو فراموش کیا جاتا رہا۔ پھر اس جاہلیت کے دور میں رسول پاک ﷺ نے توحید کی شمع روشن فرمائی اور انسانوں کو زندگی گزارنے کے اصول و قوانین بتائے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کا اظہار ''در معنی ایں کہ ملّت از اختلاط افراد پیدا می شود...'' میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

نکتۂ توحید باز آموزدش
رسم و آئین نیاز آموزدش [۳۳]

ترجمہ: (پیغمبر) اسے از سرِنو توحید کا سبق دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے نیازمندی، رسوم و آداب سکھاتا ہے۔

علامہ اقبال رسول پاک ﷺ کے اس مقام و مرتبہ سے بخوبی آشنا ہیں۔ اسی بنا پر وہ رسول پاک ﷺ کی ذات بابرکات کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ فضل کریم درانی، علامہ اقبال کے رفقا میں سے تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک ملاقات کے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ نے مقامِ نبوت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق کی سیرت سے ایک واقعہ بیان فرمایا اور کہا:

حضرت ابوبکر صدیق سے کسی نے پوچھا، ''آپ کو اللہ سے زیادہ محبت ہے یا اللہ کے رسول کے ساتھ؟'' ایک زاہدِ خشک تو عموماً یہی جواب دے گا کہ مجھے اللہ سے زیادہ محبت ہے کیونکہ رسول کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا:

مجھے اللہ کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہنے لگے ''رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ہم یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا۔ نہ اس نے ہم کو پوچھا اور نہ ہم نے اسے پہچانا، اب جو اللہ کا رسول آ گیا

تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے ہمیں پہچان لیا۔[۵]

علامہ اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقامِ رسالت سے سچی آگاہی ''صدیقیت'' کی بدولت ممکن ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان حضرت ابوبکر صدیق کی نگاہ سے رسالت محمدی ﷺ کو دیکھ لے تو وہ اُس کے دل وجگر کے لیے طاقت، زندگی اور رحمت ومحبت کا سندیسہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وبڑائی کی ترجمان بھی۔ اللہ کا وہ پیغام جو قرآن کی شکل میں نبی پاک ﷺ پر نازل ہوا وہ امتِ مسلمہ کے لیے قوت کا سرچشمہ ہے اور آپ ﷺ کے اقوال ملت کی زندگی کے لیے شہ رگ۔[۶]

وہ رموزِ بے خودی میں رکنِ دوم ''رسالت'' میں کہتے ہیں:

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ
قلبِ مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبل الورید ملت است[۷]

ترجمہ: اگر تو میری بات کی تحقیق کرے اور اگر تو سیدنا صدیقؓ کی آنکھ سے دیکھے۔
تو نبی اکرم ﷺ قلب وجگر کی قوت بن جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب بن جاتے ہیں۔
حضور ﷺ پر نازل شدہ کتاب قلبِ مومن کے لیے قوت ہے اور آپ ﷺ کے حکیمانہ اقوال ملت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رسالت کا تعلق مادہ وروح دونوں سے ہے۔ علامہ اقبال بھی زندگی کے مادی پہلو کے ساتھ روحانی پہلو کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ روحانی قوت کی شدت ہی سے مثالی خودی کی تخلیق ممکن ہے۔ اس لیے علامہ اقبال انسانیت کو یہی پیغام دیتے ہیں۔ روحانی پہلو کی تکمیل کے بغیر حیات میں آسودگی ناممکن ہے۔ اس کے حصول کے لیے علامہ کی نظر رسالتِ مآب ﷺ کی طرف اُٹھی ہے کہ وہیں سے روحانی دولت کا خزانہ مل سکتا ہے۔

دراصل علامہ اقبال روحانی بالیدگی کو صرف اور صرف نبوت کے وسیلے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور صوفیہ کے اس مسلک کے خلاف ہیں جس کے ڈانڈے عیسائیوں کے عقیدے

سے مشابہ ہیں۔ ''آب وگل سے مہجوری'' اسلام میں منع ہے۔ اسلامی شریعت حیات کے ہر اُس جائز پہلو پر زور دیتی ہے جو عملی ہو۔ اس میں جنگ و جدل اور خوشی وغیرہ بھی شامل ہے۔[۸] اس لیے وہ نظم ''پیرو مرید'' میں پیرِ رومی سے کہلواتے ہیں:

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰؑ غار و کوہ[۹]

ترجمہ: ہمارے دین میں مصلحت جنگ وشکوہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے دین میں مصلحت غار وکوہ میں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہ روحانی قوت ''عین مصطفائی'' ہے وہ نظم ''مسجد قرطبہ'' میں کہتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفیؐ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام![۱۰]

یہ قوت ایک مخصوص آئین کی پابندی سے جنم لیتی ہے۔ لہٰذا اہل نظر کا کام ہے کہ وہ خود اپنی مفید حدود کا تعین کریں۔ کیونکہ بھٹکنے والی نظر درست رہنمائی نہیں کرسکتی۔ انسان کے مختلف عناصر کی محدود قوتیں بھی اس سے عاجز دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی پابندی اور نگہداشت حیاتِ رسول کی پیروی کے ذریعے ہی ممکن ہے، وہ ضربِ کلیم کی ایک غزل میں کہتے ہیں:

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ 'مازاغ!'[۱۱]

اقبال کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کی رسالت کو یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ وہ بلا امتیاز قوم، رنگ، نسل، زمانہ تمام انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ آپ ﷺ کا دین، قرآن، کلمہ کسی کے لیے مخصوص نہیں۔ آپ کی تعلیمات انسان کے بشری تقاضوں کے مطابق ہیں۔ دیگر انبیاء کرامؑ کی تعلیمات پر ان کے بعد کے پیروکاروں نے جن مذاہب کی بنیاد رکھی اُن میں سے کسی نے تو انسان کے روحانی اور فطری تقاضوں کو بالکل فراموش کرتے ہوئے رہبانیت کی تعلیم دی اور کسی نے انھی تقاضوں کو مقصودِ زندگی بنا لیا۔ انسان ان دونوں مراحل پر ہمیشہ حق تلفی، ظلم و استبداد اور پستی کا شکار رہا۔ لیکن بعثت محمد ﷺ نے اسے ان تمام تکلیف دہ مراحل سے آزادی عطا کی۔ اس مقصد کے لیے حضور ﷺ کی اطاعت کی غلامی میں آنا فطرت کے عین مطابق تھا۔

اقبال مضمون ''نبوت'' میں لکھتے ہیں:

''نبی آخرالزماں کی غلامی، غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دین فطرت

ہیں یعنی فطرت صحیحہ اُن کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ انھیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی واسطے عین فطرت ہیں''۔[۱۲]

اس کے بارے میں خود خالق کائنات فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ[۱۳]

ترجمہ: اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں رکھی۔

یہ دینِ فطرت حضرت محمد ﷺ کی بدولت نصیب ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کو باہمی اخوت اور وحدت میں پرو دیتا ہے، اقبال رموزِ بے خودی میں رکنِ دوم ''رسالت'' میں کہتے ہیں:

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم[۱۴]

ترجمہ: ہر کثرت وحدت کے بندھن سے زندہ ہے۔ مسلمانوں کی وحدت کا دارومدار دینِ فطرت ہے۔ یہ دین فطرت ہم نے نبی اکرم ﷺ سے سیکھا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشعل روشن کی ہے۔

رسول عربی ﷺ کی ان فطری تعلیمات کے متعلق سید امیر علی رقم طراز ہیں:

رسول عربی ﷺ کی تعلیمات سے بڑھ کر کوئی تعلیم سیدھی سادھی اور ذہن انسانی کی ترقی سے ہم آہنگ نہیں۔ مذہبی رسوم کے بارے میں آپ ﷺ نے اسلام کی رو سے جو چند آداب وقواعد متعین کیے۔ ان کا مقصد نظم وضبط اور یک رنگی اور یکسانی پیدا کرنا تھا جو معاشرے کی نشو ونما کے بعض مراحل میں بہت ضروری ہوتا ہے۔[۱۵]

انھیں فطری اصولوں کی بنا پر یہ دین ہر قوم، ہر قبیلے اور ہر زمانے کے لیے قابل قبول ثابت ہوا۔

دیگر انبیاء کرامؑ مخصوص اقوام کی طرف مخصوص تعلیمات اور مخصوص وقت کے لیے مبعوث ہوئے لیکن جب انسانیت اور تاریخ اپنے ارتقا کی منزل پر پہنچی جسے ''ذہنی بلوغ'' کی منزل کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں حضرت محمد ﷺ ہدایت الٰہی کے ساتھ دُنیا میں تشریف لائے۔ اس دور میں

تاریخِ انسانیت کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو عملی زندگی کا وہ مکمل ہدایت نامہ دے جس کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خوف وخطر اپنی منزلِ مقصود کا پتہ پا سکے۔ اسی بنا پر حضور ﷺ کی رسالت اور اُن کا پیغام دائمی حیثیت و منفرد مقام کا حامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ راہ راست پر چلنے والوں کے لیے خوشخبری اور اس راہ راست سے بھٹکنے والوں کے لیے ڈر سنانے والا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَ مَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا[۱۶]

ترجمہ: اور اے میرے محبوب ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا۔

علامہ اقبال رسالت محمدی ﷺ کی ابدیت اور عالمگیریت پر صدقِ دل سے گواہی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شریعتِ محمدی ﷺ ملک وقوم، گروہ، زمانہ وغیرہ کی قید سے آزاد ہے۔ کیونکہ یہ تمام بنی نوع انسان کے لیے قانونِ حیات ہے۔ جب تک دُنیا میں ''حیات'' موجود ہے شریعت محمدیہ ﷺ کی ضرورت درکار رہے گی۔ وہ ''در معنی ایں کہ پختگی سیرت ملّیہ از اتباع آئین الٰہیہ است'' میں کہتے ہیں:

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات[۱۷]

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ کا دین ہی دین فطرت ہے۔ اور شرعِ محمدی ﷺ آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔

اس اختصاص کی وجہ سے اس دین کو، اس کی شریعت کو اور رسول ﷺ کی رسالت کو ابدیت حاصل رہے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ o وَوَ ضَعۡنَاعَنۡكَ وِزۡرَكَ o الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَo وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَo[۱۸]

کیا ہم نے تمھارا سینہ کشادہ نہ کیا اور تم پر سے تمھارا بوجھ اتار لیا جس نے تمھاری پیٹھ توڑی تھی اور ہم نے تمھارے لیے تمھارا ذکر بلند کیا۔

اقبال یہاں یہ نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں اقوام ہمیشہ سے پیدا ہوتی رہیں اور زوال سے مٹتی رہیں۔ لیکن اُمّتِ محمدیہ جو ''موسویت و ابراہیمیت'' کی وارث ہے۔ کسی بھی شے میں جذب نہیں ہوسکتی۔[۱۹] اس میں یہ خصوصیت ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گی۔ اسے زوال نہیں

ہے۔ اگرچہ یہ اپنے افعال و اعمال کی بنا پر انحطاط کا شکار ہوگی لیکن عاشقانِ رسول ﷺ ملّت کے احیا کے فریضہ سے عہدہ برآں ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے "رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" فرمایا ہے، اقبال نظم "جوابِ شکوہ" میں اس حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ 'رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ' دیکھے[۲۰]

دینِ محمدی ﷺ کی بنیاد کلمہ طیبہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" پر ہے۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت ہے کہ اس کائنات کا خالق، معبود، خدا صرف ایک ہے اور انسان صرف اس کا بندہ ہے۔ یہی کلمۂ حق نبی آخرالزماں ﷺ کے انقلاب کا بیج تھا جس نے تمام باطل خداؤں کا ابطال کر دیا اور لا الہ کی ضرب سے انھیں پاش پاش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے بعد فوراً حضرت محمد ﷺ کے نام کا ذکر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔[۲۱] اس کلمہ کے دوسرے جزو کے بارے میں نعیم صدیقی کہتے ہیں:

> اس کلمہ کے دوسرے جزو میں یہ اقدار شامل تھیں کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اس سے عقلِ انسانی کو سوچنے کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں اور پھر یہ ہے کہ محمد ﷺ اس سلسلہ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل کی جا سکتی ہے اور اس ہستی کی قیادت میں قافلۂ انسانی فلاح و ارتقا کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔[۲۲]

گویا اسلام کے اعتقادی نظام کی بنیاد اسی کلمہ پر ہے۔ اقبال اس کے متعلق کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کا دین انھی بنیادوں پر قائم ہے۔

اوّل: اللہ ایک ہے۔

دوم: محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور سلسلۂ انبیاؑ و رُسلؑ کی آخری کڑی ہیں جو وقتاً فوقتاً اور تمام ادوار میں عالمِ انسانیت کو زندگی کے صحیح طرائق کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ ان کے نزدیک ملتِ بیضا کے جسم میں یہی کلمہ بمنزلہ روح ہے، وہ رکنِ اوّل "توحید" میں فرماتے ہیں:

ملتِ بیضا تن و جاں لَا اِلٰہ
سازِ ما را پردہ گرداں لَا اِلٰہ[۲۳]

ترجمہ: ملت مسلمہ بدن ہے اور توحید اس کی جان ہے۔ لا الہ ہمارے ساز کے سارے نغموں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے

جب تک اس کلمہ کی حقیقت دل میں جاگزیں نہ ہو جائے۔ انسان غیر اللہ کی غلامی سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ نظم ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

تا نہ رمزِ لَآ اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست[۲۴]

ترجمہ: جب تک لَآ اِلٰہ کا نکتہ ہاتھ نہ آئے۔ غیر اللہ کے بند توڑے نہیں جا سکتے۔

حضرت محمد ﷺ نے جس دور میں توحید کا حکم بلند فرمایا وہ انسانی جاہلیت کا تاریک ترین دور تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک ''نفسِ واحد'' نے اس کلمہ کے ذریعہ اس عہدِ جاہلیت میں انقلاب پیدا فرمایا۔ یہی اس کی شان ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ[۲۵]

اب کلمہ کے اقرار کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کو وہ آئین بنا دیا جائے جو اِن کی زندگی کی درست راہ کی طرف رہنمائی کرے۔ اِس مقصد کے لیے رسول پاک ﷺ کو قرآن پاک کی شکل میں شریعت عطا کی گئی جس کا عملی نمونہ سیرت طیبہ ہے، خورشید احمد لکھتے ہیں:

اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے محض انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں تربیت نہیں پاتا۔ یہاں ابتدائی اور اولین رہنمائی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے حاصل کی جاتی ہے۔[۲۶]

قرآن حکیم ہر لحاظ سے کامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آفاقی اور عالمگیر قوانین کی حامل کتاب ہے۔ اس کا امتیاز ہے کہ یہ الہامی تعلیم کا آخری مکمل اور جامع مجموعہ ہے۔ اس کی تعلیمات زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی۔ اس لیے اس کو ماننے اور اس پر مکمل عمل کرنے ہی میں فلاح ہے۔

علامہ اقبال یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی بھی قوم یا گروہ اپنے آئین کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہی آئین تمام بنی نوع انسان کو پاک وحدت میں پرو سکتا ہے اور یہ خاصیت صرف اور صرف قرآنِ حکیم میں ہے جو اُمت مسلمہ کا آئین حیات ہے۔ ان کے نزدیک اس اُمت کی حیات کا دارو مدار قرآنِ پاک ہی پر ہے اس کے بغیر ملت کے انفرادی وجود کا تصور محال ہے۔ اسی

لیے تو کہتے ہیں کہ مسلمان بننے کے لیے قرآنِ پاک کو زندگی کا جزو بنانا انتہائی ضروری ہے۔ وہ ''در معنی ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد....'' میں کہتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن [۲۷]

ترجمہ: اگر تو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو ایسی زندگی قرآن پاک کے بغیر ممکن نہیں

علامہ اقبال کا دعویٰ ہے کہ قرآن پاک ایک زندہ و پائیندہ کتاب ہے۔ اس کی تعلیمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جبکہ دوسرے انبیاءؑ کی کتب میں یا تحریف کر دی گئی یا انھیں چھپا دیا گیا لیکن قرآن پاک ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لینے کے ساتھ ساتھ مومن کے سینے کو بھی اس کا محافظ بنایا ہے۔ وہ مذکورہ بالا نظم میں کہتے ہیں:

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم [۲۸]

ترجمہ: (یہ راز) قرآن حکیم ہے جو ایک زندہ کتاب ہےجس کی حکمت قدیم بھی ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والی۔

یہی سبب ہے کہ علامہ کی فکر کا بڑا ماخذ قرآن بنا اور اسی پر انھوں نے اپنے تمام عقائد کی بنیاد رکھی۔

قرآن پاک کے حوالے سے مسلم و غیر مسلم اہلِ فلسفہ و کلام کو ایک سوال ہر دور میں پریشان کرتا رہا کہ وہ وحی جو آسمانی کتب میں مرقوم ہے۔ آیا از روئے مفہوم وحی ہے یا لفظاً بھی وحی ہے۔ آیا قرآن کا مفہوم اور مضمون رسول ﷺ کے قلب میں اُتارا جاتا ہے یا اس کے ساتھ الفاظ بھی وہیں سے آتے ہیں۔

اس حوالے سے علامہ اقبال یہ مؤقف رکھتے تھے کہ رسول پاک ﷺ کے قلب پر قرآن کے صرف معانی ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی اُترتے تھے اور یہ وہی الفاظ ہیں جو قرآن پاک میں نظر آتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ قاصد بغیر الفاظ کے خیال کو لے لے اور پھر آگے بھی بے الفاظ ہی منتقل کر دے۔ صرف بندے اور اللہ کا مسئلہ ہوتا تو اور بات تھی مگر یہاں تیسرا وجود واسطہ کے لیے موجود ہے جس کا نام فرشتہ ہے۔[۲۹]

روز گارِ فقیر، جلد اوّل میں ایک واقعہ درج ہے جس کا ذکر ضروری ہے:

ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کے سالانہ اجلاس میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ کیا حضرت محمد ﷺ پر قرآن کا مفہوم اُترتا تھا یا عبارت ہی اسی طرح اُتری تھی؟ علامہ اقبال نے جواب دیا کہ یہ عبارت ایسے ہی اُتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر علامہ اقبال سے کہا کہ تم جیسا تعلیم یافتہ آدمی بھی اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ عبارت ہی اُتری تھی تو علامہ نے جواباً فرمایا:

ڈاکٹر لوکس! میرا یقین! میرا تجربہ ہے، مجھ پر پورا شعر اُترتا ہے تو پیغمبر ﷺ پر عبارت کیوں نہیں پوری اُتری ہوگی۔[۳۰]

الغرض رسالتِ محمدی ﷺ کے یہ تمام امتیازی پہلو آپ ﷺ کو دوسرے تمام انبیاء و رُسلؑ سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگرچہ تمام ادیان معنوی حیثیت سے اسلام ہی تھے مگر جو دین قرآن پاک کی شکل میں رسول پاک ﷺ کے ذریعہ روشناس ہوا وہی اس شان کا مستحق ہے کہ اس کا نام اسلام ہو۔ کیونکہ اس کی اسلامیت، دوسرے تمام ادیان کی اسلامیت سے زیادہ ہے۔ دیگر تمام ادیان کے احکام نسبتاً مختصر اور محدود تھے۔ خطاب کا دائرہ تنگ تھا۔ ان کے نفاذ کی مدت بھی کم تھی جبکہ اس دین کا مجموعہ احکام مفصل اور ہمہ گیریت کا حامل ہے۔ اس کا دائرہ خطاب لامحدود ہے اور اس کے نفاذ کی مدت غیر متعین ہے اور وہ دین جس کا آغاز حضرت آدمؑ کی رسالت سے ہوا یہ اُس کا نقطۂ کمال ہے۔ گویا ملت کی شیرازہ بندر سالت ہی ہے وہ رکن دوم ''رسالت'' میں کہتے ہیں:

فرد از حق ملت ازوے زندہ است
از شعاعِ مہرِ او تابندہ است[۳۱]
از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما[۳۲]

ترجمہ: ملت نے آپ ﷺ کے دم سے زندگی پائی ہے۔ ملت کی صبح آپ ﷺ کے آفتاب سے روشن ہے۔ رسالت ہی سے ہم ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا ہوتے ہیں۔

اس عقیدے کی نسبت یہ اعتراض جنم لے سکتا ہے کہ مسلمان تمام نوعِ انسان نہیں ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی آپس کی اخوت، رنگ و نسل اور وطن سے بالاتر سہی لیکن دُنیا کی زیادہ آبادی اس سے باہر ہے۔ اس لیے اسلام کی اخوت کو عالمگیر اخوت نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا ہی اعتراض اسرار

خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ اس کا مدلل جواب دیتے ہوئے علامہ نے کہا کہ اسلام کا مقصود ہی عالمگیر محبت اور اخوت ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک ملت کا مثال بن کر دوسروں کے لیے نمونہ بننا ضروری ہے تب ہی اخوت کی حدیں وسیع ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ رموزِ بے خودی میں اس مضمون کے لیے ایک خاص عنوان قائم کیا ہے ''درمعنی ایں کہ مقصودِ رسالت محمدیہؐ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است''۔ اس عنوان کے تحت یہ واضح کیا ہے کہ اسلام کا پیغام تمام انسانوں کے لیے آزادی، مساوات اور اخوت کا پیغام ہے۔ اسلام نے انسانوں کی گردنوں سے غلامی کا طوق اُتارا اور ظلم و ستم کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ انسان انسانوں کی پرستش کرتے تھے۔ کلیسا میں جنت کے پروانے، فریب خوردہ ابلہان کے ہاتھوں بکتے رہے۔ برہمن نجات کے کمیشن ایجنٹ بنے بیٹھے تھے۔ مذہب استحصال اور حشمت و دولت کا آلہ بن کر رہ گیا تھا۔ فطرت نے تو انسانوں کو آزاد پیدا کیا لیکن وہ پیدائش سے موت تک مختلف النوع توہمات اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی امانت اُن سے چھینی جا چکی تھی۔ جب خراب حالت یہاں تک پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور حق کو رسول پاکؐ کے ذریعے، حقداروں کے سپرد کرنے کے دور کا آغاز ہوا۔ اقبال نے اس حقیقت کا اظہار رموزِ بے خودی میں ''درمعنی ایں کہ مقصودرسالت محمدیہ تشکیل حریت....'' میں کیا ہے:

تا امینے حق بحقداراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد[۳۳]

ترجمہ: ان حالات میں جناب رسول پاکؐ تشریف لائے اور انھوں نے امین بن کر حقداروں کا حق ان کے سپرد کر دیا۔ پادشاہ کا تخت رعیت کے حوالے کر دیا۔

اب عزت و تکریم کا ایک ہی معیار قائم ہوا اور وہ معیار ہے تقویٰ۔ جو سیرت میں افضل ہے وہی سردار ہے چاہے وہ ایک نادار حبشی ہو۔ انسانیت کے لیے یہ فعل کس نے سرانجام دیا؟ اخوت، حریت اور مساوات کا یہ نعرہ کس نے لگایا؟ یہ تمام پرانے بت کس نے توڑے؟ تمام انسانیت میں تازہ دم جان کس نے ڈالی؟ مذکورہ بالا نظم میں کہتے ہیں

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں خرید[۳۴]

ترجمہ: آپ ﷺ نے آدم کے بدن میں نئی روح پھونک دی۔ غلام کو دوبارہ آقاؤں سے واپس خرید لیا۔

اسلام یعنی رسالت محمدی ﷺ حقیقی معنوں میں ایک انقلاب تھا۔ وہ قدیم دُنیا کی موت اور جدید دُنیا کی تکوین تھی۔ دین کے بارے میں ہر قسم کی سختی منع ہو گئی۔ حریت و مساوات کی تحریکیں اگرچہ عصرِ نو میں بھی جنم لیتی رہی ہیں لیکن انسانیت کی تاریخ میں یہ تمام تقاضے اسلام کے منشور میں شامل ہو کر پہلے وجود میں آ گئے۔ مذکورہ بالا نظم میں اس کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہیں:

حریت زاد از ضمیر پاک او
ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است
چشم در آغوش او وا کردہ است[۳۵]

ترجمہ: آپ کے ضمیر پاک سے حریت نے جنم لیا۔ یہ مزیدار شراب آپؐ ہی کے انگور سے ٹپکی۔ دور حاضر میں جس نے (علم کے) سینکڑوں چراغ روشن کیے ہیں۔ آپ ﷺ ہی کے آغوش میں آنکھ کھوتی ہے۔

جس اسلام نے ''کل مومن اخوۃ'' کہا۔ اس نے تمام بنی نوع انسان کی وحدت کی حقیقت کا راز بھی فاش کیا کہ تمام انسان، مرد و عورت، گورے کالے، دولت مند و مفلس ایک نفسِ واحد کے اعضا ہیں۔[۳۶] مساوات اسلام کی سرشت ہے اور رسالت محمدی ﷺ کی دین۔

بقول ڈاکٹر محمد ریاض:

یہ بات دوسرے مذاہب کے اعتدال پسند پیرووں نے بھی تسلیم کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنی نوع انسان کی گردن کو طوقِ غلامی سے آزاد کرا لیا اور حریت و مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا۔[۳۷]

علامہ اقبال کے نزدیک رسالت محمدی ﷺ اور توحید مسلمانوں کی کامل یک جہتی و یگانگت کے متقاضی ہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

ع ایک ہی سب کا نبی دین بھی، ایمان بھی ایک[۳۸]

آیئے اقبالی نقطۂ نظر سے رسالت محمدی ﷺ کے مقصود ان تین عناصر کا تفصیلی جائزہ لیں:

علامہ اقبال کے نزدیک رسالت کی غرض و غایت اور مقصود یہ ہے کہ انسان کو وہ تین نعمتیں میسر آ جائیں جن کی بدولت وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک لے جا سکے۔ وہ نعمتیں یہ ہیں:

۱- حریت ۲- مساوات ۳- اخوت

خودی کے دو پہلو ہیں: (۱) انفرادی خودی (۲) اجتماعی خودی

انفرادی خودی حریت سے مکمل ہوتی ہے اور اجتماعی خودی اخوت و مساوات سے۔[۳۹]

علامہ اقبال اجتماعی خودی کی تربیت کے لیے حریت، اخوت، مساوات کے ساتھ تنظیم اور عزائم و مقاصد میں اتحاد کو لازم قرار دیتے ہیں۔ جب تک کسی معاشرے کے افراد میں یہ تینوں صفات موجود نہ ہوں اس کے افراد کے لیے اپنی شخصیت کی تکمیل ممکن نہیں۔

اقبال کے ہاں حریت کے معنی صرف سیاسی آزادی نہیں بلکہ اس غلامی سے آزادی کے ہیں جو خدا کی اطاعت، خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری اور ضبطِ نفس کی راہ میں حائل ہو۔ چاہے وہ کسریٰ و قیصر کی غلامی ہو یا کاہن، پاپا، پادری یا برہمن کی۔ کیونکہ کسی قسم کی بیرونی اور خارجی پابندی انسان کی انفرادیت کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتی۔ اقبال نے آزادی اور حریت سے محروم اُس شخص کی تصویر کھینچی ہے جو آفتاب رسالت کے طلوع سے پہلے اس دُنیا کا باسی تھا۔ رسالت نے اُسے حریت، مساوات اور اخوت کا درس دیا اور ایک ایسے سجدے کا سبق دیا جو آدمی کو ہزار سجدے سے نجات دینے کا باعث بنا۔[۴۰]

انسان کی تخلیق کا مقصد اور غرض و غایت اطاعتِ الٰہی و عبادتِ الٰہی ہے۔ لیکن اگر وہ کسی اعتبار سے دوسروں کی غلامی میں ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے فریضہ سے عہدہ برآں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حریت اس مقصد کو پانے کے لیے اوّلین شرط ہے۔

مذہب اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ فرد کے علاوہ جماعت کی تربیت کا بھی ضامن ہے۔ جماعت کی تربیت اور نشو و نما اخوت و مساوات کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسلام نے انسان کو ان تین نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔

قرآن حکیم کے علاوہ دُنیا کی دیگر اکثر مذہبی کتب میں حریت کی تعلیم ناپید ہے۔ ہاں البتہ بعض کتب میں اخوت یا مساوات کی ناقص و مبہم تعلیم موجود ہے۔

قرآن حکیم کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب نے دُنیا کو پہلی مرتبہ حقیقی حریت، اخوت اور مساوات کی تعلیم سے آگاہ کیا اور صرف اسی کو کافی نہ سمجھا بلکہ اُن قوانین کا نفاذ بھی کیا جن کے باعث یہ تینوں اصول زندہ رہ سکتے ہیں۔

قرآن پاک نے انسان کو حریت کی نعمت عطا کرنے کے اعلان کے ساتھ اُن تمام مفاسد کا سدِ باب بھی کیا جو انسان کو حریت کی دولت سے محروم کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱- شرک کی مختلف شکلیں انسان کو حریت سے محروم کرتی ہیں اس لیے قرآن حکیم نے ان تمام صورتوں کو باطل ٹھہرایا۔
۲- ملوکیت اور اس کی مختلف شکلیں بھی انسان کی حریت چھیننے کا سبب ہیں۔ لہٰذا قرآن اس کی تمام شکلوں کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔
۳- مذہبی پیشوا، تارکینِ دُنیا، کاہن اور نجومی، احبار اور اغنیا بھی چونکہ انسانوں کی حریت چھین لیتے ہیں اس لیے اسلام نے ان تمام گروہوں کی مذمت کر کے بزرگی اور فضیلت کا معیار تقویٰ ٹھہرایا۔

دُنیا کے مذاہب کی تاریخ گواہ ہے کہ ان گروہوں نے حیلوں بہانوں سے انسانوں کو اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کی بجائے اپنی اطاعت کے لیے مجبور کیا۔ ہنود میں پنڈتوں اور پروہتوں کا طبقہ، یہود میں احبار کا طبقہ، نصاریٰ میں پادریوں کا طبقہ اور مجوسیوں میں موبدوں کا طبقہ ہر دور میں اپنے پیروکاروں کے قلب وذہن پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اسلام اور رسالت کا مقصود انسان کو صرف اللہ کا غلام بنانا ہے۔ اس لیے اُس نے بنی آدم کو ان تمام طبقات کی غلامی سے نجات عطا کی اور انھیں دُنیا کی تاریخ میں پہلی بار آزادی کی نعمت عطا کی۔

یورپ نے جس نعمت سے انسانوں کو اٹھارہویں صدی عیسوی میں آگاہ کیا، اسلام نے رسالت کے ذریعے وہ نعمت ساتویں صدی میں عام کر دی۔

یوسف سلیم چشتی رقم طراز ہیں:

''اگر انقلابِ فرانس کا موازنہ اُس انقلاب سے کیا جائے جو نبی اکرم ﷺ نے ساتویں صدی میں پیدا کیا تھا تو معلوم ہوگا کہ جس جامعیت کے ساتھ حضور ﷺ نے حریت، اخوت اور مساوات کی تعلیم دنیا کو دی، اس کی نظیر یورپ بایں ہمہ ادعائے ترقی آج بھی پیش نہیں کر سکتا۔''[۱۴۱]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ یورپ نے دُنیا کو صرف سیاسی حریت کا علم دیا لیکن اسلام نے انسان کو حریت کی جملہ اصناف حریتِ نفس، حریتِ ضمیر، حریتِ علم، حریتِ عقل اور حریتِ وطن سے آگاہ کیا۔ گویا جذبۂ حریت مومن کے ضمیر میں ہے اور اس کا فطری حق بھی، جو بالخصوص اسی کو مرحمت کیا گیا ہے۔ لہٰذا کلام اقبال کا بیشتر حصہ مفہومِ حریت، عظمتِ حریت اور مفاداتِ حریت کی وضاحت میں وقف رہا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو روز ازل سے جو عقائد واصول اور جذبات واحساسات عطا کیے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر آزادی ان کا فطری حق ہے جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے۔

مخلوق خدا کی غلامی سے ایک بے دھڑک بغاوت کا نام جہاد ہے۔ اس لیے شریعت کی رو

سے ہر غلام خطہ ''دارالحرب'' ہے۔ جہاں خدا کی طرف سے اس پر یہ چیز فرض کر دی گئی کہ وہ ہر ممکن قربانی سے جابر و مستبد لوگوں کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے مخلوق کی غلامی سے نجات پائے۔ کیونکہ مخلوق کی غلامی مصنوعی اور خود ساختہ غلامی ہے اور خالق کی غلامی قدرتی اور فطری۔ مخلوق کی غلامی کمزور کر دیتی ہے جبکہ خالق کی غلامی دل و دماغ کو روشن و مستحکم کرتی ہے اور گفتار و کردار میں بے باکی، قوت و توانائی، سوز و گداز اور روح اخلاص پیدا کرتی ہے۔ علامہ اقبال رسالتِ محمدیہؐ کے مقصود ''حریت'' کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے ''مردحر'' کے روحانی و عملی ممکنات پر بھی روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔[۴۲]

حریت اسلامیہ کے ثبوت میں کربلا سے بڑا واقعہ اور حضرت امام حسینؑ سے اُونچا کردار کون ادا کر سکتا ہے۔ لہٰذا علامہ نے مختصراً یہ بیان کیا ہے کہ انسان ہر قسم کی ذہنی و جسمانی غلامی سے آزاد ہو جائے اور اس کے قلب میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ رہ جائے۔ یزید بڑا طاقتور حکمران تھا مگر جب اس نے اسلامی خلافت کے اصول پر ضرب لگا کر اسے خاندانی بادشاہت میں بدلنا چاہا تو حضرت امام حسینؑ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ حکمران نے ہر قسم کے حربے، منت سماجت سے لے کر قتل و غارت کی دھمکی تک استعمال کی لیکن حضرت امام حسینؑ کی بے خوف حریت پسند طبیعت کے سامنے کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ انھوں نے خود کو اور ساری آل اولاد کو قربان کر دیا[۴۳] اور حریت کے اصول کو زندہ رکھا۔

علامہ اقبال نے حضرت امام حسینؑ کی حریت پسندی اور مردانگی کو عشق سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کے نزدیک عشق اور حریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حریت پسندی عشق و ایمان کی شرطِ اوّل ہے۔ اقبال ''در معنیٰ حریت اسلامیہ و سرِّ حادثۂ کربلا'' میں فرماتے ہیں:

عشق را آرامِ جاں حرّیت است
ناقہ اش را سارباں حرّیت است[۴۴]

ترجمہ: عشق کو آزادی میں تسکین دل ملتی ہے۔ اس کے ناقہ کی ساربان حریت ہے۔

زندگی میں دو ہی حقیقتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک سچائی، جمہوریت اور حریت کی قوت ہے اور دوسری وہ طاقت ہے جو ہر دم ان اقدار کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ ابراہیم و نمرود، موسیٰؑ و فرعون اور شبیر و یزید کے معرکے اسی ابدی کشمکش کے روپ ہیں اور حیات کے دو

مختلف و متضاد مظہر جو قیامت تک اسی طرح برسرِ پیکار رہیں گے:

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید[۴۵]

ترجمہ: موسیٰ و فرعون اور شبیر و یزید۔ یہ دونوں قوتیں حیات ہی کا اظہار ہیں۔

دنیا میں اس حق و باطل کی آویزش میں قوت شبیری کی بدولت حق قائم ہے اگر یہ قوت نہ ہوتی تو حق کب کا صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ حریت کی ضد ملوکیت بھی ہے۔ چونکہ خدا پرستی کے لیے حریت ضروری ہے۔ اس لیے امام حسینؑ نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر روزِ محشر تک کے لیے ملوکیت کے اصول کو باطل کر دیا۔ اسی لیے تو اقبال ''لا ملوکیت فی الاسلام'' کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملوکیت حریت کو فنا کر دیتی ہے۔ اسلام ملوکیت کا سخت دُشمن ہے۔ اسی کے خاتمہ کے لیے امام حسینؑ نے اپنی جان قربان کی اور توحید کو زندہ رکھا۔ مسلمان اللہ کے علاوہ کسی کا غلام نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔ اقبال مذکورہ بالا نظم میں کہتے ہیں:[۴۶]

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست[۴۷]

ترجمہ: مسلمان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے۔

پھر اقبال نے بتایا ہے کہ خلافتِ راشدہ تک حریت کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی فرد بھی خلیفہ کو نالش کر سکتا تھا اور اُسے عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کر سکتا تھا۔ عورتیں امیر المومنین سے باز پرس کرتیں اور غیر قرآنی فتوے پر احتجاج کرتیں۔ اس نظام حریت پر کاری ضرب امیر معاویہؓ نے لگائی۔ اس ضرب سے مسلم ریاست آج تک مجروح ہے۔ ایک مردِ مجاہد امام حسینؑ نے اس کو برداشت نہ کیا اور اس استبدادی سیاست کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حریت کی حفاظت کی۔ وہ مذکورہ بالا نظم میں کہتے ہیں:

تا قیامت قطعِ استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد[۴۸]

ترجمہ: اس نے قیامت تک کے لیے استبداد کی جڑ کاٹ دیں۔ اس کی موج سے ایک نیا چمن پیدا ہوا۔

یہ حریت تمام انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک انسانی فلاح اسی میں پوشیدہ ہے۔[۴۹] وہ اپنے مقالہ Islam as a Moral and Political Ideal میں لکھتے ہیں:

The turth is that the institution of slavery is a name in Islam, and the idea of individuality reveals itself as a guiding

principle in the entire system of Muhammad law and ethics.[50]

ترجمہ: حق بات یہ ہے کہ اسلام میں غلامی برائے نام ہے اور محمدی قانون اور اخلاق کے سارے نظام میں انفرادیت کا تصوّر ایک رہنما اصول کے طور پر جلوہ گر ہے۔

رسالت محمدیہؐ کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد صرف اللہ کا بندہ ہو اور ہر نوع کی مادی غلامی سے آزاد۔ تبھی اس کی انفرادی خودی مضبوط و مکمل ہو سکتی ہے۔

رسالت محمدیہ ﷺ کا دوسرا مقصود مساوات انسانی ہے۔ مساوات کے معنی یکسانیت کے ہیں۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ پیدائشی مساوات، معاشرتی مساوات، سیاسی مساوات، معاشی مساوات وغیرہ۔ اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں اس مساوات کو درہم برہم کیا گیا ہے۔[۵۱]

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ رسالت محمدیہ ﷺ کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ حریت کے ساتھ ساتھ مساوات کا نفاذ کرے۔ حریت ایک منفی قدر ہے اور اس میں اثباتی پہلو صرف مساوات سے پیدا ہوتا ہے۔ مساوات کا صحیح مفہوم بیان کرتے ہوئے اقبال سلطان مراد اور معمار کی حکایت بیان کرتے ہیں۔ سلطان مراد نے غصے میں معمار کا ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ معمار قاضی کے سامنے فریادی ہوا:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیوٰۃ
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست[۵۲]

ترجمہ: قاضی نے کہا زندگی کا دارومدار قانون قصاد پر ہے۔ اسی قانون سے زندگی استحکام پاتی ہے۔
مسلمان غلام آزاد سے کمتر نہیں نہ بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ سرخ ہے۔

معمار نے اس وقت سلطان کو معاف کر دیا جب قاضی نے سلطان کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر کیا:

گفت از بہرِ خدا بخشیدمش
از برائے مصطفیٰؐ بخشیدمش
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است[۵۳]

ترجمہ: اور کہا میں نے اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خاطر بادشاہ کو معاف کیا
قرآن پاک کی نظر میں آقا و غلام برابر ہیں۔ کوئی بوریا نشیں ہو یا تخت کا وارث۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک حضرت محمد ﷺ تصورِ مساوات کے عظیم پیکر ہیں اور اسلام ہی دُنیا میں وہ واحد طاقت ہے جو اب بھی مساوات کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔[۵۴]

رسالتِ محمدیہ ﷺ کا ایک اور مقصود اخوت ہے۔ قرآن میں ہے:

اِنَّمَا الْمُومِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔[۵۵]

ترجمہ: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

دین کا رشتہ تمام اُمت مسلمہ کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ اس وحدت و اخوت کا روح پرور مظاہرہ پہلی بار ہجرتِ مدینہ کے بعد مواخاۃ کی صورت میں ہوا۔ جب مہاجرین کو انصار کے ساتھ محض دین کی قدرِ مشترک کی بنا پر ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا گیا۔ جائیداد اور مال و دولت یا باغات کی تقسیم کے ساتھ ساتھ چند مخلص صحابہ کرامؓ نے اپنی متعدد بیویوں میں مہاجرین کی خاطر ایک کو طلاق دینے کی پیشکش کی۔ اس طرح یہ ملتِ واحدہ اپنی صحیح تشکیل و آزمائش سے پوری طرح عہدہ برآں ہوئی جسے رسول پاک ﷺ نے جسم سے مشابہت دی تھی۔[۵۶]

حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک ایرانی سپہ سالار جابان نے ایک مسلمان سے پناہ مانگی۔ اُس نے امان دے دی۔ لشکر نے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ سے جابان کو تہ تیغ کرنے کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے فیصلہ دیا کہ جابان کا قتل اخوت اسلامیہ کے منافی ہے اور فوج سے فرمایا: بھائیو! ہم سب مسلمان اور بھائی بھائی ہیں۔ اونچ نیچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا ہر فرد خواہ فوج میں اس کا کوئی بھی مرتبہ و منصب ہو پوری ملت کا نمائندہ ہے اور فرد کی زندگی ملت کی زندگی پر منحصر ہے تو پھر فرد کا عہد پوری ملّت کا عہد قرار پاتا ہے۔ بے شک جابان ہمارا دشمن ہے۔ لیکن اُسے ایک مسلمان سپاہی نے امان دے دی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی تلوار پر اس کا خون حرام ہے:

گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است
مسلمے اُو را اماں بخشودہ است
خونِ او اے معشرِ خیرالانامؐ
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام[۵۷]

ترجمہ: اگرچہ جاباں ہمارا دشمن تھا مگر ایک مسلمان اسے امان دے چکا تھا۔

اے امّتِ خیرالانام ﷺ اب جابان کا خون ہماری تلواروں پر حرام ہے۔

علامہ اقبال کا عقیدہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ اور اُمت مسلمہ کا خاص مشن یہی ہے کہ وہ

عالمگیر اخوت کو عملی جامہ پہنائے۔ جس کی اساس عقیدہ توحید و رسالت ہے۔ کوئی قوم اُسی وقت ایک ہوتی ہے جب اس کے تمام افراد کے دل ایک ہوں اور وہ قلب کی گہرائیوں میں یہ محسوس کریں کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اس لیے وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بھائی کا بھائی سے رشتہ الفت و محبت کا ہوتا ہے اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مساوات کو ملحوظ نہیں رکھے گا یا عدل و انصاف سے پہلو تہی کرے گا۔[۵۸] کیونکہ اسلام نے انسانی مساوات اور مذہبی رواداری پر شدت سے زور دیا ہے۔[۵۹]

پروفیسر محمد منور اخوت و مساوات پر بحث کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''اخوت و مساوات کی بنا پر عالم اسلام سمندر کی طرح تھا اور مسلمان اس میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے اور مچھلیاں خلیجوں، بحیروں اور بحروں کی سرحدیں نہیں جانتیں کہ خلیج بنگال کہاں ختم ہوئی، بحیرہ عرب کہاں سے شروع ہوا، بحرِ ہند کہاں ختم ہوا، بحر الکاہل کا کہاں سے آغاز ہوا۔ عالمِ اسلام کے علاقائی سیاسی حاکم اور سلطان محض علاقائی افسر تھے...... خیمے الگ الگ تھے دل ایک تھے والی بات تھی کلمہ طیبہ پاسپورٹ تھا السلام علیکم ویزا تھا۔ یہ کسی شاعر کی خیال آرائی نہیں یہ ٹھوس حقیقت ہے تاریخ گواہ ہے۔''[۶۰]

مذکورہ بالا سہ گانہ اصولوں کی تفصیل علامہ نے اسلامی تاریخ سے تین واقعات منتخب کر کے دی ہے اور بتایا ہے کہ رسالتِ محمدی کا مقصود حریت، مساوات اور اخوت کے اصولوں کی بنیاد قیاس یا نظریہ پر نہیں ہے بلکہ یہ قابل عمل ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کہ اقبال نے رسالتِ محمدیؐ اور اس کی غرض وغایت کو مختلف پیرائے میں سمجھانے کی کامیاب سعی کی ہے تاکہ مسلمان اس کی پوشیدہ قوتوں کا راز پا کر بے خوف و نڈر ہو جائیں اور تمام عالم کو اپنے لیے مسخر و مفتوح جانیں۔ علم و تحقیق اور ایجاد و اختراع سے فطرت کے چہرے پر پڑے نقابوں کو اُلٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ وہ انسانیت کی معراج پالیں۔ اقبال انسانیت کی بقا اور استحکام کے متمنی ہیں۔ اُن کی تمنا ہے کہ اس مقام اعلیٰ و برتر کو مادی و روحانی ہر دو لحاظ سے سب سے پہلے مسلمان حاصل کریں۔ اُن کے خیال میں مسلمان اس کے زیادہ مستحق ہیں اور یہ نبی پاک ﷺ ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان نے نہ صرف کئی لاکھ سالوں پر محیط غلامی سے نجات پائی بلکہ خوف و ہراس، وہم و گمان، غلامی و پستی، ذلت و حقارت کے بندھنوں سے بھی آزاد ہوا اور عقل و خرد، علم و حکمت اور ایمان و یقین کی فضا میں

سانس لی۔ کائنات میں اپنی عظمت سے آگاہ ہوا۔ اُس کی خودی بیدار ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ قرآن وحدیث کے استقرائی طریقہ علم اور تحقیق وجستجو سے کام لے کر سائنس وایجاد اور صنعت میں عروج حاصل کرتا چلا گیا[۶۱] لہٰذا موجودہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ رسالت کی غرض وغایت کو سمجھیں تاکہ وہ اپنے اصلی مقام، مقام خلافت کو پھر سے پالیں اور کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرکے فاتح عالم بن جائیں کہ اسی کی خوشخبری اُنھیں مختلف انداز میں دی گئی ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ ومصادر

۱- مولانا سید محمد متین ہاشمی، الشفا، بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ، (مترجم)، قاضی عیاض اللہ ابوالفضل، پنڈی بھٹیاں، انجمن اصلاح المسلمین رجسٹرڈ، گوجرانوالہ، ۱۹۸۳ء، ص:: ۲۶۵

۲- محمد عبداللہ الفلاح (مترجم) مفردات القرآن، مصنف امام راغب اصفہانی، المکتبہ القاسمیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۳۵۲، ۳۵۳۔

۳- الحج: ۲۲ آیت: ۵۲

۴- مولانا سید محمد متین ہاشمی، الشفا، مترجم: قاضی عیاض اللہ ابوالفضل، بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ، ص: ۲۴۴۔

۵- مولوی فیروز دین، مترجم بیان المطلوب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری مصنف فیروز سنز، لاہور، س ن، ص: ۲۳۹

۶- سیال، واحد بخش، روحانیت اسلام، بزم اتحاد المسلمین، جے ایس پرنٹرز، لاہور، ۱۴۰۷ھ، ص: ۲۰۵

۷- مولوی فیروز دین، مترجم بیان المطلوب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، از علی ہجویری، حضرت شیخ مخدوم، ص: ۲۳۹

۸- سیال، واحد بخش، روحانیتِ اسلام، ص: ۲۰۵

۹- منیری، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ، ترجمہ مکتوبات صدی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، س ن، ص: ۱۰۰

۱۰- سنبھلی، الحاج محمد اسماعیل، مقامات تصوف، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۵۰

۱۱- بی- کیراڈی ویبوکس (B. Caa DE Vaux) ''ولی'' مشمولہ لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۳، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۳۳

۱۲- علوی، محمد مصطفیٰ، الحقائق، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص: ۱۱۲، ۱۱۳

۱۳- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۹۰

۱۴- مولوی فیروز دین، (مترجم)، بیان المطلوب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، از علی ہجویری، حضرت شیخ مخدوم، ص: ۲۳۹
۱۵- منیری، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ، ترجمہ مکتوباتِ صدی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، س ن، ص: ۹۳، ۹۴، ۹۷
۱۶- الانبیاء: ۲۱، آیت: ۵۱
۱۷- یوسف: ۱۲، آیت: ۳۳
۱۸- مریم: ۱۹، آیت ۱۲، ۱۳
۱۹- کاندھلوی، مولانا محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ ﷺ مکتبہ عثمانیہ جامعہ اشرفیہ، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۲۰
۲۰- انعام: ۶، آیت: ۱۲۴
۲۱- آل عمران: ۳، آیت ۱۷۹
۲۲- البقرہ: ۲، آیت ۲۱۳
۲۳- النجم: ۵۳، آیت: ۵، ۶
۲۴- قدوسی، اعجاز الحق، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۲۷، ۳۲۸
مرحوم سید نذیر نیازی نے اپنے ترجمے میں یہ الفاظ لکھے ہیں ''محمد عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد: واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدے'' دراصل یہ الفاظ ممتاز صوفی ابو سلمان الدارانی (متوفی ۲۱۵ھ) کے ہیں جو اس طرح ہیں ''لو وصلوا و مارجعوا'' خود سید نذیر نیازی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ انھیں حضرت گنگوہی کے اصل الفاظ نہیں ملے، انھوں نے انگریزی الفاظ کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔ دیکھیے:
ڈاکٹر وحید عشرت، خطبہ مسلم ثقافت کی روح، مشمولہ ''اقبالیات''، رئیس ارادت، محمد سہیل عمر، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان، جولائی ستمبر ۱۹۹۹ء، ص: ۱۱۹، ۱۲۰
۲۵- سید نذیر نیازی، مترجم، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۱۸۸
۲۵- ایضاً، ص: ۳۴
۲۷- ایضاً، ص: ۳۱
۲۸- نیازی، سید نذیر، مضمون شعور نبوت، مشمولہ خطبات بیادِ اقبال، شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۰۱، ۱۰۲
۲۹- مولوی فیروز دین، (مترجم) بیان المطلوب، اردو ترجمہ کشف المحجوب، ص: ۲۴۵
۳۰- نیازی، سید نذیر، مضمون شعورِ نبوت، مشمولہ خطبات بیاد اقبال، ص: ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴
۳۱- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۳۳
۳۲- محمود عاصم (مرتب)، اقبال کے ملّی افکار، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۲۶۹
۳۳- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۳۳۔

۳۴- سید ظفر حسین برنی، (مرتب)، کلیات مکاتیب اقبال، ج:۴، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص:۴۵، ۴۶
۳۵- نیازی، سید نذیر، مضمون شعورِ نبوت مشمولہ، خطبات بیادِ اقبال، ص:۱۰۴
۳۶- ایضاً، ص:۱۰۴
۳۷- ندوی، مولانا محمد حنیف، مضمون، قرآن حکیم اور اطاعت رسول مشمولہ نقوش، ج:۱، مدیر جاوید طفیل، شمارہ نمبر ۱۳۰، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۳۰۷
۳۸- فاروقی، ڈاکٹر برہان احمد، مضمون، علامہ اقبال اور مخصوص صوفیانہ واردات، (مشمولہ)، خطبات بیادِ اقبال، شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۱۳۴
۳۹- نیازی، سید نذیر، مضمون شعورِ نبوت، مشمولہ خطبات بیاد اقبال، ص:۱۰۵
۴۰- نیازی، سید نذیر (مترجم)، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص:۱۳۳۔
۴۱- ایضاً، ص:۱۸۹
۴۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ ، کلیاتِ اقبال فارسی ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، بار ششم ۱۹۹۰ء، ص:۶۳۸/۵۱، ۶۳۹/۵۲
۴۳- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن، ص:۵۰۸
۴۴- ایضاً، ص:۵۰۶ تا ۵۱۰
۴۵- عشرت، ڈاکٹر وحید، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا منہاج، مشمولہ اقبالیات، اُردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، جنوری مارچ ۱۹۹۷ء، نمبر ۳۷، شمارہ ۴، ص ۹۵
۴۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مترجم سید نذیر نیازی، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص:۲۶۔۳۳
۴۷- عشرت، ڈاکٹر وحید، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا منہاج، ص:۹۸
۴۸- ایضاً، ص:۹۶
۴۹- ندوی، مولانا محمد حنیف، بھٹی، مولانا محمد اسحاق، چہرۂ نبوت ﷺ قرآنِ پاک کے آئینے میں، علم وعرفان پبلشرز، ۱۹۹۹ء، ص:۱۳۰
۵۰- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص:۱۸۹
۵۱- محمود حسین، مولانا، مضمون ''وحی'' مشمولہ نقوش، ج ۲، مدیر جاوید طفیل شمارہ نمبر ۱۳۰، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۶۸۳
۵۲- فراقی، ڈاکٹر تحسین، نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۱۸۹۔۱۹۰
۵۳- ایضاً، ص:۱۹۰
۵۴- النجم: ۵۳، آیت: ۳، ۴
۵۵- نیازی، سید نذیر، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار سوم، ۲۰۰۰ء، ص:۶۲

۵۶- عمر، احمد خالد، اقبال اور مقام رسالت، مشمولہ، معارف ۱۹۹۰ء، ج ۲۱، عدد ۱۱، ص: ۱۶۰
۵۷- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۱۸۹
۵۸- ایضاً، ص: ۱۹۰
۵۹- نیازی، سید نذیر، مضمون شعورِ نبوت، ص: ۱۰۸-۱۱۶
۶۰- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۱۹۱، ۱۹۲
۶۱- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، بزم اقبال، لاہور، بار پنجم ۱۹۸۳ء، ص: ۹۰، ۱۰۰
۶۲- عبدالغفار شکیل (مرتب)، ایم۔اے نوادرِ اقبال، مصنف ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۳۷۷ھ، ص: ۱۲۹
۶۳- محمود عاصم (مرتب)، اقبال کے ملّی افکار، ص: ۲۵۶
۶۴- ندوی، محمد اسحاق صدیقی، مضمون، نبی آخرالزمان کے بعد ختم نبوت کی ضرورت، اہمیت اور مصلحت، مشمولہ رسالہ ہفت روزہ ہلال، ایڈیٹر محمد ممتاز اقبال، ج: ۲۷ نمبر ۱۳-۱۸، ہلال روڈ، راولپنڈی، اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص: ۱۰۴
۶۵- علوی، ڈاکٹر خالد، مضمون تصورِ رسالت، (مشمولہ) تصوراتِ اقبال، (مرتب) سید اسعد گیلانی، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۴۵
۶۶- نیازی، سید نذیر (مترجم)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۱۹۳-۱۹۶
۶۷- ایضاً، ص: ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴
۶۸- ایضاً، ص: ۲۹۴، ۲۹۵
۶۹- محمود عاصم (مرتب)، اقبال کے ملّی افکار، ص: ۲۶۸
۷۰- نیازی، سید نذیر، شعورِ نبوت، ص: ۱۱۷-۱۱۹
۷۱- جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکار اقبال، (تشریحات جاوید)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۵۱
۷۲- شیما مجید، مرتبہ، نفائس اقبال، مصنف سید عابد علی عابد، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۵
۷۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز بار ششم، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۶۷/۷۵
۷۴- ندوی، مولانا محمد حنیف، مضمون، قرآن حکیم اور اطاعت رسول، نقوش، ج: ۱، ص: ۴۱
۷۵- منیری، شیخ شرف الدین یحییٰ، ترجمہ مکتوباتِ صدی، ۱۶۱
۷۶- ندوی، مولانا محمد حنیف، مضمون، قرآن حکیم اور اطاعت رسول، نقوش، ج: ۱، ص: ۴۱
۷۷- منیری، شیخ شرف الدین یحییٰ، ترجمہ مکتوباتِ صدی، ص: ۱۶۵، ۱۶۶
۷۸- علوی، ڈاکٹر خالد، اقبال اور احیائے دین، مضمون، ختم نبوت، مکتبہ علمیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۶۶، ۶۸

ب

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۲۶/۱۲۶

۲- الفتح:۴۸، آیت:۲۸

۳- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموزِ بے خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن، ص:۱۱۸

۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۹۰/۹۰

۵- محمد عبداللہ قریشی، مرتب آئینۂ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۴۰

۶- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجومِ ہدایت، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۶۰

۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۱/۱۰۱

۸- اظہر، افضل حسین، مضمون، اقبال اور عشق رسول ﷺ مشمولہ اقبال شناسی اور ادبی دنیا، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء، ص:۱۴۲

۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۳۹/۴۳۱

۱۰- ایضاً، ص:۹۴/۳۸۶

۱۱- ضربِ کلیم، ص:۸۵/۵۴۷

۱۲- بشیر احمد ڈار، (مرتب) انوارِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۴۶

۱۳- الحج:۲۲، آیت:۷۸

۱۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۲

۱۵- محمد ہادی حسین، (مترجم) روحِ اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۲۹۱

۱۶- السبا:۳۴، آیت:۲۸

۱۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۲۸/۱۲۸

۱۸- الانشراح:۹۴، آیت:۱-۴

۱۹- برنی، سید مظفر حسین برنی، (مرتب) کلیات مکاتیب اقبال، ج: اوّل اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۲۴

۲۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۳۶/۲۲۰

۲۱- ڈاکٹر محمد ریاض، (مترجم)، شہپر جبریل، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۱۸۶

۲۲- صدیقی، نعیم، محسن انسانیت، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص:۳۱

۲۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۹۲/۹۲

۲۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مثنوی پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۷/۸۱۳

۲۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۶/۴۷۸

۲۶- احمد، خورشید، اسلامی نظریہ حیات، کراچی، شعبہ تصنیف و تالیف، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۱۹
۲۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۲۳/۱۲۳
۲۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۲۱/۱۲۱
۲۹- یونس جاوید، مرتب صحیفہ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص: ۶۳
۳۰- وحیدالدین، فقیر سید، روز گار فقیر، ج: ا، آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۰، ۲۱
۳۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۱/۱۰۱
۳۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۲/۱۰۲
۳۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۳/۱۰۳
۳۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۴/۱۰۴
۳۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۴/۱۰۴
۳۶- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص: ۵۳۳-۵۳۶
۳۷- ریاض، ڈاکٹر محمد، مضمون، اقبال اور سیرت رسول اکرم ﷺ، مشمولہ تقاریر بیاد اقبال، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص: ۹۸
۳۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۲۰۲/۲۰۲
۳۹- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموزِ بے خودی، ص: ۱۲۳
۴۰- رفیق، سعید احمد، اقبال کا نظریہ اخلاق، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۴۹
۴۱- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموزِ بے خودی، ص: ۱۲۳-۱۲۵
۴۲- طارق، عبدالرحمٰن، جوہرِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص: ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۴
۴۳- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص: ۵۳۷
۴۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۹/۱۰۹
۴۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۰/۱۱۰
۴۶- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموزِ بے خودی، ص: ۱۴۵-۱۴۷
۴۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۱/۱۱۱
۴۸- ایضاً، ص: ۱۱۰/۱۱۰
۴۹- شیخ عطاء اللہ، (مرتب) اقبال نامہ (حصہ اوّل)، لاہور، شیخ محمد اشرف اینڈ سنز، ۱۹۵۱ء، س ن، ص: ۴۱۰
50- Sharwani Latif Ahmad(Editor), Speeches Writing and Statements of Iqbal, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, Edition: 4th, 1995, P. 104
۵۱- علوی، خالد، اسلام کا معاشرتی نظام، المکتبۃ العلمیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص: ۳۳۸
۵۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۸/۱۰۸
۵۳- ایضاً، ص: ۱۰۸/۱۰۸

۵۴- افتخار احمد صدیقی (مترجم)، شذرات فکر اقبال، لاہور، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص:۱۳۰
۵۵- الحجرات: ۴۹، آیت: ۱۰
۵۶- درانی، عطش، اسلامی تہذیب و ثقافت، شاخ زرین، گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۲۹، ۳۰
۵۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۰۶/۱۰۶
۵۸- صدیقی، بختیار حسین، اقبال بحیثیت مفکرِ تعلیم، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۴۰
۵۹- حسن، ڈاکٹر ملک مظفر، مکارمِ اخلاق، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص: ۳۲۰
۶۰- منور، پروفیسر محمد، ایقانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۴۸
۶۱- بارہوی، کرنل سید نواب عالم، بصیرتِ اقبال، راولپنڈی، آرمی ایجوکیشن پریس، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۶۸، ۱۶۹

☆☆☆☆

باب سوم

انبیاء کرامؑ اقبال کی نظر میں

حضرت آدم علیہ السلام

اقبال کے کلام کا خلاصہ در خلاصہ کرتے چلے جائیں تو آخر پہ ایک لفظ بچتا ہے "خودی"۔ اقبال کے تمام بنیادی افکار اسی نظریۂ خودی کے ماتحت ہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسانی خودی مضبوط ہو اور ہر لحہ مرتبۂ کمال تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اسی نکتہ کو وہ مختلف انداز سے سمجھاتے ہیں اور افرادِ ملت کے سامنے اہم ہستیوں کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں تا کہ وہ سبق حاصل کریں۔ حضرت آدمؑ ان ہستیوں میں سے ایک اہم ہستی ہیں جن کو اقبال نے چنا ہے۔ اقبال کے نزدیک حضرت آدمؑ کی شخصیت مضبوط خودی کی حامل اور سوز سے لبریز ہے۔

ذیل میں ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اقبال نے حضرت آدمؑ کی سیرت و کردار کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔

قرآن پاک میں انسان اوّل اور پیغمبر اوّل حضرت آدمؑ کو ٹھہرایا گیا ہے۔ انبیاء کرامؑ کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ اُن کا ہے۔ حضرت آدمؑ کا ذکر سورہ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور اوصاف دونوں کے ساتھ اور سورہ حجر و ص میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

حضرت آدمؑ کے نام کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ عربی ہے یا عجمی۔ بعض نے عربی اور بعض نے عجمی کہا ہے۔ حافظ بدرالدین عینی نے آپ کی کنیت ابوالبشر بیان کی ہے۔ والبی نے حضرت ابن عباسؓ سے آپ کی کنیت ابومحمد روایت کی ہے۔ قتادہ کے مطابق جنت میں حضرت آدمؑ کے علاوہ اور کسی کو کنیت سے یاد نہ کیا جائے گا۔ آپ کی کنیت رسول پاک ﷺ کے

شرف کے بیان کے لیے ابو محمد ہو گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو مٹی سے تخلیق کیا۔ ان کا خمیر تیار ہونے سے پہلے ہی ملائکہ کو بتایا کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہے جو بشر کہلائے گی اور زمین میں ہماری خلافت کا اعزاز حاصل کرے گی۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم زیادہ عبادت گزار ہیں۔ آدم کی تخلیق کیوں کر؟ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔[2]

حضرت آدمؑ کا خمیر نت نئی تبدیلی قبول کر لینے کی صلاحیت رکھنے والی مٹی سے گوندھا گیا۔ جب یہ مٹی ٹھیکری کی طرح آواز دینے اور کھنکھنانے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کے جسم میں اپنی روح پھونکی۔ وہ بیک وقت گوشت پوست، ہڈی پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور ارادہ وشعور، حس و عقل، اور وجدانی جذبات و کیفیات کا حامل دکھائی دینے لگا۔[3] اقبال پیامِ مشرق کی نظم ''تسخیرِ فطرت'' میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے ، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ درخاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد[4]

ترجمہ: عشق نے نعرہ بلند کیا کہ ایک خونیں جگر پیدا ہو گیا۔ حسن شرما گیا کہ صاحبِ نظر آ پہنچا

فطرت چیں بچیں ہوئی کہ (اس) جہان مجبور کی خاک سے ایسی با اختیار ہستی وجود میں آئی جو اپنے آپ کا شعور رکھتی ہے جو اپنے آپ کو توڑ کر نئے سرے سے بنا سکتی ہے۔

آسمان سے شبستانِ ازل تک یہ خبر پہنچی، پردوں میں رہنے والو! ہوشیار ہو جاؤ! پردے چاک کر دینے والا آ موجود ہوا۔

آرزو جو آغوش حیات میں اپنے آپ سے بے خبر (سوتی) تھی، اس نے آنکھ کھولی اور ایک نیا جہان وجود میں آ گیا۔

زندگی نے کہا: میں ساری عمر خاک میں تڑپتی رہی۔ تب کہیں جا کر اس پرانے گنبد (آسمان) سے راستہ پیدا ہوا۔

عشق نے آدم کی پیدائش پر یہ نعرہ لگایا کہ ایک ''خونیں جگرے'' پیدا ہو گیا ہے اور حسن نے کانپتے شرماتے کہا کہ ایک ''صاحب نظرے'' آ پہنچا ہے۔ فطرت نے چیں بچیں ہوتے ہوئے کہا کہ جہان مجبور کی خاک سے ایک ایسی با اختیار ہستی وجود میں آ گئی ہے جو ''خودگرے، خود شکنے اور خودنگرے'' ہے۔ جب آسمان سے شبستانِ ازل تک یہ خبر پہنچی تو اس نے پردے میں رہنے والوں سے کہا ہوشیار ہو جاؤ ایک ''پردہ درے'' پیدا ہو گیا ہے زندگی نے کہا میں تمام عمر خاک میں تڑپتی رہی تب کہیں جا کر اس ''گنبدِ دیرینہ'' سے ایک راستہ پیدا ہوا ہے اور آرزو نے جنم لیا ہے۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق سے پہلے کسی ہستی میں ''آرزو'' شامل نہ تھی اور کیسے ہو سکتی تھی؟

بقول یوسف سلیم چشتی:

آرزو موقوف ہے شعورِ ذات پر اور یہ دولت انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ جب انسان پیدا ہوا تو آرزو جو آغوش حیات میں خفتہ تھی بیدار ہو گئی یعنی انسان ہی اس کائنات میں وہ ہستی ہے جس میں کسی نصب العین کو حاصل کرنے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ اقبال نے نہایت بجا طور پر آرزو کی کارفرمائی کو ''پیدائش جہاں دیگر'' سے تعبیر کیا ہے کیونکہ آرزو (انسان) کے ظہور سے پہلے دنیا میں تہذیب و تمدن کا کہیں نشان نہ تھا نہ زراعت تھی نہ صنعت و حرفت، نہ باغبانی، نہ کاشتکاری، نہ تعمیر، نہ عمارت، نہ خاندان، نہ قبیلہ، نہ صلح، نہ جنگ، نہ آلات، نہ ظروف، نہ ساز نہ سامان، یہ رونق، یہ حرکت، یہ ترقی، یہ تمدن، یہ شہر، یہ باغات، یہ سب آرزو (ترقی کی خواہش) ہی کے مختلف کرشمے ہیں۔[۵]

حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے غرور و تکبر کی وجہ سے انکار کر دیا۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں اس واقعہ کے اسی حصہ کو بیان کیا گیا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ز وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ o[۶]

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ غرور کیا اور کافر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب اور قلوب کے بھیدوں سے آگاہ ہے، مگر اس نے امتحان اور آزمائش کے لیے ابلیس سے پوچھا کس بات نے تجھے جھکنے سے منع کیا؟ تو ابلیس نے جواب میں کہا کہ میں حضرت آدمؑ سے بہتر ہوں۔ اس لیے مجھے آگ سے تخلیق کیا گیا اور حضرت آدمؑ کو طین یعنی سیاہ مٹی سے۔[7] قرآن حکیم میں ہے:

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ o[8]

ترجمہ: فرمایا کس چیز نے تجھے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا۔

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ آدم خاکی مخلوق ہے اور وہ ناری۔ خاک کو آگ سے کیا تعلق؟ شیطان کے اس متکبر جواب پر ابلیس کے باطنی عجب وغرور سے آگاہ اللہ نے شیطان پر واضح کر دیا۔[9] کہ جہالت سے پیدا شدہ غرور نے تجھے اتنا اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترامِ خالقیت سے منہ موڑ بیٹھا۔ پس تو ابدی ہلاکت کا مستحق ہے۔ ابلیس نے معافی کا خواستگار ہونے اور توبہ وندامت کی بجائے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کی مہلت کی دعا مانگی اور کہا کہ طویل عمر کے لیے میری رسی دراز کر دے۔ حکمتِ الٰہی بھی اسی کی متقاضی تھی۔ لہٰذا اس کی درخواست منظور کر لی گئی۔ اُس نے اپنی شیطانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں چاروں طرف سے اولادِ آدمؑ کو گمراہ کروں گا اور ان کی اکثریت کو تیرا ناشکر گزار بنا دوں گا۔ البتہ تیرے مخلص بندے گمراہ نہ ہوں گے۔ محفوظ رہیں گے۔[10] قرآن پاک کی حسب ذیل آیات ان ہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَالَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ o قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ o قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ o وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ o قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ o قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ o اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ o قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ o اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ o قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِيْمٌ o اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ o وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ o[11]

ترجمہ: فرمایا اے ابلیس تجھے کیا کہ ہوا سجدہ کرنے والوں سے الگ رہا بولا مجھے زیبا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے بجتی مٹی سے بنایا جو سیاہ بودار گارے سے تھی۔ فرمایا تو جنت سے نکل جا کہ

تو مردود ہے اور بے شک قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔ بولا اے میرے رب تو مجھے مہلت دے اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں۔ فرمایا تو ان میں سے ہے جن کو اس معلوم وقت کے دن تک مہلت ہے۔ اے رب میرے قسم اس کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔ میں انھیں زمین میں بہلاوے دوں گا اور ضرور میں ان سب کو بے راہ کروں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ فرمایا یہ راستہ سیدھا میری طرف آتا ہے۔ بے شک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں سوائے ان گمراہوں کے جو تیرا ساتھ دیں اور بے شک جہنم ان سب کا وعدہ ہے۔

اقبال نے اس تفصیلی قصہّ کو بڑی خوبصورتی سے اشعار میں سمویا ہے۔ نظم ''تسخیرِ فطرت'' کے ''انکارِ ابلیس'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

نوریٔ ناداں نیم، سجدہ بآدم برم!
او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم!
آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو، پیر شود در برم[۱۲]

ترجمہ: میں بے وقوف فرشتہ نہیں ہوں کہ آدم کو سجدہ کروں وہ خاکی نہاد ہے اور میں پیدائش کے لحاظ سے آذر (آتشیں) ہوں۔

خاکی سرشت آدم جو پست نظر اور کم حوصلہ ہے، یہ پیدا تو تمھاری آغوش میں ہوا، مگر عمر رسیدہ میرے پہلو میں ہوگا۔

شیطان نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں بیوقوف نہیں جو آدم کو سجدہ کروں وہ خاکی نہاد ہے اور میں پیدائش کے لحاظ سے آزر (آتش) ہوں۔

می تپد از سوزِ من، خونِ رگِ کائنات
من بہ دوِ صرصرم، من بہ غوِ تندرم
رابطۂ سالمات، ضابطۂ اُمّہات
سوزم و سازے دہم، آتشِ مینا گرم[۱۳]

ترجمہ: میرے سوز سے کائنات کی رگوں میں خون جوش مارتا ہے، میرے اندر بادِ صرصر کی تیزی اور طوفان کی کڑک ہے۔ اینٹوں کا باہم ملاپ، اقوام کے قوانین، ان سب کو مَیں ہی سوز و ساز عطا کرتا ہوں۔ میں وہ آتش ہوں جو شراب کی صراحی بناتی ہے۔

اقبال نے ابلیس کی زبان سے آدم کو سجدہ سے انکار کو بیان کیا ہے۔ ابلیس نے آدم کو خاکی ہونے کی وجہ سے سجدہ سے انکار کیا اور ملائکہ کو سجدہ کرنے کی وجہ سے ناداں وکم حوصلہ گردانا اور ملائکہ کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر و بہادر۔ اقبال نے اس واقعہ کو نظم کر کے بتایا ہے کہ ابلیس کا آدمؑ کو پست نظر اور کم حوصلہ کہنا درحقیقت خود فریبی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اصل میں وہ خود ناداں، پست نظر اور کم حوصلہ ہے۔ لہٰذا اپنی اس نادانی اور پست نظری کی وجہ سے وہ رتبۂ آدم کو نہ سمجھ سکا اور کم حوصلہ ہونے کی وجہ سے حکم ربّی کا انکار کیا۔ ''خاکی'' کو سجدہ نہ کیا۔ اسی سبب سے راندۂ درگاہ ہوا اس نے ذلیل و پست فطرت کا اظہار آدم کو بہکانے کی اجازت لے کر کیا۔

''ابلیس ویزداں'' نظم ایک مکالمہ ہے جس میں اقبال نے محی الدین ابن عربی کی شہرہ آفاق کتاب ''فصوص الحکم'' سے مسئلہ تقدیر کے متعلق کچھ مطالب اخذ کر کے شعر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیے ہیں[۱۴] اور ابلیس کے سجدہ سے انکار کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ دیکھیے:

ابلیس

اے خدائے کُن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بَیر
آہ! وہ زندانی نزدیک و دُور و دیر و زُود
حرفِ اِستکبار، تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں

کب کُھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد، اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود!

یزداں (فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے، تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود![۱۵]

ابلیس یزداں سے ہمکلام ہو کر کہتا ہے کہ اے خالق کون و مکان، کن فکاں مجھے آدم سے کوئی عداوت نہیں۔ وہ آدم جو زمان و مکاں کی قیود میں گرفتار ہے، بھلا وہ اس لائق کہاں تھا کہ میں اس مٹی کے بنے پتلے سے، اُس زندائی نزدیک و دور سے دشمنی مول لیتا؟ اور نہ ہی مجھ میں اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ میں اعلانیہ تیرے حکم کو ماننے سے انکاری ہوتا۔ حرفِ استکبار اس لیے سرزد ہوا کہ تیری رضا ہی نہ تھی کہ میں آدم کو سجدہ کرتا۔ اس لیے میں قابل سرزنش نہیں ہوں۔ اس پر اللہ نے ابلیس سے دریافت کیا کہ یہ راز تجھ پر کب عیاں ہوا؟ انکار سے پہلے یا انکار کے بعد؟ تو ابلیس نے جواب دیا کہ اے اپنی تجلی سے موجودات کو درجۂ کمال تک پہنچانے والے! مجھ پر یہ راز انکار کے بعد کھلا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں سے مخاطب ہو کر یہ سب ابلیس کی پستی فطرت قرار دیتا ہے۔[۱۶]

یہ نظم اقبال کے شاعرانہ کمال، عالمانہ بصارت و بلاغت کی عمدہ تصویر ہے۔ ابلیس کا سجدے سے انکار اور اس کی ازلی آدم دشمنی صرف حضرت آدمؑ تک محدود نہیں بلکہ اس دور کے آدم اور قیامت تک کے آدم کے لیے بھی اس کی یہ دشمنی قائم رہے گی۔ آدمؑ کا دشمن ابلیس اپنی پستی فطرت کی وجہ سے آدمؑ کو کم حقیقت، زندانی نزدیک و دور، زبان و مکان کی حدود میں مقید گردانتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ خود صرف آدم کی عداوت کا زندانی ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض آدم، زندانی نزدیک دور و دیر و زود کیسے ہو سکتا ہے؟

دراصل اقبال نے نائب حق کے بلند مرتبہ اور ابلیس کی فطرت کی پستی کو عیاں کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے آدم کو بتایا ہے کہ پست فطرت ابلیس، ہر وقت آدم پر حملہ پر آمادہ رہتا ہے اس لیے اس کے وار سے بچنے کی کوشش ضروری ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ نے ازل ہی سے آدمؑ کو ابلیس کے مقابل بلند مقام عطا کیا ہے۔ وہ ذات اب بھی ابلیس کے بالمقابل آدم کو رسوا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا اپنے اندر کے آدم کو بیدار کر کے شیطان کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے کہ بہانہ بازی و حکمِ رَبّی کا انکار اور شکست کھانا شیطان کی ذات کی صفات ہیں۔ آدم حکم ربی بجالانے والا اور کائنات میں اس کے نظام کو رائج کرنے والا ہے۔ یہ کائنات اُسی کے لیے پیدا کی گئی ہے وہ بحیثیت نائب خدا اس کا حاکم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو تخلیق کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ مَیں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے سن کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ ایسی ہستی کو تخلیق کیا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خون ریزی کرے گی۔ حالانکہ ہم تیری حمد وثنا کرتے ہیں اور تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تخلیق کر کے اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت ''علم'' سے نوازا۔ آدمؑ کو علمِ اشیاء عطا فرمایا۔ پھر فرشتوں کے سامنے پیش کر کے دریافت کیا۔ تم ان اشیاء کے متعلق علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم رہے۔[۱۷] بارگاہ صمدیت سے قرب رکھنے کی وجہ سے سمجھ گئے کہ خلافتِ الٰہیہ کا مدار تسبیح وتہلیل اور تقدیس وتمجید پر نہیں بلکہ صفت ''علم'' پر ہے۔[۱۸] حکومت ارضی یعنی خلافت علم کے بغیر ناممکن ہے۔ پس جب آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا مظہر اتم بنایا ہے تو بے شک وہی ''خلیفۃ اللہ فی الارض'' بننے کا مستحق ہے نہ کہ ہم فرشتے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ o قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ o[۱۹]

ترجمہ: اور اللہ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے پھر سب اشیاء کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ۔ بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو ہی علم وحکمت والا ہے۔ فرمایا اے آدم! بتادے انھیں سب اشیاء کے نام۔ جب اس نے (یعنی آدمؑ) انھیں سب کے نام بتادیے تو فرمایا مَیں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

اقبال اس واقعہ کی طرف ''مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی'' میں یوں اشارہ کرتے ہیں:

مُدّعائے علّم الاسماستے
سِرّ سبحان الّذی اسراستے[۲۰]

ترجمہ: وہ قرآن پاک کی اس آیت پاک کا مدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیے۔ وہ اسرا کے بھیدا کا راز دان ہے۔ (دنیوی اور روحانی علوم سے آشنا ہوتا ہے۔)

ایسے ہی نظم ''در معنی ایں کہ توسیعِ حیاتِ ملّیہ از تسخیرِ قوائے نظامِ عالم است'' میں کہتے ہیں:

علم اَسْمَا اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است[۲۱]

ترجمہ: اشیا کائنات کا علم حاصل کرنے سے ہی آدم کا وقار ہے اور اشیا کی حکمت جان لینے سے اس کا تحفظ ہے۔

آدم قرآن پاک کی اس آیت کا مدّعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام اشیا کے نام سکھا دیے۔ وہ اسرا کے بھید کا رازداں ہے یعنی دینی اور روحانی علوم سے آشنا ہے اور اسی اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی وجہ سے اس کا وقار ہے اور اشیا کی حکمت جان لینے میں اس کی حفاظت ہے۔ بالواسطہ اقبال اُمّت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ آدمؑ جس کی برتری اور فضلیت کا راز قرآن پاک میں "علمِ اَسمَاء" بتا دیا گیا ہے جو کائنات کے اسرار بستہ سے آگاہ ہے۔ وہ اب اگر علم سے محروم رہے، سائنس اور حکمت سے ناآشنا ہو تو یہ اس کی بدبختی ہے۔[۲۲] اس کے دین نے تو اس کے شوق کے سمندر کو مہمیز لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ نا معلوم یہ امت حصولِ علم کی طرف دل کی گہرائیوں سے متوجہ کیوں نہیں ہوتی۔ اس کے افراد میں سوز و سازِ رومی اور پیچ و تاب رازی پیدا کیوں نہیں ہوتا؟ درحقیقت اقبال امتِ مسلمہ کو اس علم کے حصول کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں جس علم کی بدولت آدمؑ کو ملائکہ پر برتری ملی کہ اسی علم کے ذریعے امت کے افراد عناصرِ فطرت پر حکمرانی کر سکتے ہیں۔ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکتے ہیں اور پرانے جہاں کو ختم کر کے نئی دنیا تخلیق کر سکتے ہیں۔

کتب تفاسیر کے مطابق حضرت آدمؑ ایک عرصہ تک تنہا زندگی گزارتے رہے مگر وہ اپنی زندگی اور آرام وسکون میں ایک وحشت اور خلا محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم پر اونگھ ڈال کر حضرت حوا کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ حضرت آدمؑ اپنا ساتھی پا کر بہت خوش ہوئے۔ دلی اطمینان محسوس کیا۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو جنت میں رہنے اور اُس کی ہر شے سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت تھی[۲۳] سوائے ایک معین درخت کے کہ وہ اس سے کچھ نہ کھائیں بلکہ اس کے پاس بھی نہ جائیں۔ ابلیس نے موقع پا کر حضرت آدمؑ و حواؑ کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجرِ خلد" ہے۔ اس کے پھل کا کھانا جنت کے دائمی آرام و سکونت اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ضامن ہے۔ شیطان نے قسمیں کھا کر اُن کو یہ باور کرایا کہ میں تمھاری بھلائی کا خواہش مند ہوں نہ کہ دشمن۔ یہ سب سننے کے بعد حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ میں سب سے پہلے نسیان ظاہر ہوا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو فراموش کر دیا اور شیطان کے پھسلاوے میں آ کر اُس

درخت کا پھل کھالیا۔[۲۴]

پھل یا دانہ کھاتے ہی اُن کے بشری لوازم ظاہر ہو گئے۔ سرکاری لباس اتار لیا گیا۔ اپنے آپ کو بے لباس دیکھ کر انھوں نے جلدی سے جنت کے درختوں کے پتوں کو بدن ڈھانپنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر لیا۔

اقبال نے ''مئ باقی'' کی ایک غزل میں اس واقعہ کو پیش کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

جرمِ ما از دانۂ، تقصیر او از سجدۂ
نے بآں بیچارہ می سازی، نہ با ماساختی[۲۵]

ترجمہ: ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم نے ایک دانہ کھالیا، اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک سجدہ نہ کیا۔
نہ آپ نے اس بیچارے کا جرم معاف کیا اور نہ ہم سے موافقت کی۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''حضرت آدمؑ وحوا اور اغوائے شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لیے ننگا ہونا اور قابل شرم اعضا کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر و فساد کا مقدمہ ہے۔ انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اس کو ننگا کرنے کی صورت میں ہوا۔ آج بھی نئ شیطانی تہذیب انسان کو برہنہ یا نیم برہنہ کرنے میں لگی ہوئی ہے...... ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور پیدائشی ضرورت ہے جو اوّل دن سے اس کے ساتھ ہے۔''[۲۶]

ایک روایت ہے کہ حضرت آدمؑ جمعہ کے روز پیدا ہوئے۔ آپ پیدائشی ساٹھ ہاتھ کے تھے اور پیدائشی عالم و عارف باللہ[۲۷] آپ طویل القامت تھے۔ رنگ گندم گوں تھا اور بال بکثرت تھے۔ پھر جب انھوں نے پھل کھایا جس سے مخالفت تھی تو شرم گاہ کھل گئی تو انھوں نے جنت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک درخت نے ان کے بال پکڑ لیے۔ پس اللہ کی طرف سے آواز آئی کہ اے آدمؑ مجھ سے بھاگتا ہے حضرت آدمؑ نے فرمایا تجھ سے نہیں بھاگتا بلکہ شرماتا ہوں[۲۸] حضرت آدمؑ نے جیسے ہی پھل کھایا عتابِ الٰہی نازل ہوا۔ حضرت آدمؑ سے حکم عدولی کا سبب دریافت کیا گیا۔ انھوں نے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کی وجہ سے شیطان کی طرف مناظرہ کرنے کی بجائے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور آئندہ غلطی نہ کرنے کا عزم کیا اور توبہ کے طلب گار ہوئے۔[۲۹] اللہ تعالیٰ نے اُن کا عذر قبول فرمالیا اور اُن کی توبہ قبول کی لیکن بہشت سے نکلنے اور

دنیا میں رہنے کا حکم برقرار رکھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ آدمؑ دنیا ہی میں قیام کرکے اپنی خفیہ وخوابیدہ صلاحیتوں کو عمل میں لاسکیں گے۔ درحقیقت وہ دُنیا کے لیے ہی خلیفۂ حق بنائے گئے تھے نہ کہ بہشت کے لیے۔[۳۰] اقبال ''مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی'' میں کہتے ہیں:

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است[۳۱]

ترجمہ: دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہونا اور عناصرِ فطرت پر حکمرانی کرنا کیا خوب ہے۔

اور فرمایا کہ تمھیں زمین پر ایک مقررہ مدت تک قیام کرنا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کو ہندوستان میں سراندیپ کے پہاڑ پر اُتارا گیا اور حضرت حوأ کو جدّہ میں[۳۲] اور انھیں بتادیا کہ اُن کا دشمن شیطان بھی وہیں موجود ہوگا لیکن نیک بندوں کو وہ گزند نہ پہنچا سکے گا۔

قرآن پاک میں ہے:

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِىَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا○ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى○ فَقُلۡنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوۡجِكَ فَلَا يُخۡرِجَنَّكُمَا مِنَ الۡجَنَّةِ فَتَشۡقٰى○ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَ لَا تَعۡرٰى○ ۙ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى○ فَوَسۡوَسَ اِلَيۡهِ الشَّيۡطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡكٍ لَّا يَبۡلٰى○ فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ۚ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى○ ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ؕ قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيۡعًاۢ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى○[۳۳]

ترجمہ: اور بے شک ہم نے تاکید کردی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدمؑ کو تو سب سجدے میں گرے مگر ابلیس۔ اس نے نہ مانا تو ہم نے فرمایا اے آدمؑ بے شک یہ تیرا دشمن ہے اور تیری بی بی کا تو ایسا نہ ہو کہ دونوں کو جنت سے نکال دے تو مشقت میں پڑے۔ بے شک تیرے لیے جنت میں یہ ہے کہ نہ تو بھوکا ہو اور نہ ننگا ہو۔ اور یہ کہ تجھے نہ اس میں پیاس لگے نہ دھوپ۔ تو شیطان نے اسے وسوسہ دیا۔ بولا اے آدم کیا میں تمھیں بتادوں ہمیشہ جینے کا پیڑ اور وہ بادشاہی کہ پرانی نہ پڑے۔ تو ان دونوں نے اس میں سے کھالیا۔ اب ان پر ان کی شرم کی چیزیں ظاہر ہوئیں اور جنت کے پتے اپنے اُوپر چپکانے لگے اور آدمؑ سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مطلب چاہا تھا

اس کی راہ نہ پائی پھر اس کے رب نے چن لیا تو اس پر اپنی رحمت سے رجوع فرمائی اور اپنے قرب خاص کی راہ دکھائی۔ فرمایا تم دونوں مل کر جنت سے اترو تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہے پھر اگر تم سب کو میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہو وہ نہ بھٹکے نہ بد بخت ہو۔

مذکورہ بالا آیات اور دیگر آیات قرآنی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدمؑ کو ہیشگی کے درخت اور نہ زائل ہونے والی بادشاہت کا اشارہ دے کر بہکایا۔ اس سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ اقبال نے آدمؑ کو بہکانے کے واقعہ کو بڑے دلکش انداز میں نظم کیا ہے انھوں نے اسے ''اغوائے آدمؑ'' سے تعبیر کیا ہے اور اس بہکانے کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ اقبال نے ابلیس کی زبانی بہشت کو سوز و ساز سے خالی قرار دیا ہے جہاں سرگرم عمل ہونے کا کوئی لطف نہیں۔ عمل کی لذت اور نظارے دُنیا میں ہیں اس لیے دُنیا بہتر ہے۔ وہ نظم ''تسخیرِ فطرت'' میں کہتے ہیں:

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام[۳۴]

ترجمہ: تو ابھی نہیں سمجھتا، (دائمی) وصال سے شوق کی موت ہے۔ حیاتِ دوام کیا ہے؟ محبت میں ہر وقت جلتے رہنا۔

آدمؑ کے جنت سے نکلنے کی طرف اشارہ نظم ''آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید'' میں ملتا ہے۔ نظم ''سرگزشتِ آدم'' جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں اقبال نے قرآنی بیان کے برعکس آدم کا جنت سے نکلنے کا سبب سعی و خطا کی بجائے ذاتی شعور کی بیداری قرار دیا ہے۔ اسی ذاتی شعور کی بنا پر آدم میں تحقیق و تلاش کے جذبہ نے جنم لیا اور اُس نے اپنے بلند تخیلات کا ثبوت دینا شروع کیا جو اس بات کی علامت ہے کہ آدم فطری طور پر تبدیلی اور انقلاب کا خواہش مند ہے۔ اسی خو کی وجہ سے اُس نے جنت کو خیر باد کہہ دیا۔ اقبال نظم ''سرِ گذشتِ آدم'' میں کہتے ہیں:

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قِصۂ پیمانِ اوّلیں مَیں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے[۳۵]

اقبال آدم کے پھل کھا کر جنت سے نکلنے کو سزا قرار نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک مخفی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایسا ضروری تھا۔[۳۶]

ڈاکٹر ملک حسن اختر رقم طراز ہیں:

''اقبال کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو جنت سے اس لیے نہیں نکالا گیا کہ انھیں سزا دینا مقصود تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی خودی جنت میں پرورش نہ پا سکتی تھی اور زشت وخوب کی یہ دنیا ہی خودی کی پرورش کے لیے موزوں جگہ تھی۔ انسان کی خودی میں جو پوشیدہ صلاحیتیں ہیں وہ ان کو اس دنیا میں ہی آشکارا کر سکتا تھا۔''[۳۷]

اقبال آدمؑ کے اس فعل کو ایسی وقیع غفلت قرار دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں دنیا آباد ہوئی اور رونق ورنگینی نے جنم لیا۔ اسی وجہ سے یہ ''دشتِ سادہ'' اور ''جہانِ بے بنیاد'' آدم کو دعائیں دیتا نظر آتا ہے۔ اقبال نے آدمؑ کے شجرِ ممنوعہ کو چکھنے اور اُس کی پاداش میں جنت سے نکلنے کا ذکر مختلف پیرائے میں کیا ہے۔ بانگِ درا کی ایک غزل کا شعر ہے:

ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو مَلک روتے ہیں وہ غافل ہوں مَیں[۳۸]

ایک اور غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے:

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟
اور اسیر حلقۂ دامِ ہوا کیونکر ہوا؟[۳۹]

قصور وار ، غریب الدیار ہوں ، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دُعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد[۴۰]

بالِ جبریل کے حصہ اوّل کی غزل ۴ کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

شجر ہے فرقہ آرائی ، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو[۴۱]

بالِ جبریل میں اقبال نے وہ منظر پیش کیا ہے جب فرشتے آدم کو جنت سے رُخصت کر رہے تھے۔ فرشتوں کی زبان پر انسانی فضیلت کا یہ گیت نظم ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت

کرتے ہیں'' میں ملاحظہ کیجیے:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے، لیکن
تیری سرشت میں ہے کوکبی و مہ تابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تُو دیکھے
ہزار ہوش سے خوش تر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی[۴۲]

اقبال نے جاوید نامہ میں اس سے ملتا جلتا مضمون دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا آسمانی سفر ''تمہیدِ آسمانی'' سے شروع ہوتا ہے۔ آسمان زمین کو اُس کی کثافتوں اور تاریکیوں پر طعنہ دیتا ہے اور ان کے مقابلے میں اپنی پاکیزگی اور تابندگی کی ڈینگ مارتا ہے۔ آسمان کا طعنہ سُن کر زمین کو بڑا رنج ہوا۔ وہ اسی شرم وخجالت کی حالت میں حضرتِ حق کے روبرو جا کر شکوہ کناں ہوتا ہے تو اسے حضرت حق کی جانب سے یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ تیرے سینے میں ایسی امانت روپوش ہے جس کی روشنی کے سامنے سب روشنیاں ماند پڑ جائیں گی۔ تیری خاک آدم کو پروان چڑھائے گی، جس کا روحانی ارتقا آسمان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گا۔ کون آدم؟ وہی جو دامانِ وجود کے داغوں کو دھوئے گا۔ اس کی عقل کائنات کے سربستہ راز معلوم کرے گی اور اس کا عشق لا مکاں کے سارے بھید ایک ایک کر کے کھول دے گا۔ اگر چہ وہ خود خاک سے بنا ہے لیکن اس کی پرواز فرشتوں کی پرواز سے بڑھ کر ہے۔ وہ فرشتوں کی طرح ہر وقت تسبیح خوانی نہیں کرے گا لیکن اس کا عمل زمانے کی رفتار کے لیے مہمیز کا حکم رکھے گا۔ اس کی شوخیٔ نظر سے کائنات با معنی بنے گی۔ زمین ہی وہ سٹیج ہے جہاں انسانی خیر وشر کے معرکے ہوں گے۔ اس لیے وہ آسمان سے فضیلت میں کسی طرح کم نہیں۔ اس بشارتِ حق کے بعد ''نغمۂ ملائک'' کا آغاز ہو جاتا ہے:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے

خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے!
یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پُرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے!
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ اوپُر خوں شود روزے![۴۳]

ترجمہ: مشتِ خاک (آدم) کی چمک ایک دن نوریوں (فرشتوں) سے بڑھ جائے گی۔
اس کی تقدیر کے ستارے سے ایک دن زمین آسمان بن جائے گی۔
اس کا فکر جو حادثات کے سیلاب سے پرورش پاتا ہے۔ ایک دن نیلے آسمان کے گرداب سے باہر نکل جائے گا۔
ذرا آدم کی معنویت پر غور کر کہ ہم سے کیا پوچھتا ہے۔ ابھی تو وہ اس مضمون کی مانند ہے جو ذہن میں کھٹکتا ہے۔ ایک دن موزوں ہو جائے گا۔
اور یہ پامال مضمون اس خوبی سے موزوں ہوگا کہ اس کی تاثیر سے خالق کا دل بھی پرخوں ہو جائے گا۔ (خالق بھی اپنے شاہکار پر ناز کرے گا۔
رُوحِ ارضی آدمؑ کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے:

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ![۴۴]

یہ حقیقت ہے کہ انسان طوفانوں کے تھپیڑے کھا کر ہی اپنی خفیہ صلاحیتوں سے آگاہی پاتا ہے اور خودی کی مضمر قوتوں کو پہچانتا ہے۔ خفیہ صلاحیتوں کی بیداری، فروغ اور اس کی مضمر قوتوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے مسلسل عمل ضروری ہے کہ اس کے ذریعے انسان ایک منزل سے دوسری کی طرف بڑھتا ہے۔ قرآن بھی خیال کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ عمل ہی تقدیر کے راز کھولنے کا ذریعہ ہے۔ انسان مسلسل عمل سے اس کائنات کی تسخیر کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔[۴۵]

اقبال نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کی بہت ہی بلیغ تفسیر پیش کی ہے۔ اُن کے نزدیک جنت میں آدمؑ کی زندگی دراصل انسانیت کے ابتدائی دور سے عبارت ہے جب کہ اس میں احساسِ خودی نے جنم نہ لیا تھا اور اُس نے اپنے ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے موافقت کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اُس کا قلب آرزو اور احتیاج کی خلش سے بے گانہ تھا۔ پھر جبلی خواہش کے غلبے سے گزرنے کے بعد وہ ایک آزاد اور با اختیار خودی کا مالک بنا۔ اس میں آگہی، شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت نے جنم لیا۔

بقول اقبال:

......اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد ہے اور اس لیے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔ مختصراً یہ کہ ہبوط کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں، اس کا اشارہ اس تغیّر کی طرف ہے جو شعور کی صاف و سادہ حالت میں شعورِ ذات کی اوّلین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا۔ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے۔[۴۶]

حضرت آدمؑ کی نافرمانی میں اس کے لیے ایک سبق تھا۔ اس انداز سے اُس نے اپنے اختیار اور ارادے کو استعمال کرنا سیکھا۔ اس لیے اس کی خطا معاف کر دی گئی۔ پورے قرآن میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ بہشت سے نکلنے کے بعد دُنیا آدم کے لیے دُکھ اور تکلیف کا مقام بنا دی گئی تا کہ وہ اپنی لغزش کی سزا پائے۔ یہ تصور اسلام کے منافی ہے اور غیر اسلامی۔

یوں دکھائی دیتا ہے کہ آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کو علامتی رمز کے طور پر برتا گیا ہے۔ ابلیس کا چیلنج قبول کر لینے سے حیات انسانی میں ایک نئے توازن نے جنم لیا اور اس کی تخلیقی قوتیں نیند سے جاگ اُٹھیں۔ اس نئے نفسیاتی توازن کا خاص وصف عمل ہے۔ اس سے پہلے وہ فرشتوں کی طرح غیر تخلیقی حمد و ثنا میں مصروف رہتا تھا جو میکانکی حیثیت کی حامل تھی۔ اب اس کی ذات ہمیشہ کے لیے کائنات کے رحمانی اور شیطانی عناصر کی نبرد آزمائی کا اکھاڑہ ہو گئی۔ ان دونوں کی نبرد

آزمائی سے اس نے اپنی ذات کو مکمل کیا اور خیر وشر کی قدروں نے جنم لیا۔ اگر اسے اپنی ذمہ داری محسوس نہ ہوتی تو مذہب، معاشرہ اور مملکت کچھ بھی وجود میں نہ آتا جس سے تاریخ عبارت ہے۔

اسلامی تصور کے خلاف مسیحی تعلیمات میں آدمؑ کی دنیاوی زندگی کو از اوّل تا آخر گناہ کہا گیا ہے۔ نفسانی خواہشات اور احساس خودی اسی غلطی کا نتیجہ ٹھہرائے گئے جو آدم سے شیطانی وسوسے کی بنا پر رونما ہوئی تھی۔ انسان کے اس گناہ کا کفارہ اس کے اعمال سے ممکن نہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے انسانی گناہ کا کفارہ ادا کر کے انسانی نجات کا رستہ نکالا۔ یورپ میں ازمنہ وسطیٰ میں تمام مسیحی برادری میں یہ خیال عام تھا کہ عالمِ فطرت کو خدا تعالیٰ نے تخلیق کیا لیکن اس کو شیطان کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس پر حکمرانی کرے۔ یہی سبب ہے وہ اس دور میں فطرت کے مطالعہ کو ناپسندیدہ جانتے تھے اور وہ لوگ جو مطالعۂ فطرت کی جانب توجہ دیتے تھے۔ یہ تصور کرتے تھے کہ ان کا واسطہ بھوت پلید سے ہے۔ عیسائی تعلیمات نے آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے انسان کو ذلیل وحقیر گردانا جو کسی بھی نوع کی ذمہ داری کے قابل نہیں۔

ایسے ہی بدھ مت اور ہندو دھرم میں تناسخ کے لامحدود سلسلے اور شخصی وجود کو مکمل طور پر فنا کر دینے کے تصور نے زندگی کی ذمہ داریوں کو محدود کر کے انسانی عظمت کو خاک کی نذر کر دیا ہے۔ بدھ مت میں ہر نوع کی کوشش بے فائدہ ہے سوائے اس جدوجہد کے جو شخصیت اور خواہشات کو فنا کرنے کے لیے کی جائے تاکہ انسانی روح بے امتیاز وحدت میں کھو جائے۔ یہ ان تہذیبوں کا نقطۂ نظر ہے جو غیر تاریخی ہیں اور جن کی نگاہ باطنی تصورات سے پار جا کر حیات کے حقائق کا جائزہ نہ لے سکی اور لامحدودیت اور بے امتیاز ابدیت کو ڈھونڈا جس کا تاریخ میں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ یہ حیات سے فرار کی ایک شکل تھی۔ انھوں نے تاریخ میں انسان کی تکمیل کی بجائے اسے تاریخ ہی سے نجات دلوانا چاہی۔ اس کے برعکس اسلام نے انسان کی ذمہ داری کے تصور کو جس میں اس کی عظمت پنہاں ہے، بہت وضاحت سے پیش کیا اور بتایا کہ انسان کی فوز وفلاح اسی صورت ممکن ہے جب وہ قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنی تخلیقی فعلیتوں کو مٹانے کی بجائے انھیں درست راہ پر ڈال دے۔ اسلام نے محدود کے لامحدود میں ضم ہو جانے پر بحث نہیں کی بلکہ اس پر زور دیا کہ حیات خیر وشر کا ڈرامہ ہے جس میں ہر انسان شریک ہے۔ اسلام کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اخلاق کو حیات کا محرک اور تاریخ کو انسانی اعمال کا فیصلہ ٹھہرایا جس سے انسان کی ظاہری اور پوشیدہ خوبیاں نمایاں روپ

میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو مسجودِ ملائک کے لائق ثابت کر سکتا ہے۔[۴۷] چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ اس کی نسبت واضح ذکر ملتا ہے۔

سورۃ التین میں ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَo اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍo[۴۸]

ترجمہ: بے شک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا اور اسے ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انھیں بے حد ثواب ہے۔

یعنی انسان حقیقت میں نیک سرشت رکھتا ہے۔ اس کی شرافت و فضیلت تسلیم شدہ ہے لیکن اعمالِ بد کے سبب اس کا ازل سے عطا شدہ کمال زائل ہو جاتا ہے۔ انسان شر سے بچ جاتا ہے۔ وہ مجبور نہیں۔ کسی بھی شخص کا عمل زندگی میں ضائع نہیں جاتا۔

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی۔[۴۹]

ترجمہ: بے شک میں تم میں کام کرنے والوں کی محنت اکارت نہیں کرتا مرد ہو یا عورت۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط[۵۰]

ترجمہ: اور کوئی بوجھ اُٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گی۔

اقبال نے آیہ کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ کی تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں یہ تفسیر کی ہے کہ جس کا بوجھ آسمان و زمین نے اُٹھانے سے انکار کر دیا وہ شخصیت اور احساسِ خودی کی ذمہ داری تھی، جسے انسان نے جوشِ وجدان میں اُٹھا کر نادانستہ طور پر اس کائنات میں اپنی فضیلت و برتری ثابت کر دی۔[۵۱] اسی ذمہ داری کے سبب اس میں فضیلت و عظمت نے جنم لیا اور اسی کی وجہ سے اس میں اس قدر اعتماد پیدا ہوا کہ وہ نہ صرف اشیاء کے حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق فطرت میں متصور بھی کر سکتا ہے۔ اسی کی وجہ سے اس نے آگ، پانی اور ہوا کو اپنا غلام بنایا۔ پہاڑوں کے سینے شق کیے۔ ویرانوں کو آباد کیا اور اپنے وجود کا سکہ کائنات کے ہر گوشے پر بٹھا دیا۔

بااختیار خودی میں اس صلاحیت کا امکان تھا کہ وہ علم، انصاف اور عشق کی قدروں کی تخلیق کر سکے۔ حصولِ علم کی صلاحیت اور اختیار و ارادے کی آزادی اِنسانی فضیلت کا نشان ٹھہری جس سے کائنات کے دیگر تمام وجود محروم ہیں۔ اپنی اس صلاحیت اور خوبی کی بدولت انسان رفعت و

کمال کے اعلیٰ ترین مراتب حاصل کر سکتا ہے اور اپنے علم و محبت کو اتنی وسعت دے سکتا ہے کہ اس کی وسعتوں میں ساری کائنات اور اس کی اشیا سما جائیں۔[۵۲]

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی[۵۳]

ہم دیکھتے ہیں کہ کلام اقبال میں حضرت آدمؑ کی ہستی ایک متحرک، باعمل شخصیت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس ہستی کو سکون و جمود اور ایک حال پر رہنا قطعاً پسند نہیں۔ یہ ہستی سعی و عمل سے رغبت رکھتی ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک انسانِ اوّل ازل ہی سے سخت کوش ہے۔ وہ سعی و عمل کو پسند کرتا ہے۔ لیکن انھیں افسوس ہے آج کا آدم سعی و عمل سے باغی ہے۔ سخت کوشی سے فرار حاصل کرتا ہے۔ بے عملی کو پسند کرتا ہے۔ حالانکہ زندگی حرکت و عمل سے عبارت ہے۔ اس نکتے کو اقبال نے اپنے کلام میں بار بار مختلف انداز سے سمجھایا ہے۔ وہ نظم ''زندگی و عمل'' میں کہتے ہیں:

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم![۵۴]

ترجمہ: گرے ہوئے ساحل نے کہا: اگرچہ میں بڑی دیر سے زندہ رہا ہوں۔ لیکن افسوس مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ میں کیا ہوں؟ لاپرواہ موج تیزی سے لپکی اور اس نے کہا

اگر میں حرکت میں ہوں تو زندہ اگر نہیں ہوں تو نہیں یعنی زندگی حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔

گویا قِصّہ آدمؑ کو نظم کرنے سے اقبال کا مقصود آج کے آدم کو سعی و عمل پر اُبھارنا ہے۔

اقبال نے آدمؑ کی ایک اور جہت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وہ جہت ہے ''سوز'' کی۔ اقبال کے نزدیک ''سوز آدم'' عشق سے عبارت ہے اور حاصلِ زندگی۔ لہٰذا جس انسان کو یہ ''سوز و گداز'' میسر آجائے اُسے زندگی کی تمام نعمتیں مل جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اقبال اسی سوز و گداز کے متمنی ہیں۔ وہ ''گلشن رازِ جدید'' کی ''تمہید'' میں کہتے ہیں:

مِرا ناز و نیاز آدمے دہ!
بجانِ من گداز آدمے دہ[۵۵]

ترجمہ: مجھے آدم کا ناز و نیاز عطا ہو، میری جان کو آدم کا سوز و گداز ملے۔

گویا اقبال کے نزدیک یہ سوز و گداز بہت وقیع ہے۔ اسی لیے اُمت مسلمہ کے لیے اس کے حصول کے طریقہ اور حصول کے منبع کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

جاوید نامہ میں ''فلک عطارد'' کی ذیل میں ''زیارت ارواحِ جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا'' میں اقبال نے جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی روح سے ملاقات کی ہے اور ان دونوں ہستیوں سے ملاقات کے حال کے تذکرہ میں اقبال نے پہلے پانچ بندوں میں موزوں تمہید دی ہے۔ اس فلسفیانہ تمہید کے دوسرے بند میں اقبال اور مرشدِ رومی کی آپس کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں ''مقامِ اولیا'' میں ہیں۔ اقبال کے مطابق حضرت آدمؑ نے جنت سے رخصت ہونے کے بعد چند روز یہاں بھی قیام کیا تھا۔ اس لیے اس کرّہ کی فضا حضرت آدم کی آہوں کے سوز سے معمور ہے۔ چونکہ سوزِ آدم کی معموریت سے اقبال متاثر ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر وہ نماز کے ذریعے سوز و گداز کی اس نعمت کے حصول کے متمنی ہیں:

بوالبشر چوں رخت از فردوس بست
یک دو روزے اندریں عام نشست
این فضا ہا سوز آہش دیدہ است
نالہ ہائے صبحگاہش دیدہ است
زائرانِ ایں مقام ارجمند
پاک مرداں از مقاماتِ بلند
پاک مرداں چو فضیل و بوسعید
عارفاں مثلِ جنید و بایزید
خیز تا مارا نماز آید بدست
یک دو دم سوز و گداز آید بدست[۵۶]

ترجمہ: آدمؑ نے جب فردوس سے کوچ کیا تھا۔ تو وہ ایک دو دن یہاں بھی ٹھہرے تھے۔
اس فضا نے ان کی آہ کا سوز دیکھا ہے اور ان کے نالہ ہائے صبحگاہی سنے ہیں۔
اس مبارک مقام کے زائرین، بلند مرتبت پاک مرد ہیں۔ ایک طرف فضیلؒ، ابوسعیدؒ جیسے اور دوسری طرف جنیدؒ و بایزیدؒ جیسے عارف

جلدی کرتا کہ ہمیں نماز مل جائے اور ہم ایک دو لمحے کے سوز و گداز سے بہرہ ور ہو جائیں۔

یہاں یہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے سوز و گدازِ آدمؑ کے حصول کا ذریعہ نماز کو کیوں ٹھہرایا ہے؟ اس کا جواب بڑا سادہ اور واضح ہے درحقیقت نماز کے ان گنت فوائد اقبال کے پیش نظر ہیں۔ اقبال کے نزدیک نماز وہ موتی ہے جو لا اِلٰہ کے صدف میں پرورش پاتا ہے یعنی موحد اللہ کے ساتھ نماز کے ذریعہ اپنے روحانی تعلق کو استوار کر لیتا ہے، ہر قسم کی سرکشی و بغاوت سے دور رہتا ہے اور اپنی خودی کو مضبوط کرتا ہے:

لا الہ باشد صدف گوہر نماز
قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است
قاتلِ فحشا و بغی و منکر است[۵۷]

ترجمہ: کلمہ طیبہ صدف ہے اور نماز اس کا گوہر ہے۔ ہر مومن کے قلب کے لیے نمازِ حجِ اکبر کی مانند ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی مانند ہے۔ یہ بے حیائی اور ناپسندیدہ کاموں کو ختم کرتی ہے۔

انبیاء کرامؑ وہ ہستیاں ہیں جو اللہ کے ساتھ روحانی تعلق میں سب سے برتر ہیں۔ اقبال نے انسان اوّل، نبیِ اوّل، حضرت آدمؑ کے سوز و گداز کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ انسان شروع ہی سے اللہ سے مضبوط تعلق کا متمنی ہے۔ آدمؑ کے آہ و نالے اس کے گواہ ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس سوز و گداز کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے جو شیوۂ آدمؑ ہے۔ پھر اللہ سے مضبوط تعلق کے لیے نماز کی پابندی لازم ہے کہ جس کا تعلق اللہ سے مستحکم ہوتا جاتا ہے اس کی خودی بھی مستحکم ہوتی جاتی ہے اور اُس کے سوز (عشق) میں نکھار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا حضرت آدمؑ کی شخصیت مضبوط خودی کی حامل ہے اور اقبال کی خواہش ہے کہ اولادِ آدمؑ بھی اپنے جدِ امجد کی طرح مستحکم خودی کی حامل بن جائے۔ اس لیے وہ سوزِ آدمؑ کا ذکر کرتے ہیں۔ خودی کے استحکام کے لیے ''گریۂ سحر گاہی'' بھی اہم ہے۔ یہ اپنے اندر خورشید جہاں تاب کی ضو رکھتا ہے۔ اسی ''گریۂ سحر گاہی'' کے لیے تو آدم تخلیق ہوا ہے اور اسی کے ذریعے اس کے نخلِ کہن کی شادابی ممکن ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

فراقِ محبوب میں جو گریۂ سحر گاہی ہوتا ہے وہ انسان کے شجرِ حیات کو ہر دور میں سیراب کرتا اور شاداب رکھتا ہے۔[۵۸]

اقبال کی تمنا ہے کہ موجودہ آدم بھی گریہ سحرگاہی کے ذریعے حضرت آدمؑ کی سنت کو زندہ کرتا رہے اور اپنی بقا کا سامان بناتا رہے۔ وہ آدم کو گریہ سحرگاہی کی اہمیت سے نظم ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' میں یوں آگاہ کرتے ہیں:

گراں بہا ہے ترا گریۂ سَحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی!
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی![۵۹]

کلام اقبال کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے آدم کی پیدائش اور اس کے ہبوط کی داستان کے ضمن میں اسی حقیقت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کو دُنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچائے۔[۶۰]

اقبال نے ''آدمؑ'' کو مجازاً تمام بنی نوع انسان کے لیے استعمال کیا ہے۔ یوں اس میں آفاقی رنگ کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ایک تو اسی کے ذریعہ قصّہ آدم کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ دوسرے یوں احساس ہوتا ہے کہ اقبال ہر آدم کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان ہی خلاصۂ کائنات ہے۔ فطرت روزِ ازل سے اس کے تابع ہے حتیٰ کہ روزِ تخلیق فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا جن قوتوں نے آدمؑ کی برتری اور اعلیٰ مرتبے کا انکار کیا انھیں نافرمانی کا مظہر قرار دیا گیا اور ان سے جنگ کو مقصدِ زندگی۔ یہیں سے اس کے شعور کی نمود ہوئی ہے جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے اور یہی خودی اقبال کے کلام کا ایک بنیادی موضوع بھی ہے۔ جس کے نمائندے انسان اوّل، نبی اوّل حضرت آدمؑ ہیں۔[۶۱]

علاوہ ازیں آدمؑ کے قصّہ کو منظوم کر کے اقبال نے عظمت آدم و فضیلت آدم بیان کی ہے۔ انسان کی فضیلت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اس کی فطرت کو فطرت الٰہی کے مطابق ٹھہرایا گیا۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں نے آدم کو جتنا ذلیل و کمتر درجے کا سمجھا اسلام نے اسے اتنا ہی بلند مقام عطا فرمایا۔ پھر اُسے اختیار دیا کہ وہ اپنے فکر و عمل سے حالات میں مطلوبہ تبدیلی پیدا کرے۔ اسلام نے آدمؑ کے ارادے اور تصور کو مکمل آزادی عطا کی تاکہ وہ عالمِ رنگ و بو کے علاوہ جو چمن اور آشیانے ہیں ان کا راز داں بن سکے۔[۶۲]

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں[۶۳]

تخلیق کرنا اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور اس وصف سے انسان کو بھی نوازا گیا۔ وہ بھی ایجاد و تسخیر کے ذریعے زمانے پر تصرف پا کر نئی نئی اشیا بناتا ہے، بنانے کے بعد انھیں بگاڑتا ہے اور پھر بنا دیتا ہے۔ شخصیت یا ذات کا احساس ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے سپرد کی ہے۔ اس کی حیثیت با اختیار عامل کی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری کو کوئی معنی نہ مل سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے احساس ذات کی امانت کے ساتھ ساتھ آدمی میں عشق کی لگن لگا دی۔[۶۴]

بر دلِ آدم زدی عشق بلا انگیز را
آتشِ خود را بآغوشِ نیستانے نگر!
شوید از دامانِ ہستی داغ ہائے کہنہ را
سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دا مانے نگر!
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر![۶۵]

ترجمہ: آپ نے دلِ آدم کو عشق بلا انگیز عطا کیا۔ اب اس آگ کو آغوش نیستاں میں دیکھیے۔

آدم اپنے دامنِ ہستی سے پرانے گناہوں کے داغ دھو رہا ہے۔ ذرا اس آلودہ دامن کی محنتِ سخت کو نگاہ میں رکھیے۔

ہماری خاک اٹھتی ہے کہ نیا آسمان تعمیر کرے۔ دیکھیے یہ ذرہ ناچیز تعمیر بیابان کا حوصلہ رکھتا ہے

مقصود اس سے اقبال کا یہ ہے کہ آدم اپنے فرائض احسن طریقے سے سرانجام دے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۱-۲، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص:۵۶-۵۷
۲- البقرہ:۲ آیت:۳۰
۳- ابنِ کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۱، پ:۱، نور محمد کارخانہ کتب، آرام باغ، کراچی، س۔ن، ص:۹۸
۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۸۵/۲۵۵
۵- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن، ص:۲۵۶، ۲۵۷
۶- البقرہ:۲ آیت:۳۴
۷- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۵، دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۴۶۴
۸- الاعراف:۷ آیت:۱۲
۹- ابنِ کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر اردو ج:۱، پ:۱، ص۹۷
۱۰- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱-۲، حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰/۱۹۶۴ء، ص:۲۲
۱۱- الحجر:۱۵، آیت:۳۲-۴۳۔ نیز دیکھیے: الاعراف اور ص
۱۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۸۵/۲۵۵، ۸۶/۲۵۶
۱۳- حوالہ مذکورہ بالا
۱۴- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن۔ ص ۱۳۵
۱۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۶/۵۰۸، ۴۷/۵۰۹
۱۶- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، ص۱۳۶، ۱۳۷
۱۷- ابنِ کثیر، اسماعیل ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۱، پ:۱، ص:۹۶
۱۸- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۱؛ دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۲۶
۱۹- البقرہ:۲، آیت ۳۱-۳۳
۲۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۴۵/۴۵
۲۱- ایضاً، ص ۱۴۴/۱۴۴
۲۲- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ج:۱، بار پنجم، ۱۹۷۸ء، ص:۴۸
۲۳- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص ۳۰، نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۱، پ:۱، ص۱۰۰۔ پانی پتی، علامہ محمد

ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج ۱، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۹۴۔ نعیمی، احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، س ن، ص:۲۸۱

۲۴- تورات، عہدِ عتیق، تکوین، باب:۳، آیت:۱-۱۳ میں بھی قرآن کے اس واقعہ کی تائید ملتی ہے۔ لیکن تورات کے بیان کے مطابق سانپ نے پہلے عورت سے بات کی اور عورت نے اپنے شوہر کو بہکا کر اُس درخت کا پھل کھلا دیا

۲۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۵۴/۳۲۴

۲۶- محمد شفیع، مولانا مفتی، معارف القران، ج:۳، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۳۴، ۵۳۵

۲۷- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱، ص ۲۷۴، ۲۷۹

۲۸- ابنِ کثیر، ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابنِ کثیر، ج:۳، پ:۱۶، نور محمد کارخانہ کتب، س ن، ص:۹ نیز دیکھیے: پانی پتی، قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۴، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، س ن، ص:۲۸۲، ۲۸۳

۲۹- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بارسترھواں، ۱۹۸۰ء، ص:۱۳۳، ۱۳۴

۳۰- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روحِ اقبال، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۱۸۰

۳۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۴۴/۴۴

۳۲- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱، ص:۲۹۰

۳۳- طٰہٰ:۲۰، آیت:۱۱۵-۱۳۰

۳۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۸۷/۲۵۷

۳۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۸۱/۸۱، ۸۲/۸۲

۳۶- ایضاً، ص:۱۲۹

۳۷- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۱۲۵

۳۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۰۷/۱۰۷

۳۹- ایضاً، ص ۱۰۰/۱۰۰

۴۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۸/۳۰۰

۴۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۷۴/۷۴

۴۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۳۶/۴۶۰

۴۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۶/۶۰۴

۴۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۳۲/۴۲۴، ۱۳۳/۴۲۵

۴۵- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۲۶

۴۶- نیازی، سید نذیر، مترجم، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور،

۱۹۸۶ء،ص:۱۲۷،۱۲۸

۴۷- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روح اقبال، ص:۱۸۱،۱۸۲

۴۸- التین:۹۶، آیت:۴-۶

۴۹- آل عمران:۴، آیت:۱۹۵

۵۰- الانعام:۶، آیت۱۶۴

۵۱- نیازی، سید نذیر، مترجم، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص:۱۷

۵۲- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روح اقبال، ص:۱۸۴

۵۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۴/۲۷۴

۵۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۲۹/۲۹۸

۵۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، گلشن راز جدید، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۴۷/۵۳۹

۵۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۰/۶۴۸

۵۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۴۳/۴۳

۵۸- عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۳۰۹

۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۳۶/۴۶۰

۶۰- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح بالِ جبریل، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص۶۲۴۔

۶۱- شاہدہ ارشد، تصورِ خودی مشمولہ، تصوراتِ اقبال، سید اسعد گیلانی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۸۷

۶۲- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روحِ اقبال، ص:۱۸۶

۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۶۱/۳۵۳

۶۴- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روحِ اقبال، ص:۱۸۷

۶۵۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۵۹/۴۵۱

☆☆☆☆

حضرت نوح علیہ السلام

قرآن پاک میں جن انبیاء کرامؑ کا ذکر ہے اُن میں ایک نام حضرت نوحؑ کا بھی ہے جن سے علامہ اقبال متاثر ہوئے ہیں۔ اس پیغمبر کے امتیازی اوصاف، حق کی خاطر بے پناہ استقامت، صبر، ثابت قدمی کا جوہر، حق سے غیر فانی، غیر متزلزل اور نا قابل شکست رشتہ عشق و محبت ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو انسانی کردار کو دائمی رنگ عطا کرتے ہیں۔ ان اوصاف کا مرکز و محور اور مظہر اتم حضرت نوحؑ کی شخصیت عشقِ حقیقی سے لبریز چشم کے ساتھ کلامِ اقبال میں جلوہ گر ہے۔ حضرت نوحؑ کی کفار کے لیے دعا کی قبولیت کی تاثیر سے بھی اقبال از حد متاثر ہیں۔ اس لیے اُس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ خواہش مند ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کا ہر فرد اپنی ذات میں ''نوحیت'' کے اوصاف کو اُجاگر کرے کہ وقت کی رفتار پر قابو پانے کے لیے اور ہوائے زمانہ کو اپنے موافق چلانے کے لیے ان اوصاف کا ہونا از حد ضروری ہے۔ آیئے جائزہ لیں۔

اسرارِ خودی میں ''در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پزیرد'' کی فصل میں دو بند ہیں، پہلے بند میں علامہ نے بتایا ہے کہ:

۱-خودی عشق سے استحکام پاتی ہے۔
۲-اس کے استحکام کے لیے عاشقی اختیار کرنا چاہیے۔
۳-محبوب تمھارے قلب میں پوشیدہ ہے۔
۴-وہ محبوب ہے ذات رسول ﷺ

دوسرے بند میں بتایا ہے کہ عاشقی دراصل معشوق کی اتباع کا نام ہے۔[۱] اس کے لیے اقبال عاشقی کے رموز سیکھنا اور محبوب کی تلاش و اتباع لازم قرار دیتے ہیں:

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشمِ نوحے، قلب ایوبے طلب

کیمیا پیدا کُن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے[۲]

ترجمہ: عاشقی سیکھ اور اپنے لیے محبوب ڈھونڈ مگر اس کے لیے چشم نوحؑ اور قلب ایوبؑ چاہیے۔
کسی کامل کے آستاں پر بوسہ زن ہو کر (اس سے وابستگی اختیار کر کے) اپنی مشتِ خاک کو کیمیا بنالے۔

علامہ اقبال اپنے مخاطب سے کہتے ہیں اگر تُو خودی کا استحکام چاہتا ہے تو کسی سے محبت کر لے، کسی کو اپنا محبوب چن لے، کوئی معشوق تلاش کر لے، اس راہ میں مصائب و تکالیف کا پیش آنا یقینی ہے کیونکہ معشوق ہمیشہ عاشق کا امتحان لیتا ہے۔ اگر تو کسی کامل کے در کو اپنی پناہ گاہ بنالے۔ کسی محبوب کے قدموں میں سر رکھ لے تو تیرا یہ مادی وجود کیمیا میں بدل جائے گا اور تو ایک ایسا قیمتی پتھر بن جائے گا جسے چھونے والا سونا بن جائے گا۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تمھارے آنکھیں ''چشم نوحؑ'' اور دل 'قلبِ ایوب'' کی صفات سے مزین ہو۔ کلامِ اقبال میں ''چشم نوحؑ'' عبارت ہے، نگاہِ کامل سے۔ یہ نگاہِ کامل عشقِ الٰہی سے لبریز ہوتی ہے۔[۳] اور بے شمار صفات سے مزین کہ:

یہ محبوب کو پردوں کے پیچھے چھپا دیکھ لیتی ہے یعنی عین الیقین تک رسائی اس کی صفت ہے۔ یہ صرف ظاہر بیں نہیں باطن بیں بھی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ حق و باطل میں بہ آسانی تمیز کر سکتی ہے۔ یہ آنکھ:

- انبوہ کثیر میں سے حق کی طرف قدم بڑھانے والوں کو پہچان کر اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے۔
- مادی ہوس سے بے نیاز ہوتی ہے۔
- ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے پیدا شدہ نتائج کا جائزہ لیتی ہے اور بہتر حال کے لیے جدوجہد کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے۔ جس کے سبب مصائب و خطرات کو بھانپ لیتی ہے اور ان سے بچاؤ کے لیے احتیاطی و حفاظتی تدابیر کر لیتی ہے۔
- اپنے حلقے میں داخل ہونے والوں کی تقدیر بدلنے کی قوت رکھتی ہے۔
- نفسانی خواہشات و متعلقہ عناصر کا قلع قمع کرنے کی قوت رکھتی ہے۔
- خوف الٰہی میں گریہ زاری اس کی صفت ہے۔
- مضبوط خودی کی حامل ہوتی ہے اور عشق حقیقی سے لبریز ہونے کی بنا پر بقا اُس کا مقدر بن جاتی ہے۔
- باطل کی عارضی شورش کو ختم کر سکتی ہے۔

- راہ حق میں پیش آمدہ کڑی آزمائشوں سے مضطرب نہیں ہوتی۔ مخالفین کی مخالفت سے بے پروا اپنے حال میں مست راہ حق کی طرف گامزن رہتی ہے۔[۴]

مذکورہ بالا اوصاف کی بدولت ''چشمِ نوحؑ'' کی تلمیح کلام اقبال میں نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ اقبال نے ''مردِ مومن'' کو ایسے مرشد کامل کی تلاش کی تلقین کی ہے جس کی آنکھ عشق حقیقی سے لبریز ہو کہ عشق حقیقی سے لبریز آنکھ ہی راہ حق کی طرف صحیح رہنمائی کر سکتی ہے اور عین الیقین تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مردِ مومن، مرشد کامل کی اس نگاہِ پراثر کی تاثیر کو اپنی ذات میں سمو لے اور اپنی آنکھ کو بھی غیر سے بے نیاز کر کے دائمی حقیقت کے رنگ میں رنگ لے تبھی وہ عشق کے تمام اسرار و رموز سے شناسائی حاصل کر سکتا ہے اور اپنے معشوق کو پا سکتا ہے۔[۵]

اس بحث کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے حیات و سیرت نوحؑ کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ اصل حقائق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ''نوحیت'' کے اقبالی پیغام کی روح تک بہ آسانی رسائی ہو سکے۔ آیئے آپؑ کی سیرت پاک کے امتیازی اوصاف کا جائزہ لیں۔

حضرت آدمؑ کے بعد حضرت نوحؑ پہلے نبی ہیں جنھیں منصب رسالت سے سرفراز فرمایا گیا۔ صحیح بخاری کی ایک طویل روایت سے یہ تصریح ہوتی ہے۔

یَا نُوحُ اَنْتَ اَوَّلَ الرُّسُلُ اِلَی الْاَرْضِ۔

ترجمہ: اور نوحؑ آپ زمین پر پہلے رسول ہیں۔

اور

نُوحاً اَوَّلَ نَبِیَّ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ۔[۶]

ترجمہ: حضرت نوحؑ پہلے نبی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر مبعوث فرمایا۔

حضرت نوحؑ کا اصل نام مختلف کتب میں مختلف بیان کیا گیا ہے۔[۷] سکن[۸] یا عبد الغفار[۹] یشکر یا شاکر[۱۰] عبد الجبار عبد الرحمٰن عبد الملک عبد الاعلیٰ[۱۱] عبد اللہ[۱۲] اور لقب نوح۔ نوح نام ہونے کے بھی کتب میں مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں:

۱- نوح، نوحہ سے بنا ہے جس کا مطلب گریہ زاری کرنا، ماتم کرنا، پیٹنا۔[۱۳]
۲- عبرانی میں اس کا مطلب ہے آرام و آسائش۔
۳- سریانی میں اس کا مطلب ''ساکن'' ہے۔[۱۴]

پھر لقب نوح کی بھی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

۱- آپ اپنے نفس پر نوحہ کرتے تھے۔[۱۵]

۲- اُمّت کے گناہ پر نوحہ کرتے تھے۔

۳- یہ سبب بھی بتایا گیا ہے کہ طویل عمر قوم کی طرف دعوتِ توحید میں اور ہنگاموں میں گزری۔[۱۶]

۴- اللہ کے خوف سے بہت زیادہ نوحہ کرتے تھے۔[۱۷]

مفتی احمد یار خاں نعیمی رقم طراز ہیں:

اگرچہ بعض اقوال میں حضرت نوحؑ کے رونے کے کچھ خطائی اسباب لکھے ہیں لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ خوفِ خداوند، عشقِ الٰہی کا جذبہ ہی بکاء انبیاء کا سبب ہوتا ہے۔[۱۸]

اسی قسم کا بیان سید امیر علی کا بھی ہے۔ اُن کے نزدیک نوح عجمی اسم ہے۔ لہٰذا جس نے کہا کہ کثرت گریہ کی وجہ سے نوح زبر سے ماخوذ ہے، اس نے غلطی کی۔ کیونکہ عربی اشتقاق نہیں ہوسکتا۔[۱۹]

مذکورہ بالا بیانات میں سے سب سے زیادہ معقول رائے مفتی احمد یار خاں اور سید امیر علی کی معلوم ہوتی ہے۔

نام کی طرح آپ کے لقب کے بارے میں بھی متضاد بیانات ملتے ہیں۔ بعض کے نزدیک آپ کا لقب نجی اللہ ہے۔[۲۰] اور بعض کے نزدیک آدم ثانی[۲۱]، آدم اصغر اور والدِ دوم[۲۲] لیکن آخرالذکر لقب کی تردید اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں کی گئی ہے۔[۲۳] آپ کا ایک اور لقب ''شیخ الانبیاء'' بھی ہے۔ کیونکہ حضرت آدمؑ کے بعد کسی پیغمبر کی عمر اتنی طویل نہیں ہوئی۔[۲۴]

علم الانساب کے ماہرین نے آپ کا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے۔

نوح بن لامک (الملک) بن متوشالح (متوشلخ) بن اخنوخ (ادریس) بن یارد (یرد) بن مہلیل (مہلائیل) بن قینان (مانس) بن انوش بن شیث بن آدم۔[۲۵]

اگرچہ مورخین تورات اور مفسرین کی اکثریت نے اس نسب نامہ پر اتفاق کیا ہے لیکن حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اس کی صحت پر شک کا اظہار کیا ہے اور ثابت کیا ہے حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے پائے جاتے ہیں۔[۲۶] ابن کثیر کے مطابق حضرت آدمؑ تا حضرت نوحؑ ۱۰ قرون کا فاصلہ ہے۔[۲۷] بعض کے مطابق حضرت آدمؑ اور آپؑ کے درمیان ۱۶۶۵ یا ۲۲۶۲ سال کا فاصلہ ہے۔[۲۸] کہا جاتا ہے کہ آپؑ کے والد لمک جب ۱۸۲ سال کے ہوئے تو نوح پیدا ہوئے[۲۹] آپ کی والدہ کا نام قینوش بنت راکیل[۳۰] یا سمجاد

بنت انوش بیان کیا گیا ہے۔[۳۱]

تورات میں آپ کے بارے میں بڑے متضاد بیانات سامنے آتے ہیں۔[۳۲] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے ان بیانات کی صحت کو ماننے سے انکار کیا ہے۔[۳۳]

تورات کے برعکس قرآن مجید میں آپ کا ذکر اُن پانچ جلیل القدر پیغمبروں میں کیا گیا ہے جن سے خصوصی عہد و میثاق ہوئے۔[۳۴]

قرآن پاک کے معجزہ نما کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ جب تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے واقعہ کی اُن جزئیات کو بیان کرتا ہے جو مقصد کے لیے اہم و ضروری ہیں اور واقعہ کی جزئیات، اجمال اور تفصیل و تکرار میں ایک ہی مقصد سامنے ہوتا ہے اور وہ مقصد ہے پند و نصائح کا۔ چنانچہ اسی انداز بیان کے مطابق قرآن پاک میں حضرت نوحؑ کا ذکر اجمالی و تفصیلی انداز میں ۴۳ مقامات پر ہے۔ لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات سورۃ الاعراف، ہود، المومنون، الشعرا، قمر اور نوح میں ملتی ہیں۔

حضرت نوحؑ کا ظہور دریائے دجلہ و فرات کے دوآبہ عراق میں ہوا۔ یہ انسانی تہذیب و تمدن کا سب سے پرانا گہوارہ ہے۔ آپ کی قوم بھی یہیں رہائش پزیر تھی۔ بابل کی کھدائی کے دوران ملنے والے کتبوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[۳۵] اور غالباً سب سے پہلے بت پرستی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق:

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جمعیت نے اپنی ابتدائی اور فطری ہدایت کی راہ سب سے پہلے وہیں گم کی۔[۳۶]

خطہ زمین پر بت پرستی کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ان کی حقیقت کیا تھی؟ اور انسانی عقل نے ان بتوں کی معبود کیوں مان لیا؟

اہل تحقیق کے نزدیک بت پرستی کا رواج دو طریقوں سے ہوا۔ پہلا طریقہ صائبین نے اپنایا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اجرامِ سماوی بھی جاندار اور ذی روح ہیں۔ ان کا تعلق و واسطہ بھی اس کائنات سے ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے یہاں ساری تبدیلیاں، تندرستی، علاج، علالت، موت، فتح، شکست، عزت و وقار اور ذلت وغیرہ رونما ہوتے ہیں۔ جب ان کے اذہان میں یہ عقیدہ پختہ ہو گیا تو وہ ان کی عبادت کی طرف مائل ہو گئے۔ چونکہ ان اجرام تک رسائی ممکن نہ تھی۔ اس لیے

ان کے ناموں کے بت بنا کر رکھ لیے گئے۔ اس طرح بت پرستی شروع ہوگئی۔ باطل مذاہب میں سے سب سے پرانا مذہب انھی صائبین کا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں پوجے جانے والے بتوں کے نام انھی ستاروں پہ تراشے گئے ہوں۔

بت پرستی کا دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض ایسے افراد جو کہانت، بہادری، طاقت، علم یا اخلاق حسنہ اور دیگر کرداری صفات میں عام افراد سے بہت اونچے ہوتے تو عوام اس غلط فہمی کی بنا پر کہ روحِ الٰہی ان میں حلول کیے ہوئے ہے جو ان افعال کے رونما ہونے کا سبب ہے، ایسے لوگوں کی وفات کے بعد ان کے بت تراش کر ان کی پوجا کرنے لگ جاتے۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت آدمؑ کی وفات پر شیطان نے اکسایا کہ شبیہِ آدم تیار کر کے اس کی زیارت اور طواف کریں اور ان پانچ ناموں کے بت تیار کر کے رکھ دیں۔[۳۷] کتب تفاسیر میں بھی ایسی روایات مذکور ہیں۔ بت پرستی و شرک کے علاوہ بدکاری، اخلاقی پستی، جور و جفا اور روز حشر کا انکار بھی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکے تھے۔ دولت، شہرت کے بھوکے، اس کے حصول کے لیے اپنے تمام وسائل داؤ پر لگا چکے تھے۔[۳۸] یہ قوم اللہ تعالیٰ کی صفات کو تشبیہ محض میں مقید دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی کیونکہ حضرت شیثؑ کی توحید کی تعلیم کا انحصار کثرت اسمائی تھا۔ ان کی قوم اس کثرت اسمائی کو وحدتِ الٰہی کے تابع نہ کر سکی تھی۔ اس لیے وہ کثرت پرست، صورت پرست اور بت پرست تھے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ نے ان کو کثرت سے وحدت کی طرف یعنی تشبیہ سے تنزیہہ کی طرف بلایا۔[۳۹] جب آپؑ اس منصبِ نبوت پر فائز ہوئے، اُس وقت آپؑ کی عمر ۴۰ سال اور بعض کے مطابق ۵۵ سال تھی۔[۴۰] غور طلب بات یہ ہے کہ وہ عقیدہ جس کی جڑیں دور دور تک ان کے قلب و ذہن پر قابض ہو چکی تھیں۔ ان کے خلاف حضرت نوحؑ کا علمِ بغاوت بلند کر دینا عام اور اچانک پیش آ جانے والا واقعہ نہ تھا۔ یکدم کہرام مچ گیا۔[۴۱] قوم کے افراد اس پر غور کرنے کی بجائے اُلٹا بگڑ بیٹھے۔[۴۲] نفرت و حقارت سے دعوت حق اور نوحؑ کی عقل و کیاست، رعایت مصالح اور دور اندیشی سے انکار کیا۔ آپؑ کو اور آپؑ کے ساتھیوں کو جھوٹا کہا اور کہا کہ انھیں پیشوا بننے کا حق حاصل نہیں۔ الغرض ہر طریقے سے تحقیر کی۔ وہ کہتے کہ نوحؑ ہماری ہی طرح کا آدمی ہے۔ کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے۔[۴۳] نوح کی پیروی تو ہمارے ارزال نے سوچے سمجھے بغیر قبول کر لی ہے۔ اگر اس کی بات میں وزن ہوتا تو قوم کے بڑے بھی اس پر ایمان لاتے۔[۴۴] خدا کو اگر بھیجنا تھا تو کوئی فرشتہ بھیجتا۔[۴۵] اگر یہ شخص اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے اور علمِ غیب بھی ہوتا۔ نیز یہ ملائکہ کی

مثل تمام بشری ضرورتوں سے بے نیاز ہوتا[۴۶] نوحؑ اور اس کے پیروکاروں میں ایسی کونسی کرامت دکھائی دیتی ہے جس کی بنا پر ان کی برتری تسلیم کر لی جائے[۴۷] یہ آدمی دراصل اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے اس پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا رکھا ہے۔[۴۸] ہم اس کے احکام کی تعمیل کیوں کریں۔ اس پر ایمان لانے والے خاندانی لحاظ سے گھٹیا، پسماندہ اور مفلس ہیں۔ ایسے غربا کے پیشوا پر ہم ایمان لا کر شرمندگی مول نہیں لے سکتے۔[۴۹] اس کے پیروکاروں کے پاس بیٹھنے سے ہمیں گھن آتی ہے۔ اگر کبھی حضرت نوحؑ کی بات پر توجہ دیتے تو کہتے کہ اپنے گرویدہ ارزال لوگوں کو دور ہٹاؤ اور ہمیں قریب لاؤ۔ نیز اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمھارے قریب آئیں تو وضیع و شریف کو ایک صف میں نہ بٹھاؤ۔ شاہ و گدا کو ایک نظر سے نہ دیکھو۔[۵۰]

حضرت نوحؑ نے جواباً فرمایا کہ میری دعوت دعوتِ توحید ہے اور فیوضات آسمانی سے ہے کہ وضیع و شریف، سادہ و ہوشیار، تونگر و فقیر، مشہور و مغمور، اعلیٰ و ادنیٰ تمام آستانۂ دین میں یکساں ہیں[۵۱] خدا کی بھلائی و سعادت کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے نہ اس کے ہاں سعادت و ہدایت کا حصول دولت کے ذریعہ ہے۔ بلکہ اس کے ہاں تو یہ سب طمانیت نفس، رضائے الٰہی، غناءِ قلب اور اخلاصِ نیت و عمل پر منحصر ہے۔[۵۲]

حضرت نوحؑ نے قوم سے بارہا کہا کہ دعوتِ حق کے لیے میں تم سے مال، جاہ و منصب اور اُجرت نہیں مانگتا بلکہ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے۔ سورۃ ہود ان ارشادات عالیہ کا بہترین نمونہ ہے جو آپ نے دعوتِ حق کے لیے قوم کے سامنے پیش کیے۔[۵۳]

بہرحال حضرت نوحؑ نے اس بدنصیب قوم کو سمجھانے کی از حد کوشش کی لیکن قوم نے تسلیم نہ کیا۔ جتنے زور و شور سے انھوں نے دعوتِ حق کا ڈنکا بجایا، قوم نے اتنے ہی بغض و عناد سے سرگرمی دکھائی اور تکلیف دینے کے لیے تمام وسائل استعمال کیے۔[۵۴] آپ کو اتنا مارتے کہ آپ تین تین دن بیہوش رہتے۔ اکثر اوقات آپ کا گلا گھونٹ دیتے، مار مار کر ادھ موا کر دیتے۔[۵۵] کئی مرتبہ مارنے کے بعد وہ آپ کو مردہ سمجھ کر کمبل میں لپیٹ کر گھر کے سامنے رکھ کر چلے جاتے۔ رات کو حضرت جبرائیل اپنے پروں کو آپؑ کے بدن سے مل کر علاج کرتے اور صبح سویرے آپؑ پھر لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی طرف بلانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔[۵۶]

پیر محمد کرم شاہ رقم طراز ہیں:

اس جور و جفا کے باوجود یہ پیکر اخلاص و وفا ان ناہنجاروں کی اصلاح میں لگا رہا۔ بارگاہ الٰہی میں ان کے لیے دعائیں مانگتا رہا[۵۷] ایک شیطانی تحریک اس طرح بھی شروع کی گئی کہ جہاں کہیں

بھی نوحؑ پیغام حق سناتے یہ لوگوں کو پابند کر دیتے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں یا پھر چہرے پر کپڑا ڈال لیں اور گزر جائیں تا کہ نوحؑ پہچان نہ سکیں۔[۵۸] قوم کے بڑے بڑے افراد نے غربا کو اپنے پیچھے اس تاکید کے ساتھ لگا لیا کہ کسی طرح بھی ودّ، سواع، یغوث اور نسر وغیرہ جیسے بتوں کی پوجا نہ چھوڑیں۔[۵۹]

حضرت نوحؑ نے قوم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر قوم رحمت الٰہی کی آغوش میں آنے پر مائل نہ ہوئی۔ سردارانِ قوم نے خود ہی گمراہی اختیار نہ کی بلکہ عوام کو بھی آپؑ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ کہیں وہ دین نوحؑ قبول نہ کر لیں۔ اُنھیں یہ بھی فکر تھی کہ اگر عوام نے حضرت نوحؑ کے دین کو قبول کر لیا تو ان کی چودھراہٹ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر ان ناتواں لوگوں کا شعور جاگ اٹھا اور انھوں نے اللہ سے رابطہ قائم کر لیا تو وہ غلامی کا طوق اُتار دیں گے۔ اس خطرے کے پیش نظر وہ ایسی ایسی مکروہ چالیں چلتے کہ اچھے بھلے دام فریب میں آ جاتے۔[۶۰] جب حضرت نوحؑ کی بے لوث نصیحت و خیر خواہی انتہا کو پہنچی اور ہدایت و نصیحت کے تمام عنوان ختم ہو گئے، دلائلِ توحید پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ قوم کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہا جو وہ بت پرستی کی تائید میں پیش کرتے تو آخر کار متفق ہو کر کہنے لگے کہ آپؑ اپنی بات کو ختم کر کے اس دھمکی کو عملی طور پر دکھا دیں جو آپؑ نے ہمیں دی ہے اور عذاب الٰہی کی شکل میں ہم پر آنے والی ہے۔ حضرت نوحؑ نے قوم کی یہ بے باکی اور جرأت دیکھ کر ان کو تحمل سے سمجھایا کہ مَیں تمھارا خیر خواہ ہوں اور عذاب پر قابض نہیں ہوں۔ جب اللہ چاہے گا وہ بھی آ جائے گا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ٥[۶۱]

ترجمہ: بولے وہ تو اللہ تم پر لائے گا اگر چاہے اور تم تھکا نہ سکو گے۔

حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو سال تک مسلسل تبلیغ حق کا فریضہ سرانجام دیتے رہے لیکن اثر نہ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ٥[۶۲]

ترجمہ: تو غم نہ کھا اس پر جو وہ کرتے ہیں۔

جب حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ قوم کے قلوب سیاہ ہو گئے ہیں اور وہ جمالِ معبود حقیقی کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان پر دعوت و تبلیغ کا اثر نہیں ہوا۔ تب آپ نے خیال کیا کہ ایسی قوم کا زندہ رہنا بنی نوع انسان کے لیے مفید نہیں کہ یہ خود بھی مشرک و بدکار ہیں اور ان کی اولاد بھی بدکار ہو گی۔

وہ بھی زمین پر بدی و بدامنی کا سبب بنے گی۔ تب حضرت نوحؑ نے اللہ سے دُعا کی۔

وَ قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًاo اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًاo[۶۳]

ترجمہ: اورنوحؑ نے عرض کی اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔ بے شک اگر تو انھیں رہنے دے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کردیں گے اوران کی اولاد ہوگی تو وہ بھی نہ ہو گی مگر بدکاری اور ناشکری۔

اور جب حضرت نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمھاری قوم میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا، جنھوں نے ایمان لانا تھا وہ لا چکے۔ تمھاری دعا قبول ہوگئی۔ سرکشوں کی سرکشی کا اعلان کردیا گیا۔ حضرت نوحؑ کو بذریعہ جبرائیل امینؑ حکم دیا گیا کہ وہ ایک کشتی تیار کریں تا کہ ظاہری اسباب کے لحاظ سے وہ اور مومنین اس عذاب سے محفوظ رہیں جو اللہ تعالیٰ نافرمانوں پر نازل کرنے والا ہے۔ حضرت نوحؑ نے دریافت کیا کہ کشتی کس طرح تیا کریں، حضرت جبرائیلؑ نے صنوبر یا مساج کی لکڑی لا کردی اور خرما کے بیج لا کر دیے کہ ان کے درخت لگائیں۔ مخصوص مدت میں درخت تیار ہو گئے۔ پھر آپ نے حکم الٰہی سے بابل شہر سے دور باہر ایک جگہ منتخب کر کے کشتی تیار کرنا شروع کردی۔[۶۴] کفار نے دیکھ کر ہنسی مذاق شروع کردیا۔ جب کبھی اس علاقے سے ان کا گزر ہوتا تو وہ کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے، کیسا احمقوں والا خیال ہے۔ آپ کشتی بنانے میں مصروف رہتے۔ کیونکہ یہ حکم الٰہی تھا۔

وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡیُنِنَا وَوَحۡیِنَا وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَo[۶۵]

ترجمہ: اور کشتی بناؤ ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا وہ ضرور ڈبوئے جائیں گے۔

کئی مفسرین اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کشتی سازی کا فن بھی الہامی ہے جو سب سے پہلے حضرت نوحؑ کو سکھایا گیا۔[۶۶]

کلام اقبال میں کشتی نوح کا ذکر ملتا ہے، دیکھیے:

لے چلا بحرِ محبت کا طلاطم مجھ کو
کشتی نوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو[۶۷]

حضرت نوحؑ کشتی بنا کر حکمِ الٰہی کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی وحی الٰہی کی تعمیل ہوئی۔ ایک تندور اُبل پڑا[۶۸] زمین نے ذخائر انڈیل دیے، آسمان سے سیلاب اُمڈ آیا۔ چالیس دن اور رات مسلسل پانی برسا۔ پانی پہاڑوں سے بھی پندرہ ہاتھ اوپر چڑھ گیا۔ حضرت نوحؑ اپنے پیروکاروں کے ساتھ چالیس شب وروز اس کشتی میں تیرتے رہے۔ کعبہ کے مقام پر پہنچ کر کشتی نے سات مرتبہ طواف کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حکمِ ربی سے کعبہ کو بھی کشتی میں رکھ لیا گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ کعبہ اور حجرِ اسود اوپر اٹھا لیے گئے اور بعد از طوفان حضرت نوحؑ نے تعمیرِ کعبہ کا فریضہ از سرِ نو انجام دیا۔[۶۹]

کہا جاتا ہے ڈیڑھ سو دن تک کشتی پانی پر تیرتی رہی۔ پھر پانی کم ہونا شروع ہوا اور تمام منکرین غرق ہو گئے۔ ان مغرقین میں حضرت نوحؑ کا بیٹا کنعان اور بیوی واعلہ بھی شامل تھے۔ بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر حضرت نوحؑ کی پدری محبت جوش میں آئی اور بے قرار ہو کر اللہ سے فریاد کی کہ یہ تو میرے اہل بیت سے ہے۔ اسے نجات دے اور رحم فرما۔[۷۰] لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ صرف اہل ایمان کو نجات دینے کا تھا۔ حضرت نوحؑ کی طرف سے بیٹے کے لیے دعا مانگنے پر رب العلمین کی طرف سے عتاب نازل ہوا کہ ایسی چیز جس کا تمھیں علم نہیں، اس بارے میں تمھیں سوال کرنے کا حق نہیں۔ اس پر حضرت نوحؑ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے مغفرت و رحمت طلب کی۔

حضرت نوحؑ اپنی بیوی کے کافرانہ عقائد کی بدولت اس کے ایمان لانے سے مایوس ہو چکے تھے لیکن بیٹے کو نو عمر سمجھتے ہوئے مائل بہ ایمان ہونے کا سوچ کر اپنا رخ کنعان کی طرف بدلا اور اسے مخاطب کر کے منصب دعوت و فریضۂ حق ادا کرنا چاہا کہ وہ بھی مومن ہو کر نجات پا جائے۔ لیکن اس بدنصیب نے کہا کہ وہ پانی سے بچنے کے لیے پہاڑ پر پناہ لے لے گا۔ یہ سن کر حضرت نوحؑ نے کہا کہ آج اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچانے والا مگر وہ جس پر رحم کرے۔[۷۱]

روایت ہے کہ کنعان نے پانی بڑھتے دیکھ کر ایک صندوق کے جوڑوں اور سوراخوں کو تارکول سے بند کر دیا اور پناہ لینے کے لیے اس میں بیٹھ گیا۔ صندوق پانی پر تیرنے لگا لیکن مشیت نے اس پر پیشاب کی بیماری مسلط کر دی۔ پیشاب سے صندوق بھرتا رہا۔ اس وجہ سے صندوق پانی میں بیٹھ گیا اور وہ پہاڑ کی پناہ لینے سے قبل ہی پانی میں ڈوب کر ''مغرقین'' میں سے ہو گیا۔[۷۲]

علماء نے کنعان کو حضرت نوحؑ کا سوتیلا بیٹا (ربیبت بیوی کی طرف سے) بیان کیا ہے۔ سبب یہ بتاتے ہیں کہ نبی کا بیٹا کافر کیسے؟ عجب بات ہے لیکن یہ ہی اللہ کی قدرت کا سلسلہ ہے کہ وہ بنجر زمین گلابوں سے بھر دیتا ہے اور مہکتے گلابوں کے ساتھ کانٹے پیدا کر دیتا ہے۔ قرآن جب

کنعان کو حضرت نوحؑ کا بیٹا بتاتا ہے تو بحث بے فائدہ ہے۔ ایسے ہی حضرت نوحؑ کی بیوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کافرہ تھی اور خائنِ عصمت تھی۔ کافرہ ہونے کی حد تک بات درست تھی جہاں تک خائنِ عصمت کی بات ہے تو یہ بات ناقابل قبول ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ ایک عورت نبی کے نکاح میں رہتے ہوئے خائنِ عصمت ہو اور نبی اس پر غافل ہو۔ وہ صبح و شام آنے والی وحی سے اس سے آگاہ ہو سکتا ہے۔[۳]

حفظ الرحمٰن سیوہاروی رقم طراز ہیں:

"حضرت نوحؑ کی زندگی پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امراۃ نوحؑ ایک مرتبہ ایسا اقدام کرتی تو وحی الٰہی فوراً نبی کو مطلع کر کے تفریق کرا دیتی یا کم از کم "توبۃ النصوح" پر جا کر معاملہ ٹھہرتا"۔[۴]

بہر حال یہ درست ہے کہ کنعان حضرت نوح کا لختِ جگر تھا جس پر والد کی ہدایت کی بجائے کافر والدہ کی تربیت اور خاندان و قوم کے برے ماحول نے برا اثر ڈالا ورنہ نبی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔ ویسے بھی نبی کا کام صرف پیغامِ حق دینا ہے۔ اہل و عیال، قبیلہ اور قوم پر پیغام ٹھونسنا نہیں اور نہ ہی ان کے دلوں کا پلٹ دینا ہے۔[۵]

لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ[۶]

ترجمہ: تم ان پر کڑوڑا (ضامن) نہیں ہو۔

وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ[۷]

ترجمہ: اور کچھ تم ان پر جبر کرنے والے نہیں۔

الغرض جب حکم الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینۂ نوحؑ جودی پہاڑ پر ٹھہر گیا۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک طوفان عالم گیر نہ تھا۔ بلکہ اس خطے تک محدود تھا جس میں حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم رہائش پزیر تھی۔ اس لیے کہ یہ طوفان اگر عالم گیر ہوتا تو دنیا کے مختلف حصوں پر اس کے واضح نشانات ہوتے لیکن ایسا نہیں۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ اس دور میں انسانی آبادی صرف اسی خطے تک محدود تھی۔ جہاں حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ چونکہ وہ ہی مشرک تھے اس لیے عذابِ الٰہی کے بھی وہی مستحق تھے۔ انسانی آبادی سے خالی علاقوں میں اس طوفان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔[۸] دوسری جماعت کا خیال ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارض پر پھیل گیا تھا۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ دنیا کے کئی پہاڑوں پر ایسے جانوروں کے ڈھانچے اور ہڈیاں ملی ہیں جو کہ پانی کے بغیر بقیدِ حیات نہیں رہ سکتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی یہ پہاڑ پانی

میں ڈوبے رہتے تھے۔

اس معاملے میں طویل بحث کی ضرورت نہیں۔طوفان کا بے پناہ ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کوہ ارارات کی ان چوٹیوں تک پہنچ گیا تھا جن میں سے ایک چودہ ہزار تین سو فٹ بلند ہے اور دوسری دس ہزار تین سو فٹ۔ جو طوفان اس پہاڑ کے نزدیک اتنی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔اس نے عراق کے گرد و پیش میں کیا شکل اختیار کی ہوگی ارباب عقل اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

طوفان کو محدود ماننے والے بھی اس حقیقت کو ضرور مانیں گے کہ اس سے کرۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر تباہی آئی ہوگی۔[79] لیکن صاحبِ قصص القرآن نے کہا ہے کہ یہ آیت اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ طوفان کے محدود ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔محققین اور تمام شارحین تورات بھی طوفان کی آمد تسلیم کرتے ہیں۔مفسرین طوفانِ نوحؑ کا رقبہ چالیس ہزار کلومیٹر بتاتے ہیں۔[80]

طوفان نوحؑ تمام کرہ ارض پر آیا تھا یا کسی مخصوص خطے پر اس کے بارے میں علماء اور دیگر محققین کی دو آرا ہیں۔البتہ قرآن نے سنتِ الٰہیہ کے مطابق صرف موعظت وعبرت کے لیے ضروری واقعات کی تفصیلات مہیا کی ہیں۔قرآن بتانا چاہتا ہے کہ اہلِ فہم وفراست کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آج سے کئی ہزار سال پہلے ایک قوم اللہ کی نافرمانی پر ڈٹی رہی اور اس کے مرسل نبی حضرت نوحؑ کے پیغامِ ہدایت کا انکار کیا اور قبولیت سے نفرت کا اظہار کیا تو اللہ نے اپنی قدرت دکھاتے ہوئے ان سرکش کفار کو طوفانِ بادوباراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا۔حضرت نوحؑ اور ان کی مختصر جماعت کو نجات دی اور کشتی حکمِ الٰہی سے ''جودی'' پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔[81]

وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝[82]

ترجمہ: اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہِ جودی پر ٹھہری اور فرمایا گیا کہ دور ہوں بے انصاف لوگ۔

اس ہولناک عقوبت یا واقعے کو بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔سورۃ قمر میں جس طریقے سے یہ بات بتائی گئی ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ نشان عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی کہ اس زمین پر کوئی ایسا طوفان آیا تھا جس کی وجہ سے یہ کشتی وہاں جا کر ٹھہری[83] عہد صحابہ میں الجزیرہ کے علاقے میں مسلمانوں نے کوہ جودی پر باقروی نامی بستی کے قریب اس کشتی کو دیکھا تھا[84] حضرت نوحؑ اس کشتی میں ۱۰ رجب کو سوار ہوئے۔[85] محرم کی دس تاریخ کو یہ کشتی ٹھہری اور دن جمعہ کا تھا۔ حضرت نوحؑ چالیس دن تک کوہ جودی پر ٹھہرے رہے۔ اُنھوں نے ایک کوّے کو پانی کی تحقیق

کے لیے بھیجا لیکن وہ واپس نہ لوٹا۔ ایک کبوتر کو بھیجا وہ کیچڑ والے پاؤں سے واپس آیا تو آپ کو پتہ چل گیا کہ زمین ابھی خشک نہیں ہوئی۔ پھر سات یوم کے بعد بھیجا تو وہ زیتون کا پتہ لیے واپس آیا جس سے اندازہ ہوا کہ پانی ابھی ہے پھر سات روز کے بعد بھیجا تو واپس نہ آیا جس سے حضرت نوحؑ نے اندازہ لگایا کہ پانی خشک ہوگیا ہے۔ پورے ایک سال بعد حضرت نوحؑ نے کشتی کا سرپوش اٹھایا اور ندا آئی کہ سلامتی کے ساتھ اُتر جا[86] سب نے اُتر کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ شکرانے کا روزہ رکھا اور شہر بابل کی بنیاد رکھی۔[87]

حضرت نوحؑ کے تین بیٹے زندہ رہے۔ باقی تمام لوگ وفات پا گئے۔ انھی تین بیٹوں سے آپؑ کی نسل چلی[88] بعض روایات کے مطابق آپ طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔[89] اور بعض روایات کے مطابق آپ طوفان کے بعد ۳۵۰ سال زندہ رہے۔ مجموعی طور پر بارہ سو سال عمر پائی۔ مجمع البحرین کے حوالے سے نوحؑ کی عمر ۲۵۰۰ سال لکھی ہے۔ ''انوارنعمانیہ'' نے اسی کو منتخب کیا ہے۔ ''کنز الادیت'' میں نوحؑ کی عمر ہزار سال اور تورات میں ۹۵۰ لکھی ہے۔ صحیح تر ۱۲۵۰ سال ہے۔ آپ کی قبر نجف اشرف میں ہے[90] روایت ہے کہ جب موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لیے آیا تو اس نے آپؑ سے دریافت کیا کہ آپؑ نے دنیا کو کیسا پایا؟ آپؑ نے فرمایا کہ بس ایسے ہی جیسا کہ میں ایک دروازے سے کوٹھری میں داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔[91]

حضرت نوحؑ کی حیات کا جائزہ لینے سے آپؑ کی سیرت کے کئی نمایاں پہلو سامنے آتے ہیں جن میں ثابت قدمی اور صبر و استقلال سے عرصۂ دراز تک تبلیغ، توحید ایمان نہ لانے والوں کے طنز و تنقید سے اعراض و خاموشی، کفار سے روئے زمین کو پاک دیکھنے کی دُعا پر آمدِ طوفان اور اس میں آپ کا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محفوظ رہنے پر شکر بلکہ ہر حال میں شکرِ ربی بجالانے جیسے نمایاں اوصاف شامل ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کلامِ اقبال کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے ''نوحیت'' کے تمام اہم پہلوؤں کو صرف چند اشعار میں اس طرح سمویا ہے کہ آپؑ کی سیرت و حیات کے تمام اہم واقعات کی طرف تلمیحی اشارے مل جاتے ہیں جن کے سبب اِن واقعات کا ایک خاکہ قاری کے ذہن میں بن جاتا ہے۔ وہ ان کی بدولت اہم واقعات کی تفصیلات تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ علامہ اُمتِ مسلمہ کو اس ''نوحیت'' کے ذریعے کون سا پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیئے جائزہ لیں۔

جاوید نامہ میں ''فلک قمر'' کی ذیل میں ''طواسین رُسل'' کے عنوان سے چار طواسین کا ذکر ہے:

۱- طاسین گوتم بعنوان توبہ آوردن زنِ رقاصہ عشوہ فروش
۲- طاسین زرتشت بعنوان آزمائش کردن اہرمن زرتشت را
۳- طاسین مسیحؑ بعنوان رویائے حکیم طالسطائی
۴- طاسینِ محمدؐ بعنوان نوحۂ ابوجہل درحرمِ کعبہ

''طاسین زرتشت آزمائش کردن اہرمن زرتشت را'' میں بدی کے خدا کا پیغمبر زرتشت سے خطاب ہے۔ اہرمن خدا زرتشت سے کہتا ہے کہ اس کی تعلیمات سے وہ اور اس کے اہرمنی پجاری بہت پریشان ہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی تعلیمات اُن کے حق میں موت کا پیغام ہیں۔ اس تمہید کے بعد اہرمن حضرت زرتشت کو بہکانے کی جدوجہد کرتے ہوئے کہتا ہے:

تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است
بر مرادش راہ رفتن گمرہی است
زہرہا در بادۂ گلفامِ اوست
ارّہ و کرم و صلیب انعامِ اوست!
جز دعاہا نوح تدبیرے نداشت
حرفِ آں بیچارہ تدبیرے نداشت!
لیکن از پیغمبری باید گذشت
از چنیں مُلّا گری باید گذشت!
تا نبوت از ولایت کمتر است
عشق را پیغمبری دردِ سر است![۹۲]

ترجمہ: یزداں کے وعدہ پر اعتماد کرنا حماقت ہے۔ اس کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنا گمراہی ہے۔
اس کے بادۂ گلفام کے اندر زہر بھرے ہیں۔ اس کے انعامات آرہ، کٹھرے اور صلیب ہیں
مگر یہ پیغمبری اور اس قسم کی مُلّا گری چھوڑ دینی چاہیے۔
چونکہ نبوت ولایت سے کم ہے۔ (یہ شیطان کا فلسفہ ہے) اس لیے پیغمبری عشق کے لیے دردِ سر ہے۔

اہرمن زرتشت سے کہتا ہے کہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد اور اُس کے احکامات پر عمل سوائے نادانی و جہالت کے کچھ نہیں۔ اس کے احکامات پر عمل گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ انعامِ نبوت کا صلہ اذیت ہے۔ اس کے بادۂ گلفام میں زہر چھپا ہوا ہے۔ دیکھو! حضرت زکریاؑ آرے سے کٹے، حضرت ایوبؑ کے بدن میں کیڑے پڑے، حضرت عیسیٰؑ مصلوب کیے گئے اور حضرت

نوحؑ دعا کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کی تبلیغ میں تاثیر ہی نہ تھی۔ لٰہذا پیغمبری و ملاگری چھوڑ دینی چاہیے اور ولایت کو منتخب کر لینا چاہیے۔ کیونکہ پیغمبری دردِ سر ہے۔

مذکورہ بالا اشعار میں حضرت زکریاؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت نوحؑ کا ذکر ہے۔ اول الذکرتین کا تذکرہ اپنے اپنے محل پر آئے گا۔ یہاں ہمیں صرف حضرت نوحؑ کے حوالہ سے دیکھنا ہے، بدی کا خدا زرتشت کو نبوت کے مصائب و نقصانات بتاتا ہے لیکن درحقیقت وہ نبوت سے خوفزدہ ہے۔ اسی لیے تو وہ حضرت نوحؑ کی دعا کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اُسے یہ تو معلوم ہے کہ ''نوحیت'' کی دعا کی تاثیر کیا ہے کہ نبی دعا کے ذریعے پوری کائنات کے کفار کو صفحۂ ہستی سے ختم کروا سکتا ہے۔ اُس کا نعرۂ ''لاتذر'' جلال و تمکنت سے بھرپور ہے۔ نبی دعا مانگتا ہے اور اللہ کو نبی کی عزت اتنی عزیز ہے کہ وہ یک لخت تمام کفار کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر، جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ پھر اسی نبی سے ایک نئی دُنیا آباد کر کے بتا دیتا ہے کہ جو میرے لیے مصائب و تکالیف برداشت کرتا ہے میں بھی اُس کے نام کو باقی رکھتا ہوں۔

بقول مولانا احمد یار نعیمی:

عزت نبی کو بچانے کے لیے اگر سارے جہاں کو غرق کرنا پڑے تو قانونِ فطرت دریغ نہیں فرماتی۔[۹۳]

دراصل علامہ اقبال حضرت نوحؑ کی دُعائے پُر اثر سے متاثر ہیں اور موجودہ مردِ مومن میں ''نوحیت'' کی دُعائے ''لاتذر'' کا جلال و تمکنت اور تاثیر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اسی لیے تو اللہ کے حضور دُعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے سینوں کو پھر اسی نعرہ حق ''لاتذر'' کی تاثیر سے بھر دے جو ''نوحیت'' کا خاصہ تھی تاکہ مردِ حق آگاہ کی چشمِ خشمگیں کے سامنے نہ کوئی کافر ٹک سکے اور نہ اُس کی آوازِ ''لاتذر'' سے بقیدِ حیات رہ سکے۔ نظم ''طارق کی دعا'' میں اس خواہش کا اظہار یوں کرتے ہیں:

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے![۹۴]

یہاں حضرت نوحؑ کلامِ اقبال میں ایک ایسی ہستی کے طور پر اُبھرتے ہیں جو عشقِ حقیقی سے لبریز قلب و چشم کی مالک ہی نہیں بلکہ برگزیدۂ بارگاہ الٰہی اور مقبول الدعوٰت ہے۔ یہ کائنات کو کفر و شرک سے پاک دیکھنا چاہتی ہے اور طویل عرصہ تک راہِ حق پر لانے کی کوشش کے باوجود

اُنھیں کفر پر ڈٹا دیکھ کر ''لاتذر'' کا دُعائیہ نعرہ بلند کرتی ہے۔ پھر عشقِ حقیقی سے لبریز نگاہِ کامل سے اُس کا نظارا بھی کرتی ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ موجودہ دور کے مردِ مومن یقین و ایمان کو حضرت نوحؑ کی طرح پختہ کرلیں۔ مستقل مزاجی اور صبر و استقلال سے کام لیں اور حضرت نوحؑ کی تبلیغاتِ شاقہ کی پیروی کریں۔[95] انسانیت کو راہِ ہدایت پر لانے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ مصائب و مشکلات سے نہ گھبرائیں۔ اپنی روش و عزیمت میں ذرّہ بھر لچک نہ آنے دیں۔ درحقیقت علامہ چاہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کے دل میں دینِ اسلام کو کفر پر غالب دیکھنے کا وہی جذبہ پھر موجزن ہو جائے جو ''نوحیت'' کا خاصہ ہے۔ اُن کی دُعا میں وہی تاثیر آ جائے جو دُعائے ''لاتذر'' میں تھی۔

علامہ اقبال کے ذہن پر اس دُعائے نوحؑ نے کافی گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اسی لیے تو وہ جب اللہ تعالیٰ سے تبدیلیِ حالات کی دعا مانگتے ہیں تو ''نوح کی کشتی کو بچانے والے'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اللہ گردابِ حوادث سے سفینے کو پار لگانا تیرا ہی کام ہے۔ تیرے علاوہ کوئی مددگار نہیں۔ تو نے ہی انبیاء کرامؑ کی مدد کی تھی۔ تو ہی ہماری بھی مدد کر۔ ہمیں تیرے علاوہ کوئی بھی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس سے اپنی داستانِ حال کہیں۔ دیکھیے مندرجہ ذیل اشعار میں کس والہانہ انداز سے دعا کرتے ہیں:

لے چلا بحرِ محبت کا طلاطم مجھ کو
کشتیِ نوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو
اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور ابراہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
دیکھ اے نوحؑ کی کشتی کو بچانے والے
آیا گردابِ حوادث میں سفینا اپنا
اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا[96]

مذکورہ بالا اشعار میں ''کشتیِ نوحؑ کو بچانے والے، نعرہ لاتذر، جز دعاہا نوحؑ'' کی تمام تلمیحی تراکیب کو اکٹھا کیا جائے تو یہ حضرت نوحؑ کی سیرت و کردار اور طوفانِ نوحؑ کی طرف مکمل اشارے ہیں جن کی مدد سے قاری واقعات و نتائج تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جائزہ لینے

سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ''نوحیت'' اقبال کے ہاں غیر متزلزل جذبۂ عشق سے لبریز نگاہِ کامل، ناقابل شکست عزیمت و استقامت اور پرتاثیر دعا کا مجموعہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ مسلمانوں میں دعا کی قبولیت کی ''نوحی تاثیر'' دیکھنے کے متمنی و آرزومند ہیں تاکہ روئے زمین ایک مرتبہ پھر اُسی طرح کفر و شرک سے پاک ہو جائے جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانے میں پاک ہوئی تھی۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا موجودہ دور کے مردِ مومن کی دعا میں اتنی تاثیر ہوسکتی ہے؟ کیا وہ مقبول بارگاہ الٰہی کا درجہ پا سکتی ہے؟ اس کا جواب ہمیں قرآنِ پاک سے مل جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○[97]

ترجمہ: اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے تو انھیں چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اگر تم دعا کی قبولیت چاہتے ہو تو میری راہنمائی کی صداقت کا پورا یقین رکھو۔ میری اطاعت کرو اس طرح تم درست راستے تک پہنچ جاؤ گے۔

سورۃ شوریٰ میں ہے:

وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [98]

ترجمہ: ایمان لانے والوں اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں کی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔

سورۃ اعراف اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے:

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ [99]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے کو قطعاً ناپسند فرماتا ہے۔

دعاؤں کے قبول ہونے کے لیے ایمان پہلی شرط ہے اور پھر ایمان بھی اُنھیں لوگوں کا مکمل سمجھا جاتا ہے جو حقیقت میں ایمان لا کر اللہ کے ہر پیش کیے جانے والے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا جدوجہد سے کریں، کسی بھی حالت میں اللہ کی نافرمانی نہ کریں حتیٰ کہ اس جدوجہد میں راتوں کی نیند تک حرام کر دیں اور اللہ تعالیٰ کو خوف و طمع سے یاد کریں اور اللہ کے عطا کردہ رزق کو ربوبیت عامہ کے لیے بند نہ کریں بلکہ کشادہ رکھیں۔[100] اور یہ لوگ اپنی

چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے اُن کے اثرات مٹانے کی دعا کرتے رہیں اور یہ دعا کریں کہ اُن کے رب نے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ فرمایا ہے، اُن سے بہرہ یاب کرے۔

مندرجہ بالا بیان کردہ خصوصیات سے مزین مومن جب دعا مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو جواب دیتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّى لَآ اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى[۱۰۱]

ترجمہ: تو اُن کی دعا سن لی اُن کے رب نے کہ مَیں کام کرنے والے کی محنت ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت۔

اللہ تعالیٰ نے دعا اور اُس کی قبولیت کا بیان فرما دیا ہے یہی سبب ہے کہ جب حضرت نوحؑ کی قوم نے اُن کی سخت مخالفت کی تو اللہ سے دعا پر ندا آئی:

فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُوْنَ[۱۰۲]

ترجمہ: اور ہم کیا ہی اچھے قبول فرمانے والے۔

اور دعا کے اس جواب کو غور سے پڑھیے اللہ نے فرمایا: اے نوحؑ تیری دعا تو قبول کی لیکن تو اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا[۱۰۳] ترجمہ: ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا۔

دعا کے بعد اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے نوحؑ تم آرام سے بیٹھ جاؤ بلکہ فرمایا ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی تیار کرو۔ ہم تمھاری حفاظت کا انتظام کریں گے۔ یعنی دُعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُنھیں وہ تدبیر بتا دی جن سے وہ اور ان کی قوم سیلاب سے محفوظ رہ سکے۔

اقبال کی شاعری کا پیغام بھی یہی ہے کہ دعا اور دوا دونوں سے کام لو۔ یعنی نعرہ لاتذر بھی لگاؤ۔ وسیلہ بھی تلاش کرو۔ نوحؑ کی طرح مصائب کو طیبِ قلب اور انشرح صدر سے سہو۔[۱۰۴] جب تمھیں معاشرے میں مادہ کی گونا گوں صورت گری نظر آئے جو لوگوں کی یادِ الٰہی سے غافل کر رہی ہو۔ لوگ قانونِ الٰہی کی حدیں توڑ کر طغیانی کا شکار ہو رہے ہوں۔ علم کی فراوانی حجاب اکبر کا کام دے رہی ہو۔ تمدن ضلالت کی جانب راہنمائی کر رہا ہو۔ خدائے واحد سے اتنا بھی سروکار نہ رہے کہ اُس کی عبادت گاہوں کا ادب کیا جائے تو ایسے میں مردِ مومن کو فریضۂ نوحی سرانجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں اُسے اپنی شاندار امتیازی حیثیت کی فکر نہ کرنا چاہیے۔ اگر اُسے کمزور پوزیشن پر طعنے ملیں تو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اُسے دعوت الیٰ الحق

کے لیے صاف گوئی سے کام لینا چاہیے اور وہ لوگ جو اُس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اُس گروہ میں شامل ہو جائیں اُن سے علیحدگی کے لیے کسی قسم کی سختی و دباؤ کو برداشت نہ کرنا چاہیے پھر دعوت الی الحق کے لیے خزانوں سے بے پرواہ رہنا بھی ضروری ہے کہ بغیر ملکی صفات کے اور غیب کے علم کے بحیثیت معمولی انسان بھی بڑے سے بڑے جباروں کی حیثیت بگاڑ دینے کا الٹی میٹم دے سکتا ہے۔

علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ مردِ مومن جباروں سے لاتعلق رہ کر دعوتِ حق کے فریضے کو سرانجام دے کہ جبار طبیعتیں کبھی بھی راہ راست پر نہیں آ سکتیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مردِ مومن اپنی اور اپنے گروہ کی حفاظت اور بچاؤ کی تدبیر نکالے کفر وشرک کے حوادث سے محفوظ رہنے کے لیے سفینۂ نجات بنائے اور اس کے بنانے میں گرم جوشی سے تعلیمات الٰہیہ کے مطابق کام کرے۔ کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔ عزم وثبات اور استقلال میں حضرت نوحؑ کی پیروی کرے اور اس کو پار لگانے کے لیے اللہ سے دعا کرے کہ وہی سب کی دعا سُنتا اور سفینہ پار لگاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علامہ نے خود بھی حضرت نوحؑ کے حوالے سے دعا مانگی ہے۔

آخر پر ایک اہم بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ علامہ اقبال سفینۂ نوحؑ کے بارے میں بانگِ درا میں ایک غلط روایت نظم کر گئے ہیں۔ نظم ہندوستانی بچوں کا قومی گیت کے درج ذیل اشعار دیکھیے:

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحؑ نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمین کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے[۱۰۵]

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ علامہ اقبال حضرت نوحؑ کی کشتی کا ذکر کر رہے ہیں جس میں اہل ایمان آپ کے ہمراہ سوار ہو گئے اور محفوظ رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ نے اس قدیم مشہور روایت کو بھی نظم کر دیا جس کے مطابق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ''سفینۂ نوحؑ'' ہندوستان کے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آ کر ٹھہرا تھا لیکن یہ روایت درست نہیں ہے۔[۱۰۶] حیرت ہے کہ علامہ اقبال جیسی وسیع المطالعہ شخصیت کی نظر سے یہ حقیقت کیوں اوجھل رہی کہ

''سفینۂ نوحؑ'' ہندوستان کے کسی پہاڑ پر نہیں بلکہ کوہِ ارارات کی چوٹی 'جودی' پر ٹھہرا تھا جو ہندوستان میں نہیں ہے۔ غالباً علامہ اقبال نے اس واقعہ کے زبانِ زدِ عام ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں تحقیق کی ضرورت محسوس نہ کی اور وطن کی محبت کی شدت کا اظہار کرتے ہوئے ایک غلط روایت نظم کر گئے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- چشتی، یوسف سلیم، شرح اسرارِ خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۲۸۶

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸/۱۸

۳- امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال فارسی اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۲۹۴

۴- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، علامہ سید سلیمان، سیرۃ النبی، ج:۵، مکتبہ مدنیہ، لاہور، ۱۴۰۸ء، ص:۲۳۷، مرشدِ کامل پر مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حضرت شعیبؑ اقبال کی نظر میں

۵- نسیم امروہوی، فرہنگ اقبال فارسی، ۱۹۸۹ء، ص:۲۹۴

۶- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج:۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، باردوم، ۱۹۷۹ء، ص:۲۵۷۔ نیز دیکھیے: صحیح بخاری شریف، ج ۳، مکتبہ تعمیر انسانیت، باردوم، ۱۹۸۰ء، ص:۸۷۶

۷- الکاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، مکتبہ نبویہ، لاہور، باردوم، ۱۹۸۳ء، ص:۵۰۸ میں درج ہے کہ نوح نام صرف اہل عرب کے نزدیک ہے

۸- امیر علی، سید مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۱، دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۲۵

۹- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، مکتبہ اسلامیہ گجرات، ۱۹۷۰ء، ص:۷۷۔ نیز دیکھیے: اصفہانی عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، نشریات کتاب فروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، بار بیست و پنجم، ۱۳۶۰، ص ۱۹۹۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴۱

۱۰- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، ص ۷۷۔ نیز دیکھیے: الکاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، ص:۵۰۸

۱۱- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۱۹۹

۱۲- امیر علی، سید مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۶، دینی کتب خانہ، سن ندارد، ص: ۵۸۳۵
۱۳- فیروز الدین، الحاج مولوی، (مرتب) فیروز اللغات (اردو) نیا ایڈیشن، فیروز سنز، لاہور، س ن، ص:۱۳۸۴۔اسی لغت میں اسی صفحہ پر نوحؑ کا مطلب تسکین دینے والا اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ عبرانی میں نوحؑ کا مطلب آرام و آسائش ہے
۱۴- محمود الحسن عارف، ''نوح'' مشمولہ، دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۲۲، ۱۹۸۹ء، ص:۴۷۵
۱۵- سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص ۴۷۵۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو) ج:۲، نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب، آرام باغ، کراچی، سن ندارد، ص:۷۷
۱۶- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۱۹۹، ۲۰۰
۱۷- امیر علی، سید مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۱، ص ۲۲۵۔ نیز دیکھیے: نعیمی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۳، ص:۴۴۴
۱۸- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، ص ۷۷۔ نیز تفصیل کے لیے دیکھیے: کاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، ص:۵۰۸
۱۹- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص:۳۴۳۱
۲۰- کاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، ص:۵۰۸
۲۱- حوالہ مذکورہ بالا
۲۲- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمٰن، ج:۴، ص ۳۸۳۵۔ نیز دیکھیے: منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، سلمان، رحمۃ اللعلمین، ج ۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص ۳۹۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۳۱۔ نیز: ج:۲، ص ۲۲۳، نیز مودودی، ابوالاعلی، تفہیم القرآن، ج:۴، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بارِ ششم، ۱۹۸۸ء، ص ۴۸۶، نیز: ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۲، ص ۳۵۔ نیز: کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۳۹۹ھ، ص:۲۰۷
۲۳- دانشگاہ پنجاب، لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۲، ص:۴۷۵
۲۴- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص: ۲۰۰۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص:۳۴۱
۲۵- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمٰن، ج:۳، ص ۲۴۴۸۔ نیز: ج:۹، ص:۱۰۴۴۰، نیز: ابن کثیر، اسماعیل، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۲، پ:۸، ص:۷۷۔ اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص ۱۹۹۔ سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص ۳۴۱۔ نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن

ندارد، ص :۶۵۲۔کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج: ۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۳۹۹ھ، ص ۲۰۷۔نیز: ج:۵، ص ۳۱۶۷

۲۶- سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، حصہ اوّل، ج:۱۔۲، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص:۶۳، ۶۴

۲۷- ابنِ کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین، البدایہ و النہایہ، ج: اوّل، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء، ص:۱۰۱

۲۸- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج: ۲، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جمادی الثانی، ص: ۳۵۳۔نیز دیکھیے: وحید الزماں، علامہ نواب، تبویب القرآن، ج:۲، خالد احسان پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۹۶

۲۹- تورات، عہدِ عتیق، پیدائش، باب:۵، آیت:۲۸

۳۰- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱۔۲، ص:۱۹۹

۳۱- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۲، جگہ واشاعت وسن مذکورہ بالا، ص:۱۱۲

۳۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، عہدِ عتیق، تکوین، باب:۶، آیت ۹، تکوین، باب:۹، آیت ۲۰ تا ۲۲

33- Nor does shameless drunkeness of Noah accord well with the csacter of the pious hero of Flood story, *The New Encyclopedia Britannica*, Vol: 18, Edition: 15, 1997, P: 476

۳۴- الاحزاب:۳۳، آیت:۷

۳۵- ابنِ کثیر، حافظ علامہ ابوالفدا ء، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص ۱۹۰۔نیز دیکھیے: مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار سترھواں، ۱۹۸۰ء، ص: ۴۰ مابعد

۳۶- آزاد، مولانا ابوالکلام، مرتب، غلام رسول مہر، انبیائے کرام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص: ۴۰

۳۷- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۵، ص:۳۷۹۔نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۹، جگہ اشاعت وسن حوالہ مذکورہ بالا، ص: ۱۰۲۸۲، ۱۰۴۴۰، ۱۰۴۴۱۔نیز دیکھیے: کاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، ص:۵۱۱۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: دانشگاہ پنجاب، لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۲، ص: ۴۷۶۔ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین اسماعیل، تفسیر ابن کثیر، ج:۲، پ:۸، ص: ۷۷، نیز ج:۵، پ:۲، ص: ۴۷۔نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، ص: ۸۴۔امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۳، ص:۲۴۴۸ اور ج:۶، ص: ۵۰۰۷۔شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۶ ادارہ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۵۶۶۔پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۲، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص:۱۰۸۔ابنِ کثیر، حافظ علامہ ابوالفدا اعماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص ۱۹۲

۳۸- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۲، بار پنجم، ص:۳۵۳

۳۹- ابنِ عربی، شیخ اکبر محی الدین، مترجم بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم، مکتبہ تاج، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص:۱۲۶،۱۳۴،۱۳۵

۴۰- امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۳،ص ۲۴۸۴۔ نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۸، ادارۃ المعارف، کراچی، بار پنجم، ۱۹۹۸ء، ص:۵۶۵

۴۱- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۲، ص:۳۵۴

۴۲- ایضاً، ج:۶، ص:۴۶

۴۳- الاعراف:۷، آیت:۶۳

۴۴- ہود:۱۱، آیت:۲۷

۴۵- المومنون:۲۳، آیت:۲۴

۴۶- ہود:۱۱، آیت:۲۷

۴۷- ہود:۱۱، آیت:۲۷

۴۸- المومنون:۲۳، آیت:۲۵

۴۹- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۲، ص:۴۰۳

۵۰- تورات بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے دیکھیے: پیدائش باب:۶، آیت ۱۱۔۱۴

۵۱- یہی اعتراض عرب کے بدوؤں نے رسول ﷺ پر کیا اور تمام پیغمبروں نے یہی کہا ہے جو حضرت نوحؑ نے کہا اور قوی منطق جو تمام انبیاء نے دی ہے وہ یہ ہے انّ اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ ماخوذ از قصص الانبیاء (فارسی)، ص:۲۰۳

۵۲- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱۔۲، ص:۲۰۳

۵۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: ہود:۱۱، آیت:۲۷۔۲۹

۵۴- ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۴، مقام اشاعت وسن حوالہ مذکورہ بالا، ص:۳۵

۵۵- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۸، مقام اشاعت وسن حوالہ مذکورہ بالا، ص ۵۶۵۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۶، مقام اشاعت مذکورہ بالا، ۱۹۷۷ء، ص:۴۳

۵۶- کاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوت، ج:۱، ص:۵۱۳۔ نیز دیکھیے: امیر علی سید، مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۶، ص: ۵۰، ۷۰۔ اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱۔۲، ص:۲۰۲

۵۷- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۵، مقام اشاعت وبار مذکورہ بالا، ربیع الثانی، ۱۴۰۰ھ، ص:۳۷۴

۵۸- حوالہ مذکورہ بالا، ص:۳۷۶

۵۹- نوح:۷۱، آیت:۲۔۶، ۲۳

۶۰- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۵، ص:۳۷۶

۶۱- ہود:۱۱،آیت:۳۳

۶۲- ہود:۱۱،آیت:۳۶

۶۳- نوح:۷۱،آیت:۲۶،۲۷

۶۴- تورات کے مطابق صنوبر کی لکڑی لائے۔المولی،محمد احمد جاد،ابراہیم،محمد ابوالفضل،البجاوی،علی محمد،شحاتہ، قصص القرآن (عربی)،المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ،الطبعۃ العاشرہ ۱۹۶۹ء،ص:۱۸۔نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ،تفسیر مظہری،ج:۶،ص:۴۵

۶۵- ہود:۱۱،آیت:۳۷

۶۶- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۴،مقام اشاعت،بار وسن مذکورہ بالا،ص:۶۲۰،۶۲۱۔نیز دیکھیے: اصفہانی،عمادالدین حسین،قصص الانبیاء (فارسی)،ج:۱-۲،ص:۲۰۷

۶۷- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،مرتب،عبدالغفار شکیل ایم اے،نوادر اقبال،سرسید بک ڈپو،علی گڑھ،۱۳۷۷ھ،ص:۹۵

۶۸- تنور سے مراد روئے زمین ہے دیکھیے: بخاری،ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل،صحیح بخاری شریف، ج:۲،ص:۲۵۵

۶۹- اصفہانی،عمادالدین حسین،قصص الانبیاء (فارسی)،ج:۱-۲،ص:۲۰۸۔تفصیل کے لیے دیکھیے:

۷۰- ہود:۱۱،آیت:۴۵،۴۶،۴۷،۴۸

۷۱- ہود:۱۱،آیت:۴۳

۷۲- الکاشفی،ملامعین واعظ،معارج النبوت،ج:۱،ص۵۲۱

۷۳- پانی پتی،علامہ قاضی محمد ثناء اللہ،تفسیر مظہری،ج:۱۱،مقام اشاعت و بار مذکورہ بالا،۱۹۷۹ء،ص: ۵۹۵۔نیز دیکھیے: امیر علی،سید مولوی مولانا،مواہب الرحمٰن،ج:۹،ص:۱۰۲۸۲

۷۴- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن (اردو) حصہ اول،ج:۱-۲،ص:۸۰

۷۵- حوالہ مذکورہ بالا،ص:۸۱

۷۶- الغاشیہ:۸۸،آیت:۲۲

۷۷- قٓ:۵۰،آیت:۴۵

۷۸- کرم شاہ،پیر محمد،ضیاء القرآن،ج:۲،ص:۲۶۳

۷۹- ادارہ تصنیف وتالیف،انوارِ انبیاء،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،بار پنجم،۱۹۸۵ء،ص:۲۴

۸۰- محمود الحسن عارف،''نوحؑ''،دائرہ معارف اسلامیہ،ج:۲۲،ص:۴۷۸

۸۱- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن (اردو) حصہ اوّل،ج:۱-۲،ص:۷۷،۷۸

۸۲- ہود:۱۱،آیت:۴۴

جودی پہاڑ کردستان کے علاقے جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ تورات میں ارارات کا ذکر آتا ہے وہ اسی سلسلہ کوہ کا مشہور نام ہے اور جبل جودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے اور اسی

پہاڑ نے ارارات اور گرجستان کے پہاڑی سلسلوں کو آپس میں ملایا ہوا ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کا یہی مقام بتایا گیا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰؑ سے اڑھائی ہزار سال پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا ابراسس نے پرانی کلدانی روایات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اپنے ملک کی جو تاریخ رقم کی تھی اس میں سفینۂ نوحؑ کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتایا گیا ہے ارسطو کے شاگرد ابیڈ ینوس نے بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کی ہے۔ بابل کی کھدائی سے دریافت ہونے والے آثارِ قدیمہ سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے لیکن ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ 'جودی' اصل میں ایک گاؤں کا نام تھا اور پہاڑی کا وہ سلسلہ جو اس گاؤں سے متصل تھا، کوہِ جودی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے مضافات میں ''قرواو بازبدا'' کی مشہور آبادیاں تھیں اور یہ پہاڑی انھیں بستیوں کے نام سے موسوم تھی۔ اخبار الطّول کے مصنف نے اسی نسبت سے کشتی نوحؑ کے ٹھہرنے کہ جگہ ''قرواو بازبدا'' کو ٹھہرایا ہے۔ ابن کتیبہ نے بھی یہی روایت نقل کی ہے مشہور مسیحی مورخ گریگوری ابوالفرح ملطی نے ان سب کی تطبیق یہ کہہ کر کی ہے کہ یہ سب ایک ہیں کوہِ ارارات ایک وسیع سلسلہ تھا جو مختلف ناموں سے مشہور تھا۔ تورات نے پہاڑی کا اصل نام بتانا کافی سمجھا لیکن قرآن پاک نے پہاڑ کی اس چوٹی کا بھی بتا دیا جہاں کشتی رکی۔ ماخوذ از تفہیم القرآن، ج:۴،ص۳۴۱

۸۳- مہر، غلام رسول، (مرتب) انبیائے کرام، مصنف آزاد، مولانا ابوالکلام، ص:۳۵۔ نیز دیکھیے: مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳،ص:۶۸۷

۸۴- حوالہ مذکورہ بالا، ج:۲،ص:۴۷، ۴۸

۸۵- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۴،ص:۶۲۷

۸۶- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۶،ص:۵۹

۸۷- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۴،ص:۶۲۶

۸۸- اسماعیل، ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۴، پ:۲۳،ص:۳۴۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۶،ص:۵۴۔ شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۴،ص:۶۳۳۔ امیر علی، مولوی سید، مواہب الرحمٰن، ج:۵،ص:۴۵۲۰، نیز: ج:۶،ص:۵۸۳۵، ج:۷،ص:۷۸۰۱

۸۹- نعیمی، مولانا مفتی احمد یار خاں؛ تفسیر نعیمی، ج:۱۲،ص۱۵۶۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۷،ص۱۸۳۔ نیز: ج:۸،ص:۵۳۷

۹۰- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲،ص:۲۰۱

۹۱- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۹،ص۱۶۳۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمٰن، ج:۶،ص:۷۰۵۱

۹۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص۶۳۷/۴۹

۹۳- نعیمی، مولانا مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، ص:۱۵۸
۹۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۰۵/۳۹۷
۹۵- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ امم اور اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳، ص:۲۵۳
۹۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مرتب عبدالغفار شکیل ایم۔اے، نوادرِ اقبال، ص:۹۵، ۹۷، ۱۰۲
۹۷- البقرۃ:۲، آیت:۱۸۶
۹۸- الشوریٰ:۴۲، آیت:۲۶
۹۹- الاعراف:۷، آیت:۵۵
۱۰۰- السجدہ:۳۲، آیت:۱۵، ۱۶
۱۰۱- اٰل عمران:۳، آیت:۱۹۵
۱۰۲- الصّٰفّٰت:۳۷، آیت:۷۵
۱۰۳- المومنون:۲۳، آیت:۲۷
۱۰۴- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رحمتہ اللعٰلمین، ج:۲، ص:۲۶۱
۱۰۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۸۷/۸۷۔
۱۰۶- چشتی، یوسف سلیم، شرح بانگِ درا، ص ۱۳۸۔ نیز دیکھیے: عابد علی عابد، تلمیحاتِ اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۳۷۔ امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال فارسی، ص:۸۶۵

☆☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام

کلامِ اقبال میں مذکورہ انبیاء کرامؑ میں ایک اہم نام حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی زندگی حق کی تلاش، مسلسل جدوجہد اور باطل کو شکست دینے کی پیہم سعی ہے، جس میں مردِ مومن کے لیے ہدایت و رہنمائی کے علاوہ عبرت و بصیرت کا سبق موجود ہے۔ دیگر شعرا کرام کی طرح اقبال نے اپنی شاعری میں مطالب کی تشریح اور حسنِ معانی کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی حیات و سیرت کے واقعات کو ہر انداز سے بیان کیا ہے[1] اور اس مثالی انسان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی ہے۔[2]

ڈاکٹر وحید عشرت رقم طراز ہیں:

> ''حضرت ابراہیم کی زندگی علامہ اقبال کے نزدیک ایک مثالی انسان یا مذہبی زبان میں ایک مردِ مومن کی زندگی تھی جو ایک طرف تخلیقِ فعالیت سے معمور تھی اور دوسری طرف جذبِ دروں سے منور تھی جس کے ہر ہر فعل سے اقدار تخلیق ہوتی تھیں۔''[3]

اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کی سیرتِ پاک سے جن واقعات کو تلمیحاتی انداز میں بیان کیا ہے ان میں ایک پیغام ہے اور اس پیغام میں بڑی جدت ہے۔ انھوں نے ان واقعات و نتائج سے پند و نصائح کے عظیم خزانے و جواہر ریزے چنے ہیں۔[4] آیئے جائزہ لیں۔ حیات و سیرت ابراہیمؑ شاہد ہے کہ آپؑ سرتا پا مجسمِ تسلیم و رضا اور کفر کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے تھے۔ آپ شروع ہی سے بصیرت حق رکھتے تھے۔ اس لیے بتوں کی پرستش، بناوٹ اور خرید و فروخت سے متنفر تھے۔ تورات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے والد تارح تھے۔[5] وہ اپنی قوم کے لیے بت بنا کر فروخت کرتے تھے لیکن تورات کے بیان کے برعکس مفسرین قرآن کی اکثریت نے آزر کو آپ کا چچا اور تارح کو والد قرار دیا ہے۔ سید محمد باقر موسوی لکھتے ہیں کہ: آزر حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام نہیں ہے اگرچہ یہ قرآن میں باپ کے لیے آیا ہے۔ عرب کی لغت میں ''ابیہ'' کا اطلاق باپ، چچا، سرپرست، معلم حتیٰ کہ والدہ کے باپ پر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن میں بھی آزر

سے آپؑ کے والد کے طور پر خطاب نہیں ہے۔ اکثریت اس پر متفق ہے کہ آزر آپؑ کے چچا یا والدہ کے باپ کا نام ہے۔[۵] اس لیے کہ نبی کا والد کافر و مشرک نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ رسول پاک ﷺ کی حدیث ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آپ ﷺ کے والدین تک حضور ﷺ کے تمام آبا و اجداد مومن تھے۔ پاک لوگوں کی پشت سے پاک عورتوں کے رحم کی طرف اور پاک عورتوں کے رحم سے پاک مردوں کی پشت کی طرف آپ کا انتقال ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ پاک ماں باپ کے بطن وصلب سے پیدا ہوئے۔ ممکن ہے حضرت ابراہیمؑ کے والد تارح حضرت ابراہیمؑ کو ماں کے پیٹ یا شیر خوارگی کی حالت میں چھوڑ کر وفات پا گئے ہوں اور چچا آزر نے آپ کی پرورش کی ہو۔[۶] اس وجہ سے آپ باپ کے طور پر مشہور ہو گئے ہوں۔ رسول پاک ﷺ کی حدیث کے مطابق آخری رائے پر ہی اعتبار کرنا درست معلوم ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے کلام میں آزر کو حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے طور پر پیش کیا ہے۔ چونکہ قرآن پاک نے بھی آزر ہی نام بیان کیا ہے اس لیے اقبال نے اس بڑے مستند ذریعہ علم پر اعتبار کیا ہے۔ ہوسکتا ہے مفسرین کی مستند آرا اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں۔ انھوں نے آزر اور ابراہیمؑ کو باپ اور بیٹے کے روپ میں پیش کرنے کے علاوہ ان دونوں اسما کو استعارۃً ملّتِ اسلامیہ کے افراد کے لیے بھی برتا ہے۔ وہ ملّتِ اسلامیہ کے افراد کو ان کی غلط روش کی وجہ سے آزر اور ابراہیمؑ کو والد قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اولادِ ابراہیمؑ ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ان دو تلمیحات کے استعمال سے کئی نکات اخذ کرتے ہیں اور اس کی بوقلموں تعبیریں پیش کرتے ہیں، چند امثال ملاحظہ کیجیے:

چہ گویمت ز مسلمانِ نا مسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیلؑ است و آزری داند[۷]

ترجمہ: اس نامسلمان، مسلمان کی کیا بات کروں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ خلیلؑ کی اولاد ہو کر آزری پیشہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

ہمچناں دیدم فنِ صورت گری
نے براہیمی درو نے آزری[۸]

ترجمہ: میں نے مصوری کو بھی دیکھا ہے، نہ اس میں ابراہیمی ہے نہ آزری

عینِ ابراہیمؑ و عینِ آزر است
دستِ او ہم بت شکن ہم بت گر است[۹]

ترجمہ: وہ ابراہیم بھی ہے اور آزر بھی، اس کا ہاتھ بت شکن بھی ہے اور بت گر بھی۔

بت شکن اُٹھ گئے ، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں[۱۰]
آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی![۱۱]

حضرت ابراہیمؑ جب مرتبۂ نبوت پر فائز ہوئے تو سب سے پہلے آزر کو بت پرستی سے منع فرمایا۔[۱۲] آزر کا گھرانہ ہی بت پرست نہ تھا بلکہ تمام قوم مظاہر پرستی میں مگن تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم کے سامنے اعلان حق کیا لیکن آسودہ حال جاہل قوم نے آپؑ کی آوازِ حق پر لبیک کہنے کی بجائے سرکشی و ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور ایمان نہ لائی۔[۱۳] آزر بھی ان ایمان نہ لانے والوں میں سے ایک تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے مایوس ہو کر جدائی اختیار کر لی اور اپنی تبلیغ کا دائرہ وسیع کر لیا۔ لیکن مخاطب بت پرست قوم نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک نہ سُنی۔ وہ اپنے معبودوں کی طرح گونگے ، اندھے اور بہرے بن گئے اور اپنے باپ دادا کے دین پر اڑے رہے۔[۱۳] پھر حضرت ابراہیمؑ نے اور نرم لہجہ اختیار کیا لیکن قوم اصنام پرستی و نجوم پرستی میں مشغول رہی۔ قوم کا خیال تھا کہ تمام دُنیا کا نظم و نسق ستاروں کی حرکات کی تاثیر سے رواں دواں ہے۔ اس لیے ان کی خوشنودی و رضا کے حصول کے لیے ان کی پرستش لازم ہے۔[۱۴]

حضرت ابراہیمؑ نے انھیں سمجھایا کہ بتوں کی پرستش کی طرح ستاروں کی پرستش بھی غلط ہے لیکن ایک ضدی اور ہٹ دھرم قوم کو یہ سب سمجھانا اور اُن کے قلوب میں ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبے کو جنم دینا سہل نہ تھا۔ ہاں بت پرستی کے اس تصور کو کرید کر مٹانا ضروری تھا۔ آزر اور قوم کے ساتھ مناظرہ میں حضرت ابراہیمؑ نے ایک عجیب اور دلچسپ انداز اختیار فرمایا۔ آپؑ نے ایک شب ایک روشن ستارے کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ کیا یہ میرا رب ہو سکتا ہے جس کی پرستش میری قوم کر رہی ہے۔ ستارہ کچھ دیر بعد ڈوب گیا جو اُس کے رب نہ ہونے کی واضح دلیل تھی۔ اس کے بعد آپؑ نے چاند کی طرف اشارہ کر کے بھی وہی سوال دہرایا۔ جب صبح کے نزدیک چاند چھپ گیا تو آپ بولے کہ اس کو بھی زوال آ گیا اور قائم نہ رہ سکا تو میں کیسے اسے رب تسلیم کر لوں؟ دن نکلنے پر سورج آب و تاب سے نکلا۔ تمام دن چمکا اور شام کے وقت ڈوبنے لگا تو آپؑ نے سورج کی طرف اشارہ کر کے بھی وہی سوال دہرایا اور کہا کہ میری قوم کا یہ بڑا خدا بھی اپنی

اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکا لہٰذا یہ میرا رب کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ مکمل طور پر غلط آفل ہے۔

اس مکالمے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے باطل عقیدوں کو ایسے انداز میں رد کیا کہ ہر چھوٹے بڑے کے دل میں یقین پیدا ہو جائے کہ وہ چیزیں جو اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں اور طلوع و غروب ہوتی رہتی ہیں وہ خدا نہیں ہوسکتیں۔ خدا کوئی اور ہستی ہے۔ وہ جس نے زمین و آسمان اور پورے کارخانۂ حیات کو تخلیق کیا جو دائمی ہے۔ پس اے قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے آزاد ہوں اور مشرکانہ زندگی سے بیزار۔ بلاشبہ میں نے اپنا رُخ صرف اُسی ایک خدا کی جانب کرلیا ہے جو ارض و سماوی کا خالق ہے۔ میں ''حنیف'' ہوں اور ''مشرک'' نہیں۔[۱۵]

ڈاکٹر وحید عشرت رقم طراز ہیں:

> حضرت ابراہیمؑ کی اس استقرائی تفہیم میں مظاہر پرستی کے ابطال کا بنیادی نقطہ چھپا ہوا تھا جو اس زمانے میں رواج عام تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جس طرح مظاہر فطرت کی بے چارگی اور ان کی فضائیت کو آشکارا کیا اس نے مظاہر پرستی سے انانیت کو ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔[۱۶]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ نے پہلی مرتبہ چاند، سورج، ستاروں وغیرہ کو دیکھ کر سب سوالات کیے؟ حضرت ابراہیمؑ کسی کمرے یا تہ خانے میں تو نہ پلے بڑھے تھے کہ ایک عمر بعد اس میں سے نکلے۔ دراصل پیدائش سے لے کر اب تک وہ یہ سب دیکھ رہے تھے لیکن جب نظر بالغ ہوئی تو انھوں نے گہرا مشاہدہ کیا اور اللہ کی راہ تک پہنچ گئے۔ اس طرح ہم ان اشیائے مشہود کو علامات تصور کر کے یہ مفہوم اخذ کر سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے درجہ بدرجہ بہت سی اہم ہستیوں کو دیکھا جو دنیا میں کام میں مصروف تھیں لیکن کسی کا عروج مستقل طور پر قائم نہ رہا۔ اشیاء ابھرتی اور ڈوبتی نظر آئیں۔ انھوں نے اس اصل الاصول کی طرف راہ پالی کہ رب اور خالق ان چیزوں جیسا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ان میں سے کسی سے نسبت ہوسکتی ہے۔ خدا وہ ہے جو نہ ڈوبے یعنی غروب ہونے والی ہر چیز خالق کے مقابلے میں غیر اہم ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ o[۱۷]

ترجمہ: میں نے اپنا منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے ایک اسی کا ہوکر اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔

اقبال اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ[۱۸]

تارکِ آفل براہیم خلیلؑ
انبیاء را نقشِ پائے او دلیل
آں خدائے لم یزل را آیتے
داشت در دل آرزوئے ملتے[۱۹]
چوں ز بندِ آفل ابراہیم رست
در میان شعلہ ہا نیکو نشست[۲۰]

ترجمہ: غروب ہو جانے والوں کو ترک کر دینے والا ابراہیمؑ خلیل اللہ جن کا نقشِ پا انبیاء کے لیے رہنما ہے۔ وہ خدائے زوال ناپذیر کی نشانی تھے، وہ بھی اپنے دل میں ملت کی تمنا رکھتے تھے۔

ترجمہ: جب ابراہیمؑ نے غروب ہونے والوں کی قید سے آزادی پائی تو پھر آگ کے شعلوں میں بیٹھ کر بھی محفوظ رہے۔

پروفیسر محمد منور رقم طراز ہیں:

علامہ اقبال کے نزدیک اس عبرت گیر نتیجہ رس، جرأت آموز اور حقیقت شناس نظر کا نام ابراہیمی نظر ہے۔[۲۱]

اقبال اسے ہی باریک بین نظر بھی قرار دیتے ہیں۔ ابراہیمی نظر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ظلمت وعصیاں کے ہزار پردوں کے باوجود اللہ کو پہچان لیتی ہے۔ اس باریک بین نظر کے بارے میں ڈاکٹر عاشق حسین لکھتے ہیں:

اقبال نے ابراہیمی نظر کو ایمان وایقان کے نور اور یزداں شناسی کے اس جذبے سے تشبیہ دی ہے جو ظلمت وعصیاں کے ہزار پردوں کے باوجود خالقِ حقیقی کو پہچان لیتا ہے۔[۲۲]

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں![۲۳]

اس نظر کی بدولت تو حضرت ابراہیمؑ نے چچا آزر کے بت پاش پاش کر دیے اور اُس سے خطاب میں پوری قوم کی اصلاح سامنے رکھی۔ لہٰذا علامہ اقبال نے ہر قسم کے بتوں کو پاش پاش کرنے والی طاقت وقوت کے لیے ابراہیمؑ اور ابراہیمی کو علامت بنا لیا۔ مندرجہ ذیل شعر میں ''ابراہیم عشق'' کا استعارہ بھی اسی امر کی علامت ہے۔ علامہ کے نزدیک عشق ابراہیمؑ کی طرح ہے جو ہر طرح کے بتوں کو توڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان کے بت کو بھی:

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق[۲۴]

یہ شعر بانگِ درا کے دوسرے حصہ میں موجود نظم ''سوامی رام تیرتھ'' سے ہے۔ یہ پہلا شعر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بانگِ درا کے حصہ اوّل میں کہیں بھی ایسا کوئی حوالہ نہیں۔ حالانکہ سینا، طور، کلیم، حضرت عیسیٰؑ اور منصور حلاّج منصور وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب تو یہی لیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں علامہ اقبال خود چاند، ستاروں اور سورج کے نظارے میں مصروف تھے۔ پھر جب ان کے ہاں ابراہیمی مفہومِ بت شکنی متعین ہو گیا تو انھوں نے اس کا خوب استعمال کیا۔[۲۵]

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لآ اِلٰہ میں ہے![۲۶]

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ[۲۷]

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اس صنم کدہ (جہاں) کو ابراہیمؑ جیسے بت شکن کی ضرورت ہے اور اہل بصیرت اس ابراہیم کو ڈھونڈ رہے ہیں جس کی ضربت خاراشگاف سے دنیا بتوں سے پاک وصاف ہو جائے۔[۲۸] قرآن پاک میں ہے کہ تم نے وہ شخص تو دیکھا ہی ہوگا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا ہے اور پھر اللہ کے حکم سے جانتا بوجھتا گمراہ ہو گیا۔[۲۹] اس اعتبار سے دُنیا کی ہر وہ چیز جس کی آرزو اللہ سے غافل کر دے وہ ایک چھوٹا سا صنم ہے۔ خدا ایک ہے۔ جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ کثرت ہے۔ خود ہمارا جسم، اولاد، مال، عہدہ، عشرت و جاہ و مرتبہ، ہوس و ہوا وغیرہ ہر چیز ''کثرت'' ہے۔ لہٰذا یہ جہاں صنم کدہ ہی تو ہے کہ اس میں پایا جانے والا ہر بت اللہ سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر جو شخص بھی اللہ پر پختہ ایمان رکھتا ہے، وہ مردِ حق ہے۔ چنانچہ اس کا عمل حضرت ابراہیمؑ کی طرح کا ہو جاتا ہے جنھوں نے ہر شے سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف کر لیا اور لآ اِلٰہَ پر پختہ اعتقاد کر لیا۔ اس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے مقابلے میں باطل ہے۔ باطل بے بنیاد چیز کو کہتے ہیں۔ چونکہ اللہ کے علاوہ ہر چیز آفل یعنی ڈوب جانے والی ہے، لہٰذا آفل، باطل، زائل، فانی وغیرہ کلمات ایک ہی مفہوم دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ''لا احب الافلین'' کا مطلب اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ہر فانی چیز کو ''آفل'' کے زمرے میں لے آئے ہیں۔[۳۰] مثال دیکھیے:

علمِ مسلم کاملِ از سوزِ دل است
معنیٔ اسلام ترکِ آفل است[۳۱]

ترجمہ: مسلمان کا علم سوز دل سے کامل ہوتا ہے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ غروب ہونے والی چیز کو چھوڑ دیا جائے۔

اقبال کے نزدیک موجودہ تہذیب بھی ''آفل پرست'' اور ''ظاہر آمیز'' ہے۔ اس لیے وہ اسے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔[۳۲]

یہ ابراہیمؑ کی شان حنفی ہے اور اقبال کی ''آفل'' کی تشریح و تعبیر ابراہیمی۔ اسی سپردگی اور استقامت کی بدولت اللہ نے انھیں خلیل کا درجہ مرحمت فرمایا اور قرآن کے ذریعے اس دوستی کا اعلان فرمایا۔ صرف یہی نہیں وینِ اسلام کو بھی ملتِ ابراہیمی کا نام دے دیا۔

اللہ کے علاوہ ہر چیز کو آفل جان کر اللہ کی محبت سے متصادم ہر شے کو صنم سمجھ کر توڑ دینا وہ مضمون ہے جو حق کی جستجو اور جراتِ اظہار کی علامت بن کر علامہ اقبال کے کلام میں رنگ بدل بدل کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

حدیث بخاری میں احادیث نبویؐ کے حوالے سے ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کو بے آب و گیاہ چٹیل میدان میں (نزد فاران پہاڑ) چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑے تو حضرت ہاجرہؓ نے آپؑ کا دامن پکڑ کر دریافت کیا کہ آپؑ ہمیں کس کے سہارے اس ویرانے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ ہماری دیکھ بھال کون کرے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا یہ حکم ربی ہے۔ اس پر حضرت ہاجرہؓ نے کہا اگر یہ حکم ربی ہے تو آپ واپس چلے جائیں۔ وہ اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔[۳۳]

حضرت اسماعیلؑ جب سیانے ہوئے تو اللہ پاک نے اپنے خلیل کو سخت ترین امتحان سے دوچار کیا۔ آپؑ نے اس امتحان میں جس ثابت قدمی، بلند حوصلے اور جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ بے مثل ہے۔ آپ کو تین راتیں مسلسل خواب میں اللہ کی طرف سے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کا حکم ملا۔ انبیاء کرامؑ کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپؑ خواب کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لیے اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

آپؑ نے بیٹے کو خواب سنایا اور فرمایا کہ حکم الٰہی ہے۔ بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے حکمِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور عرض کی کہ میں راہِ اللہ میں قربان ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ کو لے کر خواب میں اشارہ پانے والے مقام پر پہنچے اور بیٹے کو قربان کرنے کے لیے گردن پر چھری چلا دی۔ اس موقع پر ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ: ''اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ یہ محض ایک امتحان تھا جس میں تو پورا اُترا۔''[۳۴]

آفل اور فانی ہونے کا اصول اولاد پر بھی ایسے لاگو ہوتا ہے جیسے کہ اللہ کے علاوہ باقی ہر شے فانی ہے۔ مال ہو یا اولاد یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے۔ مگر ضعیف والد کو تو لختِ جگر اپنی جان سے بھی عزیز ہوتا ہے۔ اولاد کی حفاظت کے لیے تو والدین جانیں نثار کر دیتے ہیں۔ البتہ محبت کی شدت کے مختلف درجے ہیں۔ اللہ کا سچا عاشق اپنی سب سے قیمتی شے خوشی سے وار سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے کوئی خدمت نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ اللہ خدمت یا قربانی کا حاجت مند نہیں۔ وہ تو قلوب کا خلوص دیکھتا ہے اور خلوص اور بے خلوص کا فیصلہ امتحان کرتا ہے۔ اگر فرد کے حالات اچھے ہیں تو اللہ ہے اور اس کا بندہ ہونے کا دعویٰ بجا اور اگر امتحان کا مرحلہ آ گیا اور اللہ کی محبت میں کسی اور فرد کی محبت کو فدا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو راہِ فرار اختیار کر لی۔ ظاہر ہے ایسے لوگ دین و دنیا دونوں سے کٹ گئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ[۳۵]

ترجمہ: اللہ ثابت رکھتا ہے ایمان والوں کو حق بات پر دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی زندگی میں۔

یعنی ثابت قدم اور بات پر قائم رہنے والے لوگ دین و دنیا میں رب کی طرف سے استحکام پاتے ہیں۔ لیکن غلط موقف اور اصول پر نہیں اڑتے اور سب سے بڑا اصل الاصول ہے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ جو اس پر قائم رہا اسے آزمائش سے دوچار ہونا پڑے گا اور قربانی کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے موقف اختیار کیا اور ہر شے سے رُخ موڑ کر اللہ کی خاطر آگ میں کود گئے۔ پھر بیٹے کی گردن پر خود ہی چھری چلا دی۔ اس واقعہ سے علامہ اقبال کی دوررس نگاہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ روشن مثال شخصیت اپنی نگرانی میں جو تربیت کرتی ہے وہ کتب کے کلمات سے ممکن نہیں ہے۔ کتب معلومات و کوائف دے سکتی ہیں لیکن انھیں قلب ونظر پر وارد نہیں کر سکتیں۔ قلب ونظر پہ وارد کرنے والے لوگ اور انھیں عمل میں لانے والے افراد ہی دوسروں کے لیے تابناک مثال بنتے ہیں اور باعثِ حوصلہ افزائی۔ اس لیے ضروری ہے کہ نمائندہ افراد اپنے کردار کا جائزہ لیتے رہیں اور جانچیں کہ اُن کی ذاتی مثال کیسی ہے۔ پروفیسر محمد منور رقم طراز ہیں:

"اعلیٰ مثال اعلیٰ بناتی ہے" ایمان کا نمونہ ایمان عطا کرتا ہے۔ قربانی کا عملی اقدام قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اگر خود ابراہیمؑ اپنی جان کی قربانی نمرود کی آگ میں کود کر پیش نہ کرتے تو ان کے فرزند بھی اس حوصلے کے مالک نہ ہوتے۔[۳۶]

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ لا الٰہ کی سلطنت ہی ایسی ہے کہ جو بھی اس میں آن ٹھہرتا ہے، وہ بیوی اور اولاد کے بندھن ختم کر دیتا ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز سے کنارا کر لیتا ہے اور امتحان کی گھڑی میں کامیاب ہوتا ہے۔

ہر کہ در قلیمِ لا آباد شد
فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ماسوا قطعِ نظر
می نہد ساطور بر حلقِ پسر[۳۷]

ترجمہ: جو کوئی توحید کی ولایت میں آباد ہوتا ہے وہ زن واولاد کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔
ایسا شخص غیر اللہ سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ دیتا ہے۔

اس کے علاوہ اقبال حضرت ابراہیمؑ کو معلم اور حضرت اسماعیلؑ کو متعلم کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی مثالی تربیت کے نتائج کو دیکھتے ہوئے آج اقبال بھی ایسے ہی صاحبِ نظر اساتذہ کے متمنی ہیں۔ لیکن جب وہ موجودہ دور کے اساتذہ پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں وہ نوجوانوں کی کردار کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اساتذہ ابراہیمی نظر سے مبرا اور عمدہ سیرت و کردار سے تہی نظر آتے ہیں۔ اُن کا بنایا نظامِ تعلیم بلند پروازی سے بے نیاز ہے۔ یہ مدارس کم اور نوجوانوں کے مقتل گاہ زیادہ ہیں جہاں نوجوانوں سے اسلامیت کی روح ختم کی جا رہی ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ![۳۸]

علامہ کے نزدیک نسلِ نو کی تعلیم و تربیت اور تشکیل کردار کے لیے معلمین پر لازم ہے کہ قرآن کی تعلیم اور ابراہیمی اوصاف کو اپنے اندر جنم دیں کہ صاحب کردار مومن ہی دوسرے افراد کی سیرت و کردار میں تبدیلی لا سکتے ہیں نہ کہ مدارس جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے کردار کی تربیت کی اور اس میں جو تبدیلیاں لائے وہ اپنی مثال آپ ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟[۳۹]

حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ کے باوجود قوم نہ سمجھی اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ تو ایک دن حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر کہ میں تمھارے بتوں کے بارے میں ایسی چال چلوں گا جو تمھیں لا

جواب کر دے گی، اعلانِ جنگ کر دیا۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَتَاللّٰہِ لَاَ کِیدَنَّ اَصْنَا مَکُم بَعْدَاَنْ تُوَلُّو ا مُدْبِرِیْنَo [۴۰]

ترجمہ: اور مجھے قسم اللہ کی میں تمھارے بتوں کا برا چاہوں گا بعد اس کے کہ تم پھر جاؤ پیٹھ دے کر

قوم نے کوئی توجہ نہ دی۔ حسنِ اتفاق سے جلد ہی قوم کا ایک مذہبی تہوار آ گیا۔ آزر اور دیگر لوگوں نے آپؑ سے اس تہوار میں شرکت کے لیے اصرار کیا۔ اصرار بڑھنے پر آپؑ نے ستاروں کی جانب نگاہ اٹھا کر کہا ''اِنِّی سَقِیْمٌ '' میں بیمار ہوں۔ کوکب پرست قوم سمجھی کہ ابراہیمؑ کسی منحوس ستارے کے اثر بد کا شکار ہیں، اس لیے آپ کو چھوڑ کر میلہ دیکھنے چلے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنا نظامِ عمل کرنے کا وقت مل گیا۔ انھوں نے خیال کیا کہ اب وقت ہے کہ میں اپنے نظام عمل کی تکمیل کو لوں اور مشاہدے کی شکل میں قوم پر دیوتاؤں کی اصلیت واضح کر دوں۔ آپؑ اُٹھے اور ہیکل میں پہنچے۔ ہیکل میں موجود بہتر بتوں کے سامنے قسم قسم کے حلوے، پھل، اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے پائے۔ آپؑ نے ان سے طنزیہ کہا کہ کھاتے کیوں نہیں۔ پھر تمام بتوں کو توڑ کر بڑے بت کو چھوڑ دیا تا کہ عقیدہ کے مطابق لوگ اس کی طرف رجوع کریں۔ قوم نے میلہ سے واپسی پر بتوں کا برا حال دیکھا تو سخت خفا ہوئی اور ایک دوسرے سے دریافت کیا کہ یہ سب کس نے کیا؟ اُن میں وہ افراد بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیمؑ تَا اللّٰہ لِاَ کِیدَنَّ اَصْنَامَکُم کہہ چکے تھے۔ انھوں نے فوراً حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا۔ کاہن اور سردار غصے میں آ گئے اور آپؑ کو بلا لیا اور کہا کہ ابراہیمؑ تم نے ہمارے بتوں سے یہ کیا کیا ہے؟ آپؑ نے جواب دیا مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپؑ کے سب سے بڑے بُت نے یہ سب کیا ہے۔ اس سے دریافت کرلو۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس یقینی حجت کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا تب شرمندگی سے سر جھکا کر کہنے لگے کہ ابراہیمؑ تو خوب جانتا ہے کہ ان میں بولنے کی طاقت نہیں ہے۔ تو اب حضرت ابراہیمؑ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اُنھیں بتایا کہ جب یہ بت نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے تو معبود کیسے ہو سکتے ہیں۔ تم کیوں عقل و دانائی سے کام نہیں لیتے؟ [۴۱]

اقبال نے اس واقعہ کا نقشہ بڑے خوبصورت و پرتاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ جاوید نامہ میں ''فلک زہرہ'' کے نام سے موسوم حصہ میں جب شاعر سیر کے لیے نکلتا ہے تو سب سے پہلے اسے قدیم خداؤں کی ایک محفل نظر آتی ہے۔ یہ موجودہ زمانے کے حالات کو اپنے لیے موزوں جان کر اپنی خدائی کو پھر سے زندہ کرنے کی تدبیر پر غور وخوض کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک

اس بات پر بے حد خوش ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ابراہیمؑ نہیں۔ اس لیے ان کی خدائی یقیناً قائم ہو جائے گی:

اندر و بینی خدایانِ کہن
می شناسم من ہمہ را تن بہ تن
بعل و مردوخ و یعوق و نسر و فسر
رم خن و لات و منات و عسر و غسر
بر قیام خویش می آرد دلیل
از مزاج ایں زمانِ بے خلیل[۴۲]

ترجمہ: وہاں تجھے پرانے خدایان باطل ملیں گے۔ مَیں ان میں سے ایک ایک کو اچھی طرح پہچانتا ہوں
بعل، مردوخ، یعوق، نسر فَسر، رم خن، لات، منات، عسر اور غسر
یہ دور حاضر کے توحید سے خالی مزاج کو اپنے پھر لوٹ آنے کی نشانی سمجھتے ہیں۔

ان جھوٹے خداؤں کی مجلس کی تصویر کشی میں اقبال کا پورا شاعرانہ کمال نمایاں ہے۔ ہر خدا، فریب دھوکہ بازی اور مکر و جادو کے ہتھیاروں سے لیس ہے لیکن سب کے دل میں ایک خوف ہے۔ سب کی روحیں لرزیدہ ہیں کہ اگر کسی ابراہیمؑ نے یکا یک جنم لے لیا تو وہ کہاں جائیں گے، اس ابراہیمؑ کی تو ایک ضرب سے وہ سب پاش پاش ہو جائیں گے :

اندریں وادی خدایانِ کہن
آں خدائے مصر و ایں رب الیمن
آں زار بابِ عرب ایں از عراق
ایں الٰہ الوصل و آں رب الفراق
ایں ز نسلِ مہر و دامادِ قمر
آں بہ زوجِ مشتری دارد نظر
آں یکے در دستِ او تیغ دورو
واں دگر پیچیدہ مارے در گلو
ہر یکے ترسندہ از 'ذکر جمیل'
ہر یکے آزردہ از ضربِ خلیل[۴۳]

ترجمہ: اس وادی کے اندر پرانے باطل خدا تھے، کوئی مصر کا خدا تھا کوئی یمن کا۔

کوئی عرب کے خداؤں میں سے تھا، کوئی عراق کا، کوئی وصل کا، دیوتا تھا اور کوئی فراق کا۔

یہ سورج کی نسل سے تھا اور وہ چاند کی دیوی کا شوہر تھا۔ وہ مشتری سے شادی کا خواہاں ہے۔

اس دیوتا کے ہاتھ میں دودھاری تلوار ہے۔ اس دیوتا نے سانپ کو اپنے گلے میں ڈالا ہے۔

مگر یہ سب اللہ پاک کے ذکرِ جمیل سے خوفزدہ اور ضرب خلیل سے آزردہ خاطر ہیں۔

جب یہ خدا اپنی محفل میں کفر وضلالت اور فتنہ وفساد کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکتے ہیں تو پیر روم جسے اقبال صاحب ''ذکرِ جمیل'' کے نام سے یاد کرتے تھے، آ کر ایک غزل پڑھتے ہیں جس کے خوف سے تمام جھوٹے خدا بے اختیار سجدے میں گر جاتے ہیں۔ اس غزل کو بھی علامہ نے ''ضربِ خلیل'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک اس دور میں اکثر نظریات کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے۔ لہٰذا اس مادیت نے آدمی کی آدمیت کو جگانے کے بجائے مشینی درجہ عطا کر دیا اور اپنے اس فیصلے کی تائید میں نظریے اور منطق بنالی۔ ان تمام بتوں کو پاش پاش کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس! کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو تقلیدی خطوط پر تعلیم دی جارہی ہے اور جن اندھی راہوں پر چلایا جارہا ہے اس کی درست شناخت کے لیے کسی ایسے صاحبِ ایمان اور مفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جرأتِ ابراہیمی عطا کی ہو؛ جو حق اور باطل میں امتیاز کر سکتا ہو؛ جو جرأت سے غلط نظریات یعنی باطل نظریات کے بتوں کو ریزہ ریزہ کرے۔[۴۴] اور جہان والوں کو بتادے کہ یہ دنیا صنم کدہ ہے اور عبادت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ[۴۵]

علم کی اہمیت مسلم ہے۔ اقبال ایسے علم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو محض علمی و عقلی سرمایہ نہ ہو بلکہ حقیقت میں نظر افروزی کے حق کی ادائیگی کر سکے۔[۴۶] ظاہری طور پر تو علم فقط معلومات میں اضافہ کا سبب ہے۔ یہ عمل کی راہوں کو از خود وا نہیں کرتا۔ اگر علم سے حاصل شدہ معلومات مثبت قدروں کو بحال کرنے اور تقویت دینے کا باعث بن سکتی ہوں تو وہ انسانیت کے لیے فائدہ مند ہیں ورنہ ضرر رساں۔ عقلی ونسلی سطح پر ٹھہر جانے والا علم اکثر اوقات انسانیت کش ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد منور رقم طراز ہیں:

''نا تربیت یافتہ، ذود جبلتیں اپنی وحشت کے نفاذ علم و آگہی کو اوزار اور ہتھیار بنا لیتی ہیں۔ بد نیت اور مکار آدمی علم کی وجاہت کے سہارے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ خطرناک دلیلیں اختراع اور منطق وضع کر سکتا ہے کیونکہ علم تو ایک جانبدار قوت ہے اگر اس قوت کا استعمال کرنے والا فرد اچھا انسان ہے تو وہ قوت مفید ثابت ہو سکتی ہے اور اگر قوت کا استعمال کرنے والا برا ہے تو وہ قوت مضرت رساں ثابت ہو سکتی ہے۔[۴۷]

اس مسئلے کو علامہ نے ابراہیمی حوالے سے اس طرح پیش کیا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم[۴۸]

یعنی وہی علم ابراہیمی علم کہلانے کا حقدار ہے جو قرآن و حدیث کے تابع، دل و نظر کا ندیم ہو۔ ایسا علم غلط اور درست، فائدہ مند اور مضرت رساں کا اندازہ خود کر کے غلط امور کی اصلاح کا فریضہ سر انجام دے کر کردار کو تبدیل کر کے اخلاق میں پاکیزگی لا سکتا ہے۔ دل و دماغ روشن کر سکتا ہے۔[۴۹] لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر علم آدم کے لیے لعنت قرار پائے گا۔[۵۰]

ہم جان چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے بت خانے میں جا کر تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔ یہ واقعہ جب نمرود کے علم میں لایا گیا تو قوم کے دیگر افراد کی طرح وہ بھی سخت طیش میں آیا۔ سپاہیوں کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کو دربار میں بلایا۔ کافی دیر بحث کرتا رہا۔ مناظرہ میں شکست کھا گیا۔[۵۱] اُسے فوراً اپنی حکومت و ربوبیت بچانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو رب کہلواتا تھا اور اگر لوگوں کو وہ نکتۂ توحید جو حضرت ابراہیمؑ سمجھا رہے تھے سمجھ میں آ جاتا تو یہ اس کی حکومت و ربوبیت کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنی حکومت اور ربوبیت بچانے کے لیے اپنے مشیروں کے مشورہ سے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی کوثی نامی گاؤں میں[۵۲] ایک وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت تیار کروائی گئی۔ اس میں لکڑیوں کے انبار جمع کیے جانے لگے جو آدمی بھی بیمار ہوتا وہ نذر مان لیتا کہ اگر مجھے شفا ہوگئی تو ابراہیمؑ کے جلانے کے لیے لکڑیاں لاؤں گا[۵۳] عورتیں ثواب کی نیت سے سوت کات کات کر اور لکڑیاں خرید کر انبار میں ڈالتیں۔ ایک مہینہ تک لکڑیاں اکٹھی کرنے کے بعد سات روز تک مسلسل آگ کو روشن کیا جاتا رہا۔ آگ اتنی اونچی تھی کہ کوئی پرندہ اس کے اوپر سے اڑ کر زندہ نہ رہتا تھا۔ پھر نمرود پہاڑ پر چڑھ گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بے لباس کر کے شیطان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق گوپھن کے ذریعہ آگ میں پھینک دیا گیا

پھینکوا دیا۔[۵۴] آپ سات یا چالیس یا پچاس دن آگ میں رہے۔[۵۵] لیکن آگ نے آپ کو ذرا نقصان نہ پہنچایا اور بحکم الٰہی ''بَرۡدًاوَّ سَلَاماً'' امن وسلامتی والی ہوگئی۔

قرآن پاک میں اس پُر اعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَ انۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فَاعِلِیۡنَo قُلۡنَا یَا نَارُ كُوۡنِیۡ بَرۡدًاوَّسَلَاماً عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَo وَاَرَادُوۡ ابِهٖ كَیۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَ خۡسَرِیۡنَ [۵۶]

ترجمہ: بولے ان کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تمھیں کرنا ہے ہم نے فرمایا اے آگ ہو جا ٹھنڈی اور سلامتی ابراہیمؑ پر انھوں نے اس کا برا چاہا تو ہم نے انھیں سب سے بڑھ کر زیاں کار کر دیا۔

قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡیَاناً فَاَلۡقُوۡهُ فِی الۡجَحِیۡمِo فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَیۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَسۡفَلِیۡنَo وَقَالَ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِo[۵۷]

ترجمہ: بولے اس کے لیے ایک عمارت چنو۔ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو تو انھوں نے اس پر داؤ سے چلنا (فریب کرنا) چاہا ہم نے انھیں نیچا دکھایا اور کہا میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں اب وہ مجھے راہ دکھا دے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ سے بچانے کا واقعہ بڑی جہتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱۔ معتبر وجود کے حامل لوگوں کو نا معتبر وجود کس طرح کچلتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں گرنا معتبر وجود کے سامنے خود سپردگی ہے تبھی تو معتبر وجود نے آگ میں ڈلنے کے باوجود آپ کو جلانے سے بچالیا۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں ڈالنے کا واقعہ ایک لازوال تجربہ ہے عارفانہ تجربہ نہیں بلکہ پیغمبرانہ تجربہ ہے اور عام انسانی تجربے سے بالکل مختلف۔ سب سے اہم بات علامہ بتانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آگ سے آپؑ کی سلامتی سے واپسی تمام انسانوں کے لیے گہرے سیاسی وجود اور مذہبی معنی سے عبارت ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا مختلف مراحل سے گزرنا اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ تلاشِ حق میں مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں۔[۵۸] اقبال نے ان تمام جہات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ زندگی کا سب سے بڑا جہاد عقل کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ بار بار عقل کی عمارات پر تیشہ چلاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ عقل کی موجودگی عشق کا پیغام سننے میں حائل ہے۔

لذتِ عشق ذوق جمالِ الٰہی سے منسلک ہے۔ جب عشق خود آگاہی کے آداب و رموز کی

تعلیم سے روشناس کرتا ہے تو پھر آتشِ نمرود بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے موجودہ مغربی تہذیب کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے اور تہذیب حاضر کے نمرود نے انھیں خلیلؑ کی مانند اس لمحے سے دوچار کر رکھا ہے جو آتش نمرود میں پڑتے وقت حضرت ابراہیمؑ پر گزرا تھا۔ علامہ اقبال مسلمانوں کو خلیلؑ کی اولاد قرار دے کر فرنگی تہذیب کی نمرودی قوتوں کو کچلتے دکھائی دیتے ہیں۔

آگ ہے ، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟[۵۹]

علامہ کے نزدیک عشق ایک ایسے پختہ عزم کا نام ہے جو اپنی راہ میں حائل تمام مشکلات کو فوراً مٹا دیتا ہے۔ عقل کی خام کاریاں بار بار راہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مختلف النوع اندیشے عمل کی روح کو کمزور کرتے ہیں اور جوش و ہمت کو افسردہ بنا دیتے ہیں لیکن آتشِ عشق اور مقصد کی دھن ان تمام حائل رکاوٹوں سے رخ بدل کر اپنے نصب العین کی طرف رواں رہتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کا ایمان سچے عاشق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان آج بھی اپنے اعتقاد کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح پکا، محکم اور غیر متزلزل بنالیں تو وقت کے نمرود انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے:

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا[۶۰]

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ[۶۱]

آج نئی نسل کے قلوب میں شکوک و شبہات اور توہمات نے محشر بپا کر رکھا ہے۔ دراصل یہ سب اللہ سے دور ہونے کی وجہ سے ہے۔ علامہ اقبال فرنگی عقل سے مرعوب نہیں ہیں۔ یہاں بھی وہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کو اپنا رہبر بناتے ہیں:[۶۲]

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ![۶۳]

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

اقبال کے نزدیک ابراہیمؑ کا ایمان صادق عشق کی زندہ مکمل اور حقیقی تصویر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر آج ہمارا اعتقاد ابراہیمؑ کی طرح پختہ، محکم اور غیر متزلزل ہو جائے تو نمرود کی آگ اثر انداز نہیں ہوسکتی۔[۶۴]

جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تمام آزمائشوں میں پورے اترے تو انھوں نے اللہ کے حکم کے مطابق روئے زمین پر بیت اللہ تعمیر کیا:

بہرِ ما ویرانہ آباد کرد
طائفاں را خانہ بنیاد کرد[۶۵]

ترجمہ: ہماری خاطر انھوں نے ویرانہ آباد کیا اور طواف کرنے والوں کے لیے اللہ کے گھر کی از سرِ نو تعمیر کی۔

اس گھر کو تعمیر کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے یہاں عبادت کی اور اس کی تکریم کے خیال سے چکر لگائے۔ اِن چکروں کو طواف کہتے ہیں اور عبادت کا یہ طریقہ اب تک مروّج ہے۔[۶۶]

اقبال کے نزدیک تعمیرِ کعبہ کا نقطہ بھی تاویل کے قابل ہے۔ ان کے ہاں دِل حرم کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ تجلیاتِ باری تعالیٰ کا محور ہے اور خودی کا نشیمن ۔ اس لیے خودی کی بقا اور حفاظت کی جدوجہد کرنا تعمیر حرم کے مصداق ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ انقلابی مومن بھی حرم کی تعمیر کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے کیونکہ وہ یکتا پرستوں کی بھلائی اور بہتری کرنے پر مامور ہے۔[۶۷]

در بیابانِ طلب دیوانہ شو!
یعنی ابراہیم ایں بت خانہ شو![۶۸]

ترجمہ: بیابان کی تلاش میں دیوانہ ہو جا یعنی اس بت خانہ کا ابراہیم بن جا۔

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو[۶۹]

ترجمہ: اپنے بدن میں خودی کی تعمیر کر اور ابراہیمؑ کی مانند معمارِ حرم بن جا۔

کلام اقبال کا ابراہیمی نقطہ نظر سے جائزہ بتاتا ہے کہ اقبال ایک ایسے انسانِ کامل کے منتظر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی سی صفات سے مزین ہو یعنی وہ دنیا میں تعمیری فرائض سرانجام دینے کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ کے لیے غیر اللہ سے رشتہ ناطہ ختم کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ راہِ اللہ میں جان اور مال کی قربانی سے نہ گھبرائے۔ اللہ کے لیے بخوشی ترکِ وطن کے لیے تیار ہو جائے۔ مشکلات سے نبرد آزما ہونا جانتا ہو۔ آتشِ نمرود میں کود پڑنے والا ہو۔ کفر کی آگ کو ایمان کے گلزار میں بدلنے کی قوت رکھتا ہو۔ مشکلات اور دقتوں کے بت توڑ ڈالنے کی طاقت رکھتا ہو۔ یہ بت شکنی ہر دور میں مختلف صورتوں میں ہوتی ہے۔ آج کل وطنیت ، رنگ ، ذات، فرقہ بندی وغیرہ خودی کو

ضعیف کرنے والے عوامل کی صورت میں مختلف بت موجود ہیں جن کو پاش پاش کرنے کی ضرورت ہے۔[۸] علامہ کے نزدیک ذات پات ایک بت ہے۔ جس کو توڑنے کے لیے ابراہیمی نظر اور جرات و دلیری کی ضرورت ہے۔ ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا:

اب ہم کو پھر ابراہیمی کام کرنا ہے اور ذات پات کے بت کو پاش پاش کرنا ہے میں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک سوشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔[۱]

اقبال کا خلیل درحقیقت اصطلاحاً مردِ مومن ہے اور وہ ان تمام بتوں کو پاش پاش کرنے کی کامیاب سعی کرتا ہے۔ اقبال کا عشق یا دل مومن بھی خلیل ہے اور اس کے مقابلے میں خرد یا علم بے عشق اور نمرود ہے۔ علاوہ ازیں عقلِ حاضر کو بھی علامہ نے آتش نمرود سے تشبیہ دی ہے اور اپنے انقلابی مشن کو حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی سے۔ غور کیا جائے تو یہ سب باتیں ایمان افروز ہیں۔ پختہ ایمان رکھنا، یقینِ کامل ہونا اور ہوا و ہوس سے دور رہنا ایمان ابراہیمی ہی کے مظاہر ہیں۔[۲]

مسلماناں! مرا حرفے است در دل
کہ روشن تر زِ جانِ جبرئیل است
نہانش دارم از آزر نہاداں
کہ ایں سِرّے ز اسرارِ خلیلؑ است[۳]

ترجمہ: مسلمانو! (سنو) میرے دل میں ایک حرف ہے جو روح جبریل سے زیادہ روشن ہے۔
میں نے اسے ان لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے جن کی سرشت میں آزادی (یعنی بت پرستی) ہے۔ کیونکہ یہ حرف ابراہیم کے اسرار میں سے ایک سِر ہے (لفظ اللہ کی طرف اشارہ ہے۔)

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند[۴]

یقین مثلِ خلیل آتش نشینی!
یقیں اللہ، مستی خود گزینی[۵]

بیا کہ مثلِ خلیل ایں طلسم در شکنیم
کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است[۶]

ترجمہ: اٹھ کہ خلیل اللہؑ کی طرح ہم اس طلسم کو توڑ دیں۔ کیونکہ تیرے سوائے جہاں میں جو کچھ ہے، محض صنم (باطل) ہے۔

باش ماننِد خلیل اللہ مست
ہر کہن بت خانہ را باید شکست[۷۷]

ترجمہ: ابراہیمؑ خلیل اللہ کی مانند (اپنے حال میں) مست رہ۔ ہر پرانا بت خانہ ٹوٹ جائے گا۔

در گزر مثلِ کلیم از رودِ نیل
سوے آتش گامزن مثلِ خلیل![۷۸]

ترجمہ: کلیمؑ کی مانند دریائے نیل سے گزر جا۔ خلیلؑ کی مانند آگ کی طرف قدم بڑھا۔

مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل
تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر[۷۹]

ترجمہ: خلیلؑ ایک مدت تک آتش نمرود میں جلتا ہے۔ تب کہیں اس کا حریم پرانے خداؤں سے خالی ہوتا ہے۔

علامہ اقبال دورِ حاضر کو ''زمانہ بے خلیل'' کا نام دیتے ہیں۔ اس لیے اس زمانے کو نام نہاد ''پیروانِ ابراہیمؑ'' حقیقت میں آزر کی پیروی کرتے ہیں۔ ایمانِ ابراہیمؑ موجودہ زمانے میں بھی رہنمایانہ کرشمہ دکھانے کے قابل ہے مگر مخلص موحد کہاں ہیں؟[۸۰] اقبال جب اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں عجب صورتحال نظر آتی ہے۔ موجودہ مسلمان نہ تو اپنے ابا (ابراہیمؑ) کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ کافر اپنے پیشواؤں کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں یعنی دونوں ہی اپنی راہ سے ہٹ چکے ہیں۔ غیروں (عیسائیوں) نے اسوۂ ابراہیمی کو شیوہ بنا کر عروج پانا شروع کر دیا ہے[۸۱] اور ''ابراہیمی پور'' ان کی غلامی میں آ گئے ہیں۔ افسوس میراثِ خلیل کلیسا کے زیرِ اثر آ گئی ہے اور ابراہیم کا شہر مکہ مسیحی چالوں کا شکار ہو گیا۔[۸۲] مسلمان ابراہیمی ملت واحدہ کے سبق کو بھول کر رنگ، نسل، وطن، قوم اور نسب کے غلام بن گئے ہیں۔[۸۳] حالانکہ اسلام کا مفہوم ہی ماسوا اللہ سے بے گانہ ہونے پر مشتمل ہے۔[۸۴] مسلمانوں کو چاہیے کہ حقیقی معنی میں موحد بننے کے لیے تعلیمات ابراہیمیؑ کے نقشِ پا کی پیروی کریں اور اللہ کے علاوہ ہر چیز کا خیال دل سے نکال دیں۔

لا موجودہ الا اللہ

اس یقین کے نتیجہ میں مسلمان ہر گھڑی اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھے گا کہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

لاقوۃ الا باللہ

اس کی قوت اس کا وجود کچھ نہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ جب اس میں کوئی طاقت وقوت نہیں تو اس کا خوف کرنا کیسا ہے۔ بس یہی سرِّ ابراہیمی اور مقام خلّہ ہے۔ اسلام کی حقیقت

بھی اور اقبالی پیغام بھی۔[۸۵]

علامہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اطاعت کے ذریعے اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہنچائیں اور بلند مقام تک پہنچ جائیں۔ ایسا کرنے سے ان کے اندر ایک انقلابی طاقت جنم لے گی جس کی مدد سے وہ انقلاب لاسکیں گے[۸۶] اور بت پرستوں کو خدا پرست بنا کر ان میں بھی اتنی قوت پیدا کر دیں گے کہ وہ بھی پرانی دنیا ختم کر کے نئی دنیا تخلیق کرسکیں اور خود ہی اپنا ''حرم'' اور ''حریم'' بننے کے قابل ہو جائیں۔ یعنی خدا پرستوں کے نمائندہ (ابراہیم) بن کر دشمنانِ دین کو ختم کرسکیں۔ ہر دور میں خلیل اور نمرود موجود ہوتے ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے اور دونوں میں جنگ بھی جاری رہے گی لیکن بالیقین فتح وقت کے ابراہیم کی ہوگی۔ اسی لیے تو وہ ''ایمان ابراہیمی'' کی قوت کی دعا کرتے ہیں:

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش
قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش[۸۷]

ترجمہ: رہروانِ راہِ حق کو رضا کی منزل عطا فرمایئے۔ ہمیں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی قوت عطا فرمایئے۔

ملتِ ما شانِ ابراہیمی است
شہدِ ما ایمانِ ابراہیمی است[۸۸]

ترجمہ: ہماری ملت ابراہیم شہد کا چھتہ ہے اور ہمارا شہد ایمان ابراہیمی ہے۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی رقم طراز ہیں:

اقبال کے نزدیک ابراہیمؑ کا ایمان صادق عشق کی زندہ، مکمل اور حقیقی تصویر ہے۔[۸۹]

اس یقین اور ایمان کامل کی بدولت ہی حضرت ابراہیمؑ کی طرح قولی و فعلی جہاد کیا جاسکتا ہے اور بتوں کے بندوں کو خدا کے بندے بننے میں مدد دی جاسکتی ہے۔

دراصل علامہ اقبال ہر مردِ مومن کو اپنے اپنے شعبے میں فریضۂ ابراہیمی ادا کرنے پر اُکساتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ جب بھی قوم رنگ آزری اختیار کرلے تو ہر مردِ مومن پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شاعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جب شاعر دیکھے کہ قوم رنگِ آزری اختیار کر رہی ہے تو وہ قلم کے ذریعے اُسے روک سکتا ہے۔ اگر شاعر ایسا کرتا ہے تو وہ ابراہیمی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری[۹۰]

اگر ہم اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علامہ کے کلام اور پیغام کو دیکھیں اور ان کی نسلِ نو کی اصلاح کے جذبہ و تڑپ پر نگاہ ڈالیں تو ان کے سارے کلام سے ''شانِ خلیل'' عیاں ہوتی ہے۔ کون سا بت ہے جسے علامہ نے بزورِ قلم توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آمریت کا بت، شخصیت پرستی کا بت، مغربی تقلید کا بت، وہم پرستی کا بت وغیرہ سبھی تو انھوں نے بزورِ قلم پاش پاش کرنے کی کامیاب سعی کی۔ گویا ''خلیلی فریضہ'' سرانجام دیا۔ اگر انھیں دنیائے اسلام کے شعرا کا خلیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح حضرت خلیل اللہ نے نمرود اور قوم سے تن تنہا جنگ لڑی۔ ایسے ہی آپ نے بھی برصغیر پاک و ہند میں سنتِ ابراہیمی کو از سرِ نو تازہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جنگ تنہا لڑی۔ یہی خلیلی صفت وہ صرف شعرا ہی میں نہیں بلکہ امت کے ہر فرد میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انھیں امید ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا جب مردِ مومن خلیلی صفات خود میں پیدا کرنا فخر سمجھے گا اور مسلمانوں کو خلیلی صفات سے تہی کرنے کی کوشش کرنے والے دیکھتے رہ جائیں گے اور وہ جو کہتے ہیں یہ امت مٹ جائے گی تو ان کی پیش گوئی غلط ثابت ہوگی۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ![۹۱]

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا[۹۲]

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ مشمولہ منشوراتِ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، سن ندارد، ص: ۷۷

۲- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون سنت ابراہیمؑ اور اقبال، ڈاکٹر طارق عزیز، مرتب، اقبال شناسی اور ایکو، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۱

۳- ایضاً، ص:۲۲

۴- تورات، عہد عتیق، تکوین: باب:۱۱، آیت:۲۷، سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸

۵- موسوی، سید محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاءؑ فارسی ج:۱۔۲ کتاب فروشی اسلام، بازار شیرازی، طہران، سن ندارد، ص:۴۵

۶- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۴، سعید ایچ۔ ایم۔ کمپنی، کراچی، سن ندارد، ص:۱۷۵

۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع چہارم دہم، ۱۹۹۰ء، ص:۱۷۶/۳۴۶

۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع چہارم دہم، ۱۹۹۰ء، ص:۱۸۶/۵۷۸

۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۸۸/۵۸۰

۱۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۲۰۰/۲۰۰

۱۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۲/۳۶۴

۱۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: الانبیاء:۲۱، آیت:۵۲۔۵۴

۱۳- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱۔۲ حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۸ھ، ص:۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۵

۱۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ج ا۔۲، ص:۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۵

۱۵- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بارِ پنجم ۱۹۸۵ء، ص:۴۷، ۴۹۔ نجوم پرسی وغیرہ کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کے دلائل اور نفی کا تفصیلی ذکر سورۃ انعام کے رکوع ۹ میں ملتا ہے

۱۶- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون سنت ابراہیم اور اقبال، ص:۲۱، ۲۲

۱۷- الانعام:۶، آیت:۷۹

۱۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۵۸/۲۵۸

۱۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۰/۱۰۰

۲۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۸/۶۸

۲۱- منور، پروفیسر محمد، مضمون ''اقبال اور ابراہیمی نظر''، مشمولہ، راوی، گورنمنٹ کالج، لاہور، اپریل ۱۹۷۴ء، ص:۲۴۳۔۲۴۵

۲۲- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، مشمولہ منشوراتِ اقبال، ص:۷۸

۲۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۱/۲۷۱

۲۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص۱۱۴/۱۱۴

۲۵- منور، پروفیسر محمد، مضمون اقبال اور ابراہیمی نظر، ص ۲۴۶
۲۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیام مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۶۸/۳۶۰
۲۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۱۵/۴۷۷
۲۸- احمد، پروفیسر نذر، تشبیہاتِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۲۷۹
۲۹- الجاثیہ: ۴۵، آیت: ۲۳

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ

۳۰- منور، پروفیسر محمد، مضمون اقبال اور ابراہیمی نظر، ص ۲۴۷
۳۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۶۷/۶۷
۳۲- ریاض، ڈاکٹر محمد، اقبال اور تقدیر اُمم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۶۵
۳۳- تفصیل کے لیے دیکھیے، بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۶۹/۲۶۹
۳۴- الصّٰفّٰت: ۳۷، آیت: ۱۰۲۔۱۰۶
۳۵- ابراہیم: ۱۴، آیت: ۲۷
۳۶- منور، پروفیسر محمد، ''اقبال اور ابراہیمی نظر''، ص: ۲۵۶، ۲۵۷
۳۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۴۲/۴۲
۳۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۴۶/۳۳۸
۳۹- ایضاً، ص ۱۴/۳۰۶
۴۰- الانبیاء: ۲۱، آیت: ۵۷
۴۱- الانبیاء: ۲۱، آیت: ۵۸۔۶۷
۴۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۸۸/۶۷۶
۴۳- ایضاً، ص ۹۰/۶۷۸
۴۴- منور، پروفیسر محمد، ''اقبال اور ابراہیمی نظر''، ص: ۲۵۰، ۲۵۱
۴۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۱۵/۴۷۷
۴۶- ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، آتش فشان پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۴۶
۴۷- منور، پروفیسر محمد، اقبال اور ابراہیمی نظر، ص: ۲۵۲
۴۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۲۶/۴۸۸
۴۹- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ص: ۷۹
۵۰- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص: ۷۶
۵۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: البقرہ: ۲، آیت: ۲۵۷۔۲۵۸

۵۲- امیر علی، مولونا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۵، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص:۵۴۶۰
۵۳- ایضاً۔ نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۳، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص:۱۷۵
۵۴- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۵، ص:۵۴۶۰
۵۵- ابنِ کثیر، اسماعیل ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۳، پ:۱۷، نور محمد کارخانہ کتب تجارت، کراچی، سن ندارد، ص۲۰۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۵، ص:۵۴۶۰
۵۶- الانبیاء:۲۱، آیت:۶۹۔۷۰
۵۷- الصّٰفّٰت: ۳۷، آیت: ۹۷۔۹۹
۵۸- تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، اقبال اور قرآنی تلمیحات، مرتب، ڈاکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی، اقبال اور قرآن، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۷، ۱۲۸
۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۵۷/۲۵۷
۶۰- ایضاً، ص:۲۰۵/۲۰۵
۶۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۶/۳۸۸
۶۲ بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ص:۱۲
۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، اردو، ص:۲۶۸/۲۶۸
۶۴- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ص:۸۲
۶۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۰/۱۰۰
۶۶- ادارہ تصنیف وتالیف، انوار انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بارِ پنجم ۱۹۸۵ء، ص:۵۶، ۵۷
۶۷- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ اُمم اور اقبال، ص:۴۶۷
۶۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۱/۶۱۹
۶۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیام مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۵/۲۰۵
۷۰- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ اُمم اور اقبال، ص:۲۶۲
۷۱- افضل، محمد رفیق، مرتب، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہِ پنجاب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۸۱
۷۲- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ اُمم اور اقبال، ص:۲۶۲
۷۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۲/۲۰۲
۷۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۱/۳۱۳
۷۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۶/۳۸۸
۷۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص۸۸/۴۸۰

۷۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مثنوی پس چه باید کرد، کلیاتِ اقبال فارسی، ص۸۰۳/۷
۷۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامه، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۷۱/۸۳
۷۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۶۷/۱۹۷
۸۰- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ اُمم اور اقبال، ص:۲۶۷
۸۱- امروہی، نسیم، فرہنگِ اقبال فارسی، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۷۷۹
۸۲- غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۲۸۰
۸۳- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، ص:۳۰۹، ۳۱۰
۸۴- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، سرح اسرارِ خودی، ص:۴۶۱
۸۵- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، ص:۸۳، ۸۴
۸۶- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح مثنوی پس چه باید کرد، ص:۵۷
۸۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶/۷۶
۸۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۶۲/۱۶۲
۸۹- بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ص:۸۱
۹۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۱۱/۲۱۱
۹۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۶۶/۲۶۶
۹۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۶۸/۲۶۸

☆☆☆☆

حضرت اسماعیل علیہ السلام

اسلام کی اساس رسالت پر ہے۔ رسالت کا یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ تک چلا جاتا ہے۔ تمام انبیاءؑ اسلام ہی کے مبلغ تھے۔ قرآن حکیم میں انبیاء کرامؑ کا تسلسل سے تذکرہ، سلاسل نبوت کے ذریعے نبوت کی حقانیت اور ان کے دین اسلام کی توثیق و تائید کے لیے ہی دیا گیا ہے۔ اقبال بھی نبوت کے اس ادارے کی حقانیت کو اپنے اشعار کے ذریعے دین اسلام کی دلالت کے لیے لاتے ہیں۔ اقبال اپنے کلام میں حضرت آدمؑ سے جناب رسالت مآبؐ تک متعدد انبیاء کرامؑ کی خصوصیات کے بیان سے تمثیلی، اشاراتی اور استعاراتی دلائل و براہین لا کر اپنے تفکر اور نظریات کو بیان کرتے ہیں۔ ان انبیاء کرامؑ میں حضرت اسماعیلؑ بھی نمایاں ہیں۔ جن کا ذکر اقبال نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ ذیل میں ان کی حیات اور ان صفات کا بیان ہے جن سے اقبال نے تحریک پائی اور لازوال شعر کہے۔ اقبال حضرت اسماعیل کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

سرِ ابراہیم و اسماعیل بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود[1]

ترجمہ: آپ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے واقعے کے سر اور اس اجمال کی تفصیل ثابت ہوئے۔

حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ آپ کی پیدائش سے قبل کے حالات یوں بیان کئے گئے ہیں۔ مفسرین و مورخین کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی سارہؓ کنیز حضرت ہاجرہؓ اور خدام و سامان کے ساتھ جب فلسطین جا کر آباد ہوئے تو اُس وقت بہت آسودہ حال تھے لیکن بے اولاد[2] وہاں آپ ایک ''خانہ ذاالیعر ذ'' دمشقی کے گھر مقیم ہو گئے[3] آپ کی بیوی سارہ عمر رسیدہ تھیں۔ ان سے اولاد کی امید نہ تھی جبکہ حضرت ابراہیمؑ اولاد کے شدت سے خواہش مند تھے۔ حضرت سارہؓ کو جب آپ کی خواہش کا علم ہوا تو ایک روز آپ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اولاد کے لیے باوفا، تابع، امین، نوعمر اور حسین و جمیل[4] کنیز حضرت ہاجرہ سے شادی کر

لیں تاکہ تنہائی و وحشت کا خاتمہ ہو جائے اور اولادِ نرینہ کی تمنا بھی پوری ہو جائے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ نے حضرت ہاجرہ سے نکاح کر کے اولاد کے لیے دُعا کی[۵] دُعا قبول ہوئی اور حضرت ہاجرہ حاملہ ہو گئیں جب حضرت سارہ کو پتہ چلا تو بتقاضائے انسانیت حضرت ہاجرہ سے رشک کرنے لگیں اور انھیں تنگ کرنا شروع کر دیا اور قسم کھائی کہ حضرت ہاجرہ کے تین اعضا کاٹ دیں گی۔ بعض کتب میں ہے کہ حمل ٹھہرنے کی وجہ سے حضرت ہاجرہ حضرت سارہ کی صحیح طرح سے خدمت نہ کر سکیں جس وجہ سے حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور تین اعضا کاٹنے کی قسم کھائی[۶] مجبوراً حضرت ہاجرہ آپ کو چھوڑ کر کہیں اور چلی گئیں تورات کے مطابق اللہ کے فرشتے نے آپ کو واپس جانے اور حضرت سارہؓ کی اطاعت کا حکم دیا اور ساتھ ہی بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دی[۷] حضرت ہاجرہ واپس آ گئیں تب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارہؓ سے کہا کہ حضرت ہاجرہ سے دل صاف کریں[۸] اور قسم پوری کریں۔[۹]

وقت مقررہ پر حضرت اسماعیلؑ حضرت لوط کے محل کے قریب پیدا ہوئے[۱۰] آپ کی پیدائش پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی درازئ عمر کی دعا مانگی تو تورات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کی خوشخبری سنائی اور بتایا کہ وہ اُسے اسماعیلؑ کو برکت دے گا۔ اُسے برومند کرے گا اور اس کی نسل کو بڑھائے گا۔ جس میں سے بارہ سردار ہوں گے۔[۱۱]

تورات کی معلومات کے برعکس قرآن پاک میں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت کا کوئی واضح بیان نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں جتنی بھی تفصیلات ملتی ہیں اُن کا انحصار تورات کے بیان کردہ واقعات ہیں یا پھر تاریخی روایات وغیرہ۔ اکثر مورخین نے آپ کی پیدائش کے بارے میں تفصیلات انھی ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ البتہ قرآن مجید آپ کا تعارف ایک سچے اور وعدے کے پکے نبی کی حیثیت سے کرواتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝[۱۲]

ترجمہ: اور کتاب میں اسماعیلؑ کو یاد کرو۔ بے شک وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول تھا غیب کی خبریں بتاتا۔

حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تو بکثرت آیا ہے لیکن مستقل طور پر آپ کا تذکرہ سورۃ البقرہ، الانعام، النساء، ابراہیم، الصافات، مریم اور سورۃ الانبیاء میں ملتا ہے۔

اسماعیل کا عبرانی مترادف شماایل یا اسمٰوعیل ہے جو بعد میں کثرت استعمال سے اسماعیل

ہو گیا شماع کا مطلب سننا اور ایل کا مطلب اللہ ہے یعنی اللہ کا سننا۔ عربی زبان میں اسماعیل کا مطلب مطیع اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے۔[۱۳] چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی تھی اس لیے آپ کا یہ نام ہوا۔[۱۴] جوالیقی کا قول ہے یہ نام آخر میں ن کے ساتھ (اسماعین) بھی بولا جاتا ہے۔[۱۵] حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۶۴[۱۶] یا ۸۶[۱۷] یا ۹۶ یا ۱۲۰ سال تھی۔[۱۸] حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش پر حضرت سارہؓ کو سخت تکلیف ہوئی۔ انھوں نے اپنے درد کا درماں اس میں پایا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے ماں اور بچے کو اپنی نگاہوں سے دور بھیج دیں۔[۱۹] حضرت ابراہیمؑ کو یہ اصرار پسند نہ آیا۔ لیکن اللہ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت سارہؓ کی خواہش کے مطابق عمل کرنے کا حکم ہوا کہ حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کو سرزمین مکہ میں وادی اُم القریٰ میں چھوڑ آئیں۔[۲۰] اس کا تفصیلی ذکر تورات میں بھی ہے۔[۲۱] تورات کی یہ روایت بتاتی ہے کہ اُس وقت حضرت اسحاقؑ بھی پیدا ہو چکے تھے اور حضرت اسماعیلؑ سنِ رشد کو پہنچ گئے تھے۔ تورات کی روایت ہی دونوں بھائیوں کے درمیان تیرہ سال کا فرق بتاتی ہے۔ لیکن اسی واقعے کے بارے میں تورات کی دیگر آیات متضاد معلومات فراہم کرتی ہیں۔[۲۲] ان متضاد بیانات کے برعکس اسلامی روایات کے مطابق حضرت اسماعیلؑ شیر خوار بچے ہی تھے۔ اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؓ اور شیر خوار بچے حضرت اسماعیلؑ کو ملکِ شام سے کعبہ کے قریب ایک درخت کے نیچے زم زم کے موجودہ مقام سے اُوپر والے حصہ پر بے آب و گیاہ میدان میں ایک تھیلی کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر واپس جانے لگے تو بی بی ہاجرہؓ نے آپؑ کو پکڑ کر دریافت کیا کہ کیا یہ آپؑ کے اللہ کا حکم ہے۔ آپؑ نے ہاں میں جواب دیا تب حضرت ہاجرہؓ مطمئن ہو گئیں کہ اللہ انھیں ضائع نہیں فرمائے گا اور پھر واپس لوٹ گئیں جب وہ حضرت ابراہیمؑ کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو انھوں نے اپنے رب سے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ [۲۳]

ترجمہ: اے میرے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک نالے میں بسائی جس میں کھیتی نہیں ہوتی تیرے حرمت والے گھر کے پاس اے میرے رب اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھے تو لوگوں کے دل کچھ ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں کچھ پھل کھانے کو دے شاید وہ احسان مانیں۔

علامہ اقبال رموزِ بے خودی یں ''رکن دوم رسالت'' اس واقعہ کو یوں نظم کرتے ہیں:

بہرِ ما ویرانہ آباد کرد
طائفاں را خانۂ بنیاد کرد[۲۴]

ترجمہ: ہماری خاطر انھوں نے ویرانہ آباد کیا اور طواف کرنے والوں کے لیے اللہ کے گھر کی از سرِ نو تعمیر کی۔

حضرت ہاجرہؓ نے کچھ روز پانی اور کھجوروں پر گزارہ کیا لیکن ان کے ختم ہونے پر دودھ آنا بند ہو گیا تو بچہ بھی بھوک اور پیاس سے بے قرار ہوا۔ وہ بے تاب بچے کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تاکہ بچے کی بُری حالت آنکھوں سے اوجھل رہے۔ حضرت اسماعیلؑ بھوک اور پیاس کی شدت سے بے قرار ہو کر زمین پر لیٹے تڑپتے رہے۔ اس وقت ہاجرہؓ کی مادری شفقت جوش میں آئی اور انھوں نے زندگی کے لیے جدوجہد کرنا شروع کی، وہاں سے اُٹھیں اور کوہِ صفا پر چڑھیں لیکن کوئی متنفس نہ پایا۔ وہاں سے آئیں پھر وادی میں چلتی ہوئی کوہِ مروہ تک پہنچیں۔ اس طرح شدید پریشانی کے عالم میں ہر دفعہ اپنے نونہال کو دیکھنے آتی رہیں۔ آخری پھیرے میں جب مروہ تک آئیں تو ان کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ کان لگا کر سنا تو یوں محسوس ہوا کہ کوئی پکار رہا ہے۔ حضرت ہاجرہؓ نے کہا کہ اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ۔ دیکھا تو خدا کے فرشتے حضرت جبرائیلؑ ہیں۔ روایت ہے کہ انھوں نے اپنے پر یا ایڑی کو اس جگہ مارا جہاں آج زم زم کا چشمہ ہے۔ لیکن قوی ضعیف روایت یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے پاؤں کی ایڑی سے پانی کا چشمہ جاری ہوا اور یہ آپؑ کا بچپن کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے۔[۲۵] یہاں پانی اُبلنے لگا۔ حضرت ہاجرہؓ کی مسرت قابلِ دید تھی۔ آپؓ نے خود بھی سیر ہو کر پانی پیا اور بیٹے کو بھی پلایا۔ پھر آپ نے پانی کے چاروں طرف باڑ بنانی شروع کی مگر پانی اُبلتا رہا۔ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ اگر اُمِّ اسماعیلؑ زم زم کو اس طرح نہ روکتیں اور اس کے چاروں طرف باڑ نہ لگاتیں تو وہ آج زبردست چشمہ ہوتا۔ فرشتے نے حضرت ہاجرہؓ کو تسلی دی کہ ان کا رب ان کو ضائع نہیں کرے گا۔ کیونکہ یہاں بیت اللہ ہے جس کی تعمیر یہ باپ (ابراہیمؑ) اور بیٹا (اسماعیلؑ) کریں گے۔[۲۶]

اس عرصے میں ایک قبیلے بنی جرہم[۲۷] نے پانی کی موجودگی کی وجہ سے حضرت ہاجرہؓ کی اجازت سے وہاں ڈیرے ڈال لیے لیکن حضرت ہاجرہؓ نے اِنھیں پانی کی ملکیت سے مستثنیٰ رکھا۔[۲۸] حضرت ہاجرہؓ بھی باہمی انس و رفاقت کے لیے یہ خواہش رکھتی تھیں کہ کوئی یہاں آ کر بس جائے۔ انھی چند خاندانوں میں رہ کر حضرت اسماعیلؑ پلنے بڑھنے لگے۔[۲۹] جب حضرت اسماعیلؑ

تیرہ سال کے ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ختنہ کا حکم آیا۔ آپؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ، خانہ زادوں اور غلاموں کے ختنے کروائے[۳۰] یہ رسم ختنہ ''ملت ابراہیمی'' کا شعار ہوئی اور آج بھی حضرت ابراہیمؑ کی سنت کے نام سے مشہور ہے۔[۳۱] اللہ کے مقرب بندوں اور انبیاء کرامؑ کے ساتھ جو بھی واقعہ اور معاملہ پیش آتا ہے وہ عام انسانوں سے مختلف ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک نمونہ و مثال ہوتا ہے۔ جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو بھی مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف آزمائشوں اور حالات سے دوچار کیا۔ آپؑ ہر آزمائش میں کامیاب ہوئے۔ جب آگ میں ڈالا گیا اُس وقت صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کا ثبوت دیا۔ یہ تاریخ انبیاء کرامؑ کا ایک انمول واقعہ ہے۔ اس کے بعد اکلوتے دودھ پیتے بچے اور بی بی کو بحکمِ الٰہی فاران میں چھوڑنے کا حکم پورا کیا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ یہ بھی تو کڑی آزمائش تھی۔ ان دونوں کڑی منازل کو طے کرنے کے بعد تیسرے امتحان کا حکم ملا۔[۳۲] یہ ایک انوکھا اور عظیم الشان واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے مسلسل تین راتیں خواب میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کا حکم پایا۔ آپ اس حکم ربی پر آمادہ ہو گئے لیکن یہ معاملہ صرف آپ کی ذات سے وابستہ نہ تھا۔ بلکہ اس امتحان کا دوسرا جزو ''بیٹا'' تھا جس کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو حکم الٰہی سنایا تو پیغمبر بیٹے نے پیغمبر باپ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ وہ بچہ سرِ تسلیم خم کیوں نہ کرتا جس نے خلیل اللہ کی گود میں پرورش پائی اور حضرت ہاجرہؓ کا دودھ پیا تھا۔ جسے اوّل روز ہی سے درس دیا جاتا رہا کہ رضائے الٰہی کے لیے اگر جان بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کرنا[۳۳] لہٰذا بیٹے نے عرض کی آپؑ حکم الٰہی کے سامنے مجھے صابر ہی پائیں گے۔ ابوالاعلیٰ مودودی رقم طراز ہیں:

> حضرت ابراہیمؑ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے جس صالح اولاد کی انھوں نے دعا مانگی تھی وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت سے ہی ان کی اولاد نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔[۳۴]

بیٹے کی طرف سے مثبت جواب پا کر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ قربانی پیش کرنے کے لیے جنگل کی طرف چل پڑے۔ اس وقت حضرت اسماعیل ''سعی'' کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔[۳۵] قرآن حکیم میں اس طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

> فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ [۳۶]

ترجمہ: پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ راستے میں شیطان نے باپ بیٹے کو راستے میں اور گھر میں حضرت ہاجرہؓ کو تین مرتبہ بہکانے کی جدو جہد کی لیکن ہر بار حضرت ابراہیمؑ نے اسے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا لہٰذا شیطان کی یہ کوشش بے فائدہ ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے عمل کو مناسک حج میں داخل فرما دیا۔ ہر سال منیٰ کے تینوں جمرات پر لاکھوں حجاج کرام اس عمل کی یاد میں کنکریاں مارتے ہیں۔[۳۷]

بالآخر دونوں باپ بیٹا عظیم بے مثل قربانی دینے کے لیے منیٰ کی قربان گاہ میں پہنچے۔ باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر جانور کی طرح ہاتھ پاؤں باندھے اور بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا کر تیز شدہ چھری گردن پر چلانی شروع کی۔ روایات کے مطابق اس وقت آپ کی عمر ۱۳ سال تھی۔ چھری کے متعلق روایت یہ ہے کہ درمیان میں ایک تانبے کی پتری آ جاتی تھی اور چھری چلتی نہ تھی۔[۳۸]

اقبال اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

می کند از ماسوٰی قطعِ نظر
می نہد ساطور بر حلقِ پسر[۳۹]

ترجمہ: ایسا شخص غیر اللہ سے لاتعلق ہو جاتا ہے پھر وہ بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ دیتا ہے۔

ملا معین واعظ کاشفی نے اس موقع پر بڑی لطیف بحث کی ہے، کہتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ بچوں کی یہ عادت ہے کہ بچے آزمائش و امتحان اور اس قسم کے مواقع پر اضطراب کا ثبوت دیتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ نے رضا الٰہی کے حصول کے سبب اپنی عادت کو چھوڑ دیا لہٰذا ہم نے بھی چھری کی عادت (جس کی عادت کاٹنا ہے) تبدیل کر دی اور اس کو اس کے اصل کام سے روک دیا۔''[۴۰]

روایت ہے کہ فوراً وحی اُتری، اے براہیمؑ! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بیشک یہ کٹھن امتحان تھا۔ اب لڑکے کو چھوڑ کر اپنے قریب کھڑے مینڈھے کو ذبح کرو۔ بیشک ہم نیکو کاروں کا امتحان لیا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ رب کا شکر بجا لائے۔ بعض روایات کے مطابق مینڈھا نہ تھا بلکہ ایک بکری تھی جو چالیس ہزار یا اسی ہزار سال تک جنت کے مرغزاروں میں چرتی رہی تھی یا یہ وہ بکری تھی جو ہابیل نے قربان کی تھی اور اللہ نے اس کی جنت میں پرورش کروائی تھی۔ یہ مقام جمرہ تھا اور اس بکری یا مینڈھے کے جسم کا ہر حصہ کھانے کے قابل تھا۔ یہ جانور ہڈی اور اوجری

وغیرہ سے پاک تھا۔[۴۱] یہ ایک بے نظیر قربانی کو پورا کرنے کا وسیلہ تھا۔[۴۲] اس مینڈھے کے سینگ کئی سال تک خانہ کعبہ کے اندر لٹکے رہے۔[۴۳] حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو حضرت ہاجرہؓ کے سپرد کیا اور شکرانے کے طور پر درویشوں میں صدقات تقسیم کرنے کے بعد حضرت سارہؓ کے پاس روانہ ہو گئے۔[۴۴] یہ قربانی اللہ تعالیٰ کے حضور اتنی مقبول ہوئی کہ یادگار کے طور پر ہمیشہ کے لیے ''ملتِ ابراہیمی'' کا شعار ٹھہرا دی گئی۔[۴۵] چونکہ یہ واقعہ دس ذوالحج کو پیش آیا۔ اس لیے تمام ملتِ اسلامیہ اس عظیم قربانی کی یادگار کے طور پر دس ذی الحج کو قربانی کرتی ہے اور وفاداری اور جانثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے کو وہ مرتبہ عطا فرمایا جو بیٹا قربان کر دینے والے کے لیے ہو سکتا ہے۔[۴۶]

اقبال نے اس عظیم الشان واقعہ کی طرف بڑے لطیف پیرائے میں اشارہ کیا ہے۔ رموزِ بے خودی کی نظم ''در معنی حریت اسلامیہ و سرِ حادثہ کربلا'' میں بھی اس ذِبۡحٌ عَظِیۡمٌ کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ نے اس نظم میں بتایا ہے کہ ''ھُو الموجود'' سے پیمان باندھنے والے کی گردن ہر معبود کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔ مومن کی حیات عشقِ الٰہی کی بدولت ہے اور عشق کی حیات مومن کی بدولت۔ عشق میں وہ قوت ہے کہ یہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ عشق و عزم لازم و ملزوم ہیں۔ مومن جب عشقِ الٰہی میں ڈوب جاتا ہے تو وہ ہر لمحہ اپنا احتساب کرتا رہتا ہے۔ نتیجتاً وہ اللہ کی غلامی کے علاوہ ہر قسم کی غلامی کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ بوقت قتال سرخرو ہوتا ہے۔ اس کے بعد اقبال ''منقبت حسین''، میں ''در معنی حریت اسلامیہ و سرّ حادثۂ کربلا'' میں کہتے ہیں:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذِبۡحٌ عَظِیۡمٌ آمد پسر[۴۷]

ترجمہ: ان کے والد کا مرتبہ بائے بسم اللہ کا سا تھا اور سیدنا حسین ''ذبح عظیم'' کی تعبیر ہیں۔

اس ایک شعر میں علامہ ایک عظیم شخصیت اور ایک عظیم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ شخصیت ہیں امام حسینؓ اور ''ذبح عظیم'' کا واقعہ ہے حضرت اسماعیلؑ کی عظیم الشان قربانی کا۔ لیکن غور کریں تو یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس واقعہ کو عام روایتی انداز میں نظم نہیں کیا بلکہ اس واقعہ کو نظم کر کے وہ انسانی فرائض کی ایک حس بیدار کرنا چاہتے ہیں اور وہ حس ہے ''ایقان'' کی۔[۴۸] اسی ایقان کی بدولت مذہبی مرحلے پر پہنچ کر عزیمت و رخصت میں جنگ ہوتی ہے، اس

میں فتح یاب ہوکر انسان وجود کے سامنے اپنے وجود کی غیر مشروط سپردگی کر دیتا ہے اور اسی وجودی سپردگی کی بنیاد پر وہ معتبر ہو جاتا ہے۔ رجعت سے وجود غیر معتبر ہو جاتا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کا جان کو قربان کرنے کا فیصلہ بھی دراصل خود سپردگی کا فیصلہ ہے۔ عام اخلاقیات اور فکر کے راستے کو ترک کرنے اور حصول شہادت کا فیصلہ ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے کرنے کے بعد شیطان بار بار آ کر بہکانے اور فیصلہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ معتبر (حضرت اسماعیلؑ) اور غیر معتبر (شیطان) کی جنگ ہوتی ہے۔ اس جنگ میں معتبر (اسماعیلؑ) فتحیاب ہوتا ہے۔[۴۹] اقبال یہی بتانا چاہتے ہیں لیکن اسی واقعہ "ذبح عظیم" کو علامہ نے ایک اور نقطہ نظر سے بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو ایک باپ بیٹے کے ساتھ ساتھ اُستاد اور شاگرد کے طور پر بھی لیا ہے۔ صاحب نظر اُستاد حضرت ابراہیمؑ نے اپنے شاگرد حضرت اسماعیلؑ کے کردار میں تبدیلیاں جو پیدا کیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔[۵۰] اسی لیے تو بے اختیار کہتے ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟[۵۱]

علامہ کی دور رس نظر اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ روشن مثال شخصیت اپنی نگرانی میں جو تعلیم و تربیت کرتی ہے وہ کتب و مکاتب نہیں کر سکتے۔[۵۲] دیگر تمام بزرگانِ دین کی طرح علامہ اقبال بھی اسماعیلیت کی صفات سے مزین ہونے کے لیے کسی مرشدِ کامل کی صحبت یا کسی کے فیضِ نظر کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں کہ تزکیۂ نفس کے لیے یہ از حد ضروری ہے۔ بقول یوسف سلیم چشتی:

چراغ کسی چراغ ہی سے جل سکتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص نہ کسی مرشد کی صحبت میں رہے، نہ اس کی نگاہ سے فیض حاصل کرے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے اس لائق ہو جائے کہ صالحین کی جماعت مرتب کر کے دُنیا میں کوئی پاکیزہ انقلاب برپا کرے۔[۵۳]

اس تزکیہ نفس کے بعد انسان زمانے کا راکب بن سکتا ہے اور علامہ امتِ مسلمہ کے ہر فرد کو زمانے کا راکب دیکھنے کے متمنی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کیا تھا تاکہ وہ مقام دینِ حق کا مرکز بن سکے۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اللہ کی عبادت کے لیے گھر بنائیں۔[۵۴]

روایات کے مطابق کعبہ کا وجود انسانی تاریخ سے قبل بیان کیا جاتا ہے۔ زمین کی پیدائش سے بھی قبل جب اس خطہ پر صرف پانی تھا۔ اس وقت بھی موجودہ خانہ کعبہ کی جگہ ایک کثیف قسم کی

جھاگ دکھائی دیتی تھی اور فرشتے اس کے گرد طواف کرتے تھے۔ پھر جب زمین پیدا کی گئی تو اسی جھاگ والے حصے سے زمین کا آغاز ہوا اور پانی کے ۳/۱ حصے پر زمین آ گئی۔ کعبۃ اللہ ویسے ہی چھوٹے سے ٹیلے کی شکل میں اُبھرا رہا۔ حضرت آدمؑ کو زمین پر اُترنے کے بعد اس جگہ کے بارے میں بتا دیا گیا۔ آپؑ نے اس جگہ کو اپنے ہاتھوں سے اونچا کیا۔ بحکم الٰہی خود بھی اس کا طواف کیا اور اولاد کو بھی حکم دیا۔[۵۵] اللہ تعالیٰ کا یہ گھر دس مرتبہ از سر نو بنایا گیا۔ (۱) ملائکہ (۲) حضرت آدم (۳) حضرت شیثؑ (۴) حضرت ابراہیمؑ (۵) قوم عمالقہ نے (۶) قبیلہ جرہم نے (۷) قصّی نے (۸) قریش نے (۹) عبداللہ بن زبیر (۱۰) اور حجاج بن یوسف نے۔ لیکن قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کو کعبۃ اللہ کا اوّلین معمار یا بانی قرار دیا ہے۔ آپؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ بھی اس کے معمارِ اوّل شمار کیے گئے ہیں۔ اگرچہ بیت اللہ کا وجود پہلے دن سے ہی تسلیم شدہ ہے لیکن اس کی باقاعدہ تعمیر اور عمارت کا بنانا حضرت ابراہیمؑ سے پہلے وجود میں نہ آیا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح ابن الباری[۵۶] میں ایک روایت نقل کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کعبہ کی بنیاد سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے رکھی اور اللہ کے فرشتوں نے ان کو وہ جگہ بتائی جہاں کعبہ کی تعمیر ہونا تھی۔ مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصۂ دراز سے اس کو بے نشان بنا دیا تھا۔ لیکن ہر زمانہ میں وہ ایک ٹیلہ یا اُبھری ہوئی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت ابراہیمؑ کو بتایا۔ ایک روایت کے مطابق خانہ کعبہ کے قریب حضرت آدمؑ کی قبر بھی تھی۔[۵۷] حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ کو اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے کھودنا شروع کیا تو انھیں سابقہ تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں۔ انھی بنیادوں پر بیت اللہ کی پہلی باقاعدہ تعمیر کا آغاز کیا گیا۔[۵۸] یہ واقعہ ۲۰۵۴ ق م کا ہے۔[۵۹] کہا جاتا ہے کہ جس پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ کعبۃ اللہ کی دیواریں بلند کر رہے تھے وہ غیر محسوس طور پر اُونچا ہوتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی دیواریں مطلوبہ اُونچائی تک پہنچ گئیں۔[۶۰] یہی پتھر آج مقامِ ابراہیمؑ کے نام سے جانا جاتا ہے۔[۶۱] بیت اللہ کی تعمیر پایہ تکمیل کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بتایا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کے لیے قبلہ ہے اور ہمارے حضور جھکنے کا نشان۔ اس لیے یہ توحید کا مرکز ٹھہرایا جاتا ہے۔ تب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی اولاد کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت عطا فرمائے۔ ان کے اثمار، میووں اور رزق میں برکت عطا فرمائے اور تمام دنیا

کے ہدایت یافتہ انبوہ کو اس طرف متوجہ کرے تا کہ وہ دور سے آ کر مبارک حج ادا کریں اور اس مرکز میں اکٹھے ہو کر زندگی کی سعادتوں سے مالا مال ہوں۔[۶۲] قرآن پاک میں بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا، اقامتِ نماز اور مناسک حج کی ادائیگی کے لیے شوق و تمنا کا اظہار اور بیت اللہ کے توحید کے مرکز ہونے کا تذکرہ جگہ جگہ کیا ہے۔[۶۳]

علامہ اقبال نے بیت اللہ کی ''تعمیر و تطہیر'' کے واقعہ کو رموزِ بے خودی میں ''رکن دوم رسالت'' یوں نظم کیا ہے:

جوے اشک از چشمِ بیخوابش چکید
تا پیامِ طَہِّرَا بَیْتِیْ شنید[۶۴]

ترجمہ: ان کی بے خواب آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہ نکلیں۔ تب جا کر انھوں نے ''طہرا بیتی'' کا پیغام سنا۔

دیکھیے اس واقعہ سے ہمیں ایک تو اہم قرآنی معلومات ملتی ہیں۔ (جن کا ذکر کیا جا چکا) دوسرے علامہ اقبال کا اس واقعہ کو نظم کرنے کا نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ کسی عظیم الشان کامیابی کے لیے صرف آرزو ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے انتہائی والہانہ جذبہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب تک انسان کے اندر انقلاب جنم نہ لے۔ خارج میں انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ وہ جو اپنے اندر انقلاب برپا کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے خارج میں بھی انقلاب لانے کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔[۶۴]

حضرت اسماعیلؑ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں۔ آپ انتہائی خوبصورت اور باپ سے مشابہ تھے۔[۶۵] قرآن پاک میں آپؑ کو نبی اور رسول دونوں صفات سے موصوف کیا گیا ہے جو آپ کے علوِ مرتبہ ہونے کی علامت ہیں۔ آپ کی صفات کمال میں سے سب سے اہم صفت صادق الوعدہ ہونے کی ہے۔ کیونکہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے جو بھی وعدہ کیا پورا فرمایا۔ اور سب سے اہم وعدہ وہ تھا جو آپؑ نے اپنے والد ماجد سے کیا تھا یعنی ذبح کرنے کے حکم خداوندی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس مرد پاکباز نے اپنے اس وعدہ کو کس صدق و استقامت سے مکمل کیا۔[۶۶] آپؑ کی مادری زبان قبطی اور پدری زبان عبرانی تھی۔ علاوہ ازیں بقول علامہ ابن حجر آپؑ پہلے فرد ہیں جو فصاحت و بلاغت اور روانی سے عربی بولتے تھے۔[۶۷] تورات

اور حدیث کے مطابق آپؑ تیر انداز تھے۔ آپؑ نے تمام زندگی گوشت اور پانی پر گزارہ کیا[۶۸]۔ آپؑ نے ان تمام زبانوں میں دین ابراہیمی کی تبلیغ کی اور بہت سی قوموں کے درمیان اتحاد باہمی کا وسیلہ بنے[۶۹]۔ آپؑ میں اپنے والدِ محترم والی تمام خوبیاں اور کمالات بدرجۂ اتم موجود تھے[۷۰]۔ آپ فرزندِ عہد ہیں کہ پہلے روز ہی اللہ کے عہد میں داخل ہو گئے۔ آپؑ کو عرب، حجاز، یمن کے لیے مبعوث فرمایا گیا[۷۱]۔ آپؑ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپؑ نے سب سے پہلے گھوڑے کو سدھا کر سواری کی۔ اس سے پہلے وہ وحشی ہوتے تھے۔ آپؑ نے انھیں مانوس کیا[۷۲]۔ آپؑ حضرت اسحاقؑ سے (پانچ، چودہ یا تینتیس سال) بڑے تھے۔ آپؑ کا ختنہ بھی اسی روز ہوا جس روز آپ کے والد نے اپنا ختنہ کیا[۷۳]۔ آپؑ پہلے ذبیح ہیں۔ بلا تامل اپنے آپ کو پیش کرنے پر آپؑ کا لقب ''ذبیح اللہ'' ہوا[۷۴]۔ آپؑ جدِّ پیغمبرِ اسلام ہیں۔ آپؑ نے سب سے پہلے اپنی بیوی کی تجویز پر بہت سی بھیڑوں کی پشم اکٹھی کر کے بارہ زراع کا پردہ بنا کر کعبہ کی دیواروں پر لٹکایا۔ یہ اب تک معمول ہے کہ ہر سال عید قرباں پر قیمتی اور خوبصورت پردہ بنا کر لٹکایا جاتا ہے۔

جب حضرت اسماعیلؑ کے والد محترم وفات پا گئے تو جبرائیلؑ نے آپؑ سے افسوس کیا اور وفات کی خبر دی اور صبر و شکیبائی کی تلقین کرنے کے بعد بتایا کہ نبوت و خلافت آپؑ کے خاندان میں ہی رہے گی۔ آپؑ یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ آپؑ نے حضرت اسحاقؑ سے مل کر حضرت ابراہیمؑ کو دفن کیا۔

حضرت اسماعیلؑ نے پانچ شادیاں کیں۔ مکہ کے تمام قبائل آپ کی نسل سے ہیں[۷۵]۔ لیکن تورات کے مطابق آپ کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی[۷۶]۔ آپؑ کے تمام بیٹے اپنے قبیلوں کے سردار بنے لیکن ان میں سے دو نابت یا نیا بوت اور قیدار زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا تذکرہ تورات میں بکثرت ہے۔ عرب مورخین نے بھی ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ نابت کی نسل ''اصحاب الحجر'' کے نام سے اور قیدار کی نسل ''اصحاب الرس'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپؐ کا سلسلہ نسب قیدار ہی سے عدنان کے واسطے سے حضرت اسماعیلؑ تک پہنچتا ہے[۷۷]۔ باقی بھائیوں اور ان کے خاندان کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں[۷۸]۔ آپؑ کی بیٹی نسیمہ کی شادی حضرت اسحاقؑ کے سب سے بڑے بیٹے عیسو سے ہوئی[۷۹]۔ آپؑ نے اپنی وفات سے پہلے اپنے بیٹوں کو بلا کر نبوت کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں۔ آپؑ نے ۱۳۰، ۱۳۶، یا ۱۳۸ یا ۱۸۰ سال عمر پائی[۸۰]۔ آپؑ اپنے والد سے ۴۸ سال بعد فوت ہوئے اور حضرت ہاجرہؑ کے پہلو

میں مطافِ کعبہ کے اندر دفن ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یعنی ۵۰۰ ق۔م[۸۱] تک آپؑ کی اولاد اور نسل کا سلسلہ حجاز، شام، عراق، فلسطین اور مصر تک پھیل چکا تھا۔ تجارتی شاہراہوں، بحیرہ ہند اور بحیرہ احمر کی اہم بندرگاہیں اور عرب کا اندرونی حصہ بنو اسماعیلؑ کے زیر اثر تھا۔[۸۲] تورات کے مطابق حضرت اسماعیلؑ کی قبر فلسطین میں، حرم میں حضرت ہاجرہؑ کے بالکل قریب واقع ہے۔[۸۳]

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی خدماتِ صادقہ کی بدولت ان کا نام زندہ و تابندہ ہے۔ غالباً ۶ ہزار سال گزر چکے لیکن امت مسلمہ کے افراد ان پیغمبران، باپ، بیٹے کی خدماتِ صادقہ کے سبب کعبہ کے گرد چکر لگا کر رحمتِ الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں۔[۸۴]

حیات و سیرتِ حضرت اسماعیلؑ اور کلامِ اقبال میں آپ کے ذکر کا پہلو بہ پہلو جائزہ لینے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے ہاں ''اسماعیلیت'' اطاعت و فرمانبرداری، غیر سے بے نیازی، رضا جوئی اور اللہ کے لیے خود سپردگی اور بے مثال قربانی کا عظیم الشان مرقع ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں حضرت اسماعیلؑ کی سیرت کے نمایاں اوصاف کو اہم درجہ دیا ہے۔ کلام اقبال میں حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت انتہائی متحرک اور عملی نظر آتی ہے جس کو اخلاقی اعتبار سے تکمیل فرائض کی انجام دہی کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔[۸۵] نیز آپ حق، رضا جوئی اور قربانی کی علامت کے طور پر اُبھرتے ہیں۔[۸۶] اقبال اُمتِ مسلمہ کو آفاقی حقیقت پر مشتمل ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں اور وہ خاص پیغام ہے ''اسماعیلیت'' کے تمام پہلوؤں کو اپنی ذات کا حصہ بنانے کا۔ یہی سبب ہے کہ وہ مردِ مومن کو خود ہی اپنا حرم، اپنا ''ابراہیمؑ'' اور تسلیم و رضا میں ''اسماعیل'' بن کر نفسِ امّارہ کی گردن پر چھری چلانے اور صرف اللہ کی رضا کے لیے غیر مشروط جدوجہد کا درس دیتے ہیں:

خود حریم خویش و ابراہیمِ خویش
چوں ذبیح اللہ در تسلیمِ خویش![۸۶]

ترجمہ: یہ جانِ پاک آپ ہی اپنا حرم ہے اور آپ ہی اپنا ابراہیم (معمارِ حرم) آپ ہی ذبیح اللہ کی طرف اپنے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والی ہے۔

علامہ کے نزدیک حضرت اسماعیلؑ کی طرح تسلیم و رضا کے حصول کے لیے نفسِ امّارہ سے جنگ سخت ضروری ہے۔ اصطلاحِ تصوف میں اسے مجاہدہ کہتے ہیں۔ اس سے مردِ مومن (سالک حق) میں چار صفات جنم لیتی ہیں:

۱- وہ حرص و ہوا سے پاکی حاصل کر لیتا ہے۔
۲- اس میں استقامت جنم لیتی ہے۔
۳- روحانی عروج کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔
۴- اس کے دماغی قویٰ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ان صفات کی وجہ سے وہ عالمِ ناسوت کو طے کر کے عالمِ لاہوت کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے اور فرشتوں کے مقام اور جنت الفردوس سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ فنا فی الرسول ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنے کرم سے رسول اللہ ﷺ کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ یعنی اس میں صفات الرسول ﷺ جنم لے لیتی ہیں۔ اس کی خودی بھی کامل و پختہ تر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ راہ حق کے اس سالک کو اپنا بندہ بنا لیتا ہے۔ وہ نفسِ امّارہ ولوامہ کی منازل سے گزر کر مطمئنہ کی منزل پر قربِ حق حاصل کر لیتا ہے۔[۸۷] علامہ کو اس مقام مطمئنہ پر فائز ذات کا نمونہ حضرت اسماعیلؑ کی حیات میں نظر آیا۔ انھوں نے اس اعلیٰ ہستی کو بطورِ نمونہ اُمتِ مسلمہ کے افراد کے سامنے پیش کر دیا تا کہ وہ بھی یہی اسماعیلی صفت اپنی ذات میں پیدا کر کے عبدیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے لیے جدوجہد کریں اور صبر، ایثار اور اطاعت کی ایک بلند مثال قائم کریں۔[۸۸] یہی اسلام کی روح ہے یعنی اپنے آپ کو اور اپنی ہر شے کو اللہ کے لیے نثار کر دینا۔[۸۹] مدعیانِ اسلام کو ایسی ہی اطاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور ایسی ہی بزرگ ہستیوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ کسی بھی حالت میں باطل (شیطان) کے سامنے نہ جھکنا چاہیے چاہے۔ جان دینی پڑے کہ یہی داستان حرم ہے۔[۹۰]

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ[۹۱]

کلام اقبال میں حضرت اسماعیلؑ پر کہے گئے اشعار کے پس منظر و پیش منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور سیاق و سباق کو ذہن میں لاتے ہوئے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ''اسماعیلیت'' علامہ کے ہاں ایک ایسے رویۂ زندگی کا نام ہے جو ہر لحظہ تسلیم و رضائے خداوندی کا جویا ہے۔ یہ رویہ کمال عشق سے جنم لیتا ہے اور اپنے اندر انسانیت کے لیے ایک خاص پیغام رکھتا ہے۔ انبیاء کرام کی تاریخ میں یہ کمالِ عشق ''ذبیح اللہ'' کی شکل میں حضرت اسماعیلؑ کا مقدر بنا۔ اس سلسلے میں اقبال کے افکار کا نچوڑ یہ ہے کہ تسلیم و رضا اور کمالِ عشق کی عملی تصویر مطلوب ہو تو اس

کے لیے حضرت اسماعیلؑ کی سیرت و شخصیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے کلام میں حضرت اسماعیلؑ کے لیے ''ذبیح اللہ'' کی تلمیح اور ''تسلیم و رضا'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ یہ دونوں بہت پرزور ہیں اور اقبال ان دونوں کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ''اسماعیلیت'' کے سب سے نمایاں پہلو ہیں اور یہ عناصر نوجوانانِ ملت کی صحیح تربیت میں معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔

علامہ اقبال ''اسماعیلیت'' کے حصول کے لیے ''فیضانِ نظر، یعنی کسی صاحب نظر کی صحبت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی بھی اعلیٰ منزل اور مقام کے حصول کے لیے کامل رہنما کی اکمل رہنمائی کا ہونا ازحد ضروری ہے کہ ایسی پاک شخصیات کی رہنمائی ہی:

۱- آدابِ فرزندی سکھاتی ہے اور سراپا تسلیم و رضا بناتی ہے۔

۲- قلوب کی تطہیر کی طرف مائل کرتی ہے۔ (کہ کعبہ سے بتوں کو ہٹانے کے بعد پھر سے اس کی تطہیر تو کب کی جا چکی)۔

۳- اللہ کے سوا سب سے بے نیاز کر دیتی ہے اور اس قابل بنا دیتی ہے کہ مردِ مومن ہر قسم کی حتیٰ کہ جان کی قربانی کرنے کے لیے بھی بخوشی تیار ہو جاتا ہے۔

علامہ ایسی ہی کامل شخصیات کے متلاشی اور ایسی ہی ''اسماعیلیت'' کے آرزومند نظر آتے ہیں جو امتِ مسلمہ کو عملی لحاظ سے سربلند کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ اقبال، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۱۱/۱۱۱

۲- المولی، محمد احمد جاد، البجاوی، علی محمد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، شحاتہ، السید، قصص القرآن (عربی) المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، بمصر الطبعۃ العاشرۃ، ۱۹۶۹ء، ص: ۵۶

۳- تورات، عہد عتیق، تکوین، باب: ۱۵، آیت: ۲ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸ء

۴- الکاشی، مولانا معین الدین، واعظ، مترجم، مولانا ملا معین واعظ الکاشفی، معارج النبوت، ج: ۱، مکتبہ نبویہ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص: ۶۲۰

۵- موسوی، سید محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء (فارسی) ج:۱-۲ کتابفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، سن ندارد، ص:۸۰
۶- اصفہانی، عماد الدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲ ، کتابفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران باریست وپنجم، ۱۳۶۰ء، ص:۳۱۱
۷- تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، عہد عتیق، تکوین، باب:۱۶، آیت:۷، ۱۲
۸- الکاشفی، مولانا معین الدین واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص:۶۲۱
۹- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۵۷۲-۵۷۳۔ نیز دیکھیے: اصفہانی، عماد الدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص۱۸۔ الکاشفی، مولانا معین الدین واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص:۱۲
۱۰- اصفہانی، عماد الدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ص:۳۱۱
۱۱- تورات، پیدائش، باب:۷، آیت:۲۰
۱۲- مریم:۱۹، آیت:۵۴-۵۵
۱۳- الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص:۶۲۱، ۶۲۷
۱۴- منزل (Theodor Menzel) ''اسمٰعیلؑ'' دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲، دانش گاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص:۲۸۷۔ نیز دیکھیے: سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲ حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص۲۲۵۔ نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۰، ص:۶۷۷
۱۵- سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج :۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، اگست ۱۹۸۶ء، ص:۳۴۲-۳۴۳
۱۶- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳، ص:۵۷۰
۱۷- ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۱۸
۱۸- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳، ص۵۷۰۔ نیز دیکھیے: اصفہانی، عماد الدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۳۱۱
۱۹- ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین، دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص:۲۱۹
۲۰- الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص۶۲۲۔ نیز دیکھیے:
۲۱- المولی، محمد احمد جاد، البجاوی، علی محمد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، شحاتۃ السید، قصص القرآن (عربی) ج:۱-۲، ص:۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، پیدائش، باب:۲۱، آیت:۹-۱۳۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں بعد از تحقیق درج ہے کہ حضرت سارہ کی علیحدگی کا یہ سبب قرار نہیں دیا جا سکتا جو تورات میں بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا سفر اس سبب سے پیش آیا۔ اس کی وجوہات کچھ اور ہوں گی اور اپنی جگہ بہت اہم ہوں گی۔ یہ سفر حضرت اسماعیلؑ کے دودھ پلانے کے زمانے میں ہوا یا حالتِ رشد میں، تورات کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس سفر کی اہمیت کم کر دی

جائے۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: دانش گاہ پنجاب، لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲،ص ۳۰۷-۳۱۷، ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۲، پ ۷، نور محمد کارخانہ کتب کراچی، سن ندارد، ص ۱۴۵۔

۲۲- تورات، عہد عتیق، تکوین، باب:۲۱، آیت:۱۴-۱۶

۲۳- ابراہیم:۱۴، آیت:۳۷

۲۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۰/۱۰۰

۲۵- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد، ص:۶۸۱، ۶۸۲۔نیز دیکھیے: الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص ۶۲۴۔ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۲۲۰

۲۶- بیت اللہ زمین سے ٹیلہ کی طرح بلند تھا۔سیلاب آتے لیکن اس کے دائیں بائیں سے کٹ کر گزر جاتے۔

۲۷- یہ قبیلہ جرہم بن یقتان بن ہوت کی اولاد سے تھا اور اس کے سردار کا نام مضاض بن عمرو تھا۔الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص:۶۲۲

۲۸- اصفہانی، عمادالدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۳۱۱

۲۹- بعض کتب میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہر مہینے صبح کے وقت براق پر سوار ہو کر ملک شام سے مکہ آتے اور حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیلؑ کی خیریت دریافت کرنے کے بعد لوٹ جاتے، ماخوذ از: الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، ص:۶۲۷

۳۰- تورات، عہد عتیق، تکوین، باب:۱۷، آیت:۲۳-۲۵

۳۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) حصہ اوّل، ج:۱-۲، ص:۲۳۵

۳۲- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) حصہ اوّل، ج:۱-۲، ص:۲۳۵، ۲۳۶

۳۳- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ، ص:۲۱۱

۳۴- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار ششم، ۱۹۸۸ء، ص:۲۹۵۔نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۶ ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۳۹-۴۱

۳۵- آپ تقریباً ۱۳ سال کے تھے لیکن کسی مستند روایت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔آزاد، مولانا ابوالکلام، مرتب مولانا، غلام رسول مہر، انبیائے کرام، ص ۲۳۶۔نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ص:۲۱۰

۳۶- الصّٰفّٰت:۳۷، آیت:۱۰۲

۳۷- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ص:۲۱۱، ۲۱۲

۳۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۴۲/۴۲

۳۹- ایضاً

۴۰- ابن کثیر، ابوالفداءعمادالدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱،ص:۲۲۲

۴۱- الکاشفی، مولانا معین الدین واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱،ص:۶۵۱

۴۲- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، سلمان، رحمتہ اللعالمین ﷺ، ج ۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۶۴۱، ۶۴۲

۴۳- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، ص:۲۹۷

۴۴- عبدالرحمٰن، مولانا محمد، سیرت انبیائے کرام، ج:۱، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۲۴۹۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، امام ابی الفداء اسماعیل، قصص الانبیاء (عربی)، مکتبہ طیبہ، المدینۃ المنورہ، سن ندارد، ص:۱۹۰

۴۵- اصفہانی، عمادالدین، حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، ص:۳۰۷

۴۶- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، ص:۲۹۶۔ نیز دیکھیے: نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱، ص۶۹۶، میں تحریر ہے کہ قربانی کا واقعہ کعبہ کی تعمیر کے بعد پیش آیا جو کہ درست نہیں ہے

۴۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار ششم، فروری ۱۹۹۰ء، ص:۱۱۰/۱۱۰

۴۸- احمد، ڈاکٹر توقیر، اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۰۱

۴۹- تسکینہ فاضل، ڈاکٹر، مضمون اقبال اور قرآنی تلمیحات، مرتب ڈاکٹر پروفیسر محمد امین اندرابی، اقبال اور قرآن، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۵-۱۲۶

۵۰- عشرت، ڈاکٹر وحید، مضمون سنتِ ابراہیمی اور اقبال، مرتب ڈاکٹر طارق عزیز، اقبال شناسی اور ایکو، بزم اقبال، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء، ص:۲۳

۵۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم ۱۹۹۶ء، ص:۱۴/۳۰۶

۵۲- منور، پروفیسر محمد، اقبال اور ابراہیمی نظر، راوی، اپریل ۱۹۷۴ء، ص:۲۵۶

۵۳- چشتی، یوسف سلیم، شرح بالِ جبریل، عشرت پبلشنگ ہاؤس، سن ندارد، لاہور، ص:۱۵۵

۵۴- ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۶۴

۵۵- عبدالرحمٰن، مولانا محمد، سیرت انبیائے کرام، ص:۲۴۸-۲۴۹

۵۶- عسقلانی، للامام الحافظ احمد بن علی، فتح الباری (عربی) ج:۸، دارنشر الکتب الاسلامیہ شارع شیش محل، لاہور، طبعہ ممتاز مصححتہ، ۱۹۸۱ء، ص:۱۳۸

۵۷- اصفہانی، عمادالدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۳۰۷

۵۸- قرآن پاک میں بیت اللہ کی تعمیر کے معاملے کو حضرت ابراہیمؑ سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا ذکر نہیں کیا اس واقعے سے قبل پوری دنیا کے انسان صنم پرست تھے اصنام اور نجوم کی پرستش کے لیے

ہیکل اور مندر بنے ہوئے تھے اور ان کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

- مثلاً مصریوں نے سورج، دیوتا، از دریس، ایزیس، حوریس اور بعل دیوتا کے نام پر مندر بنا رکھے تھے۔
- شودروں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنا کر ابولہول کا مجسمہ اس میں رکھا اور اس کی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کروایا۔
- اہل کنعان نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو اب بھی یادگار کے طور پر مشہور ہے۔
- غزہ کے رہنے والے ''داجون'' مچھلی دیبی مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے جس کی شکل انسان کی طرح کی اور جسم مچھلی کی طرح بنایا گیا تھا۔
- عمونیوں نے سورج دیوتا اور ستاروں سے (چاند) کو دیبی بنا کر ان کی پرستش کی اور اس کے لیے عظیم الشان مندر بنائے۔
- اہل فارس نے آگ کو مقدس جان کر آتشکدے بنا کر ان کی پرستش کی۔
- اہل روم نے مسیح اور کنواری مریم کے مجسمے بنا کر کلیساؤں کو سجایا۔
- ہندوؤں نے مہاتمابت، شری رام چندر، شری مہاویرا اور مہا دیوتا کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالی دیوی و ستیلا دیوی و سیتا دیوی اور پاربتی دیوی کے ناموں سے ہزاروں بتوں کی پوجا کے لیے بڑے بڑے عظیم الشان مندر بنائے مگر اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اور سر نیاز جھکانے کے لیے پوری دنیا کے صنم کدوں میں اللہ تعالیٰ کا جو پہلا گھر بنایا، یہی بیت اللہ ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر تعمیر کیا۔

سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص۲۴۱۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۱، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، سن ندارد، ص۱۸۹

۵۹- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳، ص۵۷۴، پ:۱۲

۶۰- اصفہانی، عماد الدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص:۳۰۶۔ اس کے مطابق دیوار نوزرع تک بنی

۶۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص۲۴۲۔ نیز دیکھیے: عبدالرحمٰن، مولانا محمد، سیرت انبیائے کرام، ج:۱، ص:۲۵

۶۲-

۶۳- البقرہ:۲، آیت: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ۱۰ رکوع تا ۱۵ رکوع

۶۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۰/۱۰۰

۶۵- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن، ص:۷۸۹، ۷۹۰

۶۶- ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص:۲۲۱

۶۷- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۳، ص:۸۸

۶۸- الکاشفی، مولانا معین الدین، واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱،ص:۶۲۷
۶۹- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، سلمان، رحمۃ اللعالمین، ج:۲،ص:۵۱
۷۰- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار الانبیاء، ص:۶۵
۷۱- ابن کثیر، امام ابی الفداء اسماعیل، قصص القرآن عربی، ص:۲۵۹
۷۲- قاضی محمد سلیمان، سلمان، رحمۃ اللعالمین، ج:۲،ص:۴۸
۷۳- دانش گاہِ پنجاب، لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲،ص۴۸ ۷۔
۷۴- اصفہانی، عمادالدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲،ص:۳۱۵،۳۱۶
۷۵- تورات، عہدِ عتیق، تکوین، باب:۲۵، آیت:۱۲-۱۶
۷۶- منزل (Theodor Menzel) ''اسمٰعیلؑ'' دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲،ص:۳۴ ۷
۷۷- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲،ص:۲۴۷
۷۸- ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، ص:۶۶
۷۹- امیر علی، سید مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۵، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص:۵۵۱۹
۸۰- اصفہانی، عمادالدین، حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲،ص ۳۱۶۔ نیز دیکھیے: نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳،ص۵۷۴۔
۸۱- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رحمۃ اللعالمین، ج :۲،ص ۵۴۔ ابن کثیر، امام ابی الفداء اسماعیل، قصص الانبیاء (عربی)، ص:۲۶۰
۸۲- ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، ص:۲۵۰
۸۳- ایضاً
۸۴- تورات، عہدِ عتیق، تکوین، باب:۲۵، آیت:۱۷
۸۵- تاریخ طبری، ج:۱،ص۲۴، بحوالہ سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲،ص:۲۴۷
۸۶- اصفہانی عمادالدین حمیس، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱،ص:۳۱۶
۸۷- احمد، ڈاکٹر توقیر، اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی، ص۲۱۱
۸۸- عابد، سید علی عابد، تلمیحاتِ اقبال، بزم اقبال، لاہور، باردوم، ۱۹۸۵ء
۸۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۷۵/۸۷
۹۰- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، ص۷۹۱،۷۹۲
۹۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۵۵/۶۳

☆☆☆☆

حضرت یعقوب علیہ السلام

علامہ اقبال نے ہر نبی و پیغمبر کی سیرت سے صرف انھی اوصاف کو اشعار کے جامہ میں سمویا ہے جن اوصاف نے انھیں متاثر کیا ہے اور جنھیں وہ انسان کامل یا فرد مصدقہ میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بنی اسرائیل کے بانی حضرت یعقوبؑ کلام اقبال میں ''پیرِ کنعان'' کے نام سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ دیکھیے:

یہی کہتا ہے چاکِ دامن یوسف زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تار نگاہِ پیرِ کنعاں کا [۱]

کلامِ اقبال میں اگرچہ حضرت یعقوبؑ پر چند اشعار ملتے ہیں۔ لیکن اِن اشعار میں اقبال نے سیرتِ یعقوبؑ کے تمام اہم واقعات کی طرف نہ صرف بلیغ اشارے مہیا کیے ہیں بلکہ ان واقعات سے خوب سے خوب تر نکات بھی اخذ کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ''یعقوبیت'' کے تمام اوصاف کو گنتی کے اشعار میں سمونا اور اُن کی گونہ پہلو تعبیریں کرنا اقبال باکمال ہی کا کمال ہے۔ آیئے تفصیلی جائزہ لیں:

پیامِ مشرق کی نظم ''نامۂ عالمگیر بیکے از فرزندانش کہ دعائے مرگِ پدر میکرد'' دراصل عالمگیر کا بیٹے کے نام ایک خط ہے جسے اقبال نے فارسی میں نظم کیا ہے۔ عالمگیر کا دوسرا بیٹا ابوالمعظم شمس الدین محمد باپ کے تخت و تاج کا وارث بننا چاہتا تھا لیکن باپ کی حیات میں یہ ممکن نہ تھا۔ اُس نے والد کی طویل العمری سے تنگ آ کر ایک پرائیویٹ مجلس میں اپنے مصاحبین سے باپ کے نہ مرنے پر دکھ کا اظہار کیا اور تاج و تخت کے حصول کے لیے اُس کے جلد مرنے کی دعا کی۔ جب باپ کو پتہ چلا تو اُس نے بیٹے کو خط لکھا جسے اقبال نے فارسی میں نظم کیا:

ندانی کہ یزدانِ دیرینہ بود
بسے دید و سنجید و بست و کشود

ز ما سینہ چاکانِ ایں تیرہ خاک
شنید است صد نالۂ درد ناک
بسے ہمچو شبیرؑ در خوں نشست
نہ یک نالہ از سینۂ اوگسست
نہ از گریۂ پیرِ کنعاں تپید
نہ از دردِ ایوب آہے کشید
مپندار آں کہنہ نخچیر گیر
بدامِ دعائے تو گردد اسیر[۲]

ترجمہ: کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ بہت قدیم ہیں، انھوں نے بہت کچھ دیکھا، جانچا اور کئی معاملات کو ختم کیا یا سلجھایا۔ انھوں نے اس تیرہ خاک (دنیا) کے مصیبت زدگان کے بہت نالہ ہائے دردناک سنے۔
کئی شبیرؑ کی مانند خون میں نہا گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سینے سے کوئی نالہ بلند نہ ہوا۔ نہ وہ حضرت یعقوبؑ کی گریہ وزاری سے متاثر ہوئے نہ انھوں نے ایوبؑ کے درد سے آہ بھری۔
یہ گمان نہ رکھ کہ وہ پرانا شکاری، تیری دعا کے دام میں پھنس جائے گا۔

یعنی اے بیٹا ازلی خدا نے اس دُنیا کے بہت سے انقلابات دیکھے اور بہت سے افراد کی گریہ زاری سنی ہے۔ اُس کے سامنے بہت سی اہم ہستیاں خاک وخون میں لوٹ پوٹ ہوئیں لیکن اُس پر کسی کی گریہ زاری نے اثر نہیں ڈالا۔ نہ گریہ پیرِ کنعاں نے اور نہ درد ِایوبؑ نے۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ وہ تیری دعا کا اسیر ہو جائے گا کبھی نہیں[۳] عالمگیر کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اُس کا بیٹا اُس کے مرنے کی دعا کر رہا ہے۔ وہ راضی بر رضا ہے۔ ایسے ہی جیسا کہ انبیاء کرامؑ راضی بر رضا اور مشیت الٰہی کے قانون کے اسیر رہے۔

اس نظم میں علامہ اقبال نے ''گریہ پیرِ کنعاں'' اور ''درد ِایوبؑ'' کا ذکر کیا ہے۔ ''گریہ پیرِ کنعاں، سیرت یعقوبؑ کے ایک اہم واقعہ کی طرف تلمیحاتی اشارہ ہے۔ اور یہ گریہ اقبال کے نزدیک دقیع، برگزیدہ اور انعام یافتہ۔ دراصل آہ و نالہ وفریاد اقبال کے افکار میں عشق کے لازمہ کے طور پر اُبھرتے ہیں اور عاشقوں کی زندگی کی بقا کے ضامن۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر رقم طراز ہیں:

اقبال کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہے اور ان کے بغیر عاشقوں کا دل مر جاتا ہے۔ اس لیے

اس لیے وہ بہشت جاوداں کو پسند نہیں کرتے کہ وہاں یہ نہ ہوں گے:

دل عاشقاں بمیرد بہشتے جاودانے
نہ نوائے درد مندے، نہ غمے نہ غم گسارے

''اور وہ لامکاں بھی نہیں چاہتے کہ وہاں یہ نالۂ نیم شبی نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دل کی زندگی کے لیے آہ و نالہ وفریاد اور غم ضروری ہے۔''[۴]

اقبال کے نزدیک جس دل میں عشق جاگزیں ہو جائے وہ ساری دُنیا سے بے نیاز ہو کر گریہ زاری اور جلنے میں سکون پاتا ہے۔ سہل انداز ترک کرتا ہے اور سخت کوشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے کہ یہ سخت کوشی خودی کی تربیت کے لیے از حد ضروری ہے۔[۵]

بنیادی طور پر خوفِ خدا اور عشق الٰہی ہی گریۂ انبیاء کرامؑ کا سبب ہوتا ہے۔ اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کے ہاں ''گریۂ پیرِ کنعاں'' کی تلمیح کا ماخذ کیا ہے۔ قرآنی واقعات یا تفسیر و تاریخ اور اسرائیلی روایات۔ اس کے لیے ہمیں سیرتِ یعقوبؑ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ آیئے جائزہ لیں۔

حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحاقؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے پوتے، حضرت لوطؑ کے نوا سے ہیں۔ آپ کا نسب نامہ یہ ہے:

یعقوبؑ (اسرائیل) بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ بن تارح بن ناخور بن ساروغ (سروج) بن راغو (رغو) بن قانع (فالج) بن عابد بن شالح بن (قینان) بن ارفحشد بن سام بن نوحؑ۔[۶]

اہل کتاب کے بیانات کے مطابق ۳۸۸۳ ق۔ م[۷] میں حضرت اسحاقؑ کے ہاں رفقا بنتِ بتوایبل سے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے لحاظ سے بڑے کا نام عیسو رکھا۔ اہلِ عرب کے نزدیک یہ عیص کہلائے۔ دوسرے بیٹے کا نام یعقوبؑ رکھا۔[۸]

یعقوبؑ نام ہونے کے بارے میں مختلف روایات ہیں:۔

۱۔ یعقوب کا مادۂ اشتقاق عقب سے ہے۔ یعنی پیچھے آنے والا یا مطلب پاؤں کی ایڑی۔ پیدائش کے وقت آپ کے ہاتھ اپنے بھائی عیسو کی ایڑی سے لگے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کا نام یعقوبؑ ہوا۔[۹]

۲۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ یعقوب کا اشتقاق ہے تو عقب سے یعنی اسحاق کے بعد اس کے عقب میں آنے والا لیکن یہ صلہ ہے حضرت ابراہیمؑ کا دین کے لیے وطن وقوم کو چھوڑنے کا۔ وہ صرف اللہ

کی عبادت کے لیے شہروں سے ہجرت کر کے دور دراز چل دیے۔ اس کی جزا اُنھیں صلبی صالح اولاد کی شکل میں ملی تاکہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔[۱۰] ان دونوں آرا میں سے ابن کثیر کی رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ ان کا ایک اور نام تاریخ میں اسرائیل مشہور ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ 'اسرا' کے معنی 'عبد' اور 'ایل' کے معنی اللہ کے ہیں۔ عربی میں اس کا ترجمہ عبداللہ کیا جاتا ہے۔ یہودی چونکہ آپ کی نسل سے ہیں۔ اس لیے قرآن پاک میں ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا گیا ہے۔[۱۱]

منقول ہے کہ حضرت اسحاقؑ اپنے بڑے بیٹے عیصو کو پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے زیادہ چاہتے تھے اور والدہ رفقا بیٹے یعقوبؑ کو زیادہ چاہتی تھیں۔ عیصو ماہر شکاری تھا جبکہ حضرت یعقوبؑ خیمہ نشیں۔ ایک روز تھکا ماندہ عیصو شکار حاصل نہ کر سکا اور حضرت یعقوبؑ سے اُن کے کھانے سے کچھ مانگا۔ حضرت یعقوبؑ نے کہا کہ فلسطینی دستور کے مطابق میراث بڑے بیٹے کو ملتی ہے۔ تو باپ کی میراث کا وارث ہے۔ اس سے دستبردار ہو جا تو تجھے کھانا مل جائے گا۔ تب عیصو میراث سے دستبردار ہوا اور کھانا کھایا۔

تورات کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اسحاقؑ نے بڑھاپے میں عیصو کو برکت دینا چاہی اور اُس سے کہا کہ کہیں سے عمدہ شکار کر کے لائے اور پکا کر اُنھیں کھلائے۔ یہ سن کر رفقا کا دل چاہا کہ یہ برکت حضرت یعقوبؑ حاصل کر لیں۔ فوراً یعقوبؑ کو بلایا اور سمجھایا کہ جلدی سے عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے پیش کرے اور دعائے برکت کا طالب ہو جائے۔ یعقوبؑ نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحاقؑ سے برکت کی دعا پائی۔ عیصو کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ حضرت یعقوبؑ سے کینہ رکھنے لگا۔[۱۲]

البدایہ والنہایہ میں اس کے برعکس معلومات ملتی ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں کہ طویل العمری کی وجہ سے حضرت اسحاقؑ کی نظر کمزور ہو گئی تو انھوں نے کھانے پینے کا سامان لانے کی ذمہ داری حضرت یعقوبؑ کو سونپی جو شکار کے شوقین اور ماہر تھے اور حضرت اسحاقؑ کی ہر خواہش کو صدقِ دل سے پورا کرتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کے دوسرے بھائی عظیم الجثہ عیصو بھی باپ کی خدمت کے لیے جدوجہد کرتے تھے لیکن ہمیشہ سبقت اور محبت حضرت یعقوبؑ کا حصہ بنتی۔ اس وجہ سے عیصو حضرت یعقوبؑ سے حسد کرنے لگا۔[۱۳]

مذکورہ بالا روایات میں سے پہلی مضامین کے اعتبار سے ناقابل اعتبار ہے۔ اس میں

حضرت یعقوبؑ کی پیش کردہ اخلاقی زندگی انبیاء کرامؑ اوران کے خاندان کی شان کے مطابق نہیں ہے۔ ہاں البتہ اس سے دونوں بھائیوں کے درمیان پائی جانے والی رنجش اورنفاق کا علم ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی دعوت کا منصب اللہ کے حضور حضرت یعقوبؑ کے لیے لکھا جا چکا تھا۔[۱۴]

دونوں بھائیوں کے شقاق و نفاق کو دیکھتے ہوئے والد یا والدہ یا دونوں نے حضرت یعقوبؑ کوحران سے کنعان یا فدام آرام واقع ایران جانے کی نصیحت کی۔ جہاں آپ کے ماموں لابان بن بتویل بن تاخور بن تارخ رہائش پذیر تھے۔ حضرت اسحاقؑ کی خواہش تھی کہ حضرت یعقوبؑ کا نکاح لابان کی بیٹی سے ہو جائے اور وہ وہیں بس جائیں تاکہ دونوں بھائیوں کی رنجش میں کمی آ جائے۔

والدین کے حکم کو بر سر تسلیم خم کرتے ہوئے حضرت یعقوبؑ نے رختِ سفر باندھا۔ راہ میں بے شمار مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ روایت ہے کہ دورانِ سفر آپ ایک پتھر کے سایہ میں پتھر ہی کا تکیہ بنا کر سو گئے۔ یہیں خواب میں آپ کو نبوت، برکت، خوشحالی، بادشاہت، بنتِ لابان سے شادی اور پاک نسل کی بشارت ملی۔[۱۵] اس واقعہ کی وجہ سے اس جگہ کا نام ''حجر'' لیا جانے لگا۔[۱۶] لیکن حضرت یعقوبؑ جب طویل عرصہ کے بعد اپنی اولاد کے ساتھ وطن واپس روانہ ہوئے تو اس جگہ کا نام ''حجر'' کی بجائے ''بیت ایل'' رکھا۔ اور وہاں مسجد تعمیر کی جس کا نام بیت اللہ یا معبدِ خدا رکھا جو آج کل بیت المقدس کے نام سے مشہور ہے۔[۱۷]

حضرت یعقوبؑ فدان آرام یا حران پہنچے۔ لابان بن بتویل سے ملے اور والدین کی طرف سے دیا گیا نکاح کا پیغام پہنچایا[۱۸] تو لابان نے سات سال مویشی چرانے کی شرط رکھی۔[۱۹] لابان کی دو بیٹیاں تھیں لیّا اور راحیل۔ لیّا بڑی تھی۔ اُس کی بصارت کمزور تھی جبکہ راحیل حسین و جمیل تھی۔ مویشی چرانے کی مدّت ختم ہونے پر لابان نے حضرت یعقوبؑ کا نکاح لیّا سے کرنا چاہا۔ حضرت یعقوبؑ نے لیّا سے شادی سے انکار کر دیا۔ تب لابان نے بتایا کہ مروج رواج کے مطابق بڑی بہن کو چھوڑ کر چھوٹی کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ لیّا سے نکاح کے بعد لابان نے حضرت یعقوبؑ سے کہا کہ اگر وہ راحیل سے بھی شادی کے خواہش مند ہیں تو پہلے جتنی مقررہ مدت تک پھر خدمت کریں۔ (اُس شریعت میں دو بہنوں کا ایک شخص کے نکاح میں رہنا جائز تھا) چنانچہ حضرت یعقوبؑ نے اس مقررہ مدت کو پورا کیا اور راحیل بھی ان کے نکاح میں آ گئی۔

[20] ان کے علاوہ لیاؔ کی کنیز زلفا اور راحیل کی کنیز بلہا بھی آپ کے نکاح میں آ گئیں۔ تورات کے مطابق حضرت یعقوبؑ کے ہاں بارہ بیٹے ہوئے۔[21] سوائے بنیامین کے آپ کے تمام بچے ماموں کے ہاں ہی پیدا ہوئے۔ تقریباً بیس سال ماموں کی خدمت گزاری کے بعد وطن لوٹنے لگے تو ماموں نے بے اندازہ مال و دولت اور بھیڑ بکریاں دے کر رخصت کیا۔ وہاں سے حضرت یعقوبؑ دادا کے دارالہجرت جبرون روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر بیت المقدس کو دوبارہ تعمیر کیا۔[22] وہیں بنیامین پیدا ہوئے۔

جس زمانے میں حضرت یعقوبؑ اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ اُسی زمانے میں عیصو بھی ناراض ہو کر اپنے چچا اسماعیلؑ کے پاس چلے گئے اور اُن کے داماد بن گئے۔ ایک طویل مدت کے بعد دونوں بھائیوں کی ملاقات کنعان میں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ناراضی کو ختم کر لیا اور اکٹھے کنعان میں رہنے لگے۔[23]

یہ تمام واقعات تورات اور تواریخ کی کتب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ قرآن حکیم ان تفصیلات کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ قرآن حکیم حضرت یعقوبؑ کا ذکر جلیل القدر نبی، صاحب صبر و عزم اور یوسفؑ کے والد کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اس ضمن میں یوسفؑ کے بھائیوں کا ذکر بھی ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں حضرت یعقوبؑ کا ذکر سورۃ البقرہ ، النساء، الانعام، مریم، الانبیاء، یوسف، ص، اور مومنون میں ملتا ہے۔ سورۃ یوسفؑ میں جگہ جگہ ضمائر اور مومنون میں اوصاف کے اعتبار سے ذکر ہے۔ نام کے ساتھ ذکر صرف دو سورتوں میں ملتا ہے۔ مزید معلومات کے لیے سورۃ یوسف اور سیرتِ یوسفؑ ہی قابلِ مراجعت ہیں۔ قرآنی بیان کے مطابق حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُنھیں ساری اولاد میں سے صرف حضرت یوسفؑ ہی میں آثار سعد و سعادت نظر آتے تھے۔[24] حضرت یعقوبؑ کی یہ محبت برادرانِ یوسفؑ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ ہر وقت اس غم میں ڈوبے رہتے کہ کیسے قلبِ یعقوبؑ سے اس پیار کو مٹا ڈالیں یا پھر یوسفؑ ہی کو مار دیں۔ بھائیوں کے اس حسد میں اضافہ اس وقت ہوا جب حضرت یوسفؑ نے ایک خواب دیکھا۔ حضرت یعقوبؑ خواب سن کر بہت خوش ہوئے اور اُنھیں اس خواب کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا۔ لیکن یہ واقعہ مزید حسد کا سبب بنا۔ بھائیوں نے یوسفؑ کے خلاف سازش تیار کی۔[25] اور اس احساس میں چھپنے

والے کانٹے کو نکال دینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے باہم مشورہ کیا اور حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت یوسفؑ کے بارے میں خیر خواہی کا اظہار کیا اور کہا کہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں اُن پر اعتماد کریں اور یوسفؑ کو سیر کے لیے ان کے ہمراہ بھیجیں۔[۲۶] حضرت یعقوبؑ ان کے دلوں کے کھوٹ سے آگاہ ہو گئے کہ وہ یوسفؑ کو گزند پہنچانے کے درپے ہیں مگر واضح الفاظ میں اس لیے بیان نہ کیا کہ کہیں وہ کھلم کھلا دُشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں لیکن اشارۃً حقیقت بیان کر دی تاکہ اُنھیں پتہ چل جائے کہ وہ یوسفؑ کے بارے میں اندیشہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا کہ اُنھیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا انھیں نہ کھا جائے۔[۲۷] حضرت ابن عباسؓ سے روایت منقول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انھیں ہی کو بھیڑیا کہا مگر مصلحتاً پوری بات ظاہر نہ کی۔[۲۸] بھائیوں نے تسلی دی اور بہانے سے جنگل میں لے گئے۔ وہاں اُن کی قمیص اُتاری اور اُنھیں عرصہ دراز سے خشک ایک کنویں میں ڈال دیا۔ واپسی پر اُس قمیص کو کسی جانور کا خون لگایا اور روتے ہوئے آکر باپ کو من گھڑت قصے کی خبر دی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔[۲۹] نشانی کے لیے خون آلود قمیص دکھائی۔ حضرت یوسفؑ کا پیراہن دیکھا نہ کہیں سے پھٹا ہوا نہ کہیں سے چاک۔ فوراً حقیقت حال جان گئے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس خون آلود قمیص چہرۂ مبارک پر ڈال کر اتنا روئے کہ لہو والی قمیص کا رنگ آپ کی ڈاڑھی پر چڑھ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے آج تک ایسا بھیڑیا نہیں دیکھا جو بچے کو کھا گیا اور قمیص کہیں سے بھی نہ پھٹی۔[۳۰] لیکن بیٹوں کو نہ جھڑکا اور نہ ہی نفرت کا رویہ اختیار کیا کیونکہ آپ کی شانِ جلالت اور نبوت کے مقام کو یہی زیبا تھا کہ صبر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور کہیں بھی ایسی حرکت کا ارتکاب نہ کریں جو عام طور پر ایسے مواقع پر لوگوں سے سرزد ہوتی ہے۔[۳۱] لیکن تورات کا بیان اس کے برعکس ہے۔ اُس کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے بیٹے کی قبا کو پہچان لیا اور کہنے لگے کہ میرے بیٹے کی قبا ہے جسے کسی بڑے درندے نے کھا لیا۔ بے شک یوسف پھاڑا گیا۔ تب حضرت یعقوبؑ نے اپنے پیراہن کو چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹ کر بہت دنوں تک اپنے بیٹے پر ماتم کرتے رہے اور اس کے بیٹے بیٹیاں اسے تسلی دیتے رہے لیکن اسے تسلی نہ ہوئی اور وہ یہی کہتا رہا کہ میں ماتم کرتا ہوا برزخ میں اپنے بیٹے کے پاس اُتروں گا۔[۳۲]

اس نقشہ میں حضرت یعقوبؑ وہی کرتے نظر آرہے ہیں جو اس موقع پر ایک باپ کو کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن پاک حضرت یعقوبؑ کی جو تصویر پیش کرتا ہے اس سے ہمارے سامنے

ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو بہت ہی بردبار اور باوقار ہے۔ اتنی اندوہناک خبر سن کر بھی اپنے دماغی توازن کی برقرار رکھتا ہے اور اپنی فراست سے معاملہ کی اصل نوعیت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ من گھڑت بات ہے۔ پھر عالی ظرف انسانوں کی طرح اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے۔[۳۳] اور بیٹوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ۝[۳۴]

ترجمہ: کہا بلکہ تمھارے دلوں نے ایک بات تمھارے لیے بنالی ہے۔ تو صبر ہی اچھا ہے اور اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں ان باتوں پر جو تم بتا رہے ہو۔

ادھر حضرت یعقوبؑ کے بیٹے یوسفؑ کو ایک قافلے والوں نے کنویں سے نکال کر مصر کے بازار میں فوطیفار کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ فوطیفار نے آپ کو اولاد کی طرح رکھا۔ اپنی دولت و ثروت اور گھر کی تمام ذمہ داریاں سپرد کر دیں۔ جب وہ جوان ہوئے تو حسن و رعنائی کا پیکر نکلے۔ عزیزِ مصر کی بیوی دل پر قابو نہ رکھ سکی اور یوسفؑ پر نثار ہونے لگی۔ مگر حضرت یوسفؑ ناپاکی و فحش میں مبتلا نہ ہوئے اور نہ ہی عزیزِ مصر کی بیوی اُنھیں کسی طرح رام کر سکی۔[۳۵] نیتجتاً آپ کو زنداں کا منہ دیکھنا پڑا۔ بے خطا طویل عرصہ تک قید میں رہے۔ پھر بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر صرف حضرت یوسفؑ ہی بتا سکے۔ ایک طویل مدت کے بعد قید سے رہائی پا کر باعزت مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے اور خواب کی تعبیر کے مطابق قحط سالی سے بچنے کے لیے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ لہٰذا جب مصر اور گرد و نواح کے تمام ممالک میں قحط سالی کا آغاز ہوا تو اہلِ مصر تدابیر یوسفؑ کی بدولت بھوک اور پریشان حالی سے بچے رہے۔ دوسرے ممالک کے افراد نے بھی غلہ لینے کے لیے مصر کا رُخ کیا۔ ان میں اہلِ کنعان بھی تھے۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے مصر بھیجا۔[۳۶]

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو پہچان لیا لیکن بھائی یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ غلہ لے کر واپس آئے۔ دوسری مرتبہ یوسفؑ کے حکم کے مطابق ضد کر کے خدا کو بیچ رکھ کر مضبوط عہد و پیمان کے بعد بنیامین کو بھی مصر لے گئے۔ جاتے ہوئے حضرت یعقوبؑ نے خوبصورت، جوان بیٹوں کو نظرِ بد سے بچانے کی خاطر نصیحت کی کہ شہر کے ایک دروازے کی بجائے علیحدہ علیحدہ دروازوں سے اندر جائیں۔ لیکن خدا کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اُس کا ارادہ بدل سکتا ہے۔[۳۷] بیٹوں نے باپ کا حکم مانا۔ ظاہری تدبیریں پوری ہوئی۔ مصر پہنچنے

پر حضرت یوسفؑ نے سب بھائیوں کو سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا لیکن تنہائی میں بنیامین کو اپنے بارے میں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔[۳۸] بھائیوں کو غلہ دیا اور تدبیر کے ذریعے بنیامین کو روک لیا۔ اس طرح سے حضرت یعقوبؑ نے بنیامین کو واپس لانے کی جو تدابیر کروائیں وہ سب ناکام ہو گئیں۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے واپس آ کر باپ کو بتایا کہ بنیامین نے چوری کی ہے۔ اس لیے بادشاہ نے اسے روک لیا۔ آپ کو بیٹوں کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ کیونکہ پہلے یوسفؑ کے معاملہ میں تجربہ کر چکے تھے اس لیے بیٹوں سے کہنے لگے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمھارے جی نے یہ بات بنالی ہے۔ اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ اللہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایک دن ان گُمے ہوؤں کو پھر اکٹھا کر دے۔ آپؑ نے خاموشی اختیار کر لی اور اکثر گریہ زاری کرنے لگے یہاں تک کہ گریہ زاری کرتے آپؑ کی آنکھیں سپید پڑ گئیں۔[۳۹]

مولانا مفتی محمد شفیع رقم طراز ہیں:

"مسلسل روتے رہنا یہاں تک کہ اُن کی بینائی جاتی رہی بظاہر اُن کی پیغمبرانہ شان کے مطابق نہیں کہ اولاد سے اتنا پیار کریں۔"[۴۰]

احمد یار نعیمی کی رائے بڑی معقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت خوفِ خدا ہی بکاءِ انبیاء علیہم السلام کا سبب ہوتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں سپید پڑنے کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت ہے کہ حضرت یعقوب نے نظر جانے اور کمر کے کمان ہونے کے بارے میں فرمایا کہ یوسفؑ پر روتے روتے نظر چلی گئی اور اُس کے بھائی کے غم میں کمر کمان ہو گئی۔ اللہ نے وحی کے ذریعے فرمایا کہ میری شکایتیں مخلوق سے کرتے شرماتے نہیں۔[۴۱] حضرت یعقوبؑ نے فوراً اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ سے اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝[۴۲] کہہ کر کی۔ تب اللہ نے فرمایا: قسم ہے مجھے اپنی عزت کی کہ اگر وہ دونوں مردہ بھی ہو گئے ہوتے تو میں تمھارے لیے زندہ کر دیتا۔ روایات میں بیان کردہ اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؑ نماز تہجد ادا کر رہے تھے کہ قریب سوئے ہوئے یوسفؑ کے خراٹے لینے کی وجہ سے دو تین مرتبہ اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض و معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف متوجہ ہے۔ مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم میں غیر کی طرف توجہ دینے والی اس کی دونوں آنکھیں

نکال لوں گا اور جس کی طرف یہ متوجہ ہوا اُس کو اس سے مدت دراز کے لیے جدا کر دوں گا۔[۴۳]

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے ایک بکری ذبح کی لیکن اپنے دروازے پر آنے والے مسکین کو نہ دی مجھے انبیاءؑ تمام مخلوق سے پیارے ہیں اور ان کے بعد مساکین۔ اب تم کھانا تیار کرو اور مساکین کو دعوت پر بلاؤ۔ حضرت یعقوبؑ نے کھانا تیار کروا کر اعلان کروایا کہ جو بھی روزہ دار ہو آج رات حضرت یعقوبؑ کے پاس کھانا تناول کرے۔ اس کے بعد آپ کی عادت رہی کہ صبح و شام کھانا کھانے سے پہلے ندا کرتے کہ جس نے کھانا کھانا ہو وہ یعقوبؑ کے پاس آ جائے۔[۴۴]

حضرت یعقوبؑ کی کثرتِ گریہ زاری دیکھ کر بیٹوں نے ہمدردی جتانے کی بجائے کہا کہ آپ ہمیشہ ایسے ہی یوسفؑ کی یاد میں گھلتے رہیں گے۔ جواباً حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ نہ میں تم سے شکوہ کرتا ہوں اور نہ میں تمھیں ستاتا ہوں۔ بے شک میرا رونا اور غم کھانا اللہ کے لیے ہے۔ کیونکہ مَیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔[۴۵] اسی گریہ زاری کا ذکر اقبال نے نظم ''نامۂ عالمگیر'' میں کیا ہے۔ جس کا ماخذ سورۃ یوسفؑ کی آیت اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ...... ہے۔ اقبال نے یہ تلمیح قرآن پاک سے اخذ کی ہے نہ کہ تاریخ یا اسرائیلیات سے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس پریشانی و غم پر طویل عرصہ صبر کیا، نہ تو اللہ سے شکوہ کیا اور نہ بیٹوں کو ملامت کی جو بظاہر اس مصیبت کا سبب بنے تھے۔ اُن سے کہا تو صرف اتنا کہ جاؤ اور دوبارہ جا کر بھائیوں کو تلاش کرو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کا اظہار نہ کرو۔

وَلَا تَاْیْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ط اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ o[۴۶]

ترجمہ: اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بے شک اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے مگر کافر لوگ۔

زبورِ عجم حصہ دوم کے شروع میں ایک نظم ہے:

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
دگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہوئے
دو صد ہنگامہ بر خیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم

ندیمِ خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تابِ آں آشوب و غوغاے کہ من دارم [۴۷]

ترجمہ: میرے پاس جو جام ہے اس میں دونوں جہان دیکھے جا سکتے ہیں۔ کہاں ہے وہ آنکھ جو وہ دیکھے جسے میں دیکھ رہا ہوں۔
ایک اور دیوانہ آیا، جس نے شہر میں نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ میرے جنوں سے سینکڑوں ہنگامے پیدا ہو رہے ہیں۔
نادان راتوں کی تاریکی سے دلگیر نہ ہو۔ میری پیشانی پر جو داغ ہے وہ ستارے کی طرح چمک رہا ہے۔
تو مجھے اپنا ساتھی تو بناتا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تو میرے آشوب و غوغا کی تاب نہیں لا سکے گا۔

اس نظم میں اقبال نے کتاب پڑھنے والوں سے عمومی رنگ میں خطاب کیا ہے۔ اُنھیں اپنے پیغام کی نمایاں خصوصیات کے بارے میں بتایا ہے۔ اپنے مقام و منصب سے خبردار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے کلام کے مطالعہ سے حقائق و معارف واضح ہو سکتے ہیں لیکن اس شخص کے لیے جو اس کا مطالعہ کرے۔ میں نے اس کتاب میں عشق و محبت کا جو پیغام دیا ہے۔ انسان اس پر عمل پیرا ہو کر کائنات میں انقلاب لا سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! یہ سچ ہے تجھے اس وقت چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے یعنی تو مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن غمگین مت ہو۔ میری فکر سے تجھے وہ روشنی حاصل ہو سکتی ہے جس کی بدولت تو اس تاریکی کو دور کر کے تمام مشکلات پر غالب آ سکتا ہے۔[۴۸]

ان الفاظ سے ذہن اُس قولِ یعقوبی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو قرآن میں سورۃ یوسف میں ہے اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا یہ قول اُمید بہار ہے۔ پیغامِ رجائیت ہے۔ دیکھیے حضرت یعقوبؑ طویل عرصہ کی جدائی سے دلبرداشتہ نہیں ہوئے بلکہ بیٹوں کو اُمید سے بھرپور نصیحت کی۔ یہی امید بہار کلام اقبال کا بھی خاصہ ہے۔ امید و رجائیت کے شاعر اقبال کے نزدیک مایوسی کفر اور گناہ ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اُن کے کلام میں ایسا تاثر ملتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے کورنگاہی کے مرض کے سامنے بے بس ہیں، مثلاً فرماتے ہیں:

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کورنگاہی! [۴۹]

لیکن مایوسی کے باوجود امید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وہ جسمانی طور پر تو جوانی کی دوپہر سے بڑھاپے کی شام کی طرف بڑھتے چلے گئے لیکن اُن کی فکر پر شباب کا عالم ہی

رہا۔[۵۰] کیونکہ انھیں یقین تھا کہ:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینۂ اِدراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے!
کیا عجب! میری نواہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے[۵۱]

اقبال کا روزگار ناامیدی کے عنصر سے بری تھا۔ اس لیے کہ انھیں اپنے ایمان کی وجہ سے ملت کی قسمت پر بھروسا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے حضرت یعقوبؑ قسمت پر بھروسہ رکھتے ہوئے اللہ کی رحمت سے مایوس و ناامید نہ تھے۔ امید و یقین کا یہ پہلو جو اقبال کے کلام میں جا بجا مختلف رنگوں میں بکھرا نظر آتا ہے۔ اس کا ماخذ قرآنی آیت، قولِ یعقوبؑ ہے۔ جس کے ذریعے وہ ملت کو مایوسی ترک کرنے کا درس دیتے ہیں۔ امید کا پیغام سناتے ہیں۔ اسی امیدِ قوی کی بدولت حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو دوبارہ ایک خط کے ساتھ مصر بھیجا جس میں تحریر تھا:

......پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔ یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی۔ اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غمزدہ کی تسلی کا سامان تھا۔ جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولادِ انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے نہ ہماری اولاد میں سے کوئی چور پیدا ہوا۔[۵۲]

حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو زار و قطار رونے لگے۔ تنہائی میں بھائیوں پر اللہ کے حکم سے یہ راز ظاہر کر دیا کہ وہ یوسفؑ ہیں۔ بھائیوں کو اپنا پیراہن دیا اور کہا کہ جاؤ اور میرے اس پیراہن کو حضرت یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دو۔ ان شاء اللہ اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اس کے بعد تمام گھر والوں کو لے کر میرے پاس آ جانا۔ ادھر یہ قافلہ مصر سے نکلا اُدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کی خوشبو پہنچا دی۔ آپؑ نے اپنے پاس موجود بیٹوں سے کہا کہ تم مجھے کم عقل نہ بناؤ تو میں بتاؤں کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔ ابھی یہ قافلہ آٹھ یوم کے فاصلے پر تھا یعنی ۸۰ فرسخ دور تھا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کو گم ہوئے ۸۰ سال بیت چکے تھے۔[۵۳] بیٹوں نے یہ سب سنا تو کہا کہ آپ ایسے ہی یوسفؑ کی محبت کی پرانی غلطی میں گرفتار و قائم ہیں۔ لیکن ایک ہفتہ کے بعد حضرت یعقوبؑ کے بڑے بیٹے یہودا پیراہن لے کر آئے۔ باپ

کے چہرہ پر ڈالا تو فوراً بینائی لوٹ آئی۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ تب آپؑ اپنے بچوں سے کہنے لگے دیکھو میں تمھیں نہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مجھے وہ باتیں معلوم ہیں جو تم نہیں جانتے۔[۵۴]

اقبال حضرت یعقوبؑ کی سیرت کے اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

عشقِ یعقوب کا تو محرم اسرار تو ہو
پیرہن دے گا دکھا تجھے پسر کی صورت[۵۵]

اس شعر میں اقبال نے جہاں سیرت یعقوبؑ کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہاں مخاطب کو ''یعقوبیت'' کے اسرار کا محرم بننے کی دعوت بھی دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں یعقوبؑ یہاں عشق کی نمائندہ ہستی کے طور پر اُبھرتے ہیں۔ اس عشق کی طاقت سے طویل فاصلے پر موجود اشیا کا علم ہو جاتا ہے اور صاحب عشق اُن پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہو جاتا ہے جن سے آگاہی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اقبال چاہتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کے افراد اس قوت کے اسرار کا محرم بننے کی کوشش کریں تاکہ اُنھیں عام انسانوں پر فوقیت حاصل ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک ''یعقوبیت'' کا یہ وصف انتہائی اہم ہے اس کی بدولت:

- انسان آزمائشوں کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتا۔
- دُنیا میں انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ آدم گری کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔[۵۶]
- نئی دنیا کی تعمیر و تسخیر اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔
- زمان و مکان سے ماورا حقیقت تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔
- ہر لحہ احوال کی تبدیلی کا مشتاق رہنے کی صفت اُس میں جنم لے لیتی ہے۔

''یعقوبیت'' کا یہ وصف زندگی کی علامت بھی ہے اور زندگی کا پیغامبر بھی۔ یہ انسان کو ایسی قوت، بصیرت، حرکت اور توانائی عطا کرتا ہے جس کی بدولت وہ دنیا کا حاکم بن جاتا ہے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگتا ہے۔ اس کی آہیں اور نالے مشکلات سے گھبرا کر نہیں نکلتے بلکہ مشکلات پر قابو پانے کے لیے نکلتے ہیں اور وہ مشکلات کا رونا رونے کی بجائے اُن پر غالب آنے کی تراکیب سوچتا ہے۔[۵۷]

''پیرہن'' کلامِ اقبال میں اصلی معنوں میں تو استعمال ہوا ہے لیکن مجازی معنوں میں بالکل انوکھے مفہوم میں جلوہ گر ہے۔

مثنوی گلشن راز جدید کے آغاز میں تمہید کے بعد نو سوالات اور اُن کے تفصیلی جوابات ہیں جن میں اقبال نے اپنے فلسفہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ سوال نمبر ۲ کے جواب میں تین بند

ہیں۔ پہلے میں خودی کی صفات کا ذکر ہے۔ دوسرے میں جہاں کی ماہیئت اور اُس کا انسان سے رشتہ نیز انسان کی حیثیت کے متعلق بیان ہے۔ علامہ نے بتایا ہے کہ کائنات کے وسیع ہونے کے باوجود تنہا انسان زیادہ اہم ہے۔ کائنات اُس کے سامنے ایک چیونٹی کی طرح ہے۔ تاہم سالکانِ راہ معرفت نے ہمیشہ اس چیونٹی سے استمداد کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے مخاطب کو مشاہدۂ کائنات کی دعوت دی۔ کیونکہ اس مشاہدہ اور سیرِ آفاق کے وسیلے ہی سے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے اور انسان جان سکتا ہے کہ وہ زمینی یا خاکی نہیں بلکہ ہمسایۂ جبریل امین ہے۔ اگر وہ عقل سے کام لے کر عالم کا مشاہدہ کرے تو اُسے پتہ چل جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کائنات کی تمام اشیاء میں سے ظاہر ہیں۔ اس لیے ہی اقبال انسان کو ''پیرہن'' یعنی کائنات کا مشاہدہ کرنے اور محبوبِ حقیقی کا نظارہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

نصیب خود زبوئے پیرہن گیر
بہ کنعاں نکت از مصر و یمن گیر
چوں آتشِ خویش را اندر جاں زن!
شبیخوں بر مکان و لامکان زن![۵۸]

ترجمہ: پیرہن کی خوشبو سے اپنا حصہ لے، کنعاں میں رہتے ہوئے مصر سے آنے والی خوشبو پالے (جسے یعقوبؑ نے کنعاں میں بیٹھے ہوئے یوسف کی خوشبو پائی تھی)۔

تو آتش ہے، اپنے آپ کو جہاں میں ڈال اور (اس طرح) مکان ولامکاں پر شبخون مالہ۔

اقبال اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کہ اُسے کائنات سے اپنا حصہ لینا ہے۔ اس حصہ کے حصول کے لیے اُسے علاقائی حد بندیوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اقبال نے ''بوئے پیرہن، کنعان، مصر و یمن'' کا ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ وتراکیب سے اقبال نے دوگونہ کام لیا ہے۔ اس سے ایک تو یعقوبؑ کی حیات کے اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرے ان الفاظ وتراکیب کو آفاقی رنگ میں استعمال کیا ہے۔ اقبال نے پیرہن کو کائنات کے لیے استعارۃً استعمال کیا ہے۔

نبی کا پیرہن بصارت وبصیرت عطا کرتا ہے۔ نیز یہ مصائب کے خاتمہ کی علامت ہے۔ روایت ہے کہ بینائی لوٹنے کے بعد پیرِ کنعان حضرت یعقوبؑ اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ مصر روانہ ہوگئے۔ مصر کے قریب پہنچے تو حضرت یوسفؑ اپنے شہر کے امرا اور ارکان دولت کے ہمراہ

استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے۔ اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو اپنے ہمراہ لائے اور اپنے پاس جگہ دی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ کے تمام بیٹے والد کے پاس آ کر معافی کے خواستگار ہوئے اور عرض کی کہ اللہ تعالیٰ سے بھی بخشش طلب فرمائیں۔ روایت ہے کہ حضرت یعقوبؑ مسلسل ۲۰ سال دُعا کرتے رہے۔ حضرت یوسفؑ آمین کہتے رہے۔ بھائیوں کا خون خوفِ خدا سے خشک ہونے لگا تب دُعا کی قبولیت کی وحی آئی اور بخششِ فرزنداں کی خوشخبری سنائی گئی۔[۵۹]

حضرت یعقوبؑ اپنی اولاد کے ساتھ مصر میں مقیم ہو گئے۔ آپؑ نے قوم قبط کو بت پرستی کرتے دیکھا تو اپنی اولاد کو اکٹھا کیا اور انھیں مسلمان رہنے اور اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی۔[۶۰] نہ کہ یہودیت پر۔ اس لیے یہودیوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹوں کو یہودی رہنے کی وصیت کی تھی۔[۶۱] آپؑ یہودیت اور نصرانیت سے جدا تھے۔[۶۲] آپؑ نے مصر ہی میں وفات پائی۔ سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو ان کی وصیت کے مطابق لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا[۶۳] اور حضرت اسحاقؑ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ اس وجہ سے عام یہود میں بھی یہ رسم جاری ہوگئی کہ اپنے مردوں کو دور دور سے لا کر بیت المقدس لے جا کر دفن کرتے ہیں۔[۶۴] روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی عمر ۱۴۷ سال تھی۔[۶۵] قرآن پاک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؑ مستقل شریعت پر عمل کرتے تھے اور وہ شریعت ابراہیمی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو بھی اس دین کی دعوت دی۔ اغلب امکان ہے کہ آپؑ کو اہل کنعان کی طرف سے مبعوث کیا گیا۔

اسلامی ادب میں حضرت یعقوبؑ کا ذکر ایک غمزدہ مبتلائے مصیبت اور بہت ہی صابر و شاکر نبی کے طور پر تمثیلی انداز میں کثرت سے ملتا ہے۔[۶۶] لیکن اس کے برعکس ''یعقوبیت'' اقبال کے ہاں صرف غم والم کی شمع ہی نظر نہیں آتی بلکہ صبر و عزیمت، استقامت، امید و یقین اور عشق کے کئی دائمی انداز آشکارا کرتی ہے۔ اقبال انسانِ کامل میں ان اوصاف کو دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اسی لیے وہ مخاطب کو عشقِ یعقوبؑ اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ اسی کی بدولت شخصیت میں استحکام آتا ہے اور انسان مایوس ہونے کی بجائے مشکلات پر قابو پانا سیکھتا ہے۔ نتیجتاً جیسے کامیابی ''یعقوبیت'' کا مقدر بنی۔ ایسے ہی اُس کا مقدر بھی بنتی ہے۔ ضرورت صدقِ دل سے اس ''جذبہ یعقوبیت'' کو پروان چڑھانے کی ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- عبدالواحد، معینی، سید محمد عبداللہ قریشی (مرتبین)، باقیات اقبال، آئینہ ادب، لاہور، بار سوم، ۱۹۷۸ء، ص:۳۸۴

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص:۱۳۱/۳۰۱

۳- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۳۷۱

۴- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۲ء، ص:۱۶۶

۵- حوالہ مذکورہ بالا، ص:۱۷۳

۶- ابن کثیر، الوالفدا ءعماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۳۹

۷- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، نشریات کتابفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، چاپ بیست و پنجم ۱۳۶۰، ص:۳۶۹

۸- ابنِ کثیر، ابوالفدا ءعماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص ۲۴۱

۹- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۱، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد، ص:۱۷۷

۱۰- ابنِ کثیر، ابوالفدا ءعماد الدین دمشقی، تفسیر ابن کثیر ج:۲، پ:۷، نور محمد، کارخانہ تجارت، کراچی، سن ندارد، ص:۹۱

۱۱- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۵ء، ص:۷۲

۱۲- تورات، تکوین: باب:۲۷، آیت:۱-۳۶، سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء

۱۳- ابنِ کثیر، ابوالفدا ءعماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص:۲۴۲

۱۴- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء، ص:۷۱

۱۵- تورات، تکوین: باب:۲۸، آیت:۱-۱۴

۱۶- ابنِ کثیر، الوالفدا ءعماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص ۲۴۲۔ نیز دیکھیے: المولی، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید، قصص القرآن عربی، المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، بمصر، الطبعۃ العاشرۃ، ۱۹۶۹ء، ص:۷۶

۱۷- ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، ص ۷۱۔ نیز دیکھیے: ابنِ کثیر، ابوالفدا ءعماد الدین، قصص الانبیاء عربی، مکتبہ طیبہ، المدینۃ المنورہ، الطبعۃ الاولیٰ، سن ندارد، ص:۷۶

۱۸- عبدالرحمٰن، مولانا محمد، سیرت انبیائے کرام، ج:۱، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۸۹۔ نیز دیکھیے: سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج:۱-۲، حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص:۲۷۷

۱۹- ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ انبیاء میں، ص:۲۶۳ پر مدت ۱۰ سال بیان کی گئی ہے۔ سات سال مدت کی اکثر مصنفین نے تائید کی ہے۔ تورات، تکوین: باب ۲۹، آیت: ۲۷، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۳، ص ۳۰۲۔ مندرجہ ذیل کتب میں تورات کی تائید ہے۔ ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص ۲۴۳۔ موسوی، سید محمد باقر، غفاری، تاریخ انبیاء، کتابفروشی صدوق، طہران، سن ندارد، ص:۹۸۔ المولی، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید، قصص القرآن عربی، ص ۸۰۔ ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، دمشقی، قصص الانبیاء (عربی)، ص:۲۶۳

۲۰- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۲۷۸۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج:۱، ص:۲۴۳

۲۱- تورات: تکوین: باب ۲۹، آیت: ۳۱-۳۵، باب ۳۰، آیت: ۶، ۲۴

۲۲- المولی، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد الفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید، قصص القرآن عربی، ص:۸۱

۲۳- ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص:۲۷

۲۴- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۲، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور، بار بائیسواں، ۱۹۸۸ء، ص:۳۸۶

۲۵- یوسف: ۱۲، آیت: ۴-۹

۲۶- حوالہ مذکورہ بالا، آیت: ۱۱، ۱۲

۲۷- حوالہ مذکورہ بالا، آیت: ۱۳

۲۸- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۵، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص:۳۳

۲۹- یوسف: ۱۲، آیت: ۱۳، ۱۴

۳۰- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۳۶۴۰

۳۱- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۷۸ء، ص:۴۱۷

۳۲- تورات، تکوین، باب: ۳۷، آیت ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷۔

۳۳- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۲، ص: ۳۸۹، ۳۹۰

۳۴- یوسف: ۱۲، آیت: ۱۸

۳۵- یوسف: ۱۲، آیت: ۲۳، ۲۴، ۶۹، ۸۴

۳۶- تورات، تکوین، باب: ۴۲، آیت: ۱-۴، باب: ۴۲، آیت ۱-۲

۳۷- ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۳، پ:۱۳، نور محمد کارخانہ کراچی، سن ندارد، ص:۱۱

۳۸- یوسف: ۱۲، آیت: ۶۹

۳۹- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۵، ص: ۱۲۹

۴۰- ایضاً

۴۱- ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۳، پ:۱۳، ص:۱۱

۴۲- یوسف:۱۲،آیت:۸۶
۴۳- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۵،ص:۱۳۲
۴۴- پانی پتی،علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری،پ:۱۳،ص:۱۹۸
۴۵- یوسف:۱۲،آیت:۸۶
۴۶- یوسف:۱۲،آیت:۸۷
۴۷- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۶۲/۴۵۳
۴۸- چشتی، پروفیسر سلیم،شرح زبورِ عجم،ص:۱۸۴
۴۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردوص:۳۶/۳۲۸
۵۰- جاوید اقبال،ڈاکٹر،مے لالہ فام،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور،۱۹۹۶ء،ص:۱۴۵
۵۱- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۶۴/۳۵۶
۵۲- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۵،ص:۱۳۵،۱۳۶
۵۳- ابن کثیر،ابوالفدا ءعماد الدین، تفسیر ابن کثیر،ج:۳،پ:۱۳،ص:۱۳،۱۴
۵۴- یوسف:۱۲،آیت:۹۶
۵۵- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،عبدالواحد معینی،محمد عبداللہ قریشی (مرتبین)،باقیاتِ اقبال،ص:۴۱۴
۵۶- عبدالحکیم،ڈاکٹر خلیفہ،فکر اقبال،بزم اقبال،لاہور،بار پنجم،۱۹۸۴ء،ص:۲۹۵
۵۷- اختر،ڈاکٹر ملک حسن،اطرافِ اقبال،بزم اقبال،لاہور،باردوم۱۹۹۲ء،ص:۱۶۲،۱۶۳،۱۶۶،۱۷۹
۵۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی،ص۱۵۳/۵۴۵
۵۹- البقرہ:۲،آیت:۱۳۳
۶۰- ابن کثیر،ابوالفدا ءعماد الدین،تفسیر ابن کثیر،ج:۳،پ۱۳،ص:۱۴،۱۵
۶۱- امیر علی،مولانا سید،مواہب الرحمٰن،ج:۱،ص:۴۰۷
۶۲- ابن کثیر،ابولفداءعماد الدین، تفسیر ابن کثیر،ج:۱،ص:۲۰۰
۶۳- اصفہانی،عماد الدین حسین،قصص الانبیاء (فارسی)،ص:۳۷۳۔نیز دیکھیے:نعیمی،مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی،ج:۱،ص:۷۱۷،۷۱۸
۶۴- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۵،ص:۱۵۰
۶۵- تورات،تکوین:باب:۴۷،آیت:۲۸۔اکثر مفسرین نے اسی کی تائید کی ہے۔

☆☆☆☆

حضرت یوسف علیہ السلام

علامہ اقبال نے جن انبیاؑ کی سیرت و کردار اور تعلیمات کو کلام کی زینت بنایا ہے اور بطور نمونہ پیش کیا ہے ان میں ایک نام حضرت یوسفؑ کا بھی ہے۔ اقبال نے اس پاک پیغمبر کی سیرت کے حقیقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے علاوہ اسے دوسرے کئی حوالوں سے بھی لیا ہے جن کی بہتر تفہیم سیاق و سباق کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک ''یوسفیت'' کے عناصر دیکھنے سے قبل حضرت یوسفؑ کی پاک سیرت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

حضرت یوسفؑ کا نسب نامہ یہ بیان کیا گیا ہے:

یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم[۱]

رسول پاک ﷺ نے آپ کے نسب نامہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

فَاکْرَمُ النّاسِ یُوْسُفُ نَبِیُّ اللّٰہِ بْنِ نَبِیِّ اللّٰہِ بن نَبِیِّ اللّٰہ۔[۲]

ترجمہ: خاندان کے اعتبار سے حضرت یوسفؑ سب سے زیادہ قابل عزت ہیں۔ اللہ کے نبی کے بیٹے اور اللہ کے نبی کے پوتے۔

یعنی حضرت یوسفؑ خاندان کے اعتبار سے سب سے زیادہ صاحب عزت ہیں۔ آپؑ پیغمبر کے بیٹے، پیغمبر کے پوتے اور پیغمبر حضرت اسماعیلؑ کے پڑپوتے ہیں۔ آپؑ کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان تھا۔ حضرت یعقوبؑ آپ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ کسی لمحہ بھی آپ کو نگاہوں سے اوجھل نہ کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے حضرت یوسفؑ انتہائی حسین و جمیل تھے۔ گھنگریالے بال، بڑی بڑی آنکھیں، خوبصورت چہرہ، گوری رنگت، بازو اور ٹانگیں گداز بھری ہوئیں، سینہ چوڑا، ناف باریک چھوٹی، تمام اعضا نہایت مناسب تھے[۳] حضرت یوسفؑ بھی اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر اللہ کے پیغمبر چن لیے گئے اور دین ابراہیمی کی دعوت کا فریضہ سرانجام دیا۔

قرآن پاک میں حضرت یوسفؑ کا ذکر چھبیس مقامات پر ملتا ہے۔ چوبیس مقامات پر صرف سورۃ یوسفؑ میں اور دو مقامات پر سورۂ الانعام اور سورۂ المومنون میں۔ قرآن حکیم نے حضرت یوسفؑ کے واقعہ کو ''احسن القصص'' کہا ہے۔ اس لیے کہ اس ایک واقعہ میں بے شمار عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ و نصائح موجود ہیں۔ دراصل یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب، دلکش اور زمانہ کے عروج و زوال کی زندہ نشانی ہے۔ یہ ایک فرد کے ذریعے قوموں کے گرنے اور اُبھرنے کی منہ بولتی تصویر ہے جس کی وضاحت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک بے مثال فرد کی حیرت انگیز تاریخ ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اُس زمانہ کی بڑی مہذب قوم کی رہنمائی اور حاکمیت کے لیے چن لیا تھا اور شرف نبوت عطا فرمایا تھا۔[۴]

سورۂ یوسفؑ کے واقعات کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ اپنی تمام اولاد میں سے حضرت یوسفؑ سے زیادہ پیار کرتے تھے جبکہ برادران یوسف کے لیے یہ پیار محبت ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے وہ ہر وقت اس محبت کو کُھرچنے یا حضرت یوسفؑ کا قصہ پاک کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ برسا کہ حضرت یوسفؑ نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج، چاند ان کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے بیٹے کا خواب سُن کر اسے روک دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے پیش نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے بھائی اس خواب کو سن لیں اور تم سے بُرا رویہ اپنا لیں[۵] اس موقع پر تورات اور قرآن مجید میں تضاد ہے۔ تورات کہتی ہے کہ بھائی اس وقت موجود تھے۔[۶] جبکہ قرآن کے بیان کے مطابق موجود نہ تھے اور یہ ہی سچ ہے۔ قرآن پاک کے بیان کے مطابق حضرت یعقوبؑ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں حضرت یوسفؑ کی بلندی دیکھ رہے تھے جو اُن کے لیے ہزار مسرت کا باعث تھی۔[۷] عمادالدین حسین اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بچپنے اور کم عمری کی وجہ سے خود ہی خواب بھائیوں کو سنا دیا جس کے بعد بھائی حضرت یوسفؑ سے زیادہ حسد کرنے لگے۔[۸] آخر کار حسد کی بھڑکتی آگ سے مجبور ہو کر ایک روز برادرانِ حضرت یوسفؑ نے حضرت یوسفؑ کے خلاف سازش تیار کی اور اپنے احساس میں چبھنے والے کانٹے کو نکال پھینکنے کا مشورہ کیا کہ حضرت یوسفؑ کو مار ڈالیں یا کسی ملک میں پھینک دیں۔ باہم مشورہ سے طے پایا کہ یوسفؑ کو اندھے یا گمنام کنویں میں ڈال دیا جائے۔ تاکہ کوئی مسافر اسے اٹھا کر لے جائے۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس مشورہ کے بعد سب

جمع ہو کر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے اور اسے سیر کے لیے ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے۔ حالانکہ ہم سے بہتر محافظ اُن کا کون ہو سکتا ہے؟ حضرت یعقوبؑ اُن کے دلوں کو کھوٹ سے آگاہ ہو گئے کہ یہ یوسفؑ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں مگر صاف لفظوں میں ظاہر نہ فرمایا کہ کہیں بگڑ کر اعلانیہ دُشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔[۹] اس لیے اشارہ کنایہ میں ان پر حقیقت کھول دی کہ اُنھیں واقعی حضرت یوسفؑ کے بارے میں ڈر ہے۔ الغرض برادران یوسفؑ حضرت یوسفؑ کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانے لے گئے اور راستے میں پیٹتے رہے۔[۱۰] پھر مشورہ کے مطابق غیر آباد کنویں میں ڈال دیا۔ یہ کنواں جنگل کے راستے میں تھا۔[۱۱] روایت ہے اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سات[۱۲] یا سترہ سال تھی اور وہ حضرت یعقوبؑ کی رہائش سے تین فرسخ دور تھے۔[۱۳] بھائیوں نے کنویں میں ڈالتے ہوئے قمیص اُتار لی۔ تفسیر مواہب الرحمٰن میں ہے کہ جیسے ہی بھائیوں نے قمیص اُتاری حضرت جبرائیلؑ نے اسی وقت انھیں نئی قمیص پہنا دی۔[۱۴] بھائیوں نے اس اُتاری ہوئی قمیص پر کسی جانور کا خون لگایا اور روتے ہوئے باپ (حضرت یعقوبؑ) کے پاس آ کر من گھڑت کہانی بیان کی اور کہنے لگے کہ ہم آپؑ کو اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں آپؑ کو یہ ہرگز یقین نہیں آئے گا۔ ہم دوڑ میں آگے نکلنے میں مصروف تھے کہ اچانک ایک بھیڑیا یوسف کو اٹھا کر لے گیا۔[۱۵]

اقبال نے اس واقعہ کی طرف مثنوی پس چہ باید کرد ... کی تمہید میں اشارہ کیا ہے اور اس سے ایک نیا مفہوم بھی اخذ کیا ہے وہ کہتے ہیں:

یوسف مارا اگر گرگے برد
بہ کہ مردے ناکسے او را خرد[۱۶]

ترجمہ: ہمارے یوسف کو اگر بھیڑیا لے جائے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی ایسا شخص اسے خرید لے جو انسانیت سے عاری ہو۔

اُدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں گرنے کے باوجود محفوظ رکھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت یوسفؑ تین روز تک کنویں میں رہے اور ان کا بھائی یہودا تمام بھائیوں سے چھپ کر ڈول کے ذریعے کھانا کنویں میں پہنچاتا رہا۔[۱۷] اللہ تعالیٰ کے حکم سے حجازی اسماعیلیوں

کا ایک قافلہ شام سے مصر جاتے ہوئے اس جگہ ٹھہرا اور کنویں میں پانی لینے کے لیے ڈول ڈالا تو حضرت یوسفؑ ڈول سے لٹک کر باہر آ گئے۔ قافلہ کا لالچی تاجر یوسفؑ کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا، خوشی سے چیخ ماری اور حیرت و مسرت سے دیکھتے ہوئے سوچا اگر وہ اِسے مصر کے بازار میں لے جا کر بیچ دے تو اسے کافی قیمت مل جائے گی۔ تورات کے مطابق یوسف کے بھائیوں نے انھیں قافلہ والوں کے ہاتھ ۲۰ درہم میں فروخت کر دیا۔[۱۸] جبکہ قرآن کا بیان ہے کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر غلام بنا لیا۔[۱۹] مصر میں اس زمانے میں غلاموں کی منڈی لگنے کا رواج تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق حضرت یوسفؑ کو غلاموں کی منڈی میں کھڑا کیا گیا۔ ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ خریدنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ راستے لوگوں سے بھر گئے۔ یہ خبر عزیزِ مصر فوطیفار تک پہنچی۔ اس نے حقیقت حال دریافت کی۔ تصدیق کے بعد اس نے حضرت یوسفؑ کو اس لالچی تاجر سے دس مثقال سونے اور بہت سے دیبا و حریر اور دوسرے قیمتی کپڑوں کے عوض خرید لیا۔[۲۰] حضرت یوسفؑ اپنی عصمت مآب زندگی حلم و وقار اور امانت و سلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت جلد ہی عزیزِ مصر کی آنکھوں کے تارے اور دل کے مالک بن گئے اور عزیزِ مصر کو اولاد کی طرح عزیز ہو گئے۔ اس نے حضرت یوسفؑ کو اپنی ریاست، دولت اور گھر کی تمام ذمہ داریوں پر امین مقرر کر دیا۔[۲۱] وہ اسی کے گھر میں جوان ہوئے۔

عین عنفوانِ شباب میں حضرت یوسفؑ کی دوسری کڑی آزمائش شروع ہوئی۔[۲۲] عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا جمال اور رعنائی کے پیکر مجسم حضرت یوسفؑ کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ ان پر پروانہ وار فدا ہونے لگی اور انھیں فحش و ناپاکی میں مبتلا ہونے پر ابھارنے لگی۔ ہر کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور حضرت یوسفؑ سے غلط فعل کے لیے اصرار کرنے لگی۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ اللہ کی نافرمانی کرنا اور عزیزِ مصر کی امانت میں خیانت کرنا ناممکن ہے مگر عزیزِ مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اُس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر زور دیا۔ حضرت یوسفؑ چونکہ اپنے رب کی بُرہان دیکھ چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے صاف انکار کر دیا[۲۳] اور عزیزِ مصر کی بیوی سے بچنے کے لیے دروازے کی طرف بھاگے۔ دروازہ کسی طرح کھل گیا۔ سامنے عزیزِ مصر کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر زلیخا نے یہ جھوٹ گھڑ لیا جس کا تفصیلی ذکر سورۃ یوسف میں ہے:

قَالَتْ مَاجَزَآءُ مَنْ اَرَادَبِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ٥ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ

نَّفۡسِیۡ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَo وَ اِنۡ کَانَ قَمِیۡصُہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَکَذَبَتۡ وَ ہُوَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَo فَلَمَّا رَاٰ قَمِیۡصَہٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّہٗ مِنۡ کَیۡدِکُنَّ ؕ اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌo یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا سکتہ وَ اسۡتَغۡفِرِیۡ لِذَنۡۢبِکِ ۚ اِنَّکِ کُنۡتِ مِنَ الۡخٰطِئِیۡنَo[۲۴]

ترجمہ: کیا سزا ہے اس کی جس نے تیری گھر والی سے بدی چاہی مگر یہ کہ قید یا دُکھ کی مار۔ کہا اس نے مجھ کو لبھایا کہ میں اپنی حفاظت نہ کروں اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی اگر ان کا کرتا آگے سے چرا ہے تو عورت سچی ہے اور انھوں نے غلط کہا اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے چاک ہوا تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے۔ پھر جب عزیز نے اس کا کرتا پیچھے سے چرا دیکھا بولا بیشک یہ تم عورتوں کا چرتر (فریب) ہے بے شک تمھارا چرتر (فریب) بڑا ہے اے یوسف تم اس کا خیال نہ کرو اور اے عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ بے شک تو خطاداروں میں سے ہے۔

عزیزِ مصر نے رسوائی سے بچنے کے لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا۔ مگر بات چھپی نہ رہ سکی۔ عورتوں میں چرچا ہونے لگا کہ عزیزِ مصر کی بے حیا بیوی غلام پر عاشق ہوگئی۔ عزیزِ مصر کی زوجہ کو یہ طعنہ سخت ناگوار گزرا۔ اُس سے اس کا انتقام لینے کی ٹھانی۔ ایک دن عورتوں کی دعوت کی۔ جب سب کھانا کھانے بیٹھ گئیں اور چھریاں ہاتھ میں لے لیں کہ موجود چیز کاٹیں۔ تب عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو باہر آنے کا حکم دیا۔ حضرت یوسفؑ باہر نکلے تو تمام عورتیں حسنِ یوسفؑ دیکھ کر حیران رہ گئیں اور رخِ انور کی تجلی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لیے اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ یہ انسان نہیں بلکہ نور کا پتلا ہے اور بزرگ فرشتہ ہے۔ یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی یہ وہ غلام ہے جس کے عشق و پیار کے بارے میں تم نے مجھے مطعون ٹھہرایا اور ملامت کا نشانہ بنایا[۲۵] اقبال نے عزیزِ مصر کی بیوی کے عشق کا اظہار مختلف پیرائے میں کیا ہے۔ دیکھیے:

دگر از یوسفِ گم گشتہ سخن نتواں گفت
تپشِ خونِ زلیخا نہ تو داری و نہ من[۲۶]

ترجمہ: اب یوسفؑ گم گشتہ کی بات نہیں کی جا سکتی کیونکہ خونِ زلیخا کی تپش نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔

ایک اور مقام پر رجائیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں[۲۷]

عزیز مصر کی بیوی نے ایک مرتبہ پھر حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور کہا اگر میرا کہا نہ مانا تو یہ ہو کر رہے گا کہ تو قید میں ڈالا جائے۔ یہ سن کر حضرت یوسفؑ نے اللہ کے حضور دعا کی کہ اے میرے پروردگار جس بات کی طرف یہ مجھے بلاتی ہے اس کے مقابلے میں مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے[۲۸] اگر تو نے مجھے اس کے مکر سے نہ ہٹایا اور میری مدد نہ کی تو میں کہیں اس کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں سے نہ ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کی دعا قبول کی۔ عزیز مصر نے تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اپنی بیوی کو رسوائی سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ کر لیا کہ حضرت یوسفؑ کو ایک مدت کے لیے قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ یہ درحقیقت حضرت یوسفؑ کی دعا اور خواہش کی عملی تکمیل تھی۔ کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عزت کی حفاظت ایک مشکل فعل ہو چکا تھا۔[۲۹] غالباً عزیز مصر کے اس بے انصافی پر مشتمل ظالمانہ فیصلے کی وجہ سے اقبال نے ایک قطعہ میں حضرت یوسفؑ کے ساتھ فرعون کا لفظ بادشاہ وقت کے لیے استعمال کیا ہے۔ درحقیقت یہ اس زمانے کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ بادشاہ کا نام عرب مورخوں نے ریّان بتایا ہے[۳۰] اور مصری میں یہ آیونی ہے۔[۳۱]

دریں صحرا گزر افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را
اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے بروں آید
بغارت می تواں دادن متاعِ کاروانے را[۳۲]

ترجمہ: بڑی مدت کے بعد میں ساربان کے نغمے سن رہا ہوں، شاید اس صحرا سے کوئی کارواں گزر رہا ہے۔
اگر فرعون کے قید خانے سے ایک یوسف باہر آ جائے، تو اس پر کارواں کا سارا مال و متاع قربان کیا جا سکتا ہے۔

بے خطا حضرت یوسفؑ کو زندان میں ڈال دیا گیا اور مجرم بنا دیا گیا تا کہ عزیز کی بیوی فصیحت سے بچ جائے اور مجرم نہ کہلائے۔ ایک قول کے مطابق اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر ۲۱ سال سے زیادہ نہ تھی[۳۳] تورات میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے علمی و عملی جوہر قید میں بھی ظاہر ہو گئے۔ قید خانہ کا داروغہ اتنا متاثر ہوا کہ تمام انتظام و انصرام آپؑ کے سپرد کر دیا۔ اس طرح حضرت یوسفؑ قید خانہ کا بالکل مختار ہو گیا اور خداوند نے وہاں بھی اسے اس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔[۳۴] پیامِ مشرق کی نظم ''بہشت'' اقبال نے اپنے ایک خاص نظریہ کے اثبات میں

لکھی ہے۔ عام طور پر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بہشت بہت عمدہ جگہ ہے۔ وہاں پر ہر طرح کی نعمتیں میسر ہیں اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔ اس لیے وہ جگہ قیام کے لائق ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ بہشت کی دلچسپیاں تسلیم شدہ سہی۔ مگر وہ اس لائق نہیں ہے کہ وہاں ہمیشہ رہنے کی آرزو کی جائے۔ یہی نظریہ ہے جس کا اثبات اقبال نے اس نظم میں کیا ہے[۳۵] اسی ذیل میں اقبال نے عزیزِ مصر کی بیوی کی غلط بیانی پر حضرت یوسفؑ کے زندان میں جانے کا ذکر کیا ہے اور طویل قرآنی واقعہ کو ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے بہشت کے عیش و آرام اور سکون کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، دیکھیے:

کجا ایں روزگارے شیشہ بازے!
بہشت ایں گنبدِ گرداں ندارد
ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او
زلیخایش دلِ نالاں ندارد[۳۶]

ترجمہ: کہاں یہ ذوفنوں دنیا (اور کہاں بہشت) جنت میں کوئی ایسا چرخِ گرداں (آسمان) نہیں۔
وہاں کے یوسفؑ نے قید خانے کی تکلیف نہیں دیکھی۔ نہ وہاں کی زلیخا کا دل فریاد کناں رہا۔

اقبال کہتے ہیں کہ کہاں یہ دنیا اور کہاں بہشت جس میں نہ عیاری ہے نہ مکاری ہے۔ وہاں کوئی شخص دوسرے سے ظالمانہ رویّہ نہیں رکھتا جو اس دنیا کے لوگ جائز سمجھتے ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں برادرانِ یوسفؑ کی سنگدلی اور سفا کی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے اور زلیخا کی یوسفؑ کے پیچھے رسوائی کی طرف بھی۔ یہاں اقبال کو داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے سورۂ یوسف کی تمام اہم جزئیات کو ایک شعر میں سمو کر پیش کر دیا ہے۔ بے شک یہ شعر بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے۔

قرآن پاک کے مطابق حضرت یوسفؑ ابھی قید میں ہی تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی پتلی گائیں ہیں۔ دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں۔ اور سات سرسبز بالیں ہیں، سات خشک اور خشک بالوں نے سبز کو کھا لیا۔ بادشاہ اس عجیب و غریب خواب سے سخت حیران ہوا۔ درباریوں کو اکٹھا کیا۔ خواب بیان کیا اور تعبیر چاہی لیکن کوئی بھی تعبیر نہ دے سکا۔ اسی اثنا میں ساقی (وہ قیدی جس نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ زنداں میں وقت گزارا تھا اور اب آزاد تھا) نے بادشاہ کی خدمت میں تعبیر لانے کی مہلت

مانگی۔ فوراً قید خانے پہنچا اور حضرت یوسفؑ کو بادشاہِ وقت کا خواب سنا کر تعبیر چاہی۔ حضرت یوسفؑ نے تعبیر بیان کی اور کہا کہ تم سات برس لگا تار کھیتی کرو گے اور یہ تمھاری خوشحالی کے سال ہوں گے۔ کھیتی کٹتے وقت سال بھر کی ضرورت کے لیے غلہ علیحدہ کر لینا اور باقی غلے کو گلنے سڑنے سے محفوظ رکھنے کے لیے یوں ہی بالوں میں رہنے دینا۔ اس کے بعد سات سال سخت مصیبت کے آئیں گے۔ تمام جمع شدہ ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ پانی خوب برسے گا۔ کھیت لہلہانے لگیں گے اور لوگ اس میں رس نچوڑیں گے۔[۳۷]

بادشاہ نے خواب کی تعبیر سنی تو یوسفؑ کے علم و دانش اور جلالتِ قدر کا قائل ہو گیا اور یوسفؑ کو دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ پیامبر کو بلانے بھیجا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کو قید خانہ میں ۷ یا ۹ یا ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ انھوں نے شاہی انداز میں تحقیقات کا مطالبہ پیش کیا۔ باہر آنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ جس تہمت کی وجہ سے بے عیب جیل میں ڈالے گئے اس کی حقیقت بادشاہ وقت اور عوام پر واضح ہو جائے۔ معاملہ کی تحقیق ہو اور صفائی سامنے آ جائے۔[۳۸]

بادشاہ نے یہ سُن کر سب عورتوں کو بلا کر واقعہ کی تحقیق کی تو عورتیں یک زباں ہو کر بولیں:

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ۝[۳۹]

ترجمہ: بولیں اللہ کو پاکی ہے ہم نے ان میں کوئی بدی نہیں پائی۔

ان عورتوں کے مجمع میں عزیز مصر کی بیوی بھی تھی۔ اُس نے جب یہ دیکھا کہ حضرت یوسفؑ کی خواہش ہے کہ حقیقتِ حال سامنے آ جائے تو بے اختیار گویا ہوئی۔

اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ز اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝[۴۰]

ترجمہ: بولی اب اصلی بات کُھل گئی۔ میں نے ان کا جی لبھانا چاہا تھا اور وہ بے شک سچے ہیں۔

عزیز مصر پر جب اصل حقیقت کُھل گئی تو اُس نے حضرت یوسفؑ کو اہم اور خاص امور کی ذمہ داریاں سونپنے کے لیے اپنے پاس بلایا۔ اُن کے اعلیٰ عادات و خصائل کی تعریف کی اور قحط سالی کے لیے تدابیر اختیار کرنے کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت یوسفؑ کے کہنے پر بادشاہ نے اُنھیں اپنی مملکت کا امین و کفیل مقرر کر دیا[۴۱] اور شاہی خزانوں کی کنجیاں بھی اُن کے حوالے کر دیں۔ کیونکہ عزیز مصر کے دل پر آپؐ کی امانت داری، سچائی، سلیقہ مندی اور کامل علم کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔[۴۲]

حفظ الرحمٰن سیوہاروی رقم طراز ہیں:

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے عطا و کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی۔ اس کو پہلے ایک گھر کا مختار، اُس کی نگاہوں میں محترم و معزز اور امین و فطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکت مصر کا مالک و مختار بنا دیا اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسباب دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا، یہ قادرِ مطلق کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے کہ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا۔ وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اس کے لیے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں اور حالات کی نامساعدت پر کاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔[۴۳]

اقبال پیامِ مشرق میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت[۴۴]

ترجمہ: یوسف کو قید خانہ سے نکال کر عہدۂ امارات عطا ہوا۔ زلیخا کی ساری کہانی اور جادوگری (بیچ میں سے نکل گئی۔

تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے۔ شاہِ مصر ریّان نے آپ کو سلطنت مصر کی وزارت دی۔ پہلے اِس عہدہ پر زلیخا کا شوہر تعینات تھا جو اب وفات پا چکا تھا۔ شاہِ مصر نے حضرت یوسفؑ کا نکاح اس خاتون سے کر دیا۔ تب حضرت یوسفؑ پر یہ حقیقت کھلی کہ زلیخا کا پہلا شوہر نامرد تھا۔ اس کے بطن سے آپ کے دو بیٹے افرائیم اور میشا پیدا ہوئے۔[۴۵]

حضرت یوسفؑ جب مختارِ کل بنے تو خواب سے متعلق تمام تدابیر اختیار کیں تا کہ رعایا قحط سالی کے دنوں میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے بچی رہے۔ حضرت یوسفؑ کی اختیار کردہ تدابیر کے متعلق قرآن خاموش ہے لیکن تورات نے ان تدابیر کی تفصیل بیان کی ہے۔[۴۶]

الغرض جب قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے اردگرد کے علاقے بھی اس کے زد میں آ گئے۔ صورت حال نازک ہونے پر حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ وہ بھی عزیز مصر کے اعلان سے فائدہ اُٹھائیں۔ اُس کے پاس جائیں اور محفوظ غلّہ خرید لائیں۔ باپ کے حکم پر بیٹے مصر گئے[۴۷] اور حضرت یوسف کے دربار میں پہنچے۔

قرآن پاک میں ہے:

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝[۴۸]

ترجمہ: اور یوسفؑ کے بھائی آئے تو اس کے پاس حاضر ہوئے۔ یوسفؑ نے اُنھیں پہچان لیا اور وہ اس سے انجان رہے۔

تورات کا بیان ہے کہ برادرانِ یوسفؑ پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا۔ اس سبب سے اُنھیں یوسفؑ کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ بات چیت کا موقع ملا۔[۴۹]

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو خوب کرید کرید کر اپنے حقیقی بھائی اور والد کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا اور بھائیوں کو غلّہ دے کر نصیحت کی کہ قحط کی شدت کی وجہ سے تمھیں دوبارہ یہاں غلّہ لینے آنا پڑے گا۔ اگر تم اپنے بھائی بن یمین کو نہ لائے تو غلّہ نہ ملے گا۔ جب وہ رُخصت ہونے لگے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے نوکروں کے ذریعے کجاووں میں وہ پیسے پر رکھوا دیے جو اُن کے بھائیوں نے غلّہ کی قیمت کے نام پر دیے تھے تا کہ جا کر پونجی دیکھیں تو پھر مصر لوٹیں۔ قافلہ نے کنعان پہنچ کر تمام داستان اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو سنائی اور بتایا کہ والئ مصر نے تاکید کی ہے کہ اگلی دفعہ تم اپنے بھائی بن یمین کو ساتھ لے کر آ ؤ گے تو غلّہ ملے گا۔ آپ اگلی مرتبہ اس کو ہمارے ساتھ بھیجیں۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا:

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓی اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝[۵۰]

ترجمہ: کہا کیا اس کے بارے میں تم پر ویسا ہی اعتبار کر لوں جیسا پہلے اس کے بھائی کے بارے میں کیا تھا تو اللہ سب سے بہتر نگہبان اور وہ ہر مہربان سے بڑھ کر مہربان ہے۔

بات چیت سے فارغ ہو کر بھائیوں نے سامان کھولا تو اُنھیں پتہ چلا کہ اُن کی رقم لوٹا دی گئی ہے۔ یہ دیکھ کر بھائی کہنے لگے ہمیں اور کیا چاہیے۔ اب ہمیں اجازت دیں کہ ہم دوبارہ بن یمین کے ساتھ جا کر زیادہ غلّہ لائیں۔ کیونکہ پہلے والا غلّہ تھوڑا ہے۔ اس پر حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں سے بن یمین کی حفاظت کا پختہ عہد لیا اور اُنھیں پھر مصر جانے کی اجازت دے دی۔ رخصت ہوتے ہوئے بیٹوں کو نصیحت فرمائی کہ سب ایک دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔[۵۱] اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے تمام بیٹے نہایت حسین وجمیل اور طاقتور تھے۔ لہٰذا حضرت یعقوبؑ کو بیٹوں کو نظر لگ جانے کا کھٹکا

تھا کہ نظر برحق ہے۔[۵۲] راستے میں بھائیوں نے بن یمین کو بھی باپ کی عشق و محبت کے طعنے دیے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے ہوئے ستایا کہ عزیز مصر نے خصوصیت کے ساتھ اُسے ہی کیوں بلایا ہے۔ تورات کے بیان کے مطابق مصر پہنچنے پر حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کی خاطر مدارات کی اور اُنھیں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا۔[۵۳] لیکن تنہائی میں بن یمین کو بتایا کہ میں تمھارا بھائی یوسفؑ ہوں۔ پس جو بدسلوکی یہ تمھارے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ تو اس پر غمگین نہ ہو۔[۵۴] پھر بھائیوں کو واپسی پر غلّہ لاد دیا لیکن اُن کی خواہش تھی کہ کسی طرح بن یمین کو روک لیں۔ اس کے لیے انھوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ قافلہ کی روانگی کے وقت اپنا چاندی کا پیالہ بغیر بتائے بن یمین کے کجاوہ میں لاد دیا۔ کنعان کے اس قافلہ کے روانہ ہونے کے بعد شاہی کارندوں نے پیالہ غائب پایا تو فوراً قافلہ کے پیچھے بھاگ اُٹھے اور چلائے۔ قافلہ والو! رُک جاؤ تم چور ہو، یوسفؑ کے بھائیوں نے متوجہ ہو کر کہا کہ بلا وجہ الزام نہ لگاؤ۔ کارندوں نے کہا بادشاہ کا پیالہ کھو گیا ہے اور چوری کی سزا یہ ہے کہ پیالے والا اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے۔ پیالہ بن یمین کی خورجی سے نکلا۔ یوں سزا کے طور پر بن یمین کو مصر میں قیدی بنا کر روک لیا گیا۔ بھائی پریشان ہوئے۔ باپ سے کیا وعدہ یاد آیا اور بن یمین کو واپس لینے کے لیے باہم مشورے کرنے لگے۔ حضرت یوسفؑ سے بن یمین کو واپس کرنے کی درخواست کی۔ لیکن جواب نفی میں پا کر باہمی مشورے سے بن یمین کے علاوہ ایک اور بھائی کو چھوڑا اور واپس آ کر حضرت یعقوبؑ کو بے کم و کاست مکمل واقعہ سُنایا۔ حضرت یعقوبؑ نے سارا واقعہ سُنا تو یقین نہ کیا اور اُن کی جانب سے رُخ پھیر لیا۔ حضرت یوسفؑ کے غم میں روتے روتے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں سپید پڑ گئیں اور غم سے سینہ جلنے لگا۔ مگر اللہ پہ تکیہ رکھا اور بیٹوں کو کہا کہ اللہ کی رحمت پر امید رکھیں۔ تیسری مرتبہ مصر جائیں اور یوسفؑ اور بن یمین کو تلاش کریں۔[۵۵] بھائی مصر گئے اور حضرت یوسفؑ سے اپنی معاشی پریشانی کا ذکر کیا۔ حضرت یوسفؑ سُن کر برداشت نہ کر سکے۔ دل بھر آیا اور فرمانے لگے تمھیں کچھ خبر ہے جو تم نے نادانی میں یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا۔ انھوں نے غور کیا تو دیکھا کہ مخاطب یوسفؑ ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اُن سے کہا کہ بے شک میں یوسفؑ اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا اور اللہ پرہیزگاروں، صبر کرنے والوں اور نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو معاف کر دیا اور کہا کہ میں اللہ کی درگاہ میں تمھاری خطا کی

معافی کے لیے دُعا کرتا ہوں کہ وہ تمھاری اس خطا کو معاف کردے۔ کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔اب تم کنعان میرا پیراہن لے کر جانا اور اسے والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ ان شاءاللہ ''بوئے یوسفؑ'' اُن کی آنکھیں روشن کردے گی اور تمام خاندان کو مصر لے کر آنا۔

برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ جونہی ''پیراہنِ یوسفؑ'' لے کر چلا تو حضرت یعقوبؑ کو بذریعہ وحی ''شمیمِ یوسفؑ'' پہنچ گئی۔ وہ فرمانے لگے کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔[۵۶] اس وقت حضرت یوسفؑ کو گُم ہوئے اسی سال گزر چکے تھے اور قافلہ کنعان سے اسی فرسخ دور تھا۔[۵۷]

قافلہ نے کنعان پہنچتے ہی حضرت یوسفؑ کے فرمان کے مطابق ''پیراہن'' یعقوبؑ کی آنکھوں پر ڈال دیا۔ یعقوبؑ کی آنکھیں فوراً روشن ہوگئیں۔[۵۸]

اقبال نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دورِاوّل کی غزل کے ایک شعر میں کہتے ہیں:

عشق یعقوب کا تو محرم اسرار تو ہو
پیرہن دے گا دِکھا تجھ کو پسر کی صورت[۵۹]

اور

نصیب خود ز بوے پیرہن گیر
بہ کنعاں نکہت از مصر و یمن گیر[۶۰]

ترجمہ: پیرہن کی خوشبو سے اپنا حصہ لے۔ کنعاں میں رہتے ہوئے مصر سے آنے والی خوشبو پالے۔
(جیسے یعقوبؑ نے کنعاں میں بیٹھے ہوئے قمیص یوسفؑ کی خوشبو پالی تھی)۔

حضرت یعقوبؑ اپنے خاندان کے ساتھ مصر گئے (تورات میں اس واقعہ کی تفصیلات ہیں)[۶۱] حضرت یوسفؑ کو اطلاع ملی کہ حضرت یعقوبؑ اپنے خاندان سمیت شہر کے نزدیک پہنچ گئے ہیں تو فوراً استقبال کے لیے گئے۔ مسرت افزا اور رِقت آمیز ملاقات کے بعد حضرت یوسفؑ اپنے والد اور تمام خاندان کو بڑی شان وشوکت سے ساتھ شہر شاہی محل لائے پھر دربار منعقد کیا تاکہ مصری خاندان سے تعارف حاصل کرسکیں۔ دربار منعقد ہونے کے بعد حضرت یوسفؑ کے حکم سے والدین کو تختِ شاہی پر جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان کو مراتب کے لحاظ سے نیچے جگہ ملی۔ حضرت یوسفؑ شاہی محل سے نکل کر شاہی تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو دستور کے مطابق سب تعظیمی سجدے میں گر پڑے۔ انھیں دیکھ کر تمام خاندانِ یوسفؑ نے بھی تعظیمی سجدہ کیا۔ تب

حضرت یوسفؑ کو اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا، قرآن حکیم نے اس کی تصویر کشی یوں کی ہے:

قَالَ یٰٓاَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ز قَدْ جَعَلَھَا رَبِّیْ حَقًّا ط [۶۲]

ترجمہ: یوسفؑ نے کہا اے میرے باپ یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے۔ بے شک اسے میرے رب نے سچا کیا۔

یہ سب عجیب وغریب واقعات اور قدرت کی کرشمہ سازیوں کے زبردست مظاہرے دیکھ کر حضرت یوسفؑ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے اور خدا تعالیٰ کے حضور مسلمان مرنے اور صالح بندوں میں داخل ہونے کی دُعا کی۔[۶۳]

تورات میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسفؑ کا تمام کنبہ مصر میں رہائش پزیر ہو گیا۔ بادشاہ نے انھیں کافی جاگیر بخش دی۔ اس طرح بنی اسرائیل مصر کی سرزمین میں آباد ہو گئے۔[۶۴]

حضرت یوسفؑ نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ مصر میں گزارا۔ آپؑ ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت یوسفؑ نے خاندان والوں سے عہد لیا کہ وفات کے بعد انھیں فلسطین میں دفنائیں۔ چنانچہ جب حضرت یوسفؑ وفات پا گئے تو اُن کو حنوط کر کے تابوت میں محفوظ کر دیا گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ کا زمانہ آیا اور بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اُس تابوت کو بھی ساتھ لے گئے اور آبا و اجداد کی سرزمین میں لے جا کر سپردِ خاک کر دیا۔[۶۵] حموی کہتے ہیں کہ یوسفؑ کی قبر فلسطین کے علاقہ نابلس کے ایک گاؤں بلاط میں ایک درخت کے نیچے ہے۔[۶۶]

حضرت یوسفؑ کی سیرت کا یہ عجیب وغریب قصہ اہلِ بصیرت کے لیے اپنی آغوش میں نہایت اہم پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ درحقیقت یہ ایک قصہ یا واقعہ نہیں بلکہ فضائل اخلاق کی ایک زرّیں کہانی ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے بھرپور ہے۔ یہ قوتِ ایمانی، استقامت، ضبطِ نفس، صبر و شکر، پاکیزگی، امانت و دیانت، عفو و درگزر، تبلیغ کے جذبے اور توحید کے پرچار سے عشق، اصلاحِ انسانیت اور تقویٰ جیسے اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک ایسا نایاب سلسلہ ہے جو اس داستان کے ہر نقش میں سمٹا نظر آتا ہے۔[۶۷]

اقبال نے ''یوسفیّت'' کے مذکورہ بالا تمام اوصاف اشعار میں سموئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ''یوسفیّت'' کو کئی اور حوالوں سے بھی لیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ''یوسفیّت'' صداقت، دیانت، وفا، رموزِ عاشقی، مستحکم خودی اور اس کے اسرار، اسلام کی عظمت رفتہ اور عروج سے عبارت ہے۔ اقبال کا یوسفیّت'' کے ان تمام پہلوؤں کو جداگانہ انداز سے پیش کرنا ایک

خاص مقصد کے تحت ہے اور وہ مقصد ہے افراد کو ان اوصاف سے مزین کرنے کی سعی جمیلہ کا جو حضرت یوسفؑ کی سیرت پاک کا حصہ تھے۔ اقبال کو اس دُنیا میں موجود انسان ان اوصاف سے تہی دین و ایمان فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔[۶۸] یہ سب یوسفیّت کے برعکس ہے۔ اسی لیے نظم تو ''رخصت اے بزمِ جہاں'' میں کہتے ہیں:

مدّتوں ڈھونڈا کیا نظّارۂ گُل، خار میں
آہ، وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں[۶۹]

اقبال نے ہمیشہ اسلاف کے کارناموں کو اہمیت دی ہے۔ اُن کے نزدیک یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے سیرت و کردار اور کارناموں کو تن آسان اُمّتِ مسلمہ کے سامنے پیش کر کے اُنھیں عمل پر اُبھارا جا سکتا ہے۔[۷۰] اور ان میں خوئے انقلاب کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ اقبال ''یوسفؑ'' کو اسلاف کی نمائندہ ہستی اور انقلابی عمل کی علامت کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ انقلاب کے لیے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جذبہ ولولۂ عشق ہی سے جنم لے سکتا ہے۔ ٹھنڈی حکمت اور مفاد کوشی کبھی بھی نظامِ حیات میں تبدیلی نہیں لا سکتی۔[۷۱] تبدیلی کے لیے یوسفیّت (رموز عاشقی) سے آگاہ ہونا اور اُن کی پیروی کرنا لازم ہے۔ یہی رموزِ عاشقی موجود ''یوسفوں'' کو فراعینِ وقت کی قید سے آزاد ہونے اور مسندِ اقتدار پر جلوہ گر ہونے میں ممدّ و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

اقبال نے ''یوسف'' کو موجودہ مسلم کے لیے استعارۃً بھی برتا ہے اور اس کے ذریعے مسلم کو غیرت دلائی ہے۔ خودداری کا پیغام دیا ہے اور دُنیا کے کمتر و ذلیل انسانوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ رزق کے حصول کے لیے دروازوں پر کھڑے ہونے کی بجائے جدوجہد کا سبق دیا ہے، وہ رموزِ بیخودی میں ''اللہ الصمد'' میں کہتے ہیں:

رزقِ خود را کفِ دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر[۷۲]

ترجمہ: رذیلوں کے ہاتھ سے رزق نہ لے تو یوسف ہے۔ اپنی قیمت کم نہ لگا۔

اس لحاظ سے دیکھیں تو اقبال کے نزدیک قرآنی اعلان کے مطابق ''یوسف'' وہ معزز و مکرم ہستی ہے جو ''احسنِ تقویم'' ہے۔ لہٰذا اس احسنِ تقویم ہستی کو خود کو کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نادانی و کم عقلی ہے[۷۳] موجودہ ''یوسف'' کو چاہیے کہ وہ بلند مقام حاصل کرنے کے

لیے حکمتِ عملی تیار کرکے اُس پر عمل پیرا ہونے کی منصوبہ بندی کرے اور فراعین زمانہ کے چنگل سے نکلنے کے لیے عملی جدوجہد کرے۔ اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ فراعین (انگریز حکمران) جوہر ناشناس ہیں۔ وہ نالائقوں اور نا اہلوں کو عزت و ثروت عطا کرتے ہیں اور اللہ کے نیک بندوں (مسلمانوں) کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ اُنھیں مبتلائے مصیبت کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے نیک بندے سگانِ دُنیا کی خوشامد کی بجائے اُن کی مذمت کرتے ہیں۔ اس لیے عتاب کا نشانہ بنتے ہیں۔[۴۷] لیکن اپنی خودی پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ اقبال تمام مسلمانوں کو خودی کی مخفی طاقتوں اور باطنی محاسن کا علم حاصل کرنے کے لیے اُکساتے ہیں۔ اور اس کے لیے "یوسف گم گشتہ" کا کنایہ استعمال کرتے ہیں۔

"نظم عبدالقادر کے نام" میں یوں گویا ہوتے ہیں:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں[۴۵]

اس نظم میں بظاہر عبدالقادر سے خطاب ہے لیکن درحقیقت تمام مسلمانوں کو مخاطب کرکے عمل پر اُکسایا ہے۔

"جلوۂ گم گشتہ" اور "تپش خونِ زلیخا" اقبال کے نزدیک اہم ہیں۔ خونِ زلیخا کی گرمی بھی ان کی گرم شاعری سے کافی مناسب رکھتی ہے[۴۶]۔ اقبال کی موجودہ مسلم کو مضبوط خودی کا حامل دیکھنے کی خواہش حضرت علی ہجویری کی اُس نصیحت سے مشابہ ہے جو اُنھوں نے اپنے مخاطب "مرو" کے نوجوان کو کی تھی۔ اقبال نے اپنی اس خواہش کا اظہار اسرار خودی کے مبحث یازدہم میں کیا ہے۔ اس فصل میں اقبال نے اس نوجوان کی حکایت بیان کی ہے جو مرو سے چل کر حضرت سید علی ہجویری کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تھا اور عرض کی تھی کہ میں دُشمنوں میں پھنس گیا ہوں۔ ان حالات میں مجھے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایئے۔ یہ سن کر حضرت سید علی ہجویری نے فرمایا کہ دشمنوں کے خوف کو اپنے دل سے ختم کرو اور اپنی ذات میں موجود خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا انتظام کرو۔ دیکھو! اگر تم نے اپنے آپ کو کمزور، ناتواں اور ضعیف سمجھنا شروع کرلیا تو آہستہ آہستہ ایسے ہی ہو جاؤ گے۔ کیونکہ جو رہرو اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے

قدرت کا قانون ہے کہ اس کے قلب سے مدافعت اور مقابلہ کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور لوٹنے والا بڑی آسانی سے اس پر غالب آ جاتا ہے۔ اس لیے تو اپنے آپ کو آب و گل کا مرکب نہ جان۔ اپنے اندر پوشیدہ شعلۂ طور کو نمایاں کرتا کہ دُنیا کے سامنے سر بسجود ہو سکے۔ تو دُشمن کو دُشمن نہ جان۔ ایک رنگ میں وہ تیرا دوست ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت تیری چھپی صلاحیتیں بروئے کار آ سکتی ہیں۔ دُشمن ہی تو ممکنات زندگی کے اظہار کی صورت ہے۔ اے نوجوان! ہمت سے کام لے۔ راستے کا پتھر پانی کی طرح تیرے سامنے سے دور ہو جائے گا۔ یاد رکھ! خورد و نوش اور سونا جانوروں کی زندگی ہے نہ کہ انسان کی۔ وہ انسان جو کمزور خودی کا مالک ہو اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اگر تو خودی کو مستحکم کر لے تو دُشمن کی کیا حقیقت و حیثیت ہے تو ساری دُنیا کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اللہ کے فضل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اے نوجوان خودی کی حفاظت سے غافل انسان کا انجام فنا ہے۔ بقا خودی کے استحکام میں مضمر ہے اور موت خودی سے غافل ہونے کا نام ہے۔ اسی لیے اقبال اُمت مسلمہ کے افراد کو نصیحت کرتے ہیں کہ خودی میں حضرت یوسفؑ کا سا مقام حاصل کر لیں اور اسیری سے شہنشاہی تک پہنچ جائیں: [۶۷]

در خودی کن صورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شہنشاہی خرام
از خودی اندیش و مردِ کار شو
مردِ حق شو حاملِ اسرار شو[۶۷]

ترجمہ: یوسف کی طرح خود شناس ہو تاکہ تو اسیری سے شہنشاہی تک پہنچے۔
خودی سے آگاہ ہو کر باہمت بن جا۔ مردِ حق اور حاصل اسرار ہو جا۔

اسرار خودی کی تمہید میں اقبال نے اپنے کلام کو ایسا یوسف قرار دیا ہے جو موجودہ دور کے لوگوں (ایں بازار) میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امید اور یقین کا اظہار بھی ہے کہ آئندہ زمانے میں اُن کے کلام سے استفادہ کرنے والے ضرور پیدا ہوں گے۔ وہ اسرار خودی میں ''تمہید'' میں کہتے ہیں:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست[۶۸]

ترجمہ: میں ایسا نغمہ ہوں جو مضراب سے بے نیاز ہے، میں آنے والے دور کا شاعر ہوں۔
میرا دور اسرار کو نہیں سمجھتا، میرا یوسفؑ اس بازار کے لائق نہیں۔

اقبال کا یہ کہنا سچ ثابت ہوا ہے۔ آج عرب و عجم اُن کے کلام سے مستفید ہو رہا ہے۔
اقبال نے ''یوسفیّت'' کے حوالے سے ایک اور نکتہ سمجھایا ہے کہ مسلمان قوم کسی خاص نسل یا وطن سے وابستہ نہیں اور نہ ہی کسی خاص ملک میں محدود ہے اگر وہ ملک تباہ ہو جائے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ لیکن یہ ساری دُنیا مسلمان کا وطن ہے۔ نہ اسلام محدود ہے اور نہ ہی مسلمان۔ اس لیے وہ دونوں کو اس دنیا سے مٹانا ناممکن ہے۔ دیکھیے یوسف کے بھائیوں نے اُن کو مٹانے کی کتنی کوشش کی لیکن حق مٹ نہ سکا بلکہ دیارِ غیر میں مضبوط خودی کا حامل بن کر اُبھرا۔ اقبال اپنے کلام میں ''یوسف'' کی تلمیح استعمال کرتے ہیں اور موجودہ مسلمان کو اپنی ذات کو یوسفؑ کے رنگ میں رنگنے کی ترغیب دیتے ہیں تو صرف اور صرف اس لیے کہ وہ موجودہ مسلم کو مضبوط و طاقتور خودی کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ خودی مخالفتوں کے تھپیڑے سہنے کے بعد مضبوط سے مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ درحقیقت اقبال کے زمانہ میں مسلمان فراعینِ وقت کے ہاتھوں مصائب کا شکار غلامی کی زنجیروں میں جکڑے زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی خودی سے آشنا نہ تھے اور اقبال چاہتے تھے کہ وہ آزاد ہو جائیں۔ غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اس کے لیے اقبال کو نمائندہ نمونہ ہستی حضرت یوسفؑ کی ذات پاک میں ملی اور انھوں نے اسے مثال کے لیے اُمت مسلمہ کے سامنے رکھ دیا تا کہ وہ اس پاک ہستی کی حیات کے واقعات سے سبق سیکھیں۔ یقیناً وہ دن دور نہیں جب وہ یوسفؑ کی طرح حکمران بن جائیں گے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱ حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۸ھ، ص:۲۸۰
۲- بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج:۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۷۹ء، ص:۸۱۷، ۸۱۸
۳- امیر علی، مولانا، مواہب الرحمن ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص:۳۶۴۵

۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) ج:۱-۲ حصہ اوّل، ص:۲۸۱
۵- یوسف:۱۲، آیت:۱-۵
۶- تورات، عہد عتیق، تکوین، باب، ۱۱، آیت ۵، ۱۱
۷- یوسف:۱۲، آیت ٦
۸- اصفہانی عمادالدین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، نشریات کتاب فروشی اسلام، تہران، چاپ بیست وپنجم، ۱۳٦۰ھ، ص:۳۸۲
۹- یوسف:۱۲، آیت ۱۲۔ اس جگہ تورات کا بیان ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خود یوسف کو کھیلنے کے اور سیر کرنے کے لیے بھائیوں کے ساتھ بھیجا دیکھیے: تورات، عہد عتیق، تکوین باب:۳۷، آیت ۱۳، ۱۴
۱۰- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج ۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۴۰۲ھ، ص ۴۱۵، نیز دیکھیے: امیر علی، مولوی، مواہب الرحمن، ج:۴، ص:۳٦۳۳
۱۱- ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا ءعمادالدین، البدایہ و النہایہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ج:۱، حصہ اوّل، ۱۹۸۷ء، ص:۲۴۷
۱۲- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۳۸۷
۱۳- موسوی، سید محمد باقر غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء، کتاب فروشی صدوق، طہران، سن ندارد، ص:٦٦٦
۱۴- امیر علی، مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۴، ص:۳٦۲۴، ۳٦۳۴، ۳٦۳۵
۱۵- یوسف:۱۲، آیت ۱۷
۱٦- محمد اقبال، ڈاکٹر، مثنوی پس چه باید کرد اے اقوام شرق، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز بارِ ششم، ۱۹۹۰ء، ص:۸۰۴/۸
۱۷- شفیع، مولانا مفتی، معارف القرآن، ج:۵، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص:۳٦
۱۸- تورات، عہد عتیق، تکوین، ۳۷، آیت ۲۷، ۲۸
۱۹- یوسف:۱۲، آیت:۱۹
۲۰- ابنِ کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا ءعمادالدین، البدایہ و النہایہ نے، ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص:۲۴۸ اور عمادالدین حسین نے قصص الانبیاء، میں ص ۳۹٦ پر تحریر کیا ہے کہ ایک دینار اور ۲٦۰ فلس میں بکے یا ۱۸۰ ریال میں بکے
۲۱- یوسف:۱۲، آیت:۲۰
۲۲- موسوی، سید محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخِ انبیاء، ج:۱-۲، ص ۳۸۷
۲۳- یوسف:۱۲، آیت:۲۳
۲۴- ایضاً، آیت ۲۰-۲۹
۲۵- ایضاً، آیت ۳۱، ۳۲

۲۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی ص: ۱۶۹/۳۳۹
۲۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۳۲/۱۳۲
۲۸- یوسف: ۱۲، آیت ۳۲، ۳۳
۲۹- شفیع، مولانا مفتی، معارف القرآن، ج: ۵، ص ۶۷ پر اور سید محمد باقر مولوی اور علی اکبر غفاری نے ایک کتاب تاریخ انبیاء میں صفحہ ۶۶۲ پر قید کی مدت ۷ سال بیان کی ہے
۳۰- امیر علی، مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج: ۴، ص ۳۶۵۰ نیز دیکھیے سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج: ۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۳۰۵
۳۱- حوالہ مذکورہ بالا، ص: ۳۰۵
۳۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۲۸/۵۲۰
۳۳- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج: ۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بیست ودوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۴۰۰
۳۴- تورات، عہد عتیق، تکوین، باب: ۳۹، آیت ۲۳
۳۵- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلشنگ ہاوس، لاہور، سن ندارد، ص ۳۷۲
۳۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۳۱/۳۰۱
۳۷- یوسف: ۱۲، آیت ۴۳-۴۹۔ تورات میں بھی اس واقعہ کی تفصیلات ملتی ہیں دیکھیے، تورات، عہد عتیق، تکوین، باب: ۴۱، آیت ۴۶، ۴۹، ۵۳، ۵۷
۳۸- شفیع، مولانا مفتی، معارف القرآن، ج: ۵، ص ۷۰، ۸۰۔ نیز دیکھیے کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج: ۳، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۳۹۹، ص ۴۳۵
۳۹- یوسف: ۱۲، آیت: ۵۱
۴۰- ایضاً
۴۱- ایضاً، آیت ۵۴، ۵۵۔ تورات میں بھی مذکور ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو مختارِ کل بنا دیا تھا دیکھیے، عہد عتیق، تکوین، باب ۴۱، آیت: ۳۷-۴۴
۴۲- ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج: ۳، پ ۱۳، نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ کراچی، سن ندارد، ص: ۳
۴۳- سیوہاروی، مولانا حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج: ۱-۲ حصہ اوّل، ص: ۳۱۲
۴۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی ص: ۹۱/۳۶۱
۴۵- ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج: ۳، پ ۱۳، ص ۳۔ نیز دیکھیے: اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج: ۱-۲، ص: ۶۲۹
۴۶- تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، عہد عتیق، تکوین، باب ۴۱، آیت ۶۴، ۴۹، ۵۳، ۵۷، باب ۴۲، آیت: ۱، ۲
۴۷- ایضاً باب: ۴۲، آیت ۱-۴

۴۸- یوسف:۱۲،آیت:۵۸
۴۹- تورات،عہدعتیق،تکوین،باب:۴۲،آیت:۱۴،۱۵
۵۰- یوسف:۱۲،آیت:۶۴
۵۱- ایضاً،آیت:۶۵،۶۶،۶۷
۵۲- تفسیر ابنِ کثیر،ج:۳،پ۱۳،ص:۶
۵۳- تورات،تکوین،باب:۴۳،آیت:۱۸،۳۲،۳۳
۵۴- یوسف:۱۲،آیت:۶۹
۵۵- یوسف:۱۲،آیت:۶۹-۸۷
۵۶- ایضاً،آیت:۸۹،۹۰،۹۱،۹۴
۵۷- ابن کثیر،اسماعیل ابوالفدا ءعمادالدین،تفسیر ابن کثیر،ج:۳،پ:۱۳،ص:۱۳
۵۸- یوسف:۱۲،آیت:۹۶
۵۹- سید عبدالواحد،معینی (مرتب)،ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی،باقیاتِ اقبال،آئینہ ادب،لاہور بار سوم، ۱۹۷۸ء،ص:۴۱۴
۶۰- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی،ص۵۴۵/۱۵۳
۶۱- تورات،عہدعتیق،تکوین،باب:۴۵،آیت:۱۶،۲۰۔باب:۱۴،آیت:۷،۲۷
۶۲- یوسف:۱۲،آیت:۱۰۰
۶۳- ایضاً،آیت:۱۰۱
۶۴- تورات،عہدعتیق،تکوین،باب:۴۶،آیت:۱۶-۱۹،۳۳،۳۴۔
۶۵- تورات، عہدعتیق،تکوین، باب:۵۰،آیت:۲۲-۲۶،خروج:باب:۱۳،آیت:۱۹۔بعض مفسرین نے آپ کی عمر ۱۲۰ سال بھی بیان کی ہے، دیکھیے،نعیمی،مفتی احمد یار خان،تفسیر نعیمی، ج:۷،مکتبہ اسلامیہ گجرات،۱۳۸۷ء،ص:۶۵۴۔سیوطی،علامہ جلال الدین،الاتقان فی علوم القرآن،ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور،۱۹۸۲ء،ص: ۳۴۔وحید الزماں، علامہ نواب، تبویب القرآن، ج:۱، خالد احسان پبلشرز،لاہور،۱۹۸۳ء،ص:۱۹۶
۶۶- سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن (اردو)،ج:۱-۲ حصہ اوّل،ص:۳۳۶
۶۷- ایضاً،ص:۳۳۷
۶۸- چشتی،پروفیسر یوسف سلیم،شرح بانگِ درا،ص:۲۳۱
۶۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۶۴/۶۴
۷۰- چشتی،پروفیسر یوسف سلیم،شرح رموزِ بے خودی،ص:۴۳۔
۷۱- عبدالحکیم،ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال،بزمِ اقبال،لاہور،بارپنجم ۱۹۸۳ء،ص:۱۳۷

۷۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۵۸/۱۵۸
۷۳- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموزِ بے خودی، ص: ۲۹۵
۷۴- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح زبورِ عجم، ص: ۲۱۵
۷۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۱۳۲/۱۳۲
۷۶- ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ۲۴۸
۷۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۵۳/۵۳
۷۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۶/۶

☆☆☆☆

حضرت شعیب علیہ السلام

علامہ اقبال کے نزدیک ملّتِ اسلامیہ کے افراد کی عملی تربیت و رہنمائی کے لیے انبیاء کرامؑ کے منتخب نمونوں میں سے ایک نمونہ حضرت شعیبؑ کا ہے، جو شکوہ، ہیبت وجلال کے ساتھ ساتھ درویشانہ صفات، خود شناسی، حق گوئی، حق آگاہی، فصاحت و بلاغت، حسن خطابت، لسانی طاقت، شیریں کلامی، جرأت و بے باکی اور بے مثال رہنمائی وغیرہ کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔

انسانی زندگی کی یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ جس ہنر یا علم سے واقفیت نہیں رکھتا اس کے لیے کسی ہنر کے ماہر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تا کہ اس کی راہنمائی میں وہ کمال حاصل کرنے کے بعد گوہرِ مقصود پالے۔ ایسے ہی روحانی زندگی میں بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی مرشد یا مردِ کامل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اپنی بصیرت سے انسان کی رہنمائی کر کے اُسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔[۱]

علامہ اقبال اپنی شاعری میں ''مرشدِ کامل'' اور اُس کی تلاش کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا نظریہ ہے کہ ان مردانِ خدا کے کمیاب ہونے کے باوجود ان کی تلاش وصحبت کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے کیونکہ ان کی صحبت انسانیت کے حق میں ''نسیم صبح'' کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اہل دُنیا پر حقائق کے انکشاف، اُن کی روحانی تربیت و رہنمائی اور شخصیت کی تشکیل وتعمیر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ مرشدِ کامل کی صحبت ہی دُنیا میں رونق و رنگینی کا سبب ہے۔ اگر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے تو ''باغ معنی'' آن کی آن میں اپنی بہار کھو دے۔ خزاں کو مقدر بنا کر ویرانے سجا لے۔ یہ مرشدِ کامل اقبال کے ہاں حضرت شعیبؑ کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، دیکھیے:

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے[۲]

''شعیبؑ'' اور ''کلیمی'' کی آپس میں کیا نسبت ہے۔ علامہ نے ''کلیمی'' کو ''شعیبیت'' سے کیوں منسلک کیا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے حیات شعیبؑ کی طرف رجوع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آیئے حضرت شعیبؑ کی پاک زندگی کی تفصیلات کا جائزہ لیں:

''خطیبُ الانبیاء'' حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۃ الاعراف، ہود، اور شعراء میں تفصیل سے اور سورۂ حجر اور عنکبوت میں مختصر طور پر ملتا ہے۔ ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیبؑ کا نام گیارہ جگہ مذکور ہے۔

حضرت شعیبؑ مدین یا مدیان میں مبعوث کیے گئے۔ یہ ایک شہر بھی ہے اور قبیلہ بھی جو معان کے قریب واقع ہے۔ قوم لوطؑ بھی اُن سے قریب تھی۔ حضرت شعیبؑ کے مبعوث ہونے کے بعد یہ قبیلہ ''قوم شعیبؑ'' کے نام سے جانا جانے لگا۔ چونکہ آپ اسی قبیلے اور نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے قرآن پاک میں آپ کو اہل مدین کا بھائی کہا گیا۔ درست بھی یہی ہے کہ ''مدین'' اور اصحاب ایکہ'' ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت کے سبب مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافیائی حالت کی وجہ سے ''اصحاب ایکہ'' کے لقب سے بھی جانا گیا۔ سید عابد علی عابد نے تلمیحاتِ اقبال اور اکبر حسین قریشی نے تلمیحات و ارشارات اقبال میں حفظ الرحمٰن سوہاروی کی تائید کی ہے۔

یہ مدین قبیلہ مدین بن مدیان بن ابراہیم خلیلؑ کی نسل سے تھا۔ حضرت شعیبؑ ان کے نبی تھے۔ اُن کے سلسلہ نسب میں اختلاف ہے۔ تورات میں یترو اور حوباب، سریانی میں یترون یا یثرون اور عربی میں شعیب بن یشخر ابن لاوی بن یعقوب کہا جاتا ہے۔ شعیب بن نویب بن عیفا یا عیا بن مدین بن ابراہیمؑ اور شعیبؑ بن صیفور یا صیفون بن عیقا یا ایقا بن ثابت بن مدین ابراہیمؑ ۔شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیمؑ اور شعیبؑ بن منویت بن رعویل بن مدین، عنقا بن مدین بن ابراہیمؑ۔[۳]

آپؑ کو حضرت موسیٰؑ کا خسر بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ اور مدین کے شیخ کے بارے میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اُن میں سے کسی جگہ بھی اس شیخ کے نام کا ذکر نہیں آیا۔ شیخ مدین کے نام میں مؤرخین و مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مفسرین، اصحاب سیر اور عرب کے ادبا کے ایک بڑے گروہ کا خیال ہے کہ یہ حضرت شعیبؑ ہیں۔

۲- حافظ عماد الدین ابن کثیر کا بیان ہے کہ حسن بصری بھی اس طرف مائل ہیں کہ صاحب موسیٰؑ حضرت شعیبؑ ہیں۔

۳- ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ صاحب موسیٰؑ حضرت شعیبؑ نہیں بلکہ اُن کے بھتیجے یثرون تھے۔ بعض کے مطابق صاحب موسیٰؑ کا نام ''یثری'' تھا تورات میں بھی اسی سے ملتا جلتا نام یثرو بتایا گیا ہے۔

۴- بعض کے نزدیک حضرت شعیبؑ کی قوم کے مردِ مومن تھے۔

۵- ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ بزرگ ''شیخ'' نہ تو حضرت شعیبؑ ہو سکتے ہیں اور نہ اُن کے بھتیجے۔ اس لیے کہ قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے کا ہے۔ جس کے درمیان کئی سو سال حائل ہیں۔ قرآن پاک میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنْكُم بِبَعِيدٍ اور قوم لوطؑ (کا معاملہ) تمھارے سے کچھ دور نہیں ہے۔

قوم لوطؑ کی ہلاکت کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ہے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا درمیانی زمانہ تقریباً چار سو سال بیان کیا جاتا ہے جیسا کہ اکثر مؤرخین سے منقول ہے۔ جن لوگوں نے اس مدت کو نزدیک کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی عمر بڑی طویل تھی۔ ان کا یہ دعویٰ بغیر دلیل کے ہے۔

اس قول کی تائید کے لیے یہ دلیل بھی پرزور ہے کہ اگر ''صاحب موسیٰؑ'' یہی حضرت شعیبؑ ہوتے تو قرآنِ پاک ضرور اُن کے نام کی وضاحت کرتا۔ ہاں بعض احادیث میں ''شیخ'' سے مراد حضرت شعیبؑ بیان کیا گیا ہے لیکن ابنِ کثیر نے کہا ہے کہ ان احادیث کی سندیں درست نہیں ہیں۔[۴]

ان پانچ مختلف اقوال کو نقل کرنے کے بعد بہترین مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو صاحبِ ابن کثیر نے اختیار کیا ہے کہ نام کی تصریح کے بارے میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی۔ اس لیے جس طرح وضاحت کیے بغیر قرآنِ پاک نے ذکر کیا ہے اس معاملے میں سکوت بہتر ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد کلام اقبال میں حضرت شعیبؑ پر کہے گئے اشعار کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ نے اسی ضعیف روایت کو بنیاد بنا کر شعر کہے ہیں جس کے مطابق مشہور ہے کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت شعیبؑ کی صحبت میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں علامہ اقبال کا مطالعہ گہرا نہ تھا یا بالواسطہ تھا۔ اس لیے وہ حقیقت نہ جان سکے اور

انھوں نے سنی سنائی مشہور بات کو شعر کا رنگ دے دیا۔ بصورتِ دیگر تو یقیناً ''شعیبؑ'' اور ''کلیمی'' کی تلمیحی نمائندہ اصطلاح کسی اور روپ اور انداز میں کلام میں جلوہ گر ہوتی اور اقبال اس سے اُمت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے کچھ اور کام لیتے۔ لیکن کلام اقبال میں حضرت شعیبؑ پر جو دو اشعار ملتے ہیں وہ ''شعیبؑ و کلیمؑ'' کے حوالے ہی سے ہیں جو ناقص معلومات کی بنیاد پر بغیر تحقیق کے شعری رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ دیگر محققین اقبال نے بھی اس پہلو پر تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی اور علامہ اقبال کی اسی غلط منظوم روایت کی توضیح کرتے چلے آ رہے ہیں۔[۵] ہمیں اس نقطۂ نظر سے نظم و نثر کے ماخذات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

حضرت شعیبؑ کے نام پر مختلف اقوال ہیں۔ کہا جاتا ہے شعیب عربی نام ہے ہوسکتا ہے یہ شعیب کی تصغیر ہو یا اشعب (بہت چوڑے سینے والا) کی جیسے اہل عرب اسود کی تصغیر میں سوید کہتے ہیں بعض کے مطابق شعیب یا تو شَعْبٌ، مصدر کی تصغیر ہے (جس کا مطلب فراہم کرنا اور پراگندہ کرنا ہے) اور یا شَعْبٌ اسم کی۔ (جس کا مطلب پہاڑ کی گھاٹی کے ہیں) بعض کہتے ہیں کہ نبی کوئی بھی ہو اُس کے نام کی تصغیر جائز نہیں ہے لیکن یہ امر قابل بحث ہے کیونکہ یہ سب نام وضع ہو جانے کے بعد کی بحث ہے نہ کہ نام رکھتے وقت کی۔ علاوہ ازیں مختار یہ ہے کہ یہ مرتجل نام ہے اور اسی طرح اس کی وضع عمل میں آئی ہے۔[۶] لیکن مفتی احمد یار نعیمی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات کے مطابق شعیبؑ پہاڑ پر چڑھنا چاہتے تو پہاڑ خود بخود جھک جاتا اور آپ آسانی سے پہاڑ پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ اغلب امکان یہ ہے کہ اسی سے آپ کا نام شعیبؑ ہوا ہوگا۔ یعنی پہاڑی راستوں کے بادشاہ۔ واللہ اعلم۔[۷]

الغرض حضرت شعیبؑ جب اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی صرف گنتی کے افراد تک محدود نہیں بلکہ تمام قوم اس کا شکار ہے اور بداعمالیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُس کے افعال و اعمال معصیت و نافرمانی اور گناہ کے زمرے میں آتے ہیں بلکہ ان اعمال کو وہ اپنے لیے باعث افتخار و امتیاز سمجھتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم توحید و رسالت اور حقوق العباد کی منکر[۸] اور (ناپ تول میں کمی کی عادی تھی۔ ناپ تول کی کمی سے اصل مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا جو حق کسی دوسرے شخص کے ذمہ ہو وہ اس کو پورا ادا نہ کرے بلکہ اس میں کمی کر دے۔ چاہے وہ ناپ تول کی شے ہو یا کسی دوسری طرح کی۔ مقررہ کام میں کوتاہی یا کمی کرنے والا تطفیف کا مجرم ہوتا ہے۔[۹]

قوم شعیبؑ کی ایک بدخصلت یہ تھی کہ جب کوئی بیوپاری اناج لے کر آتا تو بڑھتی پیمانہ سے لیتے یا تول کی شے میں بڑھتی باٹوں سے رواج ظاہر کر دیتے۔ جب خود فروخت کرنا ہوتا تو چھوٹے پیمانے اور کم باٹ سے دیتے۔[10] احمد یار نعیمی لکھتے ہیں کہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ مدین والوں نے دو قسم کے ترازو اور پیمانے بنا رکھے تھے۔ چھوٹے دینے کے لیے اور بڑے لینے کے لیے۔ گاہکوں کو چیز دینے کے لیے چھوٹے پیمانے نکالتے اور خریدنے کے لیے بڑے بھاری۔ باہمی مشورے سے خریدتے وقت ساری منڈی کا بھاؤ گرا دیتے اور بیچتے وقت باہمی مشورے سے ساری منڈی کا بھاؤ بڑھا لیتے۔[11] اس طرح سے وہ لوگوں کا حق مارنے کے عادی تھے۔ ناپ تول میں کمی کے علاوہ قوم شعیب میں ایک اور عادت بھی موجود تھی۔ وہ ملک میں رائج سکوں سے درہم و دینار کے کنارے کاٹ لیتے۔ سونا چاندی بچانے کے بعد کٹے ہوئے سکے پوری قیمت میں چلاتے۔[12] علاوہ ازیں اپنے گاہکوں کو اس انداز میں بھی دھوکہ دیتے کہ ان کا صحیح سکہ لے کر کھوٹا واپس کر کے کہتے کہ تو نے یہی دیا ہے یا پھر گنتی میں فرق ڈال دیتے مثلاً دس کے نو یا آٹھ گن کر کہتے کہ اتنے ہی دیے ہیں۔ گاہکوں کو ستھرا مال دکھا کر گھٹیا مال دیا کرتے۔[13]

یہ حقیقت ہے کہ زمین کی ظاہری اصلاح و بھلائی ہر شے کو اُس کے مصرف پر خرچ کرنے اور حدود کی رعایت کرنے اور عدل قائم رکھنے پر ہے اور باطنی اصلاح اللہ کی ذات سے تعلق اور اُس کے احکامات کی اطاعت و پیروی پر منحصر ہے۔ اسی طرح زمین کا ظاہری و باطنی فساد ان اصولوں کو خیر باد کہنے سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم نے ان تمام اصولوں کو نظر انداز کیا ہوا تھا۔ جس کے سبب سے زمین پر ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پھیلا ہوا تھا۔[14] ظاہراً یہ لوگ بہت خوش باش، دولت مند اور زرخیز زمین اور باغات رکھتے تھے۔ اس وجہ سے از حد مغرور تھے۔ وہ تمام افعال و امور کو اپنی ذاتی جائیداد اور خاندانی ہنر گردانتے تھے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوچتے تھے کہ یہ عطائے ربی ہے کسی وقت بھی چھن سکتی ہے۔ ہر وقت اس اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور نافرمانی و معصیت سے دور رہنا چاہیے۔ اس کے برعکس فارغ البالی اور خوشحالی نے ان میں مختلف قسم کی بداخلاقیاں اور عیوب پیدا کر دیے تھے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے خطاب کیا جس کا ذکر قرآن پاک میں یوں آتا ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَo وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَتَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ کُنۡتُمۡ قَلِیۡلًا فَکَثَّرَکُمۡ ۪ وَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَo وَاِنۡ کَانَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡکُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ وَ طَآئِفَۃٌ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ بَیۡنَنَا ۚ وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَo[۱۵]

ترجمہ: اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے روشن دلیل آئی تو ناپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں انتظام کے بعد فساد نہ پھیلاؤ یہ تمھارا بھلا ہے اگر ایمان لاؤ اور ہر راستہ پر یوں نہ بیٹھو کہ راہگیروں کو ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے انھیں روکو۔ جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی چاہو اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اس نے تمھیں بڑھا دیا اور دیکھو فسادیوں کا کیسا انجام ہوا اور اگر تم میں ایک گروہ اس پر ایمان لایا جو میں دے کر بھیجا گیا ایک گروہ نے نہ مانا تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ ہم میں فیصلہ کرے اور اللہ کا فیصلہ سب سے بہتر ہے۔

ان آیات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کی اصلاح و درستی کے لیے کچھ باتوں کا حکم دیا۔ ایک اللہ کی عبادت کا کہ اُس کے سوا کوئی بھی معبود بننے کے قابل نہیں۔ یہ وہی دعوتِ توحید ہے جو تمام انبیاء کرامؑ دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد اور اعمال کی روح ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ یہ لوگ مشرک تھے اور حقوق اللہ سے غافل، اس لیے اُن کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا۔

دوسرے معاملاتی کاروبار میں ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے ناپ تول درست رکھو لوگوں کی اشیا میں کمی سے اُنھیں نقصان مت پہنچاؤ۔ دوسروں کے مال میں خیانت ہرگز نہ کرو۔ ناپ تول میں چوری سے چیز میں کمی سے دوسرے کو فریب نہ دو۔ تَبۡخَسُوا النَّاسَ، اَشۡیَآءَ ہُمۡ فرما کر ہر قسم کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عمومیت دے دی۔ خواہ وہ مال کے بدلے میں ہو یا عزت و آبرو یا کسی دوسرے شے کے بارے میں۔[۱۶]

تیسرے فرمایا کہ زمین کی درستی کے بعد اُس میں فساد مت پھیلاؤ۔ حالانکہ اللہ نے تمھاری بہتری کے تمام سامان مہیّا کر دیے ہیں اور یہی تمھارے لیے نفع بخش اور بہتر ہے اگر تم ان ناجائز حرکات سے منع ہو جاؤ تو دین و دُنیا کی بھلائی و بہتری اسی میں ہے۔

چوتھے فرمایا کہ راستوں سڑکوں پر نہ بیٹھا کرو کہ آنے جانے والوں کو ڈرا دھمکا کر مال چھین

لو اور مال نہ دینے والوں کو قتل کی دھمکیاں دینے لگو اور راہ حق کی طرف آنے والوں کو روکو۔

پانچویں اُنھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت یاد کروائی کہ اللہ نے تمھیں کم تعداد سے بڑھا کر وسیع نسل وقوم بنایا۔ کم مال و دولت کو زیادتی میں بدلا پھر فرمایا کہ پہلی فساد کرنے والی قوموں کے انجام پر نظر ڈال لو کہ اُن کو کس عذاب اور نکال کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر تم میں سے ایک گروہ میری دعوت پر ایمان لاتا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لاتا تو صبر سے کام لو۔ حتّٰی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمھارے درمیان اپنا فیصلہ صادر کر دے کہ وہی سب سے اچھا حاکم اور قاضی ہے۔[۱۷]

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ فصیح و بلیغ الفاظ میں گفتگو کرنے والے، شیریں کلام حُسنِ خطابت، طرزِ بیان اور لسانی طاقت میں نمایاں شان و امتیاز کے مالک تھے۔[۱۸] پند و نصائح کے لیے استعارہ، کنایہ یا صیغۂ تعمیم استعمال کرتے تھے۔[۱۹] عبدالرشید نعمانی لکھتے ہیں:

''کہ آپ نے جس اسلوب سے اپنی قوم کے سامنے حق کی دعوت پیش کی اور پھر اس بارے میں آپس میں سوال و جواب کا جو سلسلہ ہوا اس کے لفظ لفظ سے فصاحت و بلاغت اور حسن خطاب کے نایاب جواہر ریزے نظر آتے ہیں۔''[۲۰] آپؑ نے اپنی قوم کے ایک لاکھ افراد کے مجمع سے خطاب کیا۔ ان میں چالیس ہزار فجار و کفار تھے اور ساٹھ ہزار نیک افراد تھے۔[۲۱] آپؑ کے اسی نمایاں شانِ خطابت کی وجہ سے مفسرین آپؑ کو ''خطیب الانبیاء'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شعیبؑ ہی وہ پہلے نبی ہیں جنھوں نے ناپ تول کے لیے پیمانہ یا ترازو ایجاد کیا۔[۲۲] آپ دن میں تبلیغِ حق فرماتے اور ساری رات نمازیں پڑھا کرتے۔ جیسا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ بہت زیادہ نماز پڑھتے تھے۔[۲۳]

حضرت شعیبؑ نے حسنِ بیان اور ہر نرم و گرم طریقے سے قوم کو راہِ ہدایت پر لانے کی از حد کوششیں کیں مگر قوم نے مطلق اثر نہ لیا۔ سوائے چند کمزور و ناتواں ہستیوں کے کسی نے بھی دین حق کے پیغام کی طرف توجہ نہ دی۔ خود بھی بداعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے۔ دین حق قبول کرنے والوں کو ڈراتے دھمکاتے رہے۔ مختلف النوع غلط کاموں پر آمادہ کرتے رہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت شعیبؑ نے مسلسل دعوتِ حق جاری رکھی تو اُن میں سے اُن سربرآوردہ شخصیات نے کہ جن کو اپنی شان و شوکت اور طاقت وقوت پر غرور تھا۔ حضرت شعیبؑ اور مؤمنین کو ڈرایا دھمکایا کہ یا ہم تجھ کو اور مومنین کو بستی میں سے نکال باہر کریں گے یا پھر ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ سردارانِ قوم نے جب حضرت شعیبؑ کا عزم و ارادہ دیکھا تو کفر، تمرد اور ضلالت کی شدت سے مخالفت حق میں حضرت شعیبؑ سے منہ پھیر کر اہلِ قوم یعنی

کفار سے کہنے لگے اتباعِ شعیبؑ تمھارے لیے باعثِ نقصان ہے:

لَئِنِ اتَّبَعتُم شُعَیباً اِنَّکُم اِذاً لَّخٰسِرُونَo [۲۴]

ترجمہ: اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔

قوم کے سرکردہ افراد ماتھے پر بل ڈال کر گویا ہوئے شعیبؑ! کیا تمھاری نماز تمھیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے ان معبودوں کی عبادت و پرستش ترک کر دیں جن کی پرستش ہمارے بڑوں نے کی اور ہم اپنے مال و دولت پر کوئی اختیار نہ رکھیں۔ ناپ تول میں کمی ترک کر دیں اور لوٹ مار چھوڑ کر غریب و مفلس اور نادار و بے کس ہو جائیں طنزاً کہنے لگے تو بڑا حلیم و رشید ہے۔[۲۵]

یہ سب کچھ سُننے کے باوجود حضرت شعیبؑ نے بڑی دلسوزی اور محبت و شفقت سے فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں اپنی نافرمانی کی بدولت تم بھی اس انجام کو نہ پہنچ جاؤ جو قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم صالحؑ اور قوم لوطؑ کا ہوا۔ ابھی بھی وقت ہے اپنے رب سے بخشش طلب کرو اور تائب ہو جاؤ۔ وہ مہربان ہستی تمھاری خطائیں بخش دے گی۔

دراصل قوم شعیبؑ سمجھتی تھی کہ دین اور شریعت صرف عبادات تک محدود ہے۔ معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے مال کو آزادی سے مصرف میں لاسکتا ہے۔ دین کا یہ کام نہیں کہ وہ اس پر پابندی لگا دے۔[۲۶]

قوم کے سرداروں نے حضرت شعیبؑ کو جواب دیا کہ تمھاری باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں تو ہم سے کمزور ہے۔ اگر تمھاری باتوں میں سچائی ہوتی تو تمھاری زندگی ہمارے سے بہتر ہوتی۔ ہمیں صرف تمھارے خاندان کا ڈر ہے ورنہ ہم تجھے سنگسار کر دیتے اور تو ہم پر ہرگز غلبہ نہیں پا سکتا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اُس پاک ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ اُس قوم نے اللہ کے جلال سے ذرا بھی ڈر محسوس نہ کیا فقط نبی کے گھرانے سے خوف کھایا۔ بیضاوی نے کہا کہ قوم نے حضرت شعیبؑ کے جواب میں بے ہودہ گفتگو کی۔ مارنے پیٹنے کی دھمکیاں دیں اور نادان لوگوں کا یہی قاعدہ و دستور ہوتا ہے کہ نورِ ایمان سے بے بہرہ ہو کر جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے رہتے ہیں اور بیّن آیات و کھلے دلائل کے بالمقابل ایسی ہی شیطانی حرکات کرتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کے پیغمبر کا خیال نہ کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں قبیلے والوں کی عزت کی۔[۲۷]

حضرت شعیبؑ نے قوم کے سرداران پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ تم اللہ کے مقابلے میں میرے خاندان سے ڈر رہے ہو۔ حالانکہ اللہ رب العزت تمھارے تمام افعال پر محیط ہے۔ خیر اگر

تم نہیں مانتے تو جان لو عنقریب اللہ کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

بادشاہ وقت کو جب حضرت شعیبؑ کی تبلیغ اسلام، پند و نصائح اور وعید عذاب کا پتہ چلا تو اُسے سخت تکلیف ہوئی کیونکہ اُس زمانے کے بادشاہوں نے دستور میں کم فروشی کی اجازت دے رکھی تھی۔ بادشاہ وقت نے حضرت شعیبؑ کو بلا کر کم ناپ تول کے دستور کے بارے میں ان کا نکتہ نظر دریافت کیا کہ اُنھیں یہ دستور پسند ہے یا نہیں تو حضرت شعیبؑ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں بذریعہ وحی خبر دی ہے کہ جو بادشاہ تمھاری طرح کرتا ہے وہ فاجر ہے۔ بادشاہ نے یہ سب سن کر حضرت شعیبؑ، اُن کے پیروکاروں اور قبیلہ والوں کو شہر سے باہر نکلنے کا حکم دے دیا۔[۲۸]

دیس نکالے کی تکلیف قتل سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ قتل کی تکلیف تو آنی ہے اور دیس سے نکالنے کی جاودانی۔ خاص طور پر جب جماعت ساتھ ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا اسلامی سال سن ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔[۲۹]

آخر وہی ہوا جو قانون الٰہی کا ابدی فیصلہ ہے وہ بحث و دلائل کی روشنی آ چکنے کے بعد بھی جب ضلالت اور گمراہی پر ڈٹے رہے اور حق کا مذاق اُڑایا، اللہ کے دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں تو اللہ نے اُن سے جینے کا حق چھین کر اُنھیں آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا ڈالا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ حضرت شعیبؑ کی قوم اوّل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو۔[۳۰] سات دن[۳۱] یا نو دن[۳۲] ایسا ہی رہا۔ گرمی سے ان کا دم گھٹنے لگا تو تلملا اُٹھے۔ کسی سایہ میں چین نہ آتا تھا۔ گھر کے اندر باہر سکون نہ تھا۔[۳۳] گھبرا کر تہہ خانوں میں پناہ لی تو وہاں اُوپر سے بھی زیادہ گرمی محسوس کی۔ پانی بھی ختم ہو گیا۔[۳۴] شدید پریشانی کی حالت میں جنگل کی طرف چل پڑے۔ چلنے اور دوڑنے کی وجہ سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔[۳۵] سات دن یا نو دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی۔ ایک آدمی وہاں پہنچا تو ٹھنڈک محسوس کی۔ سب کو وہاں بلا لایا۔ گرمی سے بدحواس لوگ دوڑ دوڑ کر بادل کے نیچے جمع ہو گئے کہ اللہ کے مجرم اپنے پاؤں پر چل کر آتے ہیں کسی سپاہی اور وارنٹ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔[۳۶] اس وقت ایک چیخ آئی۔ بعض نے کہا کہ حضرت جبرائیلؑ کی چیخ تھی[۳۷] اور بعض نے کہا کہ آسمانی چیخ تھی۔[۳۸] اس وقت سارا بادل یا سورج آگ بن کر ان پر برسا اور زلزلہ آیا۔[۳۹] اتنی تند و تیز ہوا چلی کہ قلوب اُڑ گئے اور روحیں پرواز کر گئیں۔ گھڑی کی

گھڑی میں سب ڈھیر ہو گیا۔ سخت عذاب نے کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑا۔[۴۰] تفسیر مواہب الرحمن میں لکھا ہے کہ شہر مدین (جس میں حضرت شعیبؑ بھی رہائش رکھتے تھے) کے رہنے والے زلزلہ اور سخت و کرخت آواز آنے سے مر گئے اور ایکہ والوں پر آسمان سے آگ برسی جس سے وہ ہلاک ہوئے۔ غریب مومنوں کے علاوہ اس قوم کے اہل ثروت، مغرور اور بدکردار سب مر گئے۔ جو مال و دولت کی محبت میں گرفتار اپنا ایمان گنوائے ہوئے حضرت شعیبؑ کو ذلیل و رسوا جانتے اور اُن کی اطاعت و پیروی سے گریز کرتے تھے سب چھوڑ کر عذاب دائمی میں پھنس گئے۔[۴۱] عذاب کی تینوں اقسام اس قوم پر اکٹھی ہو گئیں پہلے بادل سے آگ برسی پھر سخت آواز آئی پھر زمین میں زلزلہ آیا[۴۲] اور وہ آگ کی وجہ سے اس طرح بھُن گئے جیسے آگ میں ٹڈی۔[۴۳]

روایات میں لکھا ہے کہ کسی دو قوم کو اللہ رب العزت نے ایک عذاب سے نہیں مارا سوائے قوم مدین و قوم ثمود کے، کہ دونوں ''صیحہ'' سے مرے۔[۴۴] قوم شعیبؑ پر عذاب آنے کا سبب کفر اور بدافعال تھے۔ قومِ لوطؑ پر بھی انھی دو اسباب کے باعث عذاب نازل ہوا۔[۴۵]

قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت شعیبؑ مومنین کے ہمراہ مکہ میں آ کر بس گئے[۴۶] اور یہیں وفات پائی۔ ابنِ کثیر بحوالہ وہب بن منبہ روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کی قبر خانہ کعبہ کے غربی حصے میں دارالندوہ اور بنی سہم کے درمیان ہے۔ مولانا احمد یار نعیمی نے بھی اسی قول کی تائید کی ہے۔ وہ عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آپ کا مزار سنگِ اسود کے سامنے ہے۔[۴۷] جبکہ حفظ الرحمٰن سوہاروی نے لکھا ہے کہ آپ کی قبر حضر موت میں ہے۔ وہاں کی عوام کا یہ دعویٰ ہے کہ آپؑ اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد وہیں رہائش پذیر ہو گئے تھے اور بعد وفات حضر موت کے مشہور شہر ''شیون'' کے مغربی جانب ایک مقام ''شبام'' میں مدفون ہوئے۔ اس کے بعد سوہاروی صاحب نے عبدالوہاب نجار کے حوالے سے اس پر بھی شک کا اظہار کیا ہے۔ مصنف قصص قرآن نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ واللہ اعلم[۴۸]

حضرت شعیبؑ نے کتنی عمر پائی۔ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ عمادالدین نے ''تاریخ قرمانی'' کے حوالے سے آپ کی عمر چار سو سال، ابن عباس کی روایت کے حوالے سے دو سو بیالیس سال تحریر کی ہے۔[۴۹] سید ہاشم رسول محلاتی نے ناصر خسرو کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے آپ کی عمر دو سو پینتالیس سال لکھی ہے۔[۵۰]

حضرت شعیبؑ کی سیرت مطالعے کے بعد ہم جان چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ

حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک نہیں ہے اور حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کی صحبت سے فیض نہیں اُٹھایا۔ لیکن علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں روحانیت (کلیمی) کے حصول کے لیے شعیبیت (کامل مرشد و رہنما) کی تلاش وصحبت پر زور دیا ہے۔ اگر ہم سیرت شعیبؑ میں بیان کردہ تحقیق کی بنیاد پر حقائق تک پہنچنا چاہیں تو بات آگے نہ بڑھے گی اور تحقیق کا رنگ بالکل جداگانہ ہو جائے گا، جس کے سبب ''شعیبیت'' کے ذریعے دیے جانے والے اقبالی پیغام تک رسائی نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا ہمیں اس سے قطع نظر یہ دیکھنا ہے کہ علامہ ''شعیبیت'' کے ذریعے کلیمیت (روحانیت) کے حصول کا کون سا پیغام اُمت مسلمہ کے ہر فرد تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اُن کا اس سے اصل مقصود کیا ہے؟

آغاز میں بیان کردہ معلومات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبال دراصل اُمت مسلمہ کے ہر فرد کو ''شعیبیت'' کی تاثیر وفوائد سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مرشد کی صحبت میں وہ تاثیر ہوتی ہے جس کی بدولت عام انسان کی حالت یکدم بدل جاتی ہے اور وہ اعلیٰ درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ [۵۱]

اس کو علامہ یوں بیان کرتے ہیں:

''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے''

علامہ اقبال کے ہاتھ ''شعیبیت'' ایک اور فریضہ بھی ادا کرتی نظر آتی ہے اور وہ فریضہ ہے تربیتِ خودی کا۔ شعیبیت کی صحبت کی بدولت خودی اس قابل ہو جاتی ہے کہ انسان زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر اپنی ذات میں صفاتِ باری تعالیٰ کا رنگ پیدا کر سکتا ہے اور اس میں باطل کو پھونک ڈالنے کی قوت جنم لے سکتی ہے۔ علامہ اقبال اُمتِ مسلمہ کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کے انعامات کا حقدار بننے کا ایک ہی طریقہ ازل سے چلا آ رہا ہے وہ طریقہ کیا ہے۔ علامہ نظم ''خودی کی تربیت'' میں کہتے ہیں:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اِک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِٔ شب و روز! [۵۲]

مذکورہ بالا اشعار میں علامہ نے انعاماتِ الٰہیہ کا حق دار بننے کے طریقے بیان کیے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے نمبر پر خودی کی تربیت کو لازم گردانا ہے۔

خودی کی تربیت کی تین منازل ہیں:

ا۔ پہلی منزل فنافی الشیخ ہو جانا ہے یعنی شیخ کے رنگ کو اپنے اندر جنم دینا (جو اقبال کے ہاں شعیب کا نام پاتی ہے۔)

ب۔ دوسری منزل فنافی الرسول ﷺ ہو جانا ہے یعنی رسول پاک ﷺ کا رنگ اپنے اندر پیدا کر لینا۔

ج۔ تیسری منزل فنافی اللہ ہو جانا یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ کو اپنے اندر جنم دے لیتا۔[۵۳]

ان منازل کو طے کرنے کے بعد خودی میں ایسی قوت جنم لے لیتی ہے جس کے سامنے ساری فرعونیت دم توڑ دیتی ہے۔ انسان اپنی قوتِ نفس کی بقا اور روح کے ترفع کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے ہر نوع کی مشکلات کا سامنا پائے استقلال سے کرتا ہے۔[۵۴]

علامہ اقبال کے عہد میں مسلمان غلامی کے عادی ہو چکے تھے۔ اس خوئے غلامی نے انھیں انسانیت کی ترفع والی تعلیم سے محروم کر دیا تھا۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔''[۵۵]

لیکن اُن کی شدید خواہش ہے کہ مسلمانوں کی خودی پھر سے بیدار ہو جائے تا کہ وہ غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان قوتِ نفس اور روح انسانی کے ترفع والی تعلیم حاصل کریں کہ یہ خودی کی تربیت کے لیے از حد ضروری ہے اور وقت کا تقاضا بھی لیکن وہ خودی کی اس تربیت کے لیے ''ہوائے دشت، شعیب و شبانی'' لازم قرار دیتے ہیں۔ کلام اقبال میں ''ہوائے دشت'' مشکل پسندی سے عبارت ہے اور علامہ کے نزدیک مشکل پسندی کامیابی کا زینہ ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رقم طراز ہیں:

عزم و ہمت والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو مشکل پسند اور خود آگاہ ہوتے ہیں...... جو مشکل پسند ہوتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔[۵۶]

یہ سخت کوشی و مشکل پسندی انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ سورۃ البلد میں ہے:

لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِی کَبَدٍo[۵۷]

ترجمہ: بے شک ہم نے آدمی کو مشقت میں رہتا پیدا کیا۔

لیکن افسوس مسلمان اس سے بے خبر ہیں۔ علامہ چاہتے ہیں کہ فردِ مصدقہ یا انسانِ کامل مشکلات سے نبرد آزما ہونا سیکھے اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔

فکرِ اقبال کا جائزہ لیں تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال صحرائی طرزِ زندگی کو شہری طرزِ زندگی پر برتری دیتے ہیں اُن کے نزدیک دست و باز و صحرائی میں طاقت وقوت اور وسعت ہوتی ہے۔ اس سے انسان کے باز و میں قوت آتی ہے۔ شاہینی صفات جنم لیتی ہیں۔ انسان آرائش جسمانی اور موسیقی سے پرہیز کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں نسوانی خوبیاں پیدا کرنے کا سبب ہیں جس سے کوشش اور جدوجہد کا جذبہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ سیرت کی تعمیر و تشکیل اُسی خطے میں ممکن ہے جہاں نغمہ و بلبل نہ ہو۔[۵۸] یہی سبب ہے کہ اقبال ہوائے دشت اور شعیبیت لازم قرار دیتے ہیں کہ ''ہوائے دشت'' میں مرشدِ کامل کی صحبت کا اثر دو چند ہو جاتا ہے۔ علامہ اُمتِ مسلمہ کی ہر فرد پر زور دیتے ہیں کہ مرشدِ کامل کو تلاش کریں اور اس کی صحبت اختیار کریں۔ کیونکہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ''شعیب'' کی صحبت سے بے نیازی نہ برتی جائے:

کہے نہ رہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو!
یہ بات راہرو نکتہ داں سے دور نہیں[۵۹]

اوّل الذکر شعر میں ایک طرف تو علامہ نے مرشدِ کامل کی تلاش وصحبت پر زور دیا ہے تو دوسری طرف اس کامل رہنما کو بھی اُس کا فریضہ یاد دلایا ہے اور وہ فریضہ ہے ''شبانی شب و روز'' یعنی ''شعیب'' ہر لمحے ''شعیبیت'' کو اپنا شعار بنا لے تا کہ ایک احسن معاشرے کی بنیادیں از سرِ نو اُستوار ہو سکیں۔

کلام اقبال میں حضرت شعیب پر کہے گئے اشعار کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''شعیبیت'' آپ کے کلام میں ''مرشدِ کامل''[۶۰] کی علامت کے طور پر نمایاں ہوئی ہے۔ جن کی صحبت، رہنمائی اور تربیت کی ضرورت ہر دور میں ہے تا کہ اُمتِ مسلمہ کا ہر فرد اس کی صحبت کو اختیار کر کے زندگی کو سنوار سکے۔ یہ ''شعیبیت'' ہی ہے جو زندگی کو سنوارنے کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور اس کی بدولت انسان کی شخصیت یک لخت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مدارج میں گونا

گوں تبدیلی دکھائی دینے لگتی ہے۔اس کے ذریعے عام درجے کا آدمی علم وفضیلت، دنیاوی شان وشوکت، ہنر اور لیاقت کے بغیر ہی مکالمیتِ الٰہیہ کا شرف حاصل سکتا ہے۔[۶۱]

علم مادی اور اس کے حامل کی حیثیت اپنی جگہ مسلم کہ اس سے انکار ممکن نہیں لیکن اس میں وہ قوت مفقود ہے جو ''شعیب'' یعنی روحانی علم کے حامل میں ہوتی ہے کہ روحانی علم کا حامل حالت انسانی اور رتبۂ انسانی میں یک لخت تبدیلی لے آتا ہے لیکن اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ روحانی شخصیت، روحانیت کے کس مقام پر فائز ہے؟ نبی ہے یا کہ ولی یا مومن۔ کیونکہ عامی انسانی شخصیت کی تشکیل پر اُس طرح اثر انداز نہیں ہوسکتا جیسا کہ نبی یا ولی۔ انبیاء کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اولیا کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ لہٰذا وہ شخص جو تعلیمات انبیاءؑ (شریعت) کا پیروکار ہے وہی صحیح مرشدِ کامل ہے اور اُسی کی صحبت میں رہ کر مردِ مومن حیات روحی کی منازل طے کرنے کے بعد درجۂ کمال تک پہنچ کر خلافتِ الٰہیہ کا حق دار بن سکتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد تک اپنا پیغام پہنچاتے ہوئے اُسے ''شعیب'' کی تلاش و پیروی کا مشورہ دیتے ہیں۔

کلام اقبال میں ''شعیبیت'' کے ساتھ ''کلیمی'' کا ذکر اگرچہ کمزور اور غلط روایت کی بنیاد پر ہے لیکن علامہ اقبال اس کے ذریعہ جو پیغام اُمتِ مسلمہ تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ بالکل واضح ہے۔ ''شعیبیت'' علامہ کو فکری لحاظ سے رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ آپ کے کلام میں ''شعیبیت'' کی روح یہ ہے کہ ''مرشدِ کامل'' ہی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ اس لیے آپ کی خواہش ہے کہ امت مسلمہ میں حضرت شعیبؑ کی سی صفات رکھنے والے مرشدِ کامل پھر سے جنم لیں جو اپنی صحبت میں نئی نسل کے نوجوانوں (علامہ نے یہاں کلیم کی اصطلاح استعمال کی ہے) کی شاندار تربیت کا فریضہ سرانجام دیں اور ایک ایسی مضبوط جماعت تیار کریں جو دورِ حاضر کی سامراجی و طاغوتی طاقتوں کو کچل کر رکھ دے۔ یہ تربیت شدہ جماعت نہ صرف موجودہ نسل کی تقدیر بدل ڈالے بلکہ آنے والی نسلوں کی تقدیر بدلنے کی قوت بھی رکھتی ہوتا کہ ان کا حال تاباں و درخشندہ اور مستقبل روشن پُر امید ہو۔ یہ کفر وشرک کا خاتمہ اور توحید کا بول بالا کریں۔ نیز پرچم اسلام کی سربلندی کے لیے ہر لحہ کوشاں رہیں۔ علامہ پُر امید ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ان شاء اللہ ایسا ضرور ہوگا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز![۶۲]

کلام اقبال میں حضرت شعیبؑ پر دو اشعار ملتے ہیں اور ان دونوں اشعار میں علامہ نے

حضرت شعیبؑ کو صرف کامل رہنما کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا کہ اقبال کو ''شعیبیت'' کا یہی وصف پسند آیا ہے۔ اس وجہ سے اقبال کی شاعری میں ''کامل رہنمائی'' کا یہی وصف زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے اور آپ نے اسی کے ذریعے اُمت مسلمہ کے جوہر کی آبیاری کا فریضہ سرانجام دیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کس شخص کو مرشدِ کامل جان کر اُس کی پیروی کرے؟ علامہ نے اس اہم فریضہ کی اہل ہستی کے اوصاف بھی اپنے کلام میں جگہ جگہ بیان کیے ہیں۔ جن کا مختصر ذکر موقع محل کے مطابق ضروری ہے۔

۱- سچ بولنا اور اپنے ہر فعل میں راست بازی دکھانا، دروغ، فریب، بددیانتی، امانت میں خیانت اور اسی نوع کی دوسری برائیوں سے گریز، سچی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کا نام صداقت ہے۔ لیکن سب سے بڑی صداقت ہے توحید و رسالت پر ایمان لانا اور اس کے بعد بھی سچی بات کہتے رہنا، ایفائے عہد کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا اور زندگی کے ہر معاملے میں دھوکہ، فریب، مکر کو خیرباد کہنا، خوف الٰہی رکھتے ہوئے زندگی گزارنا اور سچ و حق کا ساتھ دینا مرشدِ کامل کا وصف ہے۔

۲- مرشدِ کامل متقی و پرہیزگار اور اللہ سے بہت زیادہ خوف کھانے والا ہو۔ شرک، بدعت اور گناہِ کبیرہ و صغیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو، کفر و شرک کے خاتمے اور اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کرنے کی سعی کرنے کی صفت رکھتا ہو، وہ لوگوں میں نہ جھوٹا مشہور ہو اور نہ ہی جھوٹے وعدے کرتا ہو، سنت و شریعت کو مقدم رکھتا ہو۔ الغرض ہر لحاظ سے پکا اور سچا مسلمان ہو۔ اگر اُسے فیصلہ کرنا پڑے تو کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

۳- بہادر اور مضبوط اعصاب کا مالک ہو، پیش آئندہ مشکلات سے نہ گھبرانے والا ہو، جرأت و ہمت کا مالک، بہادر اور دلیر ہو کہ وہی تو قوم کی مردہ روح میں پھر سے زندگی کی لہر دوڑا سکتا ہے اور اصولوں پر ڈٹ کر مخالفت کا سامنا کرسکتا ہے:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی [۶۳]

بلند نگاہ ہو، ہر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی قابلیت رکھتا ہو، دور اندیش ہو، اپنے سامنے بلند مقاصد رکھتا ہو، اپنی منزل آسمانوں سے بھی اُونچی تصور کرے اور نگاہیں اُسی پر مرتکز رکھے۔ اس منزل کے حصول کے لیے شب و روز ایک کر دے اس کی نگاہ تو ہمات قلب

میں نہ اُلجھے بلکہ مشاہدۂ حق کرنے والی ہو:

نگاہ وہ نہیں جو سُرخ و زرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں[۶۴]

ہوس پرستوں کے نزدیک نگاہ کا کام نظارہ کرنے تک محدود ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بلند نگاہی ہی تو انسان کو بلندیوں کی طرف محوِ پرواز کرتی ہے۔ معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے میں مدد کرتی اور بُرے اچھے میں تمیز کا سلیقہ سکھاتی ہے:

نرا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو[۶۵]

تنگ نظری سے انسانی دل تنگ اور بلند نگاہی سے وسیع و کشادہ ہو جاتا ہے۔ کشادگی انسان میں بلند ہمتی اور عالی ظرفی جیسی خصوصیات وصفات کو جنم دیتی ہے جس کی بدولت دل میں پوری دنیا کی فتح کے ولولے جنم لینے لگتے ہیں۔

۴۔ مرشدِ کامل میں دلنوازیِ سخن کی صفت ہو کہ اسی ہی سے قلوب مسخر کیے جا سکتے ہیں۔ جب تک زبان دل کی موافقت نہ کرے بات میں اثر پیدا نہیں ہوسکتا:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے[۶۶]

۵۔ مرشدِ کامل میں سوزِ دروں کا ہونا ضروری ہے۔ سوزِ دروں قلب کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس شدید ترین کیفیت میں پایا جائے۔ ایسا شخص جس کا اپنا قلب سوز وحرارت سے تہی ہو وہ دوسروں کے دلوں کو کیا گرمائے گا؟ سوز سے خالی دل پر جمود کی حالت چھا جاتی ہے۔ عمل کا جذبہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دل سے مقصد کے حصول کا عشق اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو علامہ بھی دعا کرتے ہیں:

عطا اسلاف کا جذبِ دُروں کر!
شریکِ زُمرۂ لَا یَحْزَنُوں، کر
خرد کی گُتھیاں سُلجھا چکا مَیں
مرے مولا مجھے صاحب جُنوں کر![۶۷]

سوزِ دروں سے لبریز انسان ہی متحرک، فعال اور سرگرم عمل ہو کر خود بھی کامیاب ہوتا ہے اور دوسروں کی رہنمائی بھی کامیابی کی منازل کی طرف کرتا ہے۔

سوزِ دروں ہی کی بدولت انسان زندگی کے حقائق کا علم حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بدولت وہ خود تو تکلیفیں سہہ لیتا ہے لیکن دوسروں کو تکالیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے[۶۸]

۶۔ مرشدِ کامل حب جاہ و مال کی بجائے حب الٰہی میں ڈوبا ہوا۔ موت سے نہ ڈرتا ہو کہ کامیاب و کامران زندگی گزارنے کے لیے اور بہترین "گروہ کلیماں" تیار کرنے کے لیے یہ از حد ضروری ہے۔ جن کے دل سے موت کا خوف ختم ہو جاتا ہے وہ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے۔

۷۔ مرشدِ کامل فقر کی سان پر چڑھا ہوا ہو۔ ایسا مرشدِ کامل تلوار بن جاتا ہے اور دُنیا سے ظلم و ستم کو مٹا کر رکھ دیتا ہے:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدق سلمانیؓ![۶۹]

یہ مرشدِ کامل اپنی صحبت میں رہنے والوں میں بھی یہی صفتِ فقر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ فقر کی شان ہی غیر اللہ سے بے نیاز کرنا ہے۔ صحیح مرشدِ کامل وہ ہے جو امت کو بادشاہوں کا پرستار بنانے کی بجائے "اللہ احد" کا پرستار بنا دے۔[۷۰]

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کر احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے![۷۱]

مآخذ ومصادر

۱- نور الدین، ڈاکٹر ابوسعید،اسلامی تصوف اور اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۶۶،۱۶۷۔

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ اقبال، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۳۸۰/۸۸

۳- ابنِ کثیر،امام ابوالفدا اءاسماعیل،قصص الانبیاء (عربی)،دارالفکر، بیروت،طبعۃ الاولیٰ،سن ندارد،ص: ۳۴۲۔نیز دیکھیے :موسوی محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء فارسی ج:۱-۲ کتابفروشی صدوق، تہران،سن ندارد،ص: ۲۶۹۔امیر علی،مولانا محمد سید،مواہب الرحمن،ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء،ص:۳۴۹۷

۴- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعماد الدین، تفسیرابن کثیر، ج:۴ ،پ۱۰،نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی،سن ندارد،ص:۲۰،۲۴

۵- ریاض،ڈاکٹر،تقدیر امم اور اقبال،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۳ء،ص:۲۵۷

۶- نعمانی،مولانا محمد عبدالرشید،لغات القرآن،ج:۳-۴،دارالاشاعت،لاہور،۱۹۸۶ء،ص:۲۸۱

۷- نعیمی،مفتی احمد یارخاں، تفسیر نعیمی،ج:۸،مکتبہ اسلامیہ،لاہور،سن ندارد،ص:۱۴۷

۸- تفصیل کے دیکھیے :الاعراف:۷،آیت:۸۵،ہود:۱۱،آیت:۸۴،۸۵

۹- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۴،ادارۃ المعارف،کراچی،سن ندارد۱۹۹۸ء،ص:۶۶۴

۱۰- امیر علی،مولانا سید،مواہب الرحمن،ج:۴،سن ندارد،ص:۳۴۹۸

۱۱- نعیمی،مفتی احمد یارخاں،تفسیر نعیمی،ج:۱۲،مکتبہ اسلامیہ،لاہور،۱۹۸۴ء،ص:۲۵۱

۱۲- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ادارۃ المعارف القرآن،کراچی،ج:۴،۱۹۹۸ء،ص:۶۶۴

۱۳- نعیمی،مفتی احمد یارخاں،تفسیر نعیمی،ج:۸،مکتبہ اسلامیہ، گجرات،۱۹۶۷ء،ص:۱۴۷

۱۴- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۳،سن ندارد،۱۹۹۸ء،ص:۶۲۴

۱۵- الاعراف:۷،آیت:۸۵۔۸۷

۱۶- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ۱۹۹۸ء، ص:۶۲۳۔نیز دیکھیے : ابن کثیر،اسماعیل ابوالفدا ءعماد الدین،تفسیر ابن کثیر،ج:۲،پ:۶،نور محمد کارخانہ تجارت،کراچی،ص:۹۰

۱۷- شفیع،مولانا مفتی محمد، معارف القرآن،ج:۳، بارندارد، ۱۹۹۸ء،ص۶۲۴۔نیز دیکھیے :ابن کثیر اسماعیل ابوالفدا ءعماد الدین، تفسیر ابن کثیر،ج:۲،پ:۶،ص:۹۰

۱۸- سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو) حصہ اوّل، ج:۱-۲، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ،ص:۳۴۸

۱۹- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۲، پ:۴، ص:۹۰

۲۰- نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۳-۴، ص:۲۸۲

۲۱- موسوی محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۲۷۰

۲۲- اصفہانی، عمادا لدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، از نشریات کتابفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، بار ۲۵، ۱۳۲۰ھ، ص:۳۶

۲۳- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۲، سعید، ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی بار ندارد، ۱۹۷۷ء، ص۹۷۔ نیز دیکھیےؒ ابن کثیر، امام ابوالفداء اسماعیل، قصص الانبیاء (عربی)، دارالفکر، بیروت، طبعۃ الاولیٰ، باراوّل سن ندارد، ص:۲۴۹

۲۴- الاعراف:۷، آیت:۸۸-۹۰

۲۵- ہود:۱۱، آیت:۸۷

۲۶- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۱۴، ادارہ المعارف، کراچی، ص:۶۶۳

۲۷- امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص:۳۸۱۰

۲۸- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی ج:۱-۲، ۲۵، ۱۳۶۰ھ، ص:۳۵

۲۹- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۹، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد، ص:۳

۳۰- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۸، سعید، ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک کراچی، ۱۹۷۸ء، ص:۵۴۹

۳۱- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۶، دینی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور، سن ندارد، پاکستان، ص:۶۳۹۷

۳۲- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۳۶

۳۳- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۶، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۵۴۴۔ نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ۱۹۹۸ء، ص:۶۲۲

۳۴- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، ص:۳۶

۳۵- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۶، ص:۶۳۹۷

۳۶- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القران، ج:۳، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۶۲۲

۳۷- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۲، ص ۶۲۹۸۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۹، سعید، ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص:۱۷۳

۳۸- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، ص:۳۲

۳۹- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ۱۹۹۸ء، ص:۶۳۰

۴۰- المولی، محمد احمد جاد، البجاوی، علی محمد، ابراہیم محمد ابوالفضل، شحاتہ، السید، قصص القرآن (عربی) المکتبہ النجاریۃ الکبریٰ، بمصر، الطبعۃ العاشرۃ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۷، نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ۱۹۹۸ء، ص ۶۳۰۔ ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۴، ص۳۳، ۳۴، ۱۰۲۔ اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۳۷، ۳۸

۴۱- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۴، ص۳۵۱۳۔ نیز دیکھیے: حوالہ مذکورہ بالا، ج:۶، ص:۲۶۹۸

۴۲- شفیع مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ۱۹۹۸ء، ص:۶۲۲

۴۳- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۹، ص:۱۶

۴۴- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۶، ص:۳۵۱۳

۴۵- شفیع مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۴، ص:۶۶۱

۴۶- شفیع مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ص:۶۳۱

۴۷- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۹، ص ۲۱۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۱-۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۳۷۔ ابن کثیر، امام ابوالفداء اسماعیل، عمادالدین، قصص الانبیاء (عربی)، ج:۱-۲، ص:۲۵۵

۴۸- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۲۸

۴۹- موسوی محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۲۷۰

۵۰- ابن کثیر، امام ابوالفداء اسماعیل، عمادالدین، قصص الانبیاء (فارسی)، ج:۱-۲، ص:۳۸۔

۵۱- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح بالِ جبریل، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ص:۴۸۶

۵۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۵۳۷/۷۵

۵۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، شرح بالِ جبریل، ص:۳۴۸

۵۴- غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۸۴۱، ۸۴۲

۵۵- سید مظفر حسین برنی (مرتب)، کلیات مکاتیبِ اقبال، ج:۱، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص:۲۰۱

۵۶- غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، ص:۸۵۸

۵۷- البلد: ۹۰، آیت: ۴

کبھی دریا سے مثل موج! اُبھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر!

ارمغان حجاز، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۶۷۵/۳۳

۵۸- چشتی، یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، ص:۳۹۵

۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۴۲/۵۰

۶۰- امروہوی، نسیم، فرہنگ اقبال اردو، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۴۹۸
۶۱- چشتی، یوسف سلیم، شرح بالِ جبریل، ص:۴۸۷
۶۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۵/۵۳۷
۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۷۸/۶۴۰
۶۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۷۷/۶۳۹
۶۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۳/۷۳
۶۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۹۹/۱۹۹
۶۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۸۷/۳۷۹
۶۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۹/۳۴۱
۶۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۰/۲۷۰
۷۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اقبال کا تصورِ دین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۱۸۱-۱۹۱
۷۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۹/۵۱۱، ۵۰/۵۲۰

☆☆☆☆

حضرت ایوب علیہ السلام

کلام اقبال میں حضرت ایوبؑ کا ذکر کثرت وتکرار سے تو نہیں لیکن قوتِ بیان کے ساتھ ملتا ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ صبر، تسلیم ورضا، دکھ اور مصیبت میں یادالٰہی میں مستغرق یعنی عشق حقیقی سے لبریز، غیر کی مدد سے بے نیاز، جس لازوال رہنمائی اور بے مثال نمونۂ قیادت کی علامہ اقبال کو ضرورت تھی وہ انھیں حضرت ایوبؑ کی سیرت وشخصیت میں میسر آ گیا۔ جس کے ذریعے انھوں نے اُمت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی ذات میں انھی صفات کو پروان چڑھانے کی تلقین وترغیب دی۔

اسرار خودی میں مبحث سوم بعنوان ''دربیان اینکہ خودی از عشق ومحبت استحکام می پزیرد'' کے تمام اشعار مرشدِ رومی کے فیضان کے عکاس اور عشق سے لبریز ہیں۔ ان اشعار میں علامہ اقبال نے خودی کو نقطہ نور کہا ہے اور اُسے زندگی کا شرر قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک خودی اللہ تعالیٰ کی محبت ہی سے زیادہ زندہ، زیادہ صیقل اور زیادہ سوزندہ ہوتی ہے۔ محبت ہی سے اس کی اندرونی خفیہ صلاحیتیں بروئے کار آ کر پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق ہی اس انداز سے کی ہے۔ یہ فطرت عشق سے قوت وتپش پاتی ہے۔ عشق ہی سے دُنیا کو منور کرنے کے انداز وطرائق سیکھتی ہے اور پیش آمدہ خطرات کا مقابلہ کرتی ہے۔ اسے موت کا کوئی خوف نہیں کیونکہ عشق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اسے فنا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کی نگاہ پتھر کو توڑ دیتی ہے اور اللہ کا عشق مومن کو ''بندۂ مولا صفات'' کے مرتبے تک پہنچا دیتا ہے۔[۱] لیکن علامہ بندۂ مولا صفات بننے کے لیے عاشقی کے رموز واسرار کی تعلیم حاصل کرنے اور معشوق کی تلاش پر زور دیتے ہیں۔ معشوق کی تلاش ورسائی کے لیے ''چشم نوح وقلب ایوبؑ'' کا ہونا لازم ٹھہراتے ہیں۔

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشمِ نوحے ، قلب ایوّبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے[۲]

ترجمہ: عاشقی سیکھ اور اپنے لیے محبوب ڈھونڈ۔ مگر اس کے لیے چشم نوحؑ اور قلب ایوبؑ چاہیے۔ کسی کامل کے آستان پر بوسہ زن ہو کر (اس سے وابستگی اختیار کر کے) اپنی مشتِ خاک کو کیمیا بنا لے۔

مذکورہ بالا اشعار پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال نے حضرت ایوبؑ کی شاعرانہ ستائش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مخاطب پر زور دیا ہے کہ وہ عاشقی کے رموز سے شناسائی حاصل کرے اور اس کے لیے ''چشمِ نوحؑ'' اور ''قلبِ ایوب'' کا آرزومند ہو جائے۔ اقبال کے ہاں حضرت ایوبؑ ایک ایسی علامت یا رمز کی حیثیت سے مذکور ہوئے ہیں جو صبر استقامت اور عشق حقیقی سے لبریز قلب کی نمائندہ اور توحید کی علم بردار ہے۔ یہاں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اقبال نے ''قلب ایوبؑ'' کی طلب پر زور کیوں دیا ہے نیز یہ کہ اُن کے نزدیک ''ایوبیت'' کے عناصر کی کیا حیثیت و اہمیت ہے۔ اقبال کے نزدیک ''عناصرِ ایوبیت'' کی تفصیل جاننے اور ان کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے حضرت ایوبؑ کی سیرت و کردار کا اجمالی مطالعہ ہمیں بنیاد یا سیڑھی کا کام دے سکتا ہے۔ اس لیے کچھ دیر ٹھہر کر حیات ایوبؑ پر نظر ڈالتے ہیں۔

حضرت ایوبؑ کی شخصیت، دور، قومیت ہر ایک کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ دورِ جدید کے محققین میں سے کوئی اُن کا تعلق اسرائیل سے، کوئی مصر سے اور کوئی عرب سے بیان کرتا ہے۔ کسی کے نزدیک ان کا دور حضرت موسیٰؑ سے پہلے ہے اور کسی کے نزدیک متاخر۔ لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد قرآن مجید کے ساتھ ساتھ دو اور ماخذ بھی ہیں۔ ایک تورات اور دوسرے وہ اقتباسات جو مسلم مؤرخین نے تاریخ سے اخذ کر کے نقل کیے ہیں۔[۳]

حضرت ایوبؑ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں سب سے پرانی شہادت مجموعہ تورات میں موجود وہ ''سفر ایوبؑ'' ہے جو دو اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔

۱- وہ روم نہیں بلکہ عوض کی سرزمین کے باشندے تھے۔

۲- وہ سبا اور کسدیوں (بابلیوں) کے زمانۂ عروج کے معاصر تھے۔[۴]

تورات اور اہم تاریخی کتب میں ایوب کے علاوہ ایک اور نام یوباب بھی آیا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو جدا جدا نام ہیں۔ درحقیقت عبرانی میں ''یوباب'' اوب ہوا اور پھر یہی ''اوب'' عربی میں ایوبؑ بن گیا۔[۵] لیکن تورات یوباب بھی دو جدا جدا شخصیتوں کا نام بتاتی ہے۔ اُن میں سے ایک کا تعلق بنی یقطان سے اور دوسرے کا تعلق بنی

ادوم سے ہے۔ جو یوباب یقطان کی نسل سے تعلق رکھتا ہے اس کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے ہے کیونکہ اس کا سلسلۂ نسب پانچ واسطوں سے حضرت نوحؑ تک پہنچ جاتا ہے یعنی یوباب بن یقطان بن عیر بن سلح بن ارفکسد بن سام بن نوحؑ۔[6] اور جو بنی ادوم سے ہے وہ بھی حضرت موسیٰؑ سے پہلے ہے لیکن یوباب اوّل کے زمانے سے اس کا عہد بعد میں آتا ہے۔[7] ادوم درحقیقت حضرت اسحاقؑ کے بیٹے عیسو (عیص یا عیسو) کا لقب ہے۔ جو حضرت یعقوبؑ سے بڑے تھے اور کنعان چھوڑ کر حجاز میں آباد ہو گئے تھے اور یہیں اپنے چچا اسماعیلؑ کی بیٹی محلات یا بشامہ (یاسمہ) سے شادی کر کے عمان سے حضرموت کے علاقے میں رہائش پذیر ہو گئے۔[8]

عیسو (ادوم) کی نسل میں کئی سو سال تک حکومت وسطوت کا دور دورہ رہا۔ تورات میں موجود بنی ادوم[9] کے حکمرانوں کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل پر ساؤل (طالوت) کی وسیع حکومت سے قبل کہ جس کی وسعت خطہ ادوم تک پہنچی اور جس کی بنیاد ایک ہزار سال قبل مسیح پڑی آٹھ حکمران برسرِ اقتدار رہ چکے تھے۔ ان میں سے دوسرے کا نام یوباب بن زارح تھا۔ یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں تو ان میں سے کس یوباب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں مؤرخین کی دو آرا ہیں۔ مولانا آزاد کی تحقیق کے مطابق:

> اوّلاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوبؑ عرب تھے، عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفرِ ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اُسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفرِ ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ اُن کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔
>
> ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اوّل میں عوض کو آرام بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے، اور آرامی بالاتفاق عرب عاریہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہیں۔[10]

عرب مؤرخ ابن عساکر کا رجحان بھی اسی جانب دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی حضرت ایوبؑ کا عہد حضرت ابراہیمؑ کے قریب ترین مانتے ہیں اور ان کے مطابق وہ حضرت لوطؑ کے ہم عصر اور حضرت ابراہیمؑ کے دین کے تابع تھے۔[11] لیکن ان دونوں کے برخلاف سید سلیمان ندوی حضرت ایوبؑ کو بنی ادوم سے اور اُن کے زمانہ کو ۱۰۰۰ ق۔م اور ۷۰۰ ق۔م کے درمیان مانتے ہیں۔[12]

سید سلیمان ندوی صاحب کی تائید مشہور تاریخ نگار یعقوبی کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ اُس کے مطابق بھی یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔ بلاشک وشبہ یہ درست بھی ہے کہ یوباب ہی ایوب ہیں اور بنی ادوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے زمانے کو تقریباً ۱۵۰۰ق۔م اور ۱۳۰۰ق۔م کے حدود میں تلاش کرنا چاہیے۔[۱۳]

مذکورہ بالا دلائل کے مطابق حضرت ایوبؑ کا زمانہ قبل از حضرت موسیٰؑ قرار پاتا ہے لیکن اس میں بھی مؤرخین میں اختلاف ہے۔ آپ حضرت یوسفؑ یا حضرت لوطؑ کے نواسے ہیں اور آپ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے قبل ۱۵۰۰ق۔م یا ۱۳۰۰ق۔م ہے۔ غالباً امام بخاری نے بھی اسی تحقیق کی بنا پر کتاب الانبیاء میں قائم کردہ ترتیب میں حضرت ایوبؑ کا ذکر حضرت یوسفؑ کے بعد اور حضرت موسیٰؑ سے قبل کیا ہے لیکن یہود ونصاریٰ کے بعض علما بھی عجیب ہیں کہ انھوں نے ایوبؑ کے نام کو ہی فرضی اور آپ سے منسوب واقعات یعنی صحیفہ کو باطل قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا کہنا از خود باطل ہے۔ الغرض حضرت ایوبؑ کی ذات بابرکات کو جب تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو درج ذیل حتمی نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت ایوبؑ کے عرب ہونے پر سب متفق ہیں۔
۲۔ صحیفہ ایوبؑ تورات کا سب سے پرانا صحیفہ ہے اور عبرانی میں عربی ہی سے نقل ہو کر آیا ہے۔
۳۔ حضرت ایوبؑ بنی ادوم سے تعلق رکھتے ہیں۔
۴۔ ان کا زمانہ حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا درمیانی زمانہ ہے۔[۱۴]

آپ کا نسب نامہ بالاتفاق یہ بیان کیا گیا ہے: یوباب (ایوب) بن زراح (زارح) بن عوض (موض) بن دیسان بن عیصو (عیسو) بن اسحاق بن ابراہیمؑ۔[۱۵]

قرآن وحدیث کے مطابق حضرت ایوبؑ کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا دنیاوی عیش وآرام عطا کیا ہوا تھا۔ ان کو مال و دولت، اہل وعیال، مویشی، کھیت، ملازم اور خادم[۱۶] گاؤں کے گاؤں زمین[۱۷]، تمام کا تمام بغیر محنت ومشقت کیے، محض اور محض غیب سے اللہ کے فضل وکرم سے عطا ہوا تھا۔[۱۸] آپ مع اہل وعیال آسودہ وخوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ اتنی زیادہ دولت دنیاوی اور حشمت کے باوجود ہر وقت یادِ الٰہی میں مگن رہتے۔ غربا وفقرا کا خیال رکھتے۔ زیادہ دولت نیک امور کے لیے مصّرف میں لاتے۔ جس کے صلہ میں اللہ نے دولت وثروت میں اور اضافہ کر دیا۔ لیکن دولت وثروت میں یہ اضافہ آپ کے لیے عبادت الٰہی میں اضافے کا سبب بنا۔[۱۹] اس

کی تصدیق تورات سے بھی ہوتی ہے۔[۲۰] تورات کے مطابق ایک روز شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ حضرت ایوبؑ کی نیک عملی اور عبادت صرف تیری رضا جوئی کے لیے نہیں۔ بلکہ اس لیے ہے کہ تو نے اُسے دُنیا کی ہر شے اور نعمت عطا کر رکھی ہے اگر یہ نعمتیں اس سے واپس لے لی جائیں تو اُس کی یہ پرہیز گاری اور نیکوکاری باقی نہ رہے گی۔ وہ تیرا شکر چھوڑ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایوبؑ ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ میرا خاص بندہ ہے اگر اُس سے یہ سب کچھ واپس لے لیا جائے تو بھی وہ ناشکری نہیں کرے گا بلکہ لگاتار میری عبادت ہی کرتا رہے گا۔ شیطان نے عرض کی کہ اے رب! مجھے ایوبؑ پر مسلط کر دے اور بار بار ایسا ہی کہتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حضرت ایوبؑ کی ذات کے علاوہ مال واولاد پر مسلط ہونے کی اجازت دے دی۔[۲۱]

الغرض حضرت ایوبؑ کا امتحان شروع ہوا۔ ایک روز دورانِ عبادت اچانک خبر پہنچی کہ ایک گروہ آپؑ کے مال، جانور سب لوٹ کر لے گیا اور سارے ملازم بھی قتل کر دیے ہیں۔ اگلے دن یہ خبر ملی کہ آپ کے تمام مکانات جل کر تباہ ہو گئے ہیں۔ کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ آپؑ کو خبر ملی کہ آپ کے مکان گرنے کی وجہ سے تمام بیٹے بیٹیاں دب کر مر گئے ہیں لیکن ان تمام حادثات کے باوجود آپ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے اور عبادت میں مصروف رہے۔[۲۲]

تورات کے برعکس تفسیر مواہب الرحمٰن میں ایک روایت درج ہے جس کے مطابق حضرت ایوبؑ سے کسی مسافر محتاج نے بارہا سوال کیا لیکن آپ نے جھڑک دیا۔ بعض کے مطابق ان کے باغات اور کھیتوں سے ملحق کسی غریب کی زمین دب گئی۔ ایسا ان کے کارپرداز نے کیا۔ اس پر چونکہ کوئی گواہ نہ تھا اس لیے حضرت ایوبؑ نے فریاد نہ سُنی۔ پس شیطان کو ان کے اموال پر غالب کر دیا گیا۔ جب مال، مویشی، جانیں تلف ہوئیں تو شیطان حضرت ایوبؑ کے پاس آکر دلسوزی کرتا اور کہتا کہ افسوس کا موقع ہے کہ آپؑ کا سب مال واولاد تلف ہو کر رہ گیا لیکن حضرت ایوبؑ جواباً صرف اتنا ہی فرماتے کہ اللہ کی دی ہوئی چیزیں اُس کے واپس لینے پر افسوس کیوں اور پھر عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔[۲۳]

شیطان نے شرمندگی وخجالت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک نئی تجویز پیش کی کہ اے رب! بلاشبہ حضرت ایوبؑ نے مال واولاد کی تباہی کی کچھ بھی پرواہ نہیں کی مگر میں اس کے بدن پر مسلط ہونے کی اجازت مانگتا ہوں۔[۲۴] اُسے حضرت ایوبؑ کے جسم پر مسلط ہونے کی اجازت دے کر حکم دیا گیا کہ اس کا امتحان لے لے لیکن یاد رکھنا اس کی جان ضائع نہ ہو۔[۲۵] پس

اجازت پاتے ہی شیطان نے حضرت ایوبؑ کے بدن میں آتشی پھونک ماری اور مس کیا حتیٰ کہ بدن میں بیماریوں اور سخت درد نے جنم لیا[۲۶] اور ساتھ ہی آپ کے پاؤں میں چھالا پڑ گیا جو رگڑ لگنے سے چھل گیا اور زخم کی شکل اختیار کر گیا۔ بعد میں اس میں کیڑے پڑ گئے[۲۷] اور زخم بڑھتے بڑھتے بدن کے تمام اعضا تک پہنچ گیا۔ تمام بدن میں کیڑے رینگنے لگے اور پیپ بہنے لگی۔ حتیٰ کہ جسم مبارک میں سوئی کے ناکے کے برابر بھی حصہ نہ بچا۔ سوائے ان کے دل کے کہ وہ ہی سالم رہا تھا۔ ان کے پاس مال و دولت تو درکنار علاج اور کھانے پینے کے انتظام کے لیے ایک پھوٹی کوڑی نہ بچی۔[۲۸] سب کچھ لٹ گیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے صرف محبت ایمانی سے لبریز ایک بیوی بچی۔ اس بیماری میں بھی اتنے روز بھوک میں کاٹے کہ شاید ہی کسی اور نے کاٹے ہوں۔ سب کچھ عطائے الٰہی تھی۔ اُسی نے واپس لے لی۔ مگر ایک شے اُن کے پاس رہی اور وہ تھی اللہ کی توفیق۔ آپ ان بُرے حالات میں مسلسل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے اور معمول کی عبادت میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آنے دیا۔[۲۹] اور اللہ کی مخلوق کی خدمت میں بھی مصروف رہے۔[۳۰] مصائب و تکلیف کی ان ہوشربا گھڑیوں میں بھی ثابت قدم رہے۔ کبھی حرفِ شکایت قلب و زبان پر نہ لائے۔[۳۱] صبر کرتے رہے۔ آپ کی وفا شعار مومنہ بیوی محنت مزدوری کر کے کھلاتی پلاتی اور دیکھ بھال کرتی رہی۔ آپ کے تمام عزیز و اقارب اور دوست یار آپ کی بیماری کی شدت و طوالت دیکھ کر آپ کو چھوڑ گئے سوائے دو دوستوں کے کہ یہ دونوں عزیز آپؑ کو ایک بوریا میں لپیٹ کر دوسرے گاؤں میں لے گئے۔[۳۲] ان دوستوں کا خیال یہ تھا کہ حضرت ایوبؑ پر یہ مصیبت کسی بہت ہی بڑے گناہ کے باعث ٹوٹی ہے۔ لیکن حضرت ایوبؑ نے اس بات سے انکار کیا اور ان سے مناظرہ کیا۔ یہ مناظرہ بہت طویل اور کئی باب پر مشتمل ہے۔ مناظرہ میں دلائل دینے کے باوجود آپ کے دوست نہ مانے تو آپ بہت بے قرار ہوئے۔[۳۳] لیکن حضرت ایوبؑ نے ان دوستوں کے الزام کو رد کرتے ہوئے اپنی بے گناہی پر اصرار کیا اور مصیبت کو اللہ کی طرف سے ایک امتحان ٹھہرایا۔ چنانچہ اللہ نے بھی حضرت ایوبؑ کے اس کلام کی تصدیق کی اور ان کے دوستوں کو ہی قصوروار گردانا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تورات میں حضرت ایوبؑ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان میں بھی تضاد ہے۔ صحیفہ ایوبؑ کے باب نمبر ۳ کو دیکھیے تو ایوبؑ نامی ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑتا ہے جو مصائب و تکالیف سے گھبرا کر اپنی پیدائش کے دن پر لعنت بھیج رہا ہے۔[۳۴] صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ وہ اپنے رب سے شکوہ و

شکایت کرتا ہوا اور اُلجھتا و جھگڑتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ باب نمبر ۱۱ میں وہی ایوب اپنے رب سے یہ گفتگو کرتا سنائی دیتا ہے کہ اُس نے اُسے تخلیق کیوں کیا۔[۳۵]

مذکورہ بالا معلومات کے بعد ہر شخص خود انصاف کرسکتا ہے کہ ایسی شخصیت جو سرتا پا احتجاج میں ڈوبی ہوئی ہے اور اپنے رب پر ظالم ہونے کا الزام لگا رہی ہے۔ مصائب سے گھبراتی اور اپنی پیدائش پر لعن طعن کرتی ہے۔ اس کی حیات و سیرت سے کون سی ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔[۳۶]

تورات اگرچہ حکمت کے ان گنت جواہر ریزے اپنے اندر رکھتی ہے لیکن اس کے مطالعے کے بعد یہ یقین ہرگز نہیں آتا کہ جو کچھ حضرت ایوبؑ کی نسبت اس کتاب میں درج ہے وہ واقعی درست ہے۔[۳۷] تاریخی شہادت پر اس سفرِ ایوبؑ کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد و تفاوت موجود ہے۔ اس کی معلومات قرآن پاک کی معلومات سے اتنی مختلف ہیں کہ دونوں کو بیک وقت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ان پر قطعاً بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تورات کے برعکس جب ہم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں یہ قصہ ایک جداگانہ شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں آپؑ کا ذکر سورۃ النساء، الانعام، الانبیاء، صٓ، اور انعام میں انبیا کرامؑ کی فہرست میں ہے۔ جب کہ سورۃ الانبیاء اور سورۃ صٓ میں مجمل ذکر ملتا ہے۔[۳۸] سورۃ الانبیاء میں ہے:

وَاَيُّوْبَ اِذْنَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۚ صلے o فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ o [۳۹]

ترجمہ: اور ایوبؑ کو (یاد کرو) جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی اور تو سب مہر والوں سے بڑھ کر مہر والا ہے۔ تو ہم نے اس کی دعا سن لی تو ہم نے دور کردی جو تکلیف اسے تھی اور ہم نے اسے اس کے گھر والے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور عطا کیے اپنے پاس سے رحمت فرما کر اور بندگی والوں کے لیے نصیحت۔

سورۃ صٓ میں ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْنَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ o اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ o وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ o وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ o [۴۰]

ترجمہ: اور یاد کرو ہمارے بندے ایوبؑ کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے شیطان نے تکلیف اور ایذا لگا دی۔ ہم نے فرمایا زمین پر اپنا پاؤں مار۔ یہ ہے ٹھنڈا چشمہ نہانے اور پینے کو

اور ہم نے اُسے اُس کے گھر والے اور اس کے برابر اور عطا فرما دیے اپنی رحمت کرنے اور عقلمندوں کی نصیحت کو۔ فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں ایک جھاڑو لے کر اسے مار دے اور قسم نہ توڑ۔ بے شک ہم نے اسے صابر پایا۔ کیا اچھا بندہ بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا ہے۔

ان آیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایوبؑ پاک اور مقدس انسان ہیں جو گروہِ انبیاء و رُسلؑ میں شامل ہیں۔ آپؑ دولت اور اولاد کی کثرت کے لحاظ سے خوش نصیب تھے۔ مگر یک لخت ابتلا و آزمائش سے دو چار ہو گئے۔ مال و دولت، اولاد اور جان سب مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ مال برباد ہو گیا اور گھر والے ہلاک ہو گئے۔ ۷۳ سال کی طویل العمری میں بیماری نے آ گھیرا۔ یہ بیماری چند روزہ نہ تھی۔ روایات کے مطابق ۳ یا ۷[41] یا ۸[42] یا ۱۳ یا ۱۸[43] سال پر مشتمل تھی۔ زیادہ مستند ۱۸ سال ہے۔[44] اتنے طویل عرصے تک آپ غم واندوہ کے بحر میں زندگی کا سفینہ چلاتے رہے۔ حسنِ ازل کی ایک نگاہِ لطف کے لیے سب کچھ لٹ جانے کے باوجود اتنے مطمئن، پرسکون اور باادب تھے کہ خوشی و مسرت کی نسبت اپنے رب کی طرف اور دُکھ، تکلیف کی نسبت شیطان کی طرف کی۔

بعض مفسرین کے مطابق شیطان بیماری کی حالت میں حضرت ایوبؑ کے قلب میں مختلف وسوسے ڈالا کرتا تھا جس سے آپؑ کے صبر اور رجوع الی اللہ کے پاکیزہ خیالات و جذبات کو ٹھیس لگتی اور آپ کو اس سے روحانی اذیت و تکلیف ہوتی۔ یہ تکلیف جسمانی مرض سے کہیں زیادہ تھی۔

ایک مرتبہ آپؑ کی زوجہ محترمہ نے درخواست کی کہ آپؑ کے مرض میں شدت آ گئی ہے اور تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آپؑ اللہ سے تکلیف کے دور ہونے کے لیے دعا کیجیے تو آپؑ نے جواباً فرمایا کہ میں نے ستر سال تندرستی میں گزارے ہیں۔ کیا اس کے مقابلے میں سات سال مصیبت میں گزارنے مشکل ہیں۔ بعض روایات کے مطابق آپؑ نے اس موقع پر قسم کھائی تھی کہ تندرست ہو کر بیوی کو سو کوڑے ماروں گا۔[45]

مولانا مفتی محمد شفیع رقم طراز ہیں:

''پیغمبرانہ عزم وضبط اور صبر وثبات کا یہ عالم تھا کہ دُعا کرنے کی بھی ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں صبر کے خلاف نہ ہو جائے۔ (حالانکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور اپنی احتیاج و تکلیف پیش کرنا بے صبری میں داخل نہیں) بالآخر کوئی ایسا سبب پیش آیا جس نے ان کو دعا کرنے پر مجبور کر دیا...... یہ دعا، دعا ہی تھی کوئی بے صبری نہ تھی۔ حق تعالیٰ نے ان کے کلامِ صبر پر اپنے کلام میں مہر ثبت فرما

دی ہے۔فرمایااِنَّا وَجَدْنٰہُ صَابِراً‘‘[۴۶]

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کو پہنچنے والے دُکھ پر انھیں صابر پایا۔حضرت ایوبؑ نے اللہ تعالیٰ سے شیطان کی دراز دستی کا گلہ ضرور کیا تھا لیکن یہ گلہ شکوہ صبر کے منافی نہیں اور نہ ہی اسے بے صبری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ عافیت کی تمنّا اور طلب شفا ناشکیبائی کی صف میں داخل نہیں کی جا سکتی۔اس سلسلے میں مرزا جان جاناں شہید کا کلام بہت ہی بلند پایہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ برسوں صبر کرنے کے بعد جب اللہ نے ان کے دکھ درد دور کرنے کا ارادہ فرمایا تو اُن کے دل میں اللہ سے دُعا اور خواستگاری کی تمنّا بیدار کی۔اُن سے عاجزی واحتیاج کا اظہار کروایا تا کہ اُن کی مصیبت دور کر دے۔ چنانچہ آپؑ نے فطری تقاضے کے برخلاف رضائے رب کے حصول کے لیے دعا اور آہ وزاری کو ترجیح دی۔ اس طرح مقام صبر سے آگے بڑھ کر مقام رضا میں داخل ہو گئے۔اللہ نے آپ کے صبر کی تعریف کے ساتھ ساتھ نِعْمَ الْعَبْدُاِنَّہٗ اَوَّابٌ کا خطاب بھی عطا کر دیا۔[۴۷] اور ایمان والوں کو بتا دیا کہ آپؑ دعا مانگنے میں حسنِ ادب کی تمام مراعات کا خیال رکھتے تھے۔[۴۸]

جس وقت آپؑ نے بیماری کے خاتمہ کی دعا کی اس وقت آپؑ ملک شام کی سرزمین جابیہ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی دعا قبول کی اور فرمایا، اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکر لگاؤ۔ جیسے ہی آپؑ نے ٹھوکر لگائی۔بحکم الٰہی وہاں ایک چشمہ جاری ہو گیا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ اس میں غسل کرلو۔ جیسے ہی آپؑ نے غسل فرمایا۔بدنی بیماری جاتی رہی۔ پھر دوبارہ ٹھوکر مارنے کا حکم دیا۔اس سے دوسرا چشمہ نکل آیا۔اس سے پانی پینے کا حکم دیا جس کی بدولت تمام اندرونی بیماریاں زائل ہوگئیں۔[۴۹] صرف یہی نہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کے اُجڑے چمن کو پھر سے بسا دیا۔ اداسی اور افسردگی ختم ہوگئی۔ ہر طرف چھل پہل ہونے لگی۔عزیز رشتے دار سب اکٹھے ہو گئے۔ باغوں میں پھل اور کھیتوں میں فصلیں لہلہاتی دکھائی دینے لگیں۔ یہ رونق پہلے سے دوگنا ہوگئی۔ پہلی اولاد زندہ کر دی گئی اور اُس کے مثل اور اولاد بھی دی گئی۔[۵۰] بعض روایات میں ہے کہ پہلی اولاد زندہ نہیں کی گئی بلکہ اتنی اور اولاد عطا کی گئی جو پہلی سے دوگنی تھی۔[۵۱] لیکن پہلا قول زیادہ قوی ہے۔

آزمائش ختم ہونے کے بعد بیوی کو مارنے والی قسم پوری کرنے کی باری آئی تو وفا شعار بیوی کو مارنے کو دل نہ چاہا۔لیکن قسم پوری کرنا ضروری تھی۔لہٰذا بحکم الٰہی اپنے ہاتھ میں گھاس یا سوٹھنیوں پر مشتمل گچھا یا تنکوں کا جھاڑو (جو اوپر نیچے تھے لے کر) مارا اور قسم پوری کی۔[۵۲]

امام بخاری نے صحیح بخاری شریف میں روایت تحریر کی ہے کہ فرمان نبوی ﷺ کے

مطابق حضرت ایوبؑ کے دوخرمن تھے۔ایک میں گندم بھرتے تھے اور دوسرے میں جو۔اللہ تعالیٰ نے بادل کے دوٹکڑے بھیجے۔ایک نے گیہوں کے خرمن کو برس کر سونے سے بھر دیا اور دوسرے جو کے خرمن کو چاندی سے۔اسی دوران آپؑ غسل فرما رہے تھے کہ اچانک سونے کی ٹڈیوں کی بارش ہونے لگی۔حضرت ایوبؑ نے لپ بھر بھر کر اپنے کپڑوں میں اکٹھا کر کے چھپانا شروع کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کو پکارا ایوب! کیا ہم نے تم کو یہ سب دھن دولت عطا کر کے بے پرواہ نہیں بنا دیا پھر یہ کیا؟ حضرت ایوبؑ نے عرض کیا اے پروردگار یہ درست مگر وَلٰکِنْ لَّا غِنَی لِیْ عَنْ بَرْکَتِكَ [۵۳] لیکن تیری برکتوں سے کب کوئی بے پرواہ رہ سکتا ہے۔

حضرت ایوبؑ کے مصائب ختم ہو گئے۔صبر وشکر کے بدلے میں اللہ نے انھیں اُن کی اصلی جسمانی حالت اور شان وشوکت والی زندگی عطا کر دی۔اُن کی بیوی رحمہ سے ان کے ستائیس بیٹے پیدا ہوئے۔اس خوشگوار زندگی کے ساتھ حضرت ایوبؑ نے روم میں ۷۰ سال بسر کیے۔لیکن اس دوران میں ان کی اطاعت کرنے والوں نے دینِ ابراہیمی میں کئی نت نئی باتیں شامل کر لی تھیں۔وفات کے وقت ان کی عمر ۹۳ [۵۴] یا ۱۴۰ برس تھی۔[۵۵]

ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ روز حشر انبیا کرامؑ میں حضرت سلیمانؑ کو اغنیا سے، حضرت یوسفؑ کو ارقا سے اور ایوبؑ کو اہل بلا سے بطور حجت لوگوں کے سامنے لائیں گے۔[۵۶]

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ایوبؑ کی سیرت کے کئی نمایاں پہلو ہیں جن کی وجہ سے انھیں صفِ انبیاء میں بھی نمایاں مقام وحیثیت حاصل ہے۔تین بڑی آزمائشوں (مال کا لٹ جانا، اولاد کا مر جانا، بدن میں پیپ اور کیڑے پڑنا) پر صبر اور غیر کی محبت سے خالی قلب، سخاوت اور بالآخر اِن تمام مصائب کا خاتمہ وانعاماتِ الٰہیہ کی بارش۔

آیئے ان تمام نمایاں اوصاف کو کلام اقبال میں درجہ بدرجہ دیکھیں اور جائزہ لیں کہ علامہ ان اوصاف کا تذکرہ کر کے امت مسلمہ کو کیا درس دینا چاہتے ہیں۔

جاوید نامہ میں مناجات اور تمہید آسمانی کے بعد تمہید زمینی ہے۔یہ حصہ بہت اہم ہے۔اس میں علامہ نے آسمانی سیاحت کا آغاز مولانا روم کی ایک غزل گا کر کیا ہے۔غزل گاتے گاتے شام کا آغاز ہو گیا اور سورج غروب ہوتے ہی رومی کی روح منظرِ عام پر دیکھ کر پہلے تو شاعر دنگ رہ گیا لیکن پھر رومی سے سوال و جواب کرنا شروع کر دیے۔ان سوال و جواب کے بعد شاعر کے بدن کا ہر ذرّہ پروازِ افلاک کے لیے بے قرار ہو گیا۔''فلکِ قمر'' میں شام کی معراج کا آغاز ہوتا

ہے۔ سب سے پہلے رومی شاعر کو دُنیا کے خوفناک پہاڑ دکھلاتا ہے۔ کچھ دور جا کر دونوں کی ملاقات قمر کے ایک غار میں ہندوستان کے ایک قدیم عارف رام چندر کے استاد وشوامتر جہاں دوست سے ہوتی ہے۔ دورانِ گفتگو سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر اور اس کا رہنما ''وادی یرغمید'' میں داخل ہوتے ہیں جو ملائکہ کی زبان میں ''طواسین'' کا نام پاتی ہے۔ ''طواسین رُسل'' میں چار طواسین ہیں۔ ان میں سے دوسرا طاسین، طاسینِ زرتشت (آزمائش کردن اہرمن زرتشت را) ہے۔ اس میں علامہ اقبال نے پاس ادب ملحوظ رکھتے ہوئے پیغمبروں سے گفتگو کی بجائے ان کی تعلیمات کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کرنے پر اکتفا کیا ہے اور ان کو پیش آنے والے مصائب کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ذکر کیا ہے۔ نظم میں اہرمن نے زرتشت سے ان مصائب کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فریضۂ رسالت سے عہدہ برآں ہونے کا انعام سوائے مصائب کے کچھ نہیں۔ اس لیے اس فریضے کی ادائیگی سے پرہیز اور رہبانیت پر عمل پیرا ہونا بہتر ہے، دیکھیے:

زہرہا در بادۂ گلفامِ اوست
ارّہ و کرم و صلیب انعامِ اوست![۵۷]

ترجمہ: اس کے بادۂ گلفام کے اندر زہر بھرے ہیں۔ اس کے انعامات آرہ، کٹہرے اور صلیب ہیں۔

مندرجہ بالا شعر میں ''ارّہ'' حضرت زکریا کے لیے، ''کِرم'' حضرت ایوبؑ کے لیے اور صلیب حضرت عیسیٰؑ کے مصائب کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر اپنے اپنے محل پر ہے۔

''کرم'' کی تلمیح کے ذریعے علامہ اقبال نے حضرت ایوبؑ کو پیش آمدہ بدنی مصائب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ مصائب آپؑ کے کسی فعل کا نتیجہ نہ تھے۔ آپؑ کو کارِ نبوت کے فریضے کی ادائیگی کے دوران ان مصائب اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس تلمیح کے ذریعے علامہ نے ایک تو حضرت ایوبؑ کی سیرت کے اہم پہلو کی طرف اشارہ مہیا کیا ہے، دوسرے اسے کارِ نبوت کے فریضہ سے عہدہ برآں ہونے والے اُن تمام افراد سے بھی منسلک کر دیا ہے جن کو اس احسن فریضہ کی ادائیگی کے دوران جسمانی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اسی شعر کے لفظ 'انعام' میں بالواسطہ اس کے اچھے نتیجہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ لہٰذا جسمانی مصیبت و اذیت سے گبھرا کر فریضۂ نبوت کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اس جسمانی مصیبت

واذیت کو علامہ اقبال ''دردِ ایوب'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔'درد ایوب' کی تلمیح کا ذکر ''نامۂ عالمگیر''، میں ملتا ہے۔ دیکھیے:

ندانی کہ یزدانِ دیرینہ بود
بسے دید و سنجید و بست و کشود
زما سینۂ چاکانِ ایں تیرہ خاک
شنید است صد نالۂ درد ناک
بسے ہمچو شبیرؓ در خوں نشست
نہ یک نالہ از سینۂ او گسست
نہ از گریۂ پیرِ کنعاں تپید
نہ از دردِ ایوب آہے کشید
مپندار آں کہنہ نخچیر گیر
بدامِ دعائے تو گردد اسیر[۵۸]

ترجمہ: کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ بہت قدیم ہیں۔ انھوں نے بہت کچھ دیکھا، جانچا اور کئی معاملات کو ختم کیا یا سلجھایا۔

انھوں نے اس تیرہ خاک (دنیا) کے مصیبت زدگان کے بہت نالہ ہائے دردناک سنے۔

کئی شبیرؓ کی مانند خون میں نہا گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سینے سے کوئی نالہ بلند نہ ہوا۔

نہ وہ حضرت یعقوبؑ کی گریہ وزاری سے متاثر ہوئے نہ انھوں نے ایوبؑ کے درد سے آہ بھری۔

یہ گمان نہ رکھ کہ وہ پرانا شکاری، تیری دعا کے دام میں پھنس جائے گا۔

یہ نظم دراصل اورنگ زیب عالمگیر کا اپنے بیٹے کے نام ایک خط ہے جس میں اس نے اپنے بیٹے کو بتایا ہے کہ مشیت الٰہی کے بغیر کوئی فعل روپذیر نہیں ہوسکتا۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

اس نظم پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں اعلانِ توحید بھی ہے اور انبیاءؑ پر آنے والے مصائب کی طرف بلیغ اشارہ بھی۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ علامہ نے ''دردِ ایوب'' کی تلمیح کیوں استعمال کی ہے اور وہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ نے اپنے درد کے خاتمہ کے لیے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا، راضی برضائے الٰہی رہے۔ مصائب سے نہ گھبرائے اور نہ غیر کے سامنے ان

کے خاتمے کے لیے جھکے۔ غیر کے سامنے دست سوال دراز کرنا خودی کے ضعف کا سبب ہے اور ضعیف خودی ''شیروں'' کو ''روباہ'' بنا دیتی ہے۔[۵۹] اسی وصف ایوبی نے علامہ اقبال کو شدت سے اپنی طرف مائل کیا۔ انھوں نے اسے شعر کے سانچے میں ڈھال کر اُمت کی رہنمائی کے لیے پیش کر دیا کہ مسلمان غیر کے سامنے نہ تو جھکیں۔ نہ ''غیر'' سے طلب کریں اور نہ درد کے خاتمہ کے لیے 'غیر' کی مدد چاہیں کہ وہ اللہ جو برتر اور دائمی ہے۔ وہی شافی و کافی ہے۔ درد کو مٹانا، مصائب کو ختم کرنا اسی کی صفتِ کریمی ہے۔ لہٰذا مسلمان کو درد کے خاتمہ کے لیے اسی سے التجا کرنی چاہیے اور اسی کے حضور دستِ سوال دراز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ ذات عطا کے بعد احسان نہیں جتلاتی۔ ''درد'' کے خاتمے پر کوئی بدلہ نہیں مانگتی جبکہ دنیا والے احسان کا بدلہ ''غلامی'' چاہتے ہیں اور غلامی موت کے مترادف ہے۔ مردِ مومن کی آزاد زندگی توحید سے مشروط ہے کہ اُسے اسی سے قوت و جبروت اور شان و شوکت ملتی ہے۔ نتیجتاً وہ مصائب کے باوجود حق پر ڈٹ جاتا ہے اور بڑے سے بڑے خطرات میں بھی ثابت قدم رہتا ہے۔[۶۰]

توحید پر ڈٹے رہنا اور شرک کی تمام گندگیوں سے مکمل آزادی انسانی شخصیت کی تعمیر اور کارزارِ حیات میں فیصلہ کن درجہ رکھتی ہے۔[۶۱] سیرتِ ایوبؑ کی روشنی میں علامہ اقبال اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے اور ہر منزل پر توحید پر قائم رہنا، شرک سے اجتناب کرنا اور دوسروں کو اس کا احساس دلانا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ ''فریضۂ ایوبی'' ادا کرتے ہیں اور انسانیت کو بھی اسی ''ایوبیت'' کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو انسان کو فولادی عزم و ارادہ عطا کرتی ہے اور اسے میدانِ عمل میں استحکام بخشتی ہے۔ نتیجتاً وہ صبر و حوصلے سے تمام مصائب کو برداشت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس صبر و حوصلہ کو علامہ ''صبرِ ایوب'' کا نام دیتے ہیں، مثال دیکھیے:

صبر ایوبؑ وفا خو جزو جانِ اہلِ درد
گریۂ آدم سرشتِ دودمانِ اہلِ درد[۶۲]

ترجمہ: حضرت ایوبؑ کا صبر اہلِ درد کی روح کا جزو ہے۔ اہلِ درد کے خاندان کا خمیر آدمؑ کی آہ و زاری سے اُٹھا ہے۔

صبر کیا ہے؟

بقول شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی:

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارے'' کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ

سے روکنا اور اُس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا کہ یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدر کے ہیں۔[۶۳]

صبر فضائل محمودہ میں اعلیٰ فضیلت رکھتا ہے۔ اس وصف کے بغیر دین و دنیا کا کوئی بھی اعلیٰ منصب نہیں مل سکتا۔ ارادے کی پختگی واستحکام اور اللہ کی ذات پر بھروسہ درحقیقت صبر کی شاخیں ہیں۔[۶۴]

علامہ اقبال مسلمانوں کو بلند مقام اور اعلیٰ مناصب پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ لیکن ان کے حصول کے لیے طویل مدت تک انتظار اور بلند حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ اسی کو 'صبر' سے بھی تعبیر دی جا سکتی ہے۔ گویا علامہ اپنے کلام میں ''صبر ایوب'' کی تلمیح صرف واقعاتی بیان کے لیے نہیں لائے۔ بلکہ انھوں نے اسے ایک اعلیٰ مقصد کے اظہار کے لیے اور ایک اعلیٰ صفت کو انسانِ کامل کی ذات کا حصہ دیکھنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ وہ وصف ہے جس سے شخصیت میں پختگی و استحکام جنم لیتا ہے اور توکل علی اللہ میں استحکام واضافہ ہوتا ہے۔ علامہ کے ہاں ''قلب ایوبؑ'' طلب کرنے کا راز بھی یہی صبر ہے۔ صبر اور دل کا آپس میں گہرا ربط وتعلق ہے۔ یہ تجلیاتِ الٰہی کا مرکز ہے اور حقیقت کی کلیت کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ علامہ کے ہاں حقیقت کی کلیت کا احاطہ کرنے کی صفت کو عشق سے تعبیر دی گئی ہے۔ عشق وصبر مل کر ایک تپش بن جاتے ہیں جن کی حرارت سے قلوب حیات پاتے ہیں۔ (اس حرارت کے ختم ہونے کا نام مردہ دلی ہے۔) اقبال اس تپش کو سوزِ دل کا نام بھی دیتے ہیں اور مسلمانوں کو اس کے حصول کی تلقین کرتے ہیں۔

پروفیسر شفیق الرحمٰن ہاشمی رقم طراز ہیں:

سوزِ دل رکھنے والے کی نظر کیمیا بن جاتی ہے۔ وہ جس کی طرف بھی توجہ کرتا ہے اسے کندن بنا دیتا ہے۔ ایسے شخص میں دوسروں کی اصلاح کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔[۶۵]

علامہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے سنا کہ میرے کتب خانے میں ایک کتابی کیڑے نے پروانے سے کہا کہ میں ایک عرصہ تک حکیم بوعلی سینا کی کتابوں میں سکونت پذیر رہا ہوں۔ مشہور مفکر اور مسلمان فلسفی فارابی کی کتابوں کو بھی چاٹ گیا ہوں۔ لیکن مجھے زندگی کا راز ہاتھ نہیں آیا۔ میری حیات پہلے کی طرح اندھیرے سے بھرپور ہے۔ پروانے نے اس کو جواب دیا کہ یہ نکتہ تجھے کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اگر تو زندگی چاہتا ہے تو کسی بلند تر مقصد کے حصول کے لیے جلنا سیکھ لے۔ تجھے زندگی کا راز معلوم ہو جائے گا۔

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را[۶۶]

ترجمہ: تپش زندگی کو اور زندہ تر کرتی ہے، (اور) تپش ہی زندگی کو بال و پر عطا کرتی ہے۔

اسی حرارت قلب یا سوز سے انسان حقیقتِ حیات سے آشنا رہتا ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔ اسی جذبے کی بنا پر انسان تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔[۶۷] اقبال کے ہاں یہ سوزِ قلب ''قلب ایوبؑ'' کی تاریخی مذہبی تلمیح کا نام پاتا ہے۔ قلب ایوب کی صفات کا حامل دل موجود سے بیزار اور غائب کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ دنیا کی طلب کی بجائے اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز رہتا ہے اور وہ دل جسے اللہ سے محبت ہو جاتی ہے، وہ زندگی کی بجائے موت کو عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ موت ''محبوبِ طلب'' تک رسائی و ملاقات کا ذریعہ بن جاتی ہے اور دنیا میں جو لوگ موت کے خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑا کارنامہ بے دھڑک سرانجام دے سکتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ہر فرزندِ توحید کا مسلک حیات ''ایوبیت'' کی طلب ہونا چاہیے۔ کیونکہ زندگی کی تلخیوں اور وقت کی گردشوں کے سامنے سینہ سپر ہونے، نجات، فلاح اور انعام کی راہ پانے کے لیے بندۂ مومن کا واحد راستہ ''ایوبیت'' ہے کہ اس ''ایوبیت'' کے اوصاف جمیلہ واحسنہ (صبر، تسلیم ورضا، استغنا و بے نیازی، مصائب کے سامنے ڈٹ جانا اور حوصلہ نہ ہارنا) کی بدولت ہی:

۱۔ قلب غیر کی محبت سے خالی اور عشقِ الٰہی سے لبریز ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں انتہا کی طاقت آتی ہے۔

۳۔ ہمت عروج حاصل کرتی ہے۔

۴۔ عزم میں مضبوطی و پائیداری جنم لیتی ہے جس کی بدولت وہ فیصلہ کن گھڑی میں مشکلات کے سامنے چٹان بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ یہ سب وہ اللہ کے بھروسے پر کرتا ہے[۶۸] اور ضلالت کو شکست فاش دے سکتا ہے۔[۶۹]

۵۔ اس میں استغنا اور بے نیازی جنم لیتی ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جو سچائی کو جنم دیتا ہے اور بندۂ خدا کسی آقا یا قوت قاہرہ کی پرواہ کیے بغیر بے دھڑک جو چاہے کر سکتا ہے[۷۰] اور جو چاہے پا سکتا ہے۔

۶۔ وہ بے صبری سے عاری ہو جاتا ہے، حالات کتنے ہی نا مساعد کیوں نہ ہو جائیں، آزمائش اپنی انتہا کو ہی کیوں نہ پہنچ جائے وہ صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ایک

''یزداں دیرینہ'' ہے جیسے ہی اُس کی رحمت نے جوش مارا وہ آن کی آن میں اُس کے مصائب کو ختم کر کے آسانیاں پیدا کر دے گا۔ نیز اُسے بھی انعامات سے نوازے گا۔ کیونکہ وہ وارثِ ''ایوبیت'' ہے۔ اسے نہ صرف ''ایوبیت'' کی اس راہ حق پر چلنا ہے بلکہ اس راہ سے ہٹنے والوں کی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دینا ہے کہ وہ مبلغِ نبوت بھی تو ہے اور بندۂ خدا بھی۔

المختصر اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جن صفات سے مزین دیکھنا چاہتا ہے ''ایوبیت'' کی وہی صفات علامہ اُمت مسلمہ کے ہر فرد میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱۔ چشتی، یوسف سلیم، شرح اسرار خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص: ۲۸۵، ۲۸۷

۲۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۸/۱۸

۳۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، حصہ دوم، ج: ۱-۲، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص: ۱۷۶، ۱۷۷

۴۔ تورات، عہد عتیق، ایوب، باب: ۱، آیت: ۱، سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء

۵۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، حصہ دوم، ج: ۱-۲، ص: ۱۷۷

۶۔ تورات، تکوین: باب: ۱۰، آیت: ۲۲-۲۴

۷۔ حوالہ مذکورہ بالا، باب: ۲۸، آیت: ۹

۸۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القران (اردو)، حصہ دوم، ج: ۱-۲، ص: ۱۷۸

۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، تکوین، باب، آیات: ۳۲-۳۹

۱۰۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن، ج: ۲، ساھتیہ اکادمی، دہلی، بار چہارم، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۸۶

۱۱۔ عسقلانی، حافظ احمد بن علی بن محمد بن حجر، فتح الباری (عربی)، ج: ۶، دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، طبع ممتاز مصححۃ، ۱۹۸۱ء، ص: ۳۲۶

۱۲۔ ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن کامل، ج: ۲، دارالاشاعت، کراچی، بار دوم، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۴، ۳۶

۱۳۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، حصہ دوم، ج: ۱-۲، ص ۱۸۱

۱۴- ایضاً،ص۱۸۲،۱۸۴

۱۵- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۱۳۸۷ جمادی اوّل،ص ۶۵۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۷، دینی کتب خانہ لاہور، سن ندارد،ص: ۹۵۶۷۔سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج: ۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء،ص:۳۴۶۔ نیز سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، حصہ دوم، ج:۱-۲،ص:۱۸۲

۱۶- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین، مترجم، بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم، مکتبہ تاج کراچی، ۱۹۸۴ء،ص:۵۵۷

۱۷- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۵ء،ص:۱۸۸

۱۸- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین، مترجم، بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم،ص:۵۵۷

۱۹- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء،ص:۱۸۹

۲۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، عہد عتیق، ایوب، باب:۱، آیت:۳-۵

۲۱- ایضاً، آیت:۶-۱۲

۲۲- ایضاً، آیت:۱۳-۲۳

۲۳- امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۷،ص:۹۵۷،۹۵۸

۲۴- ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء،ص ۱۹۱۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمٰن، ج:۷،ص:۹۵۸

۲۵- حوالہ مذکورہ بالا

۲۶- المولیٰ، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید، قصص القرآن (عربی)،ص ۲۳۰

۲۷- ادارہ تصنیف و تالیف، انوار انبیاء،ص ۱۹۱۔ نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۳، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۷ء،ص ۱۸۲

۲۸- امیر علی، مولانا مولوی، سید، مواہب الرحمن، ج:۷،ص:۹۵۸

۲۹- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین، مترجم، بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم،ص ۵۵۷

۳۰- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۳، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۷ء،ص ۱۸۱

۳۱- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین (مترجم)، بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم،ص ۵۵۸

۳۲- ادارہ تصنیف و تالیف، شیخ، انوارِ انبیاء، غلام علی اینڈ سنز،ص:۱۹۲

۳۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: تورات، عہد عتیق، ایوب، باب:۱۱، آیت:۱۔۷

۳۴- ایضاً، باب:۴۲، آیت ۷، نیز باب:۳، آیت ۱-۴، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲

۳۵- ایضاً، باب:۱، آیت:۱، ۲، ۳، ۱۷، ۱۸، ۱۹

۳۶- کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۳،ص:۱۸۲

۳۷- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار سترہ، ۱۹۸۰ء،ص ۴۵۲

۳۸- دیکھیے :النساء:۴،آیت:۱۶۳۔نیز الانعام:۶،آیت ۸۴۔الانبیاء:۲۱،آیت ۸۳،۸۴۔ص:۳۸، آیت ۴۱-۴۴
۳۹- ۲۱،آیت:۸۳،۸۴
۴۰- ۳۸،آیت:۴۱،۴۴
۴۱- سیوطی،علامہ جلال الدین،الاتقان فی علوم القرآن،ج:۲،ص:۳۴۲۔نیز دیکھیے :ابن کثیر،ابوالفداء عمادالدین اسماعیل،البدایہ والنہایہ،حصہ اوّل،نفیس اکیڈمی،کراچی،۱۹۸۷ء،ص:۲۵۹شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۲،ادارۃ المعارف،کراچی،۱۹۹۸ء،ص:۲۱۶
۴۲- ابنِ کثیر،ابوالفداءعمادالدین،تفسیر ابن کثیر،اردو،ج:۴،نور محمد کارخانہ کتب،کراچی،سن ندارد، ص:۶۷۔نیز دیکھیے :سیوطی،علامہ جلال الدین،الاتقان فی علوم القرآن،ج:۲،ص۳۴۶۔
۴۳- سیوطی،حوالہ مذکورہ بالا۔
۴۴- ابنِ کثیر،ابوالفداءاعمادالدین،البدایہ والنہایہ،ج:۱،ص۲۶۰۔نیز دیکھیے :اسی مصنف کی تفسیر ابن کثیر،اردو،ج:۴،ص:۶۸
۴۵- المولیٰ،محمد احمد جاد،ابراہیم،محمد ابوالفضل،البجاوی،علی محمد،شحاتہ،السید،قصص القرآن (عربی)،ص۲۳۲۔
۴۶- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۷،ص:۵۲۰
۴۷- پانی پتی،علامہ قاضی محمد ثناءاللہ،تفسیر مظہری،ج:۵،سعید ایچ۔ایم کمپنی،ادب منزل،کراچی، ۱۹۷۹ء،ص:۱۲۶،۱۲۷
۴۸- منصور پوری،قاضی محمد سلیمان سلمان،رحمتہ اللعالمینﷺ،ج:۲،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،سن ندارد،ص:۲۹۰
۴۹- اکثر مفسرین کے نزدیک دو چشمے نکلے تھے ایک ٹھنڈے پانی کا اور ایک گرم پانی کا۔دائیں پاؤں کی ٹھوکر سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ جاری ہوا اور بائیں پاؤں کی ٹھوکر سے گرم پانی کا چشمہ جاری ہوا۔بعض جگہ دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں لکھا ہے۔ماخوذ از امیر علی،مولانا سید،مواہب الرحمٰن،ج:۷، ص۹۶۱،۷۔نیز دیکھیے :پانی پتی،علامہ قاضی محمد ثناءاللہ،تفسیر مظہری،ج:۵،ص:۱۲۶
۵۰- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن (اردو)،حصہ دوم،ج:۱-۲،ص:۱۸۸۔نیز دیکھیے :کرم شاہ،پیر محمد،ضیاء القرآن،ج:۴،ص۲۴۶۔امیر علی،مولوی مولانا سید،مواہب الرحمٰن،ج:۷، ص:۷۹۶۱
۵۱- شفیع،مولانا مفتی محمد،معارف القرآن،ج:۷،ص۲۱۵۔نیز دیکھیے :امیر علی،مولوی مولانا سید،مواہب الرحمٰن،ج:۷،ص:۷۹۶۱
۵۲- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن (اردو) حصہ دوم،ج:۱-۲،ص۱۹۰
۵۳- بخاری،ابوعبداللہ،محمد بن اسماعیل،بخاری شریف،ج:۲،کتاب الانبیاء،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور،

۱۹۷۹ء،ص:۲۸۳
۵۴- ابن کثیر،ابوالفدا ءعمادالدین اسماعیل،البدایہ والنہایہ،حصہ اوّل،ص:۲۶۱
۵۵- تورات،عہد عتیق،ایوب،باب:۴۲،آیت:۱۶،۱۷
۵۶- ابنِ کثیر،ابوالفدا ءعمادالدین،قصص الانبیاء(عربی)،مکتبہ طیبہ المدینۃ المنورۃ،سن ندارد،ص:۳۱۹
۵۷- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،جاوید نامہ،کلیاتِ اقبال فارسی،ص۴۹/۶۳۷
۵۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پیامِ مشرق،کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۳۱/۳۰۱
۵۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،اسرار و رموز،کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۲۳/۲۳
۶۰- ہاشمی،پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصور دین،فیروز سنز،پرائیویٹ لمیٹڈ،لاہور،سن ندارد،ص:۳۱
۶۱- اظہر،ڈاکٹر ظہور احمد،اقبال کے نجوم ہدایت،فیروز سنز،پرائیویٹ لمیٹڈ،لاہور،۱۹۹۱ء،ص:۵۸
۶۲- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،مرتب،عبدالغفار شکیل،نوادرِ اقبال،سرسید بک ڈپو،علی گڑھ،۱۳۷۷ھ،ص:۴۴
۶۳- نعمانی،علامہ شبلی،ندوی،علامہ سید سلیمان،سیرۃ النبی،ج:۵،مکتبہ مدنیہ،لاہور،صفر المظفر،۱۴۰۸ھ، ص:۲۳۵
۶۴- منصور پوری،قاضی محمد سلیمان،سلمان،رحمۃ اللعلمین،ج:۲،ص:۲۸۹
۶۵- ہاشمی،پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصورِ دین،ص:۱۸۷،۱۸۸
۶۶- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پیامِ مشرق،کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۱۰۴/۲۷۴
۶۷- ہاشمی،پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصور دین،ص:۱۸۸
۶۸- نعمانی،علامہ شبلی ندوی،علامہ سید سلیمان،سیرۃ النبی،ج:۵،ص:۲۴
۶۹- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،اخلاق اور فلسفۂ اخلاق،مکتبہ رحمانیہ،لاہور،۱۹۷۶ء،ص:۵۰۵
۷۰- اظہر،ڈاکٹر ظہور احمد،اقبال کے نجوم ہدایت،ص:۱۷۳

☆☆☆☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام

فکرِ اقبال میں ''توانائی'' کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے ثبات، پائیداری، استحکام اور قیام کے لیے بنیادی وسیلہ توانائی ہے اور زندگی کا سب سے بڑا مظہر۔ یعنی انسان توانائی ہی کا ایک مرکب ہے۔ لہٰذا اُس کی ذات کی بقا و ترقی اسی طرح ممکن ہے کہ اس بنیادی عنصر کو گرفت میں لیا جائے۔ اقبال اپنے ایک شذرہ ''شخصیت کی بقا'' میں تحریر کرتے ہیں:

انسان اصلاً ایک توانائی، ایک قوت یا قوتوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے عناصر کی ترتیب میں اختلاف کی گنجائش ہے، ان قوتوں کی ایک مخصوص ترتیب کا نام شخصیت ہے۔[۱]

اس حوالے سے دیکھا جائے تو اقبال فرد اور توانائی کو لازم و ملزوم ٹھہراتے ہیں۔ اس کی کمی یا ناموزوں تنظیم انسان کی شخصیت کو درہم برہم کرنے سے عبارت ہے۔ شخصیت کی یہ تعریف اقبال کے اہم تصور خودی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یوں اگر غور کیا جائے تو اقبال کے ہاں شخصیت، خودی اور توانائی اصلاً ایک ہی مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔ اقبال کے تصورِ خودی کی سادہ تشریح یہ ہے کہ خودی ذات کی شناخت اور اثبات کا نام ہے۔ چنانچہ ذات اگر توانائی یا مختلف قوتوں کا مجموعہ ہے اور ذات کا عرفان خودی ہے تو گویا خودی ''توانائی'' ہی ہے۔[۲]

اقبال کے نزدیک توانائی ایک ایسی قدر ہے جس کے ذریعے وہ اشیا اور افراد کو رد یا قبول کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے اقبال نے جن اہم شخصیات کو قوت و توانائی کے تصور کی وضاحت کے لیے اپنی تخلیقی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کا ہے۔ وہ ''حضرت موسیٰؑ کو دُنیا کے سب سے پہلے مقنن اور توحیدِ مطلق کے پہلے اُستاد قرار دیتے ہیں''۔[۳]

آیئے حضرت موسیٰؑ کی سیرت اور اقبال کی نظر میں اُس کی حیثیت و وقعت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اقبال نے اس پاک پیغمبر کے وقائع حیات سے کون کون سے خوب سے خوب تر نکات اخذ کیے ہیں اور بنی اسرائیل کی تاریخ کو ایک دردناک کہانی کیوں کہا ہے۔[۴]

حضرت موسیٰؑ کا نسب نامہ چند واسطوں سے حضرت یعقوبؑ تک پہنچتا ہے۔ موسیٰؑ بن عمران بن قاہث، بن عازر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیمؑ۔[۵] عمران کے ہاں موسیٰؑ کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جب فرعون منفتاح بن ریمسیس کا دور تھا۔[۶]

مؤرخین کے مطابق فرعون بنی اسرائیل کا اس لیے دشمن بن گیا کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ لگانے والوں نے بتایا تھا کہ اُس کی حکومت کے زوال کا سبب ایک اسرائیلی لڑکا ہوگا اور بعض کے مطابق فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر منجموں اور کاہنوں نے بھی یہی دی تھی لیکن بائبل اور قرآن ان دونوں واقعات کے ذکر سے خالی ہیں۔[۷]

تورات کے مطابق فرعون نے ''دایہ'' مقرر کر دی تھیں کہ مصر میں جو لڑکا پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے قلوب میں ایسی ہمدردی نے جنم لیا کہ انھوں نے اس فعل کے لیے عملی اقدام نہ کیے۔ جب فرعون نے پوچھ گچھ کی تو یہ معذرت پیش کی کہ اسرائیلی عورتیں نازک اندام نہیں۔ اس لیے وہ ہمیں خبر نہیں ہونے دیتیں اور خود ہی بچہ جن لیتی ہیں۔ اس پر فرعون نے ایک گروہ مقرر کیا کہ وہ نئے پیدا ہونے والے ہر اسرائیلی لڑکے کو مار دیں اور لڑکیوں کو زندہ رکھیں۔[۸]

فرعون کے اس ظالمانہ حکم پر سختی سے عمل ہوا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بچہ دریا میں بہا دیا جائے، ہم اس کے محافظ ہوں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اس پر عمل کیا۔[۹]

حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل میں جوان ہوئے۔ آپ بہت طاقتور، بہادر اور عظیم الجثہ تھے۔ چہرے سے خاص جلال نمایاں تھا۔ گفتگو پُر وقعت و پُر عظمت ہوتی تھی۔ تمام اہل مصر ان کی عزت کرتے تھے۔[۱۰] وہ جوان ہوئے تو انھیں علم ہو چکا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں۔ لہٰذا مصریوں کی طرف سے اسرائیلیوں پر بلاوجہ مظالم دیکھ کر اُن کا دل کڑھتا تھا۔ حالات و واقعات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ گاہے بگاہے شہر کا گشت لگایا کرتے تھے اور حق ناشناسوں کو زیادتی سے روکتے تھے۔ اکثر مصری اسرائیلیوں پر ظلم ڈھا رہے ہوتے تو آپؑ ظالم کا ہاتھ روک کر مظلوم کی دادرسی کرتے۔ ایک دن گشت کے دوران ایک مصری کو اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو آگے بڑھ کر مصری کو تشدد سے منع کیا لیکن وہ تشدد سے باز نہ آیا۔ مجبوراً حضرت موسیٰؑ نے ظالم کو ایک گھونسا مارا۔ مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ اُسی وقت مر گیا۔[۱۱] حضرت موسیٰؑ کا ارادہ چونکہ قتل کا نہ تھا سمجھ گئے کہ شیطانی کام ہے اور شیطان دُشمن اور گمراہ ہے۔ اُس کا گمراہ کرنے والا ہونا بھی ظاہر ہے۔ فوراً معافی مانگی اور اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔[۱۲]

لیکن اُسی ہم قوم کی کم عقلی کی وجہ سے اگلے روز راز افشا ہونے کے بعد مصری اُس قتل کے بدلے حضرت موسیٰؑ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ جس کی اطلاع انھیں مومن مرد نے دے دی۔

لہٰذا حضرت موسیٰؑ مصر سے مدین کی طرف روانہ ہوئے۔[۱۳] تن تنہا، نہ کوئی رفیق نہ غمگسار، وادی مدین کی سرزمین پر پہنچے تو دیکھا کہ کنویں کے سامنے پانی کے حوض پر بہت رش ہے۔ جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے تھوڑے سے فاصلے پر دو لڑکیاں ٹھہر کر اپنے جانوروں کو بھی پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو یہاں بھی جاری ظالمانہ قانون کی سمجھ آ گئی جو کہ ہر طاقتور نے ضعیف کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اُن لڑکیوں کے پاس گئے اور اُن سے صورت حال دریافت کی۔ تمام واقعہ سُن کر آپؑ جوش میں آ گئے۔ آگے بڑھے اور تن تنہا لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ اگرچہ لوگوں کو ناگوار گزرا لیکن آپ کے جلال و طاقت سے مرعوب ہو کر ہار مان گئے۔[۱۴] جیسے ہی جانوروں نے پانی پیا۔ لڑکیاں جانور لے کر گھر چلی گئیں۔ خلافِ معمول جلد لوٹنے پر اُن کے والد کو سخت حیرانی ہوئی۔ بچیوں سے دریافت کیا تو انھوں نے تمام واقعہ سنا دیا۔ بزرگ نے حضرت موسیٰؑ کو بُلا کر پہلے کھانا کھلایا پھر تمام حالات سنے۔ تفصیل جاننے کے بعد بزرگ نے تسلی دی اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمھیں ظالموں کے پنجہ سے نجات مل گئی۔ اب خوف کا کوئی مقام نہیں ہے۔[۱۵]

پھر اس بزرگ شیخ کی بیٹیوں نے حضرت موسیٰؑ کے اچھے کردار کی وجہ سے سفارش کی کہ اُنھیں بکریاں چرانے کے لیے رکھ لیں کیونکہ وہ قوی اور امین ہیں۔ تب بزرگ باپ نے اُن کی رائے سے اتفاق کیا اور حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اگر آٹھ برس تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں گا۔ اگر مزید دو سال ملازمت اختیار کر لو تو یہی زائد عرصہ بیٹی کا حق مہر سمجھا جائے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قبول فرما لیا۔ جب ملازمت کی شرط پوری ہو گئی تو شیخ بزرگ نے اپنی بیٹی کی شادی حسبِ وعدہ حضرت موسیٰؑ سے کر دی۔

قرآن پاک میں لڑکیوں کے باپ کا نام مذکور نہیں۔ انھیں صرف ''شیخ کبیر'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں مؤرخین و مفسرین اختلاف رکھتے ہیں کہ یہ شیخ کبیر حضرت شعیب تھے یا کوئی اور۔ عام رائے یہ ہے کہ یہ حضرت شعیبؑ تھے۔ لیکن ابن کثیر نے دلائل سے اسے رد کیا ہے اور ہمارے نزدیک بھی ابنِ کثیر کی بات ہی درست ہے کہ شیخ کبیر سے مراد حضرت شعیب نہیں ہیں۔ اگر حضرت شعیب ہی مراد ہوتے تو قرآن پاک نام ضرور دے دیتا۔

کلامِ اقبال کا بحوالۂ انبیاء کرامؑ جائزہ لیں تو اُس میں ایک قطعہ ملتا ہے جس میں شعیبؑ اور موسیٰؑ کا اکٹھے ذکر آیا ہے۔ غالباً اس کی بنیاد یہی اختلافی روایت ہے۔ لیکن اقبال نے اس کے

ذریعہ امت مسلمہ کے افراد کو جو درس دیا ہے وہ شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ دیکھیے:[۱۶]

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے[۱۷]

مختصراً یہ کہ حضرت موسیٰؑ اپنے خُسر کے یہاں بکریاں چرانے کی مدت پوری کرنے کی لیے قیام پذیر رہے۔ مفسرین کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ آپ نے کُل مدت دس سال پوری کی۔ تورات کے مطابق اس کے بعد بھی کافی عرصہ بکریاں چراتے رہے۔[۱۸]

ایک روز حضرت موسیٰؑ اپنے اہل وعیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے کافی دور نکل آئے۔ رات سرد تھی۔ اس لیے سردی نے آگ کی تلاش پر مجبور کیا۔ سامنے کوہِ سینا کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک دن کے فاصلہ پر بحرِ قلزم کے دو شاخے کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا۔ آپؑ نے چقماق پتھر استعمال کیا۔ مگر سخت سردی کی وجہ سے وہ کام نہ دے سکا۔ حضرت موسیٰؑ نے سامنے وادی ''ایمن'' میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا دکھائی دیا۔ بیوی سے کہنے لگے کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لاتا ہوں تاکہ آگ سینکنے کا انتظام ہو۔[۱۹] وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ آگ عجب ہے جتنا آگے بڑھتے وہ آگ بھی آگے بڑھ جاتی تھی، نہ درخت کو جلا رہی تھی اور نہ ہی بجھ رہی تھی بلکہ اس سے درخت کی تازگی اور حسن کو اور بڑھا رہی تھی۔[۲۰] نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ آگ آسمان تک متصل تھی۔ حضرت موسیٰؑ خوفزدہ ہو کر واپسی کے لیے مڑے تو آگ قریب آ گئی اور اُس میں سے آواز آئی جو ہر جانب سے یکساں تھی اور اس آواز کو صرف کان ہی نہیں پورا بدن سُن رہا تھا۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی ط اِنِّیٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ج اِنَّكَ بِالْوَادِالْمُقَدَّسِ طُوًّیo وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰیo[۲۳]

ترجمہ: پھر جب آگ کے پاس آیا ندا فرمائی گئی اے موسیٰ بے شک میں تیرا رب ہوں تو تُو اپنے جوتے اُتار ڈال بے شک تُو پاک جنگل طویٰ میں ہے میں نے تجھے پسند کیا اب کان لگا کر سُن جو تجھے وحی ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی آواز سُنی تو حیران رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔ پھر اُسی

جانب سے ابتدا ہوئی اور دریافت کیا گیا۔[۲۴]

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى o قَالَ هِيَ عَصَايَ ج اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى o[۲۵]

ترجمہ: اور یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ۔ عرض کی یہ میرا عصا ہے میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور میرے اس میں اور کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى o فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى o قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ قف سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى o وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى o لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى o[۲۶]

ترجمہ: فرمایا اسے ڈال دے تو موسیٰ نے ڈال دیا تو جبھی وہ دوڑتا ہوا سانپ ہوگیا۔ فرمایا اسے اٹھا لے اور ڈر نہیں۔ اب ہم اسے پھر پہلی طرح کر دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بازو سے ملا خوب سپید نکلے گا بے کسی مرض کے ایک اور نشانی کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو لاٹھی زمین پر پھینکنے کا حکم دیا۔ لاٹھی ناگاہ اژدہا بن گئی۔ وہ اژدہا بھاگنے لگا۔ حضرت موسیٰؑ یہ واقعہ دیکھ کر گھبرا گئے اور بھاگنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے فرمایا اس کو پکڑ اور خوف نہ کھا۔ اسے اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیا جائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں دبالیں۔ وہ بغیر کسی مرض کے روشن (بیضاء) نکل آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ یہ اللہ کی طرف سے اُن کی نبوت کے دو بڑے نشانات ہیں۔[۲۷]

اقبال نے اپنے کلام میں اس واقعہ کی طرف اشارے مہیا کیے ہیں۔ کلام میں یہ واقعہ کہیں حقیقی مفہوم کی ادائیگی کے لیے جلوہ گر ہے اور کہیں مجازی معنوں میں، امثال ملاحظہ کیجیے:

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم[۲۸]

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَاتَخَفْ[۲۹]

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہیدِ کلیم اللّٰہی![۳۰]

از عصا دستِ سفیدش محکم است[۳۱]

ترجمہ: اس کا سفید ہاتھ عصا سے مضبوط ہے (حضرت موسیٰؑ کے یدِ بیضا اور عصا کی طرف اشارہ ہے)۔

حکیماں مردہ را صورت نگارند!
یدِ موسیٰؑ، دمِ عیسیٰؑ ندارد![۳۲]

ترجمہ: فلاسفہ مُردے کے بدن کی آرائش کرتے رہے، کیونکہ ان کے پاس نہ یدِ بیضا تھا۔ نہ دمِ عیسیٰؑ۔

در کہستاں چو کلیم آوارہ شو
نیم سوزِ آتشِ نظارہ شو[۳۳]

ترجمہ: کلیم کی مانند پہاڑوں میں آوارہ پھر اور نظارۂ جمال کی آتش سے نیم سوزرہ

دو معجزات اور بنیادی تعلیمات دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ ان نشانات کے ساتھ فرعون اور اُس کی قوم کے پاس جا کر اُنھیں راہِ ہدایت دکھائیں۔ تب حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حضور عرض کی کہ میرے ہاتھ سے ایک مصری قتل ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ علاوہ ازیں میری تکذیب کریں۔ یہ منصب عالی عطا کیا ہے تو میرا سینہ کھول دے اس اہم خدمت کو میرے لیے آسان بنا دے اور زبان میں پڑی گرہ کھول دے تا کہ لوگ میری بات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے۔ اس لیے میرے ہمراہ میرے بھائی ہارونؑ کو شریک کار (نبوت کا شریک) بنا دے کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔[۳۴] اللہ تعالیٰ نے درخواست منظور کی۔ حضرت موسیٰؑ منصب سے سرفراز ہو کر وادی مقدس سے اُتر کر بیوی کے پاس آئے اور یہیں سے حکمِ الٰہی کی تعمیل کے لیے مصر پہنچے۔ گھر گئے تو حضرت ہارونؑ منصب نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے اور حضرت موسیٰؑ کے تمام واقعہ کے بارے میں بذریعہ وحی جان چکے تھے۔ وہ گرم جوشی سے بھائی سے ملے۔[۳۵] پھر حکمِ الٰہی کے مطابق دونوں نبی و رسول بھائیوں نے فرعون کے دربار میں جا کر بے خوف و خطر پیغامِ حق سنایا اور دعوتِ توحید دی۔ اقبال نے اسرار خودی کی نظم ''در معنی ایں کہ یاس و حزن و خوف اُم الخبائث'' میں کہتے ہیں:

چوں کلیمے سوے فرعونے رود
قلب او از لَاتَخَف محکم شود[۳۶]

ترجمہ: جب موسیٰؑ فرعون کی جانب گئے، تو ان کا دل لاتخف سے مضبوط ہوا۔

فرعون نے یہ سب سُن کر موسیٰؑ سے کہا کہ میرے ہی گھر میں پرورش پانے کے بعد اور ایک مصری کو قتل کرنے کے بعد تو ایک عرصہ بعد آ کر اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیوں کر کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دلائل سُن کر گفتگو کا رُخ موڑا اور رب موسیٰؑ کی طرف کر لیا۔ وہاں سے بھی دل ہی دل میں ہار مان بیٹھا[۳۷] لیکن ظاہر نہ ہونے دیا اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں ہی تمھارا بہترین رب ہوں۔[۳۸]

پھر فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اگر وہ سچا ہے تو سچائی کا کوئی معجزہ دکھائے۔ تب حضرت موسیٰؑ نے ید بیضا اور لاٹھی کے سانپ بننے کا معجزہ دکھایا لیکن یہ سب دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری ایمان لانے کی بجائے تلملا اُٹھے اور سب نے مل کر حضرت موسیٰؑ کا ''یوم الذینۃ'' (جشن کا روز) پر معارضہ اور مقابلہ کے لیے سکندریہ بلایا[۳۹] اور تمام مشہور و ماہر جادوگروں کو دارالحکومت میں مقابلہ کے لیے جمع کر لیا۔[۴۰] مقابلہ کے دن لاکھوں انسان حق و باطل کے اس معرکہ کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ فرعون نے خوشی و مسرت سے جادوگروں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں موسیٰؑ کو شکست دینے کے بدلے میں بے انتہا انعام و اکرام کا لالچ دیا۔[۴۱]

جادوگر فرعون سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تب حضرت موسیٰؑ نے مجمع سے بھی خطاب کیا اور حق تبلیغ ادا کیا لیکن درباریوں نے دونوں بھائیوں کو جادوگر قرار دیا اور جادوگروں سے اپنا کام شروع کرنے کو کہا۔[۴۲] جادوگروں نے آگے بڑھ کر حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ابتدا تم کرو گے یا ہم کریں۔ تب حضرت موسیٰؑ نے اُنھیں پہل کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ساحروں نے ہزاروں رسیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں۔[۴۳] جو سانپ اور اژدھے کی شکل میں بھاگتی دکھائی دینے لگیں۔ تب حضرت موسیٰؑ نے خوف محسوس کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ اطلاع دی کہ خوف نہ کھاؤ تم ہی غالب رہو گے۔ اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔ حضرت موسیٰؑ نے لاٹھی کو زمین پر ڈالا تو لاٹھی نے اژدھا بن کر جادوگروں کے تمام شعبدوں کو نگل کر میدان صاف کر دیا اور اس طرح جادوگر اپنے سحر میں ناکام رہے۔[۴۴] معجزہ کے مقابلہ میں جادو کی رسوائی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور موسیٰؑ کے کرشمہ کو دیکھ کر حقیقت سمجھ لی۔ وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رب پر ایمان لے آئے۔ فرعون نے اس پاداش میں اُنھیں پھانسی دلوا دی[۴۵] لیکن اس کے باوجود حق کو فتح ہوئی اور باطل کو شکست:

اقبال کے کلام میں اس بارزۂ موسیٰؑ وفرعون پر کئی اشعار ملتے ہیں، دیکھیے:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم!
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم![۴۶]

اس واقعہ کو نظم کر کے اقبال نے عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ انھیں حضرت موسیٰؑ کی طرح آج کے فرعونوں کے سامنے بے خوف پیغامِ حق پہنچانا ہے۔ وہ اسرارِ خودی کی نظم ''در معنی ایں کہ یاس وحزن اُم الخبائث است....'' میں کہتے ہیں:

رہے ہیں اور ہیں فرعون مری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا![۴۷]

مبارزۂ حق و باطل میں حق کی فتح دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہوگئی۔[۴۸] مگر فرعون کے ظلم وستم کی وجہ سے اعلان نہ کرسکی۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں تلقین فرمائی کہ مومن ہونے کے بعد تمھارا واحد سہارا اللہ ہے۔ تب اس جماعت نے مغفرت کی دعائیں کیں اور ظالموں کے عذاب ومعصیت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے۔[۴۹]

فرعون حضرت موسیٰؑ کی روحانی طاقت وقوت کا مظاہرہ دیکھ کر مرعوب ہوا اور کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا لیکن جب ارکانِ سلطنت نے احتجاج کیا کہ وہ موسیٰؑ کو قتل کرا دے۔ تب فرعون نے اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے سے روکنے کا ایک منصوبہ بنایا کہ لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے گا اور لڑکوں کو مار دیا جائے گا۔ گویا یہ فرعون کا بچوں کے قتل کے بارے میں دوسرا اعلان تھا۔[۵۰] حضرت موسیٰؑ نے یہ اعلان سُن کر اپنے پیروکاروں کو صبر اور توکل علی اللہ کی تلقین کی اور انھیں بتایا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس لیے مت گھبراؤ تمھارے دُشمن ہی کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔[۵۱] تم سرزمین مصر میں اپنے گھروں کو ہی مسجدیں بنالو، نماز قائم کرو، اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے قومِ فرعون کے لیے عذاب کی دُعا کی۔[۵۲]

فرعون نے اپنی ربوبیت کا اعلان کیا اور اپنے مشیروں سے کہا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کو قتل کر کے اس قصہ کو ختم کردے گا۔[۵۳] فرعون باوجود ارادہ کے حضرت موسیٰؑ کو قتل نہ کرسکا اور نہ ہی اُس

کا کوئی حیلہ حضرت موسیٰؑ کو شکست دینے میں کام آ سکا تب اُس نے مسلسل اعلان شروع کر دیا کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے سرداروں کو کافی سمجھایا لیکن فرعون کے اعلانِ ربوبیت میں شدت آتی چلی گئی۔ بار بار مہلت کے باوجود قومِ فرعون نہ سمجھی۔

قرآن پاک کی سورتوں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ید بیضا اور عصا کی علاوہ حضرت موسیٰؑ کو اور بھی معجزے ملے تھے جن میں سینن (قحط)، نقصِ ثمرات (پھلوں کا نقصان) طوفان، جراد (ٹڈی دل)، قمل (جوں)، ضفادع (مینڈک)، دم (خون)، فلقِ بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصہ ہو جانا)، من سلوی (حلوا و بیٹر)، غمام (بادلوں کا سایہ)، انفجارِ عیون (پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا) شقِ جبل (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آ جانا) اور نزولِ تورات وغیرہ [۵۴] بہر حال فرعون اور اس کی قوم مسلسل سرکشی و نافرمانی کرتی رہی۔ فرعون اور مصر کے رؤسا کے رویے سے یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ اب یہ اصلاح کا راستہ اختیار نہ کریں گے۔ تب حضرت موسیٰؑ نے مکمل مایوسی کے بعد بارگاہ الٰہی میں ان کے لیے دردناک عذاب کی دعا کی [۵۵] اس دعا میں حضرت ہارونؑ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جائیں۔ حضرت موسیٰؑ نے خشکی کی بجائے بحرِ احمر کا راستہ چنا اور رات کو چھ لاکھ سے زائد بنی اسرائیل کو لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت یوسفؑ کا تابوت بھی ساتھ تھا۔ اُدھر پرچہ نویسوں کی اطلاع پر فرعون زبردست فوج ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ و بنی اسرائیل کے پیچھے پہنچا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں تسلی دی اور فرمایا خوف مت کھاؤ۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ پورا ہو کر رہے گا۔ کامیابی ہمیں ہی ملے گی پھر حضرت موسیٰؑ نے وحی الٰہی کے مطابق عصا کو قلزم میں پانی پر مارا تو پانی پھٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی مانند کھڑا ہو گیا اور درمیان میں راہ نکل آئی۔ حضرت موسیٰؑ کے حکم پر تمام بنی اسرائیل پار اُتر گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے لاٹھی سے دریا کو صحیح کرنا چاہا لیکن اللہ نے منع فرمایا۔ جیسے ہی فرعون اور اس کی قوم لشکرِ موسوی کا پیچھا کرنے کے لیے بحرِ قلزم میں داخل ہوئی۔ پانی اللہ کے حکم سے اپنی اصل حالت پر آ گیا۔ فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔ [۵۶] اقبال نے اس واقعہ کی طرف ضربِ کلیم میں اشارہ کیا ہے اور اس سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ کسی بھی قوم کے لیے کسی بڑے معجزہ کا رونما ہونا ضروری ہے۔

در گزر مثلِ کلیمؑ از رودِ نیل
سوے آتش گامزن مثل خلیل! [۵۷]

ترجمہ: کلیمؑ کی مانند دریائے نیل سے گذر جا۔ خلیلؑ کی مانند آگ کی طرف قدم بڑھا۔

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا[۵۸]

یہ واقعہ نظم کر کے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسانِ کامل کو مشکلات سے نہ گھبرانا چاہیے۔ صرف نظم ہی میں نہیں نثر میں بھی ضربِ کلیمی و عصائے کلیمی کے اشارے ملتے ہیں۔ منشی طاہر الدین کے نام ایک خط میں سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بمبئی سے لے کر اس وقت تک جہاز ''ملوجا'' بحرِ روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے سمندر بالکل خاموش ہے۔ طوفان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ موسم بھی نہایت خوشگوار رہا۔ البتہ بحرِ احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے گرم مزاج کیوں نہ ہو۔[۵۹]

حضرت موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کے بعد انھیں شریعت سے نوازا جائے گا۔ اب وعدہ الٰہی پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ آپ نے حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور حکمِ ربی کے مطابق کوہ طور پر اللہ کی عبادت کے لیے اعتکاف کے لیے چلے گئے۔ اس اعتکاف کی مدت تیس دن تھی لیکن بعد میں دس یوم بڑھا کر چلّہ مکمل کیا۔[۶۰] چلّہ مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں ہم کلامی کا شرف بخشا۔ تب حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے دیدار کی درخواست کی۔ جواب ملا کہ اے موسیٰؑ آپ اس مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لا سکیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر فرمائیں گے۔ اگر اس پہاڑ نے تجلی برداشت کر لی تو پھر ہم سے سوال کرنا۔ پھر جیسے ہی تجلیِ حق پہاڑ پر پڑی۔ پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ہوش میں آتے ہی حضرت موسیٰؑ نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور کہا وہ سب سے زیادہ یقین کرنے والوں میں سے ہیں۔[۶۱] قرآن پاک کی سورہ الاعراف میں ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَ کَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝[۶۲]

ترجمہ: اور جب موسیٰ ہمارے وعدہ پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام فرمایا عرض کی اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا ہاں اس

پہاڑ کی طرف دیکھ یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا پھر جب اس نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ گر کر بے ہوش ہوا۔ پھر جب اسے ہوش آیا، بولا پاک ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

اقبال نے اپنے کلام میں اس واقعہ کا ذکر کئی مقامات پر کیا ہے اور اس واقعہ سے مختلف نکات اخذ کیے ہیں۔ چند امثال ملاحظہ کیجیے:

جا تو نکلوں وادیٔ ایمن میں میں بھی اے کلیم!
لن ترانی کہہ نہ دے وہ شوخ بے پروا مجھے[۶۳]

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی[۶۴]

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی![۶۵]

جائے حیرت ہے بُرا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
کیا خبر ہے کی تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا؟[۶۶]

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی!
گیا دُورِ حدیثِ لن ترانی!
ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی[۶۷]

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد
نگاہِ شوق در امید و بیم است
نمیگردد کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است[۶۸]

ترجمہ: خرد کہتی ہے کہ اسے آنکھ دیکھ نہیں نہیں سکتی، (اس سے) نگاہِ شوق امید و بیم میں ہے۔ طور کا واقعہ اب بھی دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ ہر دل میں وہی تمنا ہے۔ جس کا اظہار موسیٰؑ نے کیا۔

اقبال نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی اس عظیم واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دیدارِ الٰہی صرف حضرت موسیٰؑ اور اُن کی قوم ہی کی خواہش نہ تھی آج کا ہر انسان بھی اسی خواہش کا اسیر نظر آتا ہے۔

بقول اقبال:

"مکان و زمان اشیا کی حقیقت انسان سے پوشیدہ ہے۔ ہر انسان کے دل میں ایک ہوس ہے ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ اسے نظام عالم کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یہود کا یہ سوال ولن نومن حتی نری اللہ جھرۃً (ہم خدا پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اسے عیاناً نہ دیکھ لیں) اسی ہوس کا نتیجہ تھا۔ خود موسیٰ کلیم اللہ نے بھی رب ارنی انظر الیک کی درخواست کی تھی۔ غرض مشاہدہ کی ہوس عالمگیر ہے۔۔۔۔۔موسیٰؑ کی کہانی پرانی نہیں آج بھی ہر شخص اَرِنی کہہ رہا ہے۔"[۶۹]

اقبال نے اس واقعہ کو نظم کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر خودی، خودیِ مطلق کو دیکھنے کے لیے بے تاب و بے قرار ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی اصل سے مل کر طاقت و قوت دائمی پانا چاہتی ہے۔
اس تمام راز و نیاز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو تورات کی لکھی لکھائی تختیاں عطا کی گئیں۔[۷۰]

اسی دوران ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جانے سے پہلے بتایا کہ وہ ایک ماہ کوہِ طور پر اعتکاف کرنے کے بعد تورات لے کر آئیں گے۔ تب تک حضرت ہارونؑ تمھارے نگران ہوں گے۔ مگر کوہِ طور پر جا کر اس مدت میں دس دن کا اضافہ ہو گیا جس سے سامری نے فائدہ اُٹھایا۔ اس نے قوم سے سونا اکٹھا کر کے ایک بچھڑا بنایا اور جادو کے زور سے اس میں آثارِ حیات پیدا کیے اور صدیوں سے غلام، غور و فکر، تدریج و تامل سے عاری قوم کو اپنی حیرت انگیز شیطانی ایجاد سے گوسالہ پرستی کی طرف راغب کر لیا۔ وہ بچھڑے کی پرستش کرنے لگے۔[۷۱] اور حضرت ہارونؑ کے سمجھانے سے بھی گوسالہ پرستی سے باز نہ آئے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بذریعہ وحی اس تمام واقعہ کی اطلاع دی[۷۲] تو حضرت موسیٰؑ قوم کی اصلاح کے لیے لوٹ آئے۔ آ کر حضرت ہارونؑ کو بھی سرزنش کی۔ پھر اصل حقیقت جاننے کے بعد حضرت ہارونؑ سے دل صاف کیا اور سامری کی خبر لی۔ گوسالہ جلا کر دریا میں بہا دیا۔ اصل حقیقت حال قوم کے سامنے پیش کی۔ انھیں ایک اللہ کی عبادت کا سبق دیا اور قوم کی اس خطا پر سجدہ ریز ہو کر اللہ سے معافی مانگی جو اللہ نے قبول فرما لی۔

اقبال نے اپنے کلام میں اس واقعہ کی طرف اشارے مہیا کیے ہیں اور موجودہ دور میں پھر

ایسے کلیم کی ضرورت پر زور دیا ہے جو طلسمِ سامری کو مٹا ڈالے۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری[43]

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری[44]

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری
آن ہمہ جذبہ کلیم، ایں ہمہ سحرِ سامری
ضربِ قلندری بیار، سدِّ سکندری شکن
رسمِ کلیمؑ تازہ کُن، رونقِ ساحری شکن[45]

ترجمہ: ضربِ قلندری پیدا کر (اور اس سے (سدِّ سکندری توڑ ڈال!
حضرت موسیٰؑ کی روایت تازہ کر، سامری کی رونق ختم کر دے۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ اُس ملاقات کا ہے جو ان میں اور ایک صاحب باطن ہستی حضرت خضرؑ کے درمیان ہوئی اور حضرت موسیٰؑ نے اُن سے عالم تکوینیات کے بعض اسرار و رموز سے آگاہی پائی۔ اس ملاقات کا تفصیلی ذکر سورۃ کہف اور صحیح بخاری میں ملتا ہے[46] اس تمام تفصیل کا خلاصہ یوں ہے۔

ایک روز حضرت موسیٰؑ سے خطاب کے دوران کسی شخص نے دُنیا کے سب سے بڑے عالم کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا مجھے خدا نے سب سے زیادہ علم سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی فوراً بذریعہ وحی تنبیہ کی اور فرمایا کہ ''مجمع البحرین'' میں ہمارا ایک بندہ ہے۔ جو بعض امور میں تجھ سے بڑا عالم و دانا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اُس بندے تک رسائی کا طریقہ دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنے توشہ دان میں رکھ لو۔ جس مقام پر وہ گُم جائے۔ اُسی مقام پر تم اُس شخص کو پاؤ گے۔ حضرت موسیٰؑ نے مچھلی کو توشہ دان میں محفوظ کیا اور اپنے خلیفہ یوشعؑ بن نون کے ہمراہ اس نیک مرد کی تلاش میں نکل پڑے۔ راستے میں ایک مقام پر مچھلی زندہ ہو کر پانی میں کود گئی لیکن حضرت یوشعؑ نے اُس وقت حضرت موسیٰؑ سے اس کا ذکر نہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو جب بھوک نے بہت ستایا تو اُس مچھلی کے بارے میں دریافت کیا تب حضرت یوشعؑ نے بتایا کہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں کود گئی اور وہ بتانا بھول گئے تھے۔ حضرت

موسیٰؑ اس مقام کی تلاش میں تھے۔ دونوں واپس اُسی مقام پر پہنچے تو اس جگہ ایک عمدہ لباس والے آدمی کو دیکھا، سلام کیا اور بتایا کہ وہ اُن سے اللہ کا عطا کردہ علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ تب حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ وہ صبر نہ کرسکیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ وہ صابر رہیں گے اور ارشاد کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ حضرت خضرؑ نے کہا کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے آپ کسی بھی دیکھے گئے معاملہ کے بارے میں سوال نہ کریں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے منظور کرلیا پھر دونوں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ سمندر کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ ملاحوں نے حضرت خضرؑ سے شناسائی کی وجہ سے اُن کے اصرار کرنے کے باوجود کرایہ نہ لیا۔ کشتی چل پڑی لیکن کچھ دیر بعد ہی حضرت خضرؑ نے کشتی کے سامنے والے حصہ کا ایک تختہ اُکھاڑا اور اُس میں سوراخ کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ سے یہ ضبط نہ ہوسکا اور انھوں نے خضرؑ کو اس فعل پر تنبیہہ کی کہ یہ نازیبا حرکت ہے۔ تب حضرت خضرؑ نے کہا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کرسکیں گے۔ آخر وہی ہوا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ میں بھول گیا تھا۔ اس لیے بھول چوک پر پکڑ نہ کریں اور میرے معاملہ میں سختی سے کام نہ لیں۔ کشتی کنارے پر لگی اور دونوں اُتر کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ سمندر کے کنارے ایک میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خضرؑ نے اُن میں سے ایک بچہ پکڑا اور قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ صبر نہ کر سکے فرمایا ''ناحق ایک معصوم جان کو مار کر آپ نے بہت برا کیا'' حضرت خضرؑ نے کہا، میں نے آغاز ہی میں بتا دیا تھا کہ آپ میرے ہمراہ رہ کر ضبط وصبر سے کام نہ لیں سکیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اس مرتبہ نظر انداز کر دیں۔ اس کے بعد بھی اگر مجھ سے صبر نہ ہوسکا تو پھر عذر کا کوئی موقع نہ رہے گا۔ اس کے بعد آپ مجھ سے علیحدہ ہو جایئے گا۔ دونوں آگے روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک ایسی خوشحال بستی میں پہنچے جس کے مکینوں نے آسودہ حالی کے باوجود دونوں ہستیوں کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اس بستی میں حضرت خضرؑ ایک مکان کی طرف بڑھے اور اس کی وہ دیوار ہاتھ کا سہارا دے کر سیدھی کر دی جو گرنے کے قریب تھی۔ اس موقع پر حضرت موسیٰؑ نے پھر ٹوکا اور فرمایا کہ آپ نے بغیر معاوضہ دیوار درست کر دی۔ کچھ اُجرت طے کر لیتے تو ہم اپنی بھوک پیاس ہی مٹا لیتے۔ تب حضرت خضرؑ نے فرمایا کہ اب میری اور تمھاری جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ ہاں جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہوسکا اُن کی حقیقت تمھیں بتا دیتا ہوں۔ سب سے پہلے کشتی کا معاملہ لو۔ وہ چند مساکین کی تھی۔ وہ سمندر میں مزدوری کرتے تھے۔ وہ جس منزل کی طرف رواں دواں تھے

وہاں کا ظالم بادشاہ ہر اچھی کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔ مَیں نے کشتی میں عیب اس لیے لگایا کہ بادشاہ اُسے نہ لے۔ رہا لڑکے کا معاملہ تو وہ مومن ماں باپ کا بچہ تھا لیکن مجھے ڈر لگا کہ وہ بچہ کفر و سرکشی کی وجہ سے اپنے والدین کو تکلیف دے گا۔ پس مَیں نے چاہا کہ اللہ انھیں اُس لڑکے سے دینداری اور محبت میں بہتر لڑکا دے گا۔ اور جو دیوار درست کی ہے وہ شہر کے یتیم لڑکوں کی ہے جس کے نیچے اُن کا خزانہ محفوظ ہے۔ پس تمھارے پروردگار نے چاہا کہ دونوں لڑکے اپنی جوانی کو پہنچ کر اپنا محفوظ خزانہ نکال لیں یہ اُن لڑکوں کے حال پر پروردگار کی مہربانی تھی جو اس طرح ظہور میں آئی اور یاد رکھو میں سب کچھ اپنے اختیار سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے کیا۔ یہ حقیقت حال ہے جس پر تم صبر نہ کر سکے۔

اقبال نے اتنے طویل قصے کو کس خوبصورت انداز میں ایک شعر میں سمو کر پیش کیا ہے، دیکھیے:

''کشتیِ مسکین'' و ''جانِ پاک'' و ''دیوارِ یتیم''
علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش[۷۸]

حضرت موسیٰؑ کی قوم مسلسل وعدہ فراموشی کرتی رہی اُن کی اس وعدہ فراموشی سے عاجز آ کر آپ نے اللہ کے سامنے عرض کی کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی پر اختیار نہیں۔ قوم عمالقہ پر جہاد کی مہم کو کس طرح سر کیا جائے۔ اے اللہ تو ہی ہم دونوں اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما۔ تب اللہ تعالیٰ نے چالیس سال تک سرزمینِ شام اُن کے لیے حرام کر دی۔ وہ وادی تیہ میں گھومتے رہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ بھی اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لیے موجود رہے۔ ان کے ہمراہ دو اور نیک بندے یوشعؑ بن نون اور کالب بن یوفنا بھی تھے۔ ان ہستیوں کے طفیل اس قید و سزا کے دور میں بھی اُن پر انعامات ہوتے رہے۔ اسی دوران حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی وفات ہوگئی۔[۷۹] تورات میں ہے کہ اس وقت آپ کی عمر ۱۲۰ سال تھی۔[۸۰] ابن کثیر نے بھی اِسی کی تائید کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قید کی مدت ختم ہونے کے بعد اسرائیلی حضرت یوشعؑ بن نون کی قیادت میں جہادِ بیت المقدس کے لیے روانہ ہوگئے۔

کلامِ اقبال کا جائزہ لیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے کلام میں صرف حضرت موسیٰؑ کی سیرت کے اہم واقعات کی طرف ہی اشارے مہیا نہیں کیے بلکہ ہستی پاک کو اس طرح سے علامتی انداز میں برتا ہے کہ یہ اپنے بنیادی تصور کے ساتھ ساتھ کچھ اور تلازمات بھی ذہن میں ابھارتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں کلیم اور عصا لازم و ملزوم ہیں۔ اقبال نے بھی انھیں لازم و ملزوم ہی ٹھہرایا

ہے۔ بنیادی طور پر ''کلیم'' اور اس سے وابستہ ''عصا'' توانائی وقوت کی علامات ہیں۔ جن کی ضرورت ہر دور میں ہے اور رہے گی۔[۸۱] قوت وطاقت کی یہ علامات اقبال کے ہاں ایک دوسرے حوالے سے عمل کرتی ہیں۔ ''عصا'' توانائی کا خارجی مظہر ہے۔ اس لیے عصا کی بھی کافی اہمیت ہے۔ اقبال نے ''عصا'' کی علامت کو حیاتیاتی توانائی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے بڑے زور وشور سے استعمال کیا ہے۔ بے شک عصا حیاتیاتی توانائی کی علامت ہے جس سے برتر کسی بھی توانائی کے وجود کو خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔ یہ بات اس علامت کے تاریخی پس منظر میں پوری وضاحت سے پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ریاض رقم طراز ہیں:

> ید بیضا (دست سفید) اور عصا (چوب) کے کلیمی معجزات، قوت وسطوت کے مظہر ہیں، جن کی مدد سے مخالفوں کو دبایا اور قوانین حقہ کو جاری کیا جاتا ہے۔ عصا کی مدد سے چشمے جاری کرنا، تسخیر کائنات، ضبطِ نفس اور تکاملِ خودی کی علامت ہے۔ یہ معجزات بے خوف وحزن زندگی کے آداب سکھاتے ہیں۔[۸۲]

غالباً یہی سبب ہے کہ اقبال نے عصا پر زیادہ زور دیا کہ معرکۂ خیر وشر اب ہمیشہ سے بڑے پیمانے پر جاری وساری ہے جس میں صرف روحانی طاقت کام نہیں آ سکتی۔ یہ بھی واضح ہے کہ موجودہ دور میں فرعونی قوتیں جدید ترین مادی اور سائنسی آلات ووسائل کی مالک ہیں۔ چنانچہ اگر خیر کی قوتیں ان جدید سائنسی وسائل کو گرفت میں نہیں لیں گی اُن پر قابو نہیں پائیں گی تو باطل قوتوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی اور نہ ہی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکیں گی۔ دراصل اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حق بھی دنیا میں طاقت وقوت کے بل بوتے پر حق بنتا ہے۔ وگرنہ باطل طاقت وقوت کے زور پر حق بننے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے سچائی وحق کو قوت کے بغیر نامکمل قرار دیا۔ وہ بالِ جبریل کی غزل نمبر ۵۰ میں کہتے ہیں:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد[۸۳]

وارث میر لکھتے ہیں:

> اقبال کی شاعری میں فلسفۂ حق وباطل اور تخریب وتعمیر جاری وساری ہے۔ قرآنی اصولوں کے تحت تخریبی عناصر ہمیشہ برباد ہوتے ہیں اور تعمیری طاقتوں یعنی حق وانصاف کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔[۸۴]

''عصا'' زندگی کی توانائی اور ایک معجزاتی عنصر کا مالک ہے۔ معجزاتی سطح پر ''عصا'' ایک ودیعت ہے جو عام عقلی اور سائنسی اصولوں سے بالاتر ہے۔ لیکن اگر عصا کا تقابل وموازنہ اسی نوع کی ایک اور طاقت وقوت ''ساحری'' سے کیا جائے تو ''عصا'' کی نوعیت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ''ساحری'' بھی درحقیقت حیات کا معجزاتی اظہار ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر غیر موجود، نقلی کو اصلی اور غیر حقیقی کو حقیقی بنانے کی سعی کرتا ہے جو مصنوعی اور عارضی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ اسلام کے برعکس دوسری تہذیبیں بھی معجزاتی توانائی کی مالک ہیں۔ ان کے پاس مافوق الفطرت طاقت وقوت ہے جن کی مدد سے وہ زندگی میں تصرف سے تبدیلی پیدا کرسکتی ہیں مگر یہ تصرف اور تبدیلی اصلی نہیں مصنوعی اور نظر کا دھوکہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ساحروں کے مصنوعی سانپ، عصائے کلیمی کے سامنے مٹ گئے۔ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی میں دو قوتیں رونما ہیں۔ ایک حق کی اور دوسری باطل کی، حضرت موسیٰؑ حق کے نمائندہ اور فرعون باطل کا۔[۸۵] اقبال ان دو قوتوں کے ذکر سے مخاطب کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس دُنیا میں باطل نظریات اور نظام ہائے حیات اپنی ظاہری آب وتاب، آن بان اور قوت سے موجود ہیں اور اپنے ظاہری وجود کی جاذبیت سے انسانوں کو مرعوب کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر ان میں توانائی کی ایک ایسی لہر ملتی ہے جس کے سامنے حق اور سچائی خس وخاشاک کا درجہ رکھتے ہیں اور اسی توانائی کے بل پر وہ انسانوں کا غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ خدائی کے دعویدار بھی بن جاتے ہیں اور یوں انسانیت کو ذلیل کرتے ہیں۔ لیکن جب حق اور سچائی کا اظہار کلیمی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے تو باطل فوراً میں مٹ جاتا ہے۔ کلیمی اس ''ساحری'' کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک اس امر کی ضرورت ہے کہ زندگی کے حیاتیاتی اور مادی وسائل کو کلیمی کی سطح پر گرفت میں لیں۔ تبھی مسلمان دورِ حاضر میں اپنے وجود کا جواز پیش کر سکتے ہیں۔

بلاشبہ اقبال نے بڑی شدو مد سے ''عصا'' کی ضرورت کو اُجاگر کیا ہے جس سے حیاتیاتی توانائی کی اہمیت کا احساس اُبھرتا ہے لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ اس سائنسی یا مادی توانائی ہی کو افرادِ ملّت اپنا مقصود قرار نہ دے لیں۔ اقبال نے کلیم کے ساتھ ''تجلی'' کا تلازمہ برتا ہے۔ تجلی کا تعلق اللہ سے ہے جو بالذات ''قوی'' ہے۔ گویا تجلی درحقیقت روحانیت ہے جو طاقت کا غالب عنصر بھی رکھتی ہے اور کلیم کی ہر نوع کی قوت وطاقت کا منبع ہے۔ یہ تجلی افراد میں غیر محسوس طریقے سے سرایت کر کے اعصاب پر محیط ہو جاتی ہے جس کے بعد فرد میں ایک ایسی طاقت اور قوت جنم

لے لیتی ہے کہ وہ سوائے اللہ کے کسی کا خوف اور ڈر دل میں نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی کے آگے جھکتا ہے۔ فرد کو اس تجلّی کے غالب ہونے کے بعد عشق کی باطنی واردات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات کی شناخت کے بعد وہ ذاتِ حق کی شناخت کرتا ہے۔ اس شناخت کے بعد وہ کلیمی کی سطح پر نفس کے استحکام کو چھوتا ہے۔ درحقیقت اقبال نے کلیم کی توانائی کو عشق و ایمان کے حوالے سے لیا ہے اور اس پر گرفت پانے کی کوشش کی ہے:

کب تک طور پر دریوزہ گری مثلِ کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر[۸۶]

''اللہ اَحَد'' محسوسات سے ماورا ہے۔ اس کو گرفت میں لینے کے لیے وجدانی سطح پر فعال و متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ چیز عشق و ایمان کی بدولت جنم لیتی ہے۔ ذاتِ واحد کے لیے صرف ایمان نہیں بلکہ ایمان بالغیب چاہیے۔ ''غیب'' سے وابستہ تصورِ حقیقت کو مغربی مادہ پرست منہاج نے گزند پہنچائی اور خود مسلمانوں نے بھی حاضر و موجود کو حقیقت کے مترادف خیال کیا۔ ''غیب'' سے رابطہ و تعلق منقطع کر لیا۔ یہ ''غیب'' ہی مسلمانوں کے لیے قوت و توانائی کا حوالہ تھا۔ اس لیے وہ اس سرچشمہ توانائی سے کٹ گئے۔[۸۷] چنانچہ اقبال نے جب کلیم اللہ سے یہ سوال کیا کہ:

آتشِ نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز
ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوزِ کُہن؟

تو کلیم (حضرت موسیٰؑ) یوں گویا ہوئے:

تھا جوابِ صاحبِ سینا کہ مسلم ہے اگر
چھوڑ کر غائب کو تُو حاضر کا شیدائی نہ بن
ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
ہے اگر دیوانۂ غائب تو کچھ پروا نہ کر
منتظر رہ وادیِ فاراں میں ہو کر خیمہ زن
عارضی ہے شانِ حاضر، سطوتِ غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ جان و تن
شعلۂ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا

"شمع خود را می گدازد درمیانِ انجمن
نورِ ما چوں آتشِ سنگ از نظر پنہاں خوش است"[۸۸]

اقبال کے خیال میں اس نورِ باطنی کا عشق ہی کے حوالے سے اظہار ممکن ہے۔ چنانچہ کلیم کا کردار بنیادی طور پر فلسفی یا حکیم کے برعکس ایک عاشق کا کردار ہے جس کو اللہ سے ملنے کی شدید خواہش اپنی انتہا کو مس کر رہی ہے۔ اس رابطہ کا مقصد ایسی طاقت وقوت کا حصول ہے جس کی مدد سے جامد اور سکونی تصورات سے افراد و قوم کو نکالا جائے اور انھیں حیاتِ تازہ عطا کر دی جائے۔ چنانچہ اقبال کے خیال میں مسلمان اب تک اس لیے لا حاصل ہیں کہ وہ عشق وطلب کے رویے سے دور ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ جواہر موسویت ہیں۔ موسویت عشق وطلب سے عبارت ہے۔ سر بلندی کا جذبہ اور مقام عزت کا حصول ایک منزل کے بعد دوسری منزل کو پانے کی تڑپ کا ایک سلسلہ جو کبھی سرد نہ ہو۔[۸۹] اقبال کی خواہش ہے کہ مسلمان اسی عشق وطلب کے رویہ کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیں۔ کیونکہ آج بھی جلوۂ طور انھیں پکار رہا ہے:

خیمہ زن ہو وادیِ سینا میں مانندِ کلیم
شُعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر[۹۰]

تم میں حُوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طُور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں[۹۱]

ہر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے![۹۲]

عشق کے اس رویہ کا حاصل قوتِ کلیمی ہے۔ جو فرعونی (طاغوتی) قوت و طاقت کے بالمقابل زندگی کے ثبات اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ کلیم کے اس رویہ کے حوالے سے بھی اقبال عقل کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ قوتِ عشق کے سامنے عقل کی شعبدہ بازیاں بسا اوقات ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ حقیقت تاریخ سے عیاں ہے کہ قوموں کی زندگی کا انقلابی عمل عشق کی قوت کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ عشق کی اس قوت کا اظہار محمد ﷺ کی سطح پر ہو یا کلیم اللہ کی سطح پر قوموں کو ذلالت ور ذالت سے نکالتا ہے اور عظمت و بلندی عطا کرتا ہے۔ یہ شے اقبال کے ہاں ایک سچائی کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ ضربِ کلیم کی نظم "اہل مصر سے" میں کہتے ہیں:

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم!
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ اُمم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم!
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے، کبھی چوبِ کلیمؑ![۹۳]

کلامِ اقبال میں کلیم کی ایک اور جہت کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں اور وہ جہت ہے "علم" کی۔ جہاں تک کلیمؑ کی وحی سے رابطے کا واسطہ ہے تو یہ ایک ایسا رخ ہے جو قوت سے بھر پور ہے۔ عام انسان اس سے تہی ہیں۔ وہ اکتساب سے اسے حاصل بھی نہیں کر سکتے۔ علم کے اس ذریعہ میں غور وفکر، بحث و مباحثہ، منطقیانہ فکر ونظر اور ترغیب مقدمات کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس علم کو انسانی وسائل کے بغیر ان لوگوں کو عطا فرماتا ہے[۹۴] لیکن یہ حقیقت ہے کہ "علمِ وحی" ہی ذات واحد سے تعلق کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم اس قابل نہیں ہے۔ اس وسیلے سے اس علم کے فیوض و برکات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اقبال جب افراد کو تجلی سے عاری کہتے ہیں تو درحقیقت اُن کی مراد اس سرچشمۂ علم "وحی" سے افراد کی لاتعلقی اور دوری کا اظہار ہے۔ کلیم کے حوالے سے تعلیم کے جس پہلو کو اُبھارا گیا ہے اس میں خصوصاً ماحول کے اثرات کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مخصوص نہج پر افراد کی تربیت کن نتائج کو جنم دیتی ہے۔ لہٰذا اقبال نے کلیم کے مضافات میں جس ماحول کی تصویر کشی کی ہے مثلاً "ہوائے دشت"، "صحرا"، "کوہ"، "بیابان"، "آتش" وغیرہ۔ فطرت کے یہ تمام مظاہر تندی و تیزی، وسعت و کشادگی اور سختی و بلندی کے عکاس ہیں جس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی متعین نتائج کے حصول کے لیے تیار کیا جانا ضروری ہے۔ ہوائے دشت اور کوہ وصحرا کو کلیمی کے لیے ضروری ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ اقبال نے کلیم کے لیے دو اور تلازمے شبانی وشعیب کے بھی اُبھارے ہیں[۹۵] اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مردِ کامل کی رہبری ورہنمائی اور صحبت اور سازگار ماحول خودی کی شناخت، تربیت اور استحکام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ وہ ضربِ کلیم کی

نظم ''خودی کی تربیت'' میں کہتے ہیں:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز![۹۶]

وہ خودی جس نے ایمان و عشق میں تربیت پائی ہو۔ اس کے نتائج بھی اُن نتائج سے مختلف النوع ہوں گے جو خودی کی اس تربیت سے پیدا ہوں جو عقلی علوم کے حوالے سے کی گئی ہو۔ اقبال عقلی علوم کی مخالفت نہیں کرتے لیکن اس سے وہ گر گرفت میں نہیں آتا جو معرکۂ حق و باطل میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے۔ عقلی علم مصلحت اندیشی کو جنم دیتا ہے نیز فلسفیانہ تفکر اس کا خاصہ ہے جو انسانی توانائی کو فکری اُلجھاؤ ہی میں ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ عقلی علوم کے تحصیل یافتہ حیات کے اعلیٰ تخلیقی امکانات پر گرفت حاصل کرنے کے صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ زندگی میں کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ علم کس درجہ اپنے عامل کی عملی قوتوں کے تحرّک کا سبب بنتا ہے۔ اگر افراد افکار ہی کی دُنیا میں اُلجھ جائیں تو اس کا ماحصل سوائے تشکک کے کچھ نہیں اور یہ انسانی ذات کی تنظیمی قوتوں کے خاتمہ کا باعث ہے۔ مجرد افکار کی دُنیا سے عمل کی دُنیا تک کا سفر کلیمی جرأت کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ عمل کے اس دائرہ میں داخل ہونے کا مطلب ہے خودی نے کشمکش حیات اور پیکارِ حیات کو صداقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ مشکلات و مصائب کا قدم قدم پر پیش آنا یقینی ہے اور اسی کے بعد حقیقت مطلق تک رسائی ممکن ہے۔ چنانچہ اقبال کے خیال میں مجرّد افکار کی سطح عبور کرنے اور حصول خودی کے لیے ''ضربِ کلیمی'' درکار ہے۔[۹۷] اس ضرب سے مشکلات میں رہنمائی میسر آتی ہے اور معرکۂ حق و باطل میں ثابت قدمی جنم لیتی ہے۔ دنیا محیر العقول معجزے دیکھتی ہے جو منبع حق ہوتے ہیں۔ یوں کامیابی ''کلیمیت'' کا مقدر بنتی ہے اور شکست ''فرعونیت'' کا مقدر۔ اگرچہ باطل کوششِ فرعونی بھی عارضی اثر رکھتی ہے لیکن یہ اثر جلد ختم ہو جاتا ہے جبکہ حق کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

معجزۂ اہلِ فکر، فلسفہ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طُور[۹۸]

وہ نظم ''ماہرِ نفسیات سے'' میں یوں مخاطب ہوتے ہیں:

جُرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے[۹۹]

علم وحی کے حوالے سے اس بحث سے ظاہری طور پر تو یہ تاثر ملتا ہے کہ اقبال مروج علم کے مخالف ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت اقبال اُس علم کو حقیقی علم سمجھتے ہیں جس کی تصدیق قرآن وحدیث سے ہو۔ اسے اقبال عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۰۰] لیکن اس میں توازن و اعتدال کا غلبہ نظر آتا ہے۔ وہ عقل کو بھی اہمیت دیتے ہیں، اسی لیے تو کہتے ہیں:

وہ علم ، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم![۱۰۱]

ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

اقبال کی شاعری محض نظریاتی ، جمال آرائی نہ تھی۔ اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز کی غلامی کے دور میں ایثار اور جرات کی کمی تھی اور یہ جرات اور ایثار عشق کے جذبے ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے بار بار عشق کو عقل کا رہنما قرار دیا۔[۱۰۲]

اقبال کے ہاں ''کلیمی'' کا اظہار تمام علوم وفنون اور ہنر میں ضروری ہے کہ اسی سے افراد و اقوام کی بقا وزندگی ہے۔ کلیمی ہی ادب اور آرٹ میں جبروتی شان جنم دیتی ہے جس کے سامنے مصنوعی چمک ودمک ماند پڑ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اقبال کے یہاں ''کلیمی'' ایک ایسا معیار یا قدر ہے جو اشیا و افراد اور روایات کے غلط اور درست کی وضاحت کرتی ہے۔ کلیمی کی قوت سے عاری چیزیں اقبال کے نزدیک بے وقعت ہیں کیونکہ یہ حیات میں ناطاقتی اور بے قوتی کی تخلیق کا سبب بنتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں زندگی عروج کی بجائے پستی کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فنونِ لطیفہ میں بھی جب اس رویہ کا اظہار ہوتا ہے تو یہ ادنیٰ درجے کا تخلیقی اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کلیمی کی خوبی سے مزین علوم وفنون اپنی طاقت وقوت اور توانائی سے نئی زندگی کی تخلیق اور روح کا ارتعاش بدن کی حرکات سے ظاہر کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔[۱۰۳]

بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

اچھا ہنر وہ ہے جس سے بقول ٹینی سن ملتوں کے قلوب استوار ہوں اور جو قوموں کا رُخ انحطاط سے عروج کی طرف پلٹ دے۔[۱۰۴]

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا![۱۰۵]

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی!
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیِ کام ودہن
صلہ اس رقص کا ہے درویشی و شاہنشاہی![۱۰۶]

اگر دیگر تمام اشیا کی اقدار کے لیے کلیمی، رد و قبول کا ایک پیمانہ ہے تو خود کلیمی کی صحت کے لیے اقبال کے ہاں قومی یا اجتماعی وجود ایک معیار ہے۔ قومی سطح پر اس کا مطلب یہ ہے ملک و قوم کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھ میں ہو جو توانائی کو ملک و قوم کی بقا کے لیے حاصل کریں اور مصرف میں لائیں پھر جو ہیئت اجتماعیہ اسلام کے حوالے سے وجود میں آتی ہے اُس کی حفاظت اور بقا کے لیے سعی و جہد تو بذات خود ایک دینی فریضہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوت جو ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کو گزند پہنچانے کا باعث بنے وہ شر اور لعنت ہے اور یہ رویہ غلامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ غلامی وہ لعنت ہے جو قوموں کے مزاج اور معیارات کو بدل دیتی ہے۔[۱۰۷]

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ رُوباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی![۱۰۸]

الغرض کلیمی اپنے مکمل روحانی اور حیاتیاتی وجود کے ساتھ زندگی میں ثبات و قیام کے لیے ضروری چیز ہے۔ فرد ہو یا قوم کلیمی کی قوت کے بغیر اُس کا وجود مشکوک رہتا ہے۔ کسی بھی لمحے کوئی فرعونی طاقت مقابلے میں آ کر اسے تباہی و بربادی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ چنانچہ اقبال مسلمان کو اسی شے کے حصول کی طرف راغب کرتے ہیں تاکہ مسلمان ذاتِ واحد سے طاقت و قوت حاصل کرے اور زندگی کے باطل نظاموں اور نظریات کو 'ضربِ کلیمی' سے ختم کر دے۔

خدائی کے دعویداروں کا نام نشان مٹا دے اور توحید کا بول بالا کرے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی اور قومی وجود کا ثبات و قیام اور بقا قوتِ موسوی کی بدولت ممکن ہے۔ خالی افکار بے فائدہ ہیں۔[۱۰۹]

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سر بکف![۱۱۰]

زندگی کی اس بنیادی صداقت کو جب خودی اس سطح پر پا لیتی ہے تو تمام فرعونی (طاغوتی) طاقتیں اور ابلیسی تصورات اس کے سامنے دم توڑ دیتے ہیں۔

اسی لیے تو اقبال ایک ایسے انسانِ کامل کی آمد کے لیے دعا گو ہیں۔

۱۔ جس کے فقر پہ اندازِ کلیمانہ کا غلبہ ہو

نصیبِ خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ[۱۱۱]

۲۔ جو اپنی خودی کو بلند کرے اور اپنی ہستی ہی سے شعلۂ سینائی کو جنم دے کہ یہ شعلۂ سینائی ہر مردِ حق میں موجود ہے۔ ضرورت اس کی شناخت کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کی ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مصنف جسٹس جاوید اقبال، (مرتب) ڈاکٹر افتخار صدیقی، (مترجم) شذرات فکرِ اقبال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۷۶

۲۔ شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، المدینہ پبلشرز، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص: ۷۳

۳۔ محمود عاصم مرتب، اقبال کے ملی افکار، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۶۳

۴۔ حوالہ مذکورہ بالا

۵۔ ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعمادالدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج: ۱، نفیس اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۷۴

۶۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، حصہ اوّل، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص: ۳۶۳

۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج: ۳، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بارہشتم ۱۹۸۸ء، ص ۶۱۵۔ نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد، ضیا القرآن، ج: ۱، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۴۰۲ھ، ص: ۵۵۔ امیر علی،

مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص ۴۰۶۴۔ وحید الزمان، علامہ نواب، تبویب القرآن، ج:۲ نعمانی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۶۳۲

۸- تورات، عہد عتیق، خروج: باب:۱، آیت:۱۵-۲۲، سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء
۹- طٰہٰ:۲۰، آیت:۳۹
۱۰- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداءعماد الدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۲۷۸
۱۱- قصص:۲۸، آیت:۱۵
۱۲- ابن کثیر، ابوالفداءعماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو) ج:۴، پ:۲۰، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، س ن، ص:۲۱
۱۳- القصص:۲۸، آیت:۱۵-۲۰۔ نیز دیکھیے: تورات، عہد عتیق، خروج:۲، آیت:۱۱-۱۴۔ مدین: عربی روایات کے مطابق خلیج عقبہ کے غربی ساحل پر مقنا سے چند میل شمال کی جانب واقع تھا۔ آج کل اسے البِدْ ع کہتے ہیں وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ ماخوذ از، تفہیم القرآن، ج:۳، ص:۶۲۸
۱۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص:۳۸۱
۱۵- القصص:۲۸، آیت:۲۳-۲۸
۱۶- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳، ص ۶۲۷۔ پر ابنِ کثیر کے قول کی تائید کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: حضرت شعیبؑ اقبال کی نظر میں۔ نیز دیکھیے: سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ اوّل ص:۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹
۱۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۸۸/۳۸۰
۱۸- تورات، عہد عتیق، خروج، باب:۳، آیت:۱-۱۰
۱۹- طٰہٰ:۲۰، آیت:۱۰
۲۰- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۶، ادارۃ المعارف، کراچی، نمبر۱۴، ص:۶۹
۲۱- ایضاً، ص:۵۶۲
۲۲- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۴، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، سن ندارد، ص:۳۷۸
۲۳- طٰہٰ:۲۰، آیت:۱۱-۱۳
۲۴- ایضاً، آیت:۱۱
۲۵- ایضاً، آیت:۱۸
۲۶- ایضاً، آیت:۱۹-۲۳
۲۷- القصص:۲۸، آیت:۳۱، ۳۲
۲۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۱۶/۱۱۶
۲۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۰/۳۳۲
۳۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۵/۳۶۷

۳۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار خودی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۵/۴۵

۳۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۵۶/۵۴۸

۳۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۹/۶۳۷

۳۴- الشعراء: ۲۶، آیت: ۱۰-۱۴۔ نیز دیکھیے: تورات، عہدِ عتیق، خروج: ۳، آیت ۹-۱۲، ۴، ۱۳-۱۴

۳۵- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۳۹۷

۳۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۹۵/۹۵

۳۷- طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۴۷، ۴۹

۳۸- القصص: ۲۸، آیت: ۳۸

۳۹- تفصیل کے لیے دیکھیے: الاعراف: ۷، آیت: ۱۰۶-۱۰۹۔ یونس: ۱۰، آیت: ۷۸۔ طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۵۷، ۶۰

۴۰- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۴۲۱

۴۱- الاعراف: ۸، آیت ۱۱۳-۱۱۴

۴۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: طٰہٰ: ۲۰، آیت ۶۰-۶۵

۴۳- الشعراء: ۲۶، آیت: ۴۴

۴۴- تفصیل کے لیے دیکھیے: الاعراف: ۷، آیت: ۱۱۷-۱۱۹۔ الشعراء: ۲۶، آیت ۴۵

۴۵- پانی پتی، تفسیر مظہری، جلد: ۴، ص: ۳۶۳، نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سعید، مواہب الرحمن، ج: ۳، ص: ۵۲، ۴۳۔ نیز دیکھیے: الاعراف: ۷، آیت ۱۲۳، ۱۲۴۔ طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۷۱-۷۳۔ الشعراء: ۲۶، آیت: ۴۹، ۵۰، ۵۷۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر (اردو) ج: ۳، پ: ۱۶، ص: ۸۰

۴۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۳۰/۴۹۲

۴۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص: ۲۵/۳۱۷

۴۸- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج: ۴، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۴

۴۹- یونس: ۱۰، آیت: ۸۳-۸۵

۵۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: الاعراف: ۷، آیت: ۱۲۷

۵۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۳۸۔ نیز مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الاعراف: ۷، آیت: ۱۲۸

۵۲- یونس: ۱۰، آیت: ۸۷

۵۳- مومن: ۴۰، آیت: ۲۶

۵۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۴۴۴، ۴۴۷، ۴۴۸

۵۵- یونس: ۱۰، آیت: ۸۸

۵۶- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ اوّل، ص: ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸

۵۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۸۳/۶۷۱
۵۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو ص:۱۱۹/۵۸۱
۵۹- برنی، سید مظفر حسین (مرتب)، کلیات مکاتیبِ اقبال، ج:۳، ساھتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص:۲۴۳
۶۰- الاعراف:۷، آیت:۱۴۲
۶۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ اوّل، ص:۴۸۳
۶۲- الاعراف:۷، آیت:۱۴۳
۶۳- سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی (مرتبین)، باقیاتِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، بار سوم ۱۹۷۸ء، ص:۴۲۱
۶۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو ص:۱۰۲/۱۰۲
۶۵- ایضاً ص:۹۹/۹۹ ۶۶- ایضاً ص:۱۰۰/۱۰۰
۶۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو ص:۸۹/۳۸۱
۶۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۳۸/۲۰۸
۶۹- افضل، محمد رفیق (مرتب)، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۲۴
۷۰- الاعراف:۷، آیت:۱۴۵
۷۱- الاعراف:۷، آیت:۱۴۸
۷۲- طٰہٰ: آیت:۹۷، ۹۸۔ ماخوذ از سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، ص:۴۹۱، ۴۹۲
۷۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو ص:۲۶۱/۲۶۱
۷۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو ص:۲۵۲/۲۵۲
۷۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۲۸/۶۱۶
۷۶- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، ج:۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص:۲۸۸-۲۹۱
۷۷- خلاصہ سورۂ کہف، ماخوذ از ابن کثیر ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۳، پ:۱۵، ص:۱۰۴-۱۱۲۔ نیز دیکھیے: پ:۱۶، ص:۲-۵
۷۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو ص:۲۵۶/۲۵۶
۷۹- تفصیل کے لیے دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۱۰۳-۱۰۶۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابن کثیر (اردو)، ج:۲، پ:۱، ص:۷۹
۸۰- تورات، عہد عتیق، تثنیہ شرع، باب:۳۴، آیت:۷
۸۱- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۳۵۱
۸۲- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیر امم اور اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۷۱
۸۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو ص:۷۰/۳۶۲
۸۴- میر، وارث، شکوہ اور جواب شکوہ، مرتب ڈاکٹر انور سدید، مشمولہ اقبال شناسی اور ادبی

دنیا، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۱۵۰

۸۵- امروہوی، نسیم، فرہنگ اقبال فارسی، اظہار سنز، ۱۹۸۹ء، لاہور، ص:۸۴

۸۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۹/۲۷۹

۸۷- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴۔

۸۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص۲۴۰/۲۴۰۔

۸۹- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، ص:۳۱۴

۹۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۹۰/۱۹۰

۹۱- ایضاً، ص:۲۰۲/۲۰۲

۹۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۲۷/۵۸۹

۹۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۴۴/۶۰۶، ۱۴۵/۶۰۷

۹۴- نعمانی، شبلی ندوی، علامہ سید سلیمان، سیرۃ النبی، ج:۴، مکتبہ مدینہ، لاہور، صفر المظفر ۱۴۰۸ھ، ص:۵۰

۹۵- تفصیل کے لیے دیکھیے: حضرت شعیبؑ اقبال کی نظر میں

۹۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۵/۵۳۷

۹۷- شاہد محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص۱۲۵-۱۲۸

۹۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۵۱/۵۱۳

۹۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص۱۶۷/۴۵۹

۱۰۰- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح ضربِ کلیم، ص۷۷

۱۰۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۶/۴۸۸

۱۰۲- تاثیر، ڈاکٹر ایم۔ ڈی، مرتب افضل حق قریشی، اقبال کا فکر و فن، بزم اقبال، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۴ء، ص:۱۳۸

۱۰۳- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۱۲۸-۱۳۰

۱۰۴- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور بار پنجم، ۱۹۸۳ء، ص:۴۸۳

۱۰۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۱۹/۵۸۱

۱۰۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۳۴/۵۹۶

۱۰۷- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصور توانائی، ص:۱۳۰

۱۰۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۵۸/۶۲۰

۱۰۹- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۱۳۱

۱۱۰۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۹/۳۳۱

۱۱۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۱/۶۸۳

☆☆☆☆

حضرت ہارون علیہ السلام

توحید کی دعوت تمام انبیاء کرامؑ کا مشن رہا ہے۔ اقبال کے تمام افکار بھی اسی تصورِ توحید کے تابع ہیں۔ اقبال نے دعوتِ توحید دینے والی جن برگزیدہ ہستیوں یعنی انبیاء و رسلؑ کی تعلیمات کو اپنے کلام کی زینت بنایا ہے اور اہمیت دی ہے۔ اُن میں سے ایک نام حضرت ہارونؑ کا بھی ہے۔
وہ پیامِ مشرق کی نظم ''حکیم آئن سٹائن'' میں کہتے ہیں:

من چہ گویم از مقامِ آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زرد تشتے زنسلِ موسیٰ و ہاروں ظہور![1]

ترجمہ: میں اس حکیم نکتہ شناس کے بارے میں کیا کہوں، تھا وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کی نسل سے، مگر اس نے کام زردشت کا کیا۔

آیئے تفصیلات میں جانے سے بیشتر تھوڑی دیر ٹھہر کر حضرت ہارونؑ کی پاک سیرت کا مختصر جائزہ لیں تا کہ درست نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی تھے۔ آپؑ حضرت موسیٰؑ سے تین سال پہلے پیدا ہوئے[2] لیکن حضرت موسیٰؑ کو وہ طور پر مانگی جانے والی دعا کی بدولت عہدۂ نبوّت سے سرفراز فرمائے گئے۔ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں مذکور ہے:

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْراً مِّنْ اَھْلِیْ○ ھٰرُوْنَ اَخِیْ○ اشْدُدْبِہٖٓ اَزْرِیْ○ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ○ کَیْ نُسَبِّحُکَ کَثِیْراً○ وَّ نَذْکُرَکَ کَثِیْراً○ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْراً○ قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی○[3]

اور میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر کر دے۔ وہ کون؟ میرا بھائی ہارون۔ اس سے میری کمر مضبوط کر اور اسے میرے کام میں شریک کر کہ ہم بکثرت تیری پاکی بولیں اور بکثرت تیری یاد کریں۔ بے شک تو ہمیں دیکھ رہا ہے، فرمایا اے موسیٰؑ! تیری مانگ تجھے عطا ہوئی۔

ابنِ کثیر لکھتے ہیں کوئی بھائی کسی بھائی کو فی الواقع اتنا نفع نہیں پہنچا سکتا جتنا حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کو پہنچایا کہ آپؑ نے دُعا سے بھائی کو نبوت دلوائی۔[4]

منصب نبوت سے سرفراز فرمائے جانے کے بعد حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے مددگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ حضرت ہارونؑ کی زبان میں فصاحت و بلاغت بہت زیادہ تھی۔ آپؑ حضرت موسیٰؑ ہی کے ساتھ فرعون کو دعوتِ حق دینے گئے۔[۵]

ایک مرتبہ جب حضرت موسیٰؑ چالیس یوم کے لیے کوہ طور پر گئے تو حضرت ہارونؑ کو قوم کی رہنمائی کے لیے چھوڑ گئے اور اُن سے کہا کہ ان کی اصلاح کرتے رہنا۔ بدعمل افراد کی رائے پر عمل نہ کرنا۔[۶] ان کی ہدایت و رہنمائی کے باوجود قوم نے سامری کے کہنے پر سامری کے بنائے سونے کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اس وقت حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کو سمجھانے اور پوجا سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ تب حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کا انتظار کرنے لگے لیکن لگا تار لوگوں کو بچھڑے کی پوجا سے روکتے رہے۔[۷] تورات میں قرآن پاک کے برعکس حضرت ہارونؑ کو گوسالہ پرستی میں شریک دکھایا گیا ہے۔[۸] جبکہ قرآن نے آپؑ کو پیغمبرانہ عظمت کا مکمل خیال رکھا ہے۔ المختصر حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس آئے تو گوسالہ پرستی کے متعلق حضرت ہارونؑ سے باز پرس کی۔ حضرت ہارونؑ نے اپنی کمزوری اور مخالفین کی طاقت و قوت کا اظہار کیا۔ تمام تفصیلات جاننے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اُن کے لیے دُعا بھی فرمائی۔[۹]

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے گوسالہ پرستوں کو بحکم الٰہی آپس میں قتل کرنے کا حکم دیا۔ تین دن میں ۷۰ ہزار اسرائیلی قتل ہو گئے۔ اسرائیلی عورتوں اور بچوں کی فریاد پر حضرت موسیٰؑ نے رو رو کر اللہ سے توبہ کی دعا کی جو قبول ہوئی۔[۱۰]

قرآن پاک میں حضرت ہارونؑ کو بت پرستی سے جدا دکھایا گیا ہے۔ قرآن پاک بتاتا ہے کہ حضرت ہارونؑ شرک کرنے والوں کو شرک سے منع کرتے رہے۔ قرآن نے حضرت ہارونؑ کا قصور صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ شرک کرنے والوں سے مکمل طور پر علیحدہ کیوں نہ ہو گئے۔[۱۱]

وادی سینا میں جب قوم نے حضرت موسیٰؑ کے حکم پر آگے بڑھ کر جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ کے حضور اپنے ساتھ جس دوسرے شخص کا ذمہ اپنے سر لیا وہ حضرت ہارونؑ تھے۔[۱۲] چنانچہ اس سرکشی کے نتیجہ میں بنی اسرائیل چالیس سال تک صحرانوردی کرتے رہے۔ اسی صحرانوردی کے دوران کئی بڑے بڑے لوگ انتقال فرما گئے۔ پہلے حضرت ہارونؑ تیہ کے اندر ہی فوت ہوئے۔[۱۳] بعد ازاں موسیٰؑ کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ چالیس سال بعد بنی

اسرائیل کا قصور معاف ہوا۔ انھیں نجات ملی اور وہ فلسطین کی حدود میں داخل ہوئے۔[۱۴]

حضرت ہارونؑ کا انتقال کس طرح ہوا۔ یہ قصہ نہ تو قرآن میں ملتا ہے اور نہ حدیث میں۔ تاہم اسرائیلی اثرات کے تحت بعض مسلم مؤرخین و مفسرین نے اس ضمن میں عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں۔[۱۵]

حضرت ہارونؑ عمر میں حضرت موسیٰؑ سے بڑے تھے لیکن مرتبہ نبوت میں حضرت موسیٰؑ اُن سے برتر تھے۔ اس لیے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی اطاعت اور احکام کی تکمیل میں جس جانثاری کا مظاہرہ کیا وہ بے مثل ہے اور عوام کے لیے نمونہ بھی۔ یہ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔[۱۶] غالباً علامہ اقبال حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا جو اکٹھا ذکر کرتے ہیں تو اُس کے پس منظر میں قرآن پاک کی وہ آیاتِ کریمہ ہیں جن میں ان دو پیغمبر بھائیوں کا اکٹھے ذکر آیا ہے۔ دونوں پیغمبر بھائی تمام وقت اکٹھے ہی فریضۂ نبوت ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

حضرت ہارونؑ کی پاک سیرت کے اجمالی جائزہ کے بعد یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کی ہمراہی میں تمام عمر دعوتِ توحید دیتے رہے۔ ان کی تبلیغ توحید کی اہمیت کا اندازہ گوسالہ پرستی کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ آیئے دیکھیں اقبال نے اس پیغمبر کا ذکر کس انداز میں کیا ہے اور وہ اس پاک پیغمبر کی سیرت و کردار کے ذریعے امتِ مسلمہ کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ مثنوی رموزِ بیخودی میں نظم ''در معنی ایں کہ در زمانہ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است'' ہے۔ اس میں اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ملتِ اسلامیہ علمی اور دینی انحطاط کا شکار ہو جائے تو ان حالات میں اجتہاد سے تقلید کرنا بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور بھی مسلمانوں کے لیے مختلف النوع فتنوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی طبائع میں دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے اعتنائی نے جنم لے لیا ہے۔ اس نے ان کے قلوب میں اپنے آبا و اجداد کی تحقیر کے مادے کو جنم دے دیا ہے۔ ان کی حیاتِ دینی کے منابع کو خشک کر دیا ہے۔ مسلمانوں کو ان کے دین سے اجنبی اور عشقِ رسول ﷺ کے جذبہ سے تہی کر دیا ہے۔ توحید کا مفہوم ان کے قلوب سے نکال دیا ہے۔ مغربی علوم کی بنیاد الحاد پر رکھ دی ہے۔ جو اب نصاب تعلیم ہے۔ موجودہ دور کے مفاسد کی وضاحت کے بعد اقبال بتاتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے تقویمِ حیات میں اضمحلال جنم لے لے تو ایسے حالات میں قوم کو تقلید کے اصول کو منتخب کر لینا چاہیے کہ اسی کی وجہ سے رنگِ ثبات جنم لے

سکتا ہے۔ یعنی اگر حیاتِ قومی کا نظام ناطاقتور ہو جائے تو ایسے میں نظام کو درہم برہم ہونے سے بچانے کے لیے سلفِ صالحین کی پیروی لازم ہے۔ اگر قوم ایسا نہیں کرے گی تو اُس کا قومی نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ پھر اقبال مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مسلمان! کیا تو دیکھ رہا ہے کہ تو مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے سبب روز بروز اپنے دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تو مارکس و لینن کے راستہ پر چلنے کی بجائے اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل۔ اس لیے کہ اسی میں جمعیت ہے و بقا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت قوم حالتِ خزاں میں ہے لیکن سلمانوں کو بہار کی امید رکھنی چاہیے اور اپنی قومی روایات سے وابستہ رہ کر ان کی حفاظت پر ڈٹے رہنا چاہیے۔ اسی میں حیات ہے۔ اس کے بعد اقبال نے بنی اسرائیل کی زندگی سے استشہاد دی ہے، وہ رموزِ بیخودی میں ''در معنی ایں کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اُولی تراست''، میں کہتے ہیں:

پنجۂ گردوں چو انگورش فشرد
یادگارِ موسیٰؑ و ہارون نمرد
اے پریشان محفلِ دیرینہ ات
مُردہ شمعِ زندگی در سینہ ات
نقش بر دل معنیٔ توحید کن
چارۂ کارِ خود از تقلید کن[1]

ترجمہ: آسمان کے پنجے نے اسے انگور کی طرح نچوڑ ڈالا مگر یہ قوم جو موسیٰؑ و ہارونؑ کی یادگار ہے مٹ نہ سکی۔
اے مسلمان! تیری قدیم محفل پریشان ہو چکی ہے۔ تیرے سینے کے اندر زندگی کی شمع بجھ چکی ہے۔
تو اپنے دل پر دوبارہ توحید کا نقش کندہ کر اور اپنے اسلاف کی تقلید سے اپنی مشکلات کی چارہ سازی کر۔

اگر تم مثال چاہتے ہو تو یہودیوں کو دیکھو۔ آسمان نے ان پر ان گنت ظلم و ستم ڈھائے لیکن وہ موسیٰؑ و ہارونؑ کی اس یادگار کو دُنیا سے ختم نہ کر سکا۔ قومِ موسیٰؑ و ہارونؑ موجود تو ہے مگر اس کے افراد تہی از سوز اور پریشان حال ہیں۔ یہ جسمانی طور پر زندہ ہیں لیکن روحانی طور پر مردہ۔ یہ یہودی کہلانے ہی میں فخر محسوس کرتے ہیں اور تعلیماتِ انبیاءؑ کی پیروی میں شرم اور عار جانتے ہیں۔

اقبال چونکہ وحدتِ دین کے قائل ہیں۔ اس لیے انھوں نے پاک پیغمبروں کے پیروکاروں کو دعوتِ حق دی ہے۔ اب ان پیغمبروں کے حقیقی پیروکار اور وارث مسلمان ہیں جنھوں

نے ان کی بنیادی تعلیم توحید کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے فخر یہ کہتے ہیں:

در دلِ حق سرِّ مکنونیم ما
وارثِ موسیٰؑ و ہارونیمؑ ما[۱۸]

ترجمہ: ہم اللہ تعالیٰ کے دل کا چھپا ہوا راز ہیں، ہم ہی موسیٰ و ہارونؑ کے وارث ہیں۔

دراصل اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انبیاءؑ کی تعلیمات کو عام کرنے والے ہی ان کے سچے وارث ہو سکتے ہیں۔ انبیاءؑ کی تعلیمات از آدم تا محمد ﷺ توحید پر مشتمل ہیں۔ توحید کی تعلیم عام کرنے والے اس صفحۂ ہستی پر صرف مسلمان ہیں۔ آج اگر وہ محکوم ہیں تو کیا غم؟ کہ ان علمبردارانِ توحید کے لیے حکمرانی چشم براہ ہے۔ اس لیے کہ یہ پیدا ہی حکمرانی کے لیے ہوئے ہیں۔ پس ہم مسلمانوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ہم آج بھی جدوجہد کریں تو سربلند ہو سکتے ہیں۔ اقوام عالم اور اشیائے عالم کو مسخر کر کے اُن پر حکمرانی بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم توحید اور اُس کے تقاضوں سے آگاہ ہو جائیں۔

یہ سچ ہے کہ مسلمان کے لیے قوت و جبروت اور شان وشوکت کا سرچشمہ توحید ہے۔ جب کسی فرد کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی و برتری کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے تو وہ بڑے سے بڑے فرعون کے سامنے بھی گردن نہیں جھکاتا۔ مسلمان صرف اور صرف اللہ کا بندہ ہے۔ وہ اپنی گردن صرف اللہ کے حضور ہی جھکاتا ہے۔ بڑے سے بڑا خطرہ اور خوف بھی اس کی روش کو نہیں بدل سکتا اور کسی نوع کا ڈر اور لالچ اسے حق کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔[۱۹]

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست[۲۰]

ترجمہ: مسلمان غیر اللہ کا بندہ نہیں وہ کسی فرعون کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

مسلمان دنیا میں نہ تو اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے اور نہ ہی غیر اللہ کی حکمرانی کو بخوشی قبول کرتا ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونے ہی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ اسی کے احکام کو آئین کی حیثیت حاصل ہے اور مسلمانوں کو شان وشوکت اور طاقت وقوت انھی احکام پر عمل کرنے کی بدولت میسر آتی ہے اور وہ اللہ کا بندہ بننے ہی میں فخر محسوس کرتا ہے۔[۲۱]

اہل حق را رمزِ توحید ازبر است
وَاٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْداً مضمر است
دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو[۲۲]

ترجمہ: اہل حق توحید کی رمز کو خوب جانتے ہیں یہی راز سورۂ مریم کی آیت ۹۳ میں مضمر ہے۔
دین، حکمت، شریعت سب توحید ہی سے ہیں۔ اسی سے (افراد و اقوام) میں زور، قوت اور ثبات واستحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

توحید کا علمبردار صرف انفرادی طور پر اللہ کی عبادت میں مصروف اِردگرد سے آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کہیں اللہ کی حاکمیت کی بجائے غیر اللہ کے قوانین تو جاری و ساری نہیں۔ کہیں انسان وقت کے فرعونوں کی غلامی میں تو مبتلا نہیں۔ اگر وارث ہارونؑ کو کہیں ایسی صورت نظر آتی ہے تو وہ ان حالات کو تبدیل کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور غلاموں کو توحید کی تعلیم دے کر انھیں دنیوی آقاؤں سے برسرِ پیکار کر دیتا ہے۔ وہ یہ سب اس توحید کی رمز سے آگاہی کی بدولت کرتا ہے جو اُسے موسیٰؑ و ہارونؑ سے ورثہ میں ملا ہے۔[۲۳]

تا نہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات
تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را با خواجہ خواہی درستیز؟
تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز!
ہر کہ ایں سوز باشد در جگر
ہولش از ہولِ قیامت بیشتر[۲۴]

ترجمہ: جب تک لا الہ کا نکتہ ہاتھ نہ آئے غیر اللہ کے بند توڑے نہیں جا سکتے۔
غیر اللہ کے سامنے لا کہنا زندگی ہے۔ اسی کے ہنگامے سے کائنات میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔
تو غلام کو آقا کے خلاف لڑانا چاہتا ہے؟ تو اس کی مشتِ خاک میں لا کا بیج بو دے۔
جس کے جگر میں اس کا سوز ہوگا اس کی ہیبت قیامت کی ہیبت سے بڑھ کر ہوگی۔

جب تک نکتۂ توحید ہاتھ نہ آئے غیر اللہ کے بندھنوں کو توڑا نہیں جا سکتا۔ غیر اللہ کے سامنے لا کہنا یعنی اس کی حاکمیت کا انکار کرنا ہی حیات ہے۔اسی سے رونقِ دنیا قائم ہے۔غلام کو آقا سے برسرِ پیکار کرنے کے لیے اس بدن میں 'لا' کا بیج بو۔جس شخص کے جگر میں لا کا سوز ہو۔اس کا خوف قیامت کے خوف سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

حاملِ توحید جب اللہ کو ایک بار اپنا رب اور الٰہ تسلیم کر لیتا ہے تو اُسے ہی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتا ہے۔دُنیا کے بڑے سے بڑے مرتبے پر فائز شخص کا کوئی ایسا حکم نہیں مانتا جو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف ہو۔ اللہ کو رب ماننے کے بعد اُس کی ذات میں استحکام اور ثابت قدمی جنم لے لیتی ہے۔ وہ خوف وغم سے محفوظ ہو جاتا ہے اور دوسرے افراد کو بھی ایسے ہی غیر اللہ کا خوف دل سے نکالنے کی ترغیب دیتا ہے۔[۲۵] اپنی قوم کو موجودہ فرعون کے پنجہ سے آزاد کراتا ہے۔ باطل کو شکست دیتا ہے اور یوں وہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی پیروی کرتے ہوئے توحید کا بول بالا کرتا ہے۔

اقبال محسوس کرتے ہیں کہ آج پھر اسی جذبۂ موسویت و ہارونیت کی ضرورت ہے۔اس لیے کہ اُمت مسلمہ کے افراد فرعونی طاقتوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں جن کو صرف اور صرف جذبۂ ایمانی کی قوت رکھنے والے حاملِ توحید افراد ہی آزادی دلوا سکتے ہیں۔ جذبۂ ایمانی کے ساتھ ساتھ ہمت کی بھی ضرورت ہے اور یہ ہمت عقیدہ توحید پر پختگی کی بدولت جنم لیتی ہے۔ اسی لیے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اس عقیدہ توحید کو دلوں پر نقش کر لیں۔ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کی پیروی کریں اور غلامی میں جکڑی انسانیت کو فرعونیت کے پنجے سے آزاد کروائیں۔ دُنیا میں حق کا بول بالا کریں۔

حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ پر کہے گئے اشعار پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے ان دو انبیاءؑ کا ذکر یوں کیا ہے کہ حاملینِ اسلام اور حاملینِ یہودیت کا مقابلہ وموازنہ بھی کر دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام وہ سچا اور آفاقی دین ہے جو اپنے پیروکاروں کے قلوب کو سوزِ عشق سے بھر دیتا ہے جبکہ یہودی حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی حقیقی اطاعت و پیروی کو ترک کر چکے ہیں۔اس وجہ سے ان کے قلوب اُس سوزِ عشق سے خالی ہو چکے ہیں جو سچے ایمانداروں کا طرّہ امتیاز ہیں۔اس لیے وہ موسویت وہارونیت کے حقیقی وارث نہیں بلکہ اس کے حقیقی وارث مسلمان ہیں۔اب مسلمانوں کو اسی ورثۂ نبوت کی حفاظت کرنی ہے تاکہ وہ دنیا میں پھر سے کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۰۰/۳۷۰

۲- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج: ۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار سترہواں، ۱۹۸۸ء، ص: ۷۷

۳- طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۲۹-۳۶

۴- ابن کثیر، ابوالفدا ءعمادالدین، تفسیر ابن کثیر، ج: ۳، پ ۱۶، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی، سن ندارد، ص: ۶۲

۵- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج: ۳، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص: ۲۵۳۳ نیز دیکھیے: قصص: ۲۸، آیت: ۳۴، ۳۵۔ تورات، عہد عتیق، خروج، باب: ۱۴، آیت ۱۶ سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء

۶- پانی پتی، علامہ قاضی ثناءاللہ، تفسیرِ مظہری، ج ۴، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، سن ندارد، ص: ۳۷۸

۷- الاعراف: ۷، آیت: ۱۵۰، ۱۵۱۔ نیز دیکھیے: طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۹۰-۹۵، ۱۳۳، ۱۳۷

۸- تورات، عہد عتیق، خروج، باب: ۳۲، آیت: ۲-۵، ۲۳-۲۵

۹- الاعراف: ۷، آیت: ۱۵۰، ۱۵۱

۱۰- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج: ۱، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد، ص: ۳۶۸۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی ثناءاللہ، تفسیرِ مظہری، ج: ۱، ص: ۱۲۱

۱۱- طٰہٰ: ۲۰، آیت: ۹۰-۹۳

۱۲- المائدہ: ۵، آیت: ۲۵، ۲۶

۱۳- پانی پتی، علامہ قاضی ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج: ۳، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص: ۴۳

۱۴- پانی پتی، علامہ قاضی ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج: ۸، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص: ۵۲۳

۱۵- ایضاً، ج: ۳، ص: ۴۳۷

۱۶- جے ای سن برگ (J. Easen-Berg) ہارونؑ بن عمرانؑ، دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۳، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۸۵

۱۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۲۵/۱۲۵

۱۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۷۵/۷۵

۱۹- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصور دین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد، ص: ۳۱

۲۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۱/۱۱۱

۲۱- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصور دین، ص: ۳۲

۲۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۹۱/۹۱

۲۳- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصور دین، ص: ۳۴

۲۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۷/۸۱۳

۲۵- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، ص: ۳۶

☆☆☆☆

حضرت داؤد علیہ السلام

جاوید نامہ میں ایک نظم ''زیارت ارواحِ جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا'' ہے۔اس نظم کے پانچ بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے بتایا ہے کہ انسان اپنی ذاتی تجلیات سے بہرہ اندوز ہوکر روحانیت کے اعلیٰ مقامات بہ آسانی حاصل کرسکتا ہے اور کائنات کو مسخر کر کے ہر شے اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ وہ کائنات کا خادم نہیں بلکہ کائنات اُس کی خادم ہے۔ کائنات کا وجود اُسی کی وجہ سے ہے۔ اس فلسفیانہ تمہید کے بعد اقبال بتاتے ہیں کہ ''فلک قمر'' سے چل کر وہ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ اس عالم میں کوئی انسان آباد نہیں کیونکہ اس عالم کو ابھی آدم نے مسخر نہیں کیا۔

دوسرے بند میں اقبال مرشدِ رومی سے اس دلچسپ مقام کے بارے میں دریافت کرتے ہیں جہاں اذان کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اقبال نے بہ زبانِ رومی اسے ''مقامِ اولیا'' کا نام دیا ہے اور نماز با جماعت کو سوز و گداز کی نعمت کے حصول کا ذریعہ۔

تیسرے بند میں اقبال نے دو آدمیوں تاتاری (سعید حلیم پاشا) اور افغانی (سید جمال الدین) کو نماز پڑھتے دیکھا۔ ان میں مقتدی تاتاری تھے اور امام افغانی تھے۔ ان کے بارے میں رومی نے بتایا کہ انیسویں صدی میں پیدا ہونے والے بہترین افراد ہیں۔

چوتھے بند میں اقبال بتاتے ہیں کہ سخت کوش افغانی نے امامت میں قرآن پاک کی ''سورۃ النجم'' کی تلاوت اتنی خوش الحانی سے کی کہ انبیاء اور ملائکہ (خلیل و جبریل) وجد میں آجائیں۔ ان کی قرات سُننے والوں کے قلوب میں عشق الٰہی کا جذبہ موجزن کرنے کا باعث تھی کہ مردے سنیں تو کلمہ پڑھ کر اُٹھ بیٹھیں اور مردہ دلوں میں زندگی جنم لے لے:

اضطرابِ شعلہ بخشد دُود را
سوز و مستی می دہد داؤد را
آشکارا ہر غیاب از قرأتش
بے حجاب اُم الکتاب از قرأتش[1]

ترجمہ: اس نے دھوئیں کو شعلے کا اضطراب کیا وہ ایسی قرأت تھی جو داؤدؑ کو بھی سوز و مستی عطا کر دے۔
ان کی قرأت سے سب پوشیدہ راز کھلتے تھے اور ام الکتاب کے پورے معانی ظاہر ہو جاتے تھے۔

ان اشعار کو پڑھ کر قاری کا ذہن حضرت داؤدؑ کی حیات کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ذہن میں فوری سوال اُبھرتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کا قرات سے اور سوز و مستی سے کیا تعلق ہے۔ افغانی کی قرات کی تاثیر بیان کرتے ہوئے اقبال حضرت داؤدؑ کی تلمیح لائے ہیں کسی اور نبی کی کیوں نہیں۔ قرات کتاب کی ''داؤدیت'' کے حوالے سے کیا خاص اہمیت ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے حضرت داؤدؑ کی سیرت و کردار کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ''داؤدیت'' کی بحوالہ اقبال تفہیم اور توضیح میں آسانی ہو۔

حضرت داؤدؑ کا تعلق اسرائیلی اسباط میں سے یہودا کی نسل سے ہے۔

آپ کا نسب نامہ یہ ہے:

داؤد بن ایشا (ایشی) بن عوید بن عابر (یا عابز) بن سَلمُون بن نخشون بن عویناذب (یا عمی ناذب) بن ارم (یا رام) بن حصرون بن فارص بن یہودا بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم خلیلؑ بتایا جاتا ہے۔[۲]

تورات کے مطابق ایشا یا ایشی کے بہت سے لڑکے تھے۔ حضرت داؤدؑ ان میں سب سے چھوٹے تھے۔[۳] کہا جاتا ہے کہ داؤد عجمی نام ہے۔[۴]

منقول ہے کہ آپؑ کا قد چھوٹا تھا۔ آنکھیں نیلگوں تھی۔ جسم پر بال زیادہ نہ تھے۔ چہرے اور بشرے سے پاکیزگیِ قلب اور نفاست طبع جھلکتی تھی۔[۵] سر کے بال سیدھے اور نرم تھے۔ رنگ گورا تھا۔ ڈاڑھی لمبی تھی اور اس میں کسی قدر پیچ و خم تھا[۶] صحیفہ سموئیل کے مطابق آپؑ کا رنگ لال تھا اور بہت ہی حسین و جمیل تھے۔[۷]

قرآن پاک میں آپؑ کا ذکر سورۃ بقرۃ، نساء، مائدہ، انعام، بنی اسرائیل، انبیاء، نمل، سبا اور صٓ میں ملتا ہے۔ ان سورتوں میں سولہ جگہ نام کا ذکر ہے بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیل سے اُن کے حالات و واقعات اور رشد و ہدایت کا بیان ہے۔

حضرت داؤدؑ عہدۂ نبوت سے سرفراز ہونے سے پہلے مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز تھے۔ عنانِ حکومت آپؑ کے ہاتھ میں تھی۔ آپؑ کا زمانۂ حکومت ۹۷۳ تا ۱۰۱۳ قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔[۸] آپؑ سے پہلے حکومت بنی اسرائیل کے ایک گھرانے میں ہوتی تھی اور ہدایت و رسالت کا تعلق دوسرے گھرانے سے ہوتا تھا۔[۹] لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؑ میں یہ دونوں نعمتیں جمع کردیں۔ آپؑ بیک وقت پیغمبر اور بادشاہ تھے۔[۱۰] بنی اسرائیل آپؑ سے بہت محبت کرتے تھے۔

تورات کے مطابق حضرت داوٗدؑ کا اصل وطن بیت لحم تھا۔ جو یروشلم سے دس میل جنوب میں واقع ہے۔ سموئیل نبی کو اشارہ مل چکا تھا کہ طالوت کے بعد حضرت داوٗدؑ بادشاہ بنیں گے۔ چنانچہ اسی اشارے کی بنا پر سموئیل نبی بیت لحم گئے۔ ایشا یا ایشی کے بیٹوں کو دیکھا۔ حضرت داوٗدؑ اس وقت بھیڑ بکریاں چرانے گئے ہوئے تھے۔ اُنھیں خاص طور پر بلوایا گیا۔ اس لیے کہ خدا کا اشارہ اُن کی طرف تھا۔[۱۱]

اس زمانے میں بنی اسرائیل کا بادشاہ طالوت تھا۔[۱۲] تورات کے مطابق شاوٗل کو بربط بجانے والے کسی ماہر کی تلاش ہوئی۔ ملازموں نے حضرت داوٗدؑ کا بتایا۔ طالوت نے حضرت داوٗدؑ کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسی دوران حضرت داوٗدؑ اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے گھر بھی جاتے اور بھیڑ بکریاں بھی چرایا کرتے تھے۔ غالباً اسی زمانے میں حضرت داوٗدؑ نے بھیڑ بکریوں کو جنگلی درندوں سے بچانے کے لیے فلاض چلانے میں مہارت حاصل کی۔ یہی آلہ تھا جسے انھوں نے آگے چل کر جالوت کو مارنے کے لیے انتہائی کامیابی سے استعمال کیا۔[۱۳] جالوت کا قتل ہی آپؑ کی بہادری، جوانمردی اور جنگی مہارت کا مشہور قصہ ہے۔ آپؑ نے اس فلسطینی سردار جالوت کو قتل کر کے بنی اسرائیل کو ایک بہت بڑے خطرے سے نجات دلائی۔

فلسطینیوں اور بنی اسرائیل کے درمیان لڑائی کا آغاز ہوا تو طالوت بادشاہ اپنے لشکر کے ہمراہ مقابلے کے لیے نکلا۔ راستے میں ایک ندی تھی۔ طالوت نے لشکریوں کو حکم دیا کہ جو آدمی اس ندی کا پانی سیر ہو کر پیے گا وہ میری جماعت میں شامل نہ رہ سکے گا۔ صرف چلو بھر کے پینے والے ہی میری جماعت میں رہیں گے۔ اس آزمائش میں پورا اترنے والے ندی کے پار اتر گئے۔ فلسطینیوں کے بڑے لشکروں کی دیکھ کر بعض نے کہا کہ ہم میں ان سے لڑنے کی سکت نہیں۔ لیکن ایمان والوں نے کہا کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعتوں پر غالب آئی۔[۱۴]

بنی اسرائیل اور فلسطینیوں کی فوجیں دو پہاڑیوں پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں۔ فلسطینیوں کے لشکر میں جالوت بڑا قوی ہیکل اور شہ زور سردار تھا۔ وہ پہلوانی میں بہت مشہور تھا۔ اس کا قد چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا۔ وہ پیتل کا خود اور پیتل کی زرّہ استعمال کرتا تھا۔ اس زرّہ کا وزن پانچ ہزار پیتل مثقال کے برابر تھا۔ وہ ٹانگوں پر پیتل کے دو ساق پوش چڑھاتا تھا۔ دونوں شانوں کے درمیان پیتل کی ایک برچھی رکھی رہتی جس کے بھالے کی چھڑ جولا ہے کے شہتیر جیسی

تھی اور نیزے کا پھل چھ سو مثقال لوہے کا تھا۔ وہ جب اس قسم کے ہتھیار اپنے بدن پر سجا کر نکلتا تو دیکھنے والوں پر رُعب طاری ہو جاتا۔ وہ اپنے آگے ہمیشہ سپر والے ایک شخص کو چلایا کرتا۔

جنگ کے آغاز میں وہ چالیس دن تک مسلسل روزانہ میدانِ جنگ میں آ کر اسرائیلیوں کو مقابلے کے لیے للکارتا رہا لیکن کسی اسرائیلی کو آگے جانے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ مدِّ مقابل نہ پا کر واپس لوٹ جاتا۔[۱۵] قرآن پاک میں اسی صورت حال کی تصدیق ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ[۱۶]

ترجمہ: پھر طالوت اور اس کے ساتھ کے مسلمان نہر کے پار گئے بولے ہم میں آج طاقت نہیں جالوت اور اس کے لشکروں (سے مقابلہ) کی۔

حضرت داؤدؑ اس جنگ میں کم عمری کی وجہ سے شریک نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے والد کی طرف سے بھائیوں کو کھانے پینے کا سامان دیتے اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے آتے مگر جالوت کی بہادرانہ مبارزطلبی اور اسرائیلیوں کی پس و پیش دیکھ کر حضرت داؤدؑ نے جالوت سے جنگ کی اجازت طلب کی۔ طالوت نے کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اجازت دینے میں پس و پیش کی لیکن حضرت داؤدؑ کے بے حد اصرار پر مبارزت کی اجازت دے دی اور حضرت داؤدؑ نے خود کو جالوت کی طرح اسلحہ سے لیس کیا۔ حضرت داؤدؑ چونکہ اس طرح کے سرو سامان کے عادی نہ تھے سب کچھ اُتارا۔[۱۷] معمول کے مطابق چرواہے کی لاٹھی اور جھولا اُٹھایا۔ ندی سے پانچ چکنے پتھر چُن کر جالوت سے لڑنے نکل پڑے۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو لڑائی کے وقت ایک پتھر یا تین پتھروں سے آواز آئی تھی کہ اُنھیں اُٹھالیں۔ اُنھی سے جالوت قتل ہو گا۔ جب داؤدؑ نے انھیں اٹھا کر گوپھن میں رکھا تو وہ تینوں ایک پتھر بن گئے۔[۱۸] جالوت نے حسب عادت میدان جنگ میں آ کر مبارزت کے لیے للکارا۔ حضرت داؤدؑ کو مقابلے پر دیکھا تو آپؑ پر لعنت کی اور کہنے لگا کہ عنقریب تیرا گوشت ہوائی پرندوں اور جنگلی درندوں کے حوالے کر دوں گا۔ جالوت آگے بڑھا تو حضرت داؤدؑ نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر پتھر نکالا اور فلاض میں رکھ کر اُس کے ماتھے پر مارا۔ وہ پتھر اس کے ماتھے میں گھس گیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ حضرت داؤدؑ دوڑ کر اُس کے اوپر چڑھ گئے اور اُسی کی تلوار سے اُسے مار ڈالا۔[۱۹] اس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ بنی اسرائیل کامیاب و کامران لوٹے۔ اس واقعہ سے حضرت داؤدؑ کی بہادری کا سکہ سب کے دلوں پہ بیٹھ گیا اور وہ ہر دلعزیز ہو گئے۔

قرآن مجید میں اگرچہ اس واقعہ کی تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے یا یہ اصل میں درست نہیں لیکن تورات اور قرآن دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جالوت کے قاتل حضرت داؤدؑ ہیں۔[۲۰]

تورات کے صحیفہ سموئیل میں طالوت اور داؤدؑ کے متعلق ایک داستان ملتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ طالوت نے آپ کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی لیکن بعد میں آپ کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے آپ سے حسد کرنے لگا اور آپ کو ختم کرنے کے خفیہ منصوبے بناتا رہا۔[۲۱] لیکن حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اس کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ جس (طالوت) کی قرآن تعریف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔[۲۲]

حضرت داؤدؑ فکر و تدبیر، بہادری، عدل و انصاف اور علم و حکمت میں بے مثال تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہمیشہ ان کے شامل حال رہا۔ امور سلطنت کے سلسلے میں انھیں جتنی بھی لڑائیاں پیش آئیں ان سب میں فتح و نصرت نے اُن کے قدم چومے۔ مختصر سی فوج کے ساتھ ہمیشہ انھوں نے دُشمن کی بھاری افواج پر فتح حاصل کی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ تمام علاقے ان کے زیر نگیں آ گئے جنھیں ہم آج کل شام اور عراق کہتے ہیں اور پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جو خلیج عقبہ سے مشرق میں دریائے فرات اور شمال میں دمشق تک پھیل گئی۔ بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صرف بنی اسرائیل کی نہیں بلکہ سامی النسل تمام قوموں اور جماعتوں کا امن و خوشحالی کا ایک مشترکہ نظام تھا۔[۲۳] لشکر کی کثرت اور رقبۂ مملکت کی وسیع حدوں کے ساتھ وحی الٰہی کی وجہ سے ان کی عظمت و شوکت اور صولت و ہیبت اور زیادہ ہو گئی تھی۔ کیونکہ رعایا کو یقین تھا کہ جس مرضی نوعیت کا معاملہ ہو وحی الٰہی کے ذریعے اُن پر حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے جن و بشر کوئی بھی اُن کے احکام کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔[۲۴] اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو کمال درجہ کا فہم و ادراک اور عقل و دانائی عطا کی تھی۔ اس لیے وہ ہر قضیہ کا فیصلہ حق و انصاف کے مطابق فرماتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَشَدَدۡنَا مُلۡكَهٗ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡحِكۡمَةَ وَ فَصۡلَ الۡخِطَابِ[۲۵]

ترجمہ: اور ہم نے اس کے سلطنت کو مضبوط کیا اور اسے حکمت اور قول فیصل دیا۔

دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح آپ بھی تقریر و خطابت کے فن میں ماہر تھے۔ اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ ہر لفظ اور ہر فقرہ جدا جدا سمجھ آ جاتا تھا۔ کلام فصاحت و بلاغت اور لطافت و شوکت سے لبریز تھا۔ وہ جو کچھ فرماتے قلوب میں اتر جاتا اور روحوں میں ایمان کے چراغ جلانے کا باعث بنتا۔[۲۶]

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ پر ماہِ رمضان میں زبور نازل فرمائی۔ رخت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب تورات کو مکمل کرنے کے لیے اُتری تھی اس لیے اس کا حصہ اور ٹکڑا تھی۔ یہ کتاب قصائد اور مسجّع کلمات کا مجموعہ تھی۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف، انسانی بندگی کا اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔[۲۷]

موجودہ بائیبل میں زبور کے نام سے موجودہ کتاب ''زبورِ داؤد'' نہیں۔ اس میں بہت سے مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی ڈال دیے گئے ہیں۔ البتہ وہ مزامیر جو حضرت داؤدؑ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں کلام حق کی روشنی کا احساس ہوتا ہے۔[۲۸]

علامہ اقبال کے شعری مجموعۂ کلام زبورِ عجم میں بھی اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید اور تعریف ہے۔ یہ خالصتاً ''زبور'' کا رنگ ہے۔ اقبال یقیناً اس سے متاثر ہیں۔ اسی لیے اپنے محبوب شعری مجموعے کو یہ نام دیا ہے۔ جو عجمی زبان میں ہے۔ علامہ کو اس کتاب پر ناز ہے۔ اس لیے اہل ذوق سے اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں[۲۹]

اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب انبیاءؑ و رُسلؑ کو خصوصی شرف و امتیاز عطا فرمایا ہے اور ان کو ان گنت انعام و کرام بخشے ہیں۔ تاہم شرف و خصوصیت کے درجات کے اعتبار سے اُن کے مابین فرقِ مراتب رکھا ہے۔ یہی امتیازی مراتب اُنھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں حضرت داؤدؑ کے چند خصائص و امتیازات کا ذکر ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسول کو کتنی بزرگی اور عظمت عطا فرمائی ہے۔

حضرت داؤدؑ کثرت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے تھے۔ آپؑ بہت خوش الحان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بے نظیر نغمہ عطا کیا تھا۔ آپؑ دورانِ نماز الہامی کتاب زبور کی تلاوت ستر طریقوں سے ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔[۳۰] عام حالت میں بھی جب زبور کی تلاوت فرماتے یا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مشغول ہوتے تو وجد آفریں، پر کشش و پرتاثیر اور سوز و گداز سے لبریز نغموں سے انسان، وحوش اور اُڑتے ہوئے پرندے آپؑ کی طرف کھنچے چلے آتے۔ آپؑ کے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ ساتھ مل کر اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے۔[۳۱] وحوش و طیور وجد میں رقص کرنے لگتے۔ ان میں سے بعض بھوک و پیاس کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے اور بعض مر جاتے۔[۳۲] یہ بھی مذکور ہے کہ چلتا پانی ٹھہر جاتا تھا اور ہوا رک جاتی تھی۔[۳۳] جانداروں کے ساتھ ساتھ پہاڑ بھی اس حمد و

ثنا میں برابر شریک ہوتے تھے اور حضرت داوٗدؑ ان سب کی حمد وثنا کو سمجھتے تھے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ شیطان نے تمام باجے ''نغمہٗ داوٗدی'' ہی سے نکالے ہیں۔[۳۴]

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ۝[۳۵]

ترجمہ: بے شک ہم نے اس کے ساتھ پہاڑ مسخر فرما دیے کہ تسبیح کرتے شام اور سورج چمکتے اور پرندے جمع کیے ہوئے سب اس کے فرمانبردار تھے۔

علامہ اقبال نے بھی ''نغمہٗ داوٗد'' کو اپنے کلام کی زینت بنایا ہے، دیکھیے:

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمہٗ داوٗد[۳۶]

ترجمہ: ہند کی خاک میں زندگی (کے گیت) کی آواز بے اثر ہے، (کیونکہ) نغمہٗ داوٗد بھی مردہ کو زندہ نہیں کرسکتا۔

''نغمہ داوٗد'' سے مراد ہی الہامی کتاب زبور کی تلاوت ہے جس کو سننے والے بھی سوز و مستی میں ڈوب جاتے تھے۔ مذکورہ بالا شعر میں اقبال نے ''نغمہٗ داوٗدی'' سے حیات داوٗدؑ کے اُس اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر کلام پاک، قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اس طرح اقبال نے ''داوٗدیت'' کی بنیادیں قرآنی معلومات پر استوار کی ہیں نہ کہ اسرائیلیات پر۔

حضرت داوٗدؑ کی سیرت کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپؑ نے بادشاہ وقت ہونے کے باوجود سلطنت ومملکت کے مالیہ سے کبھی ایک حبہ نہ لیا۔ آپؑ اپنے اہل وعیال کا پیٹ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بھرتے تھے۔[۳۷] آپؑ ہمیشہ اللہ سے دعا کرتے تھے۔ کہ اُن کے لیے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے تا کہ بیت المال پر بوجھ نہ پڑے۔ چنانچہ حضرت داوٗدؑ کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس فضیلت کے ساتھ قبول فرمایا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرمی دے دی۔ انھیں لوہے کو بھٹی میں ڈالنے اور ہتھوڑے مارنے کی حاجت نہ ہوئی۔ لوہا ہاتھ میں آتے ہی دھاگے کی طرح نرم ہو جاتا۔ آپ اس سے زرہیں بناتے۔ ہر روز ایک زرّہ سے چھ ہزار روپے مل جاتے۔ آپؑ نے تین سو ساٹھ زرہیں بنائیں۔[۳۸] آپؑ اس قیمت کے تین حصے کر لیتے۔ ایک حصہ گھر پر صرف کرتے۔ ایک حصہ عام لوگوں پر اور ایک حصہ صدقہ کے لیے رکھ چھوڑتے تا کہ دوسری زرّہ بنانے تک اور فروخت کرنے تک اللہ کے بندوں کو دیتے رہیں۔[۳۹]

قرآن پاک میں ہے:

وَاَلَنَّالَهُ الْحَدِيْدَo اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْفِى السَّرْدِ وَاعْمَلُوْ اصَالِحاً ط اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌo [۴۰]

ترجمہ: اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ وسیع زرہیں بنا اور بنانے میں اندازے کا لحاظ رکھ اور تم سب نیکی کرو بے شک تمھارے کام دیکھ رہا ہوں۔

تورات اور لوہے کے استعمال کے زمانہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داوٗدؑ کے زمانہ سے پہلے لوہے کی صنعت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اس کے سپاٹ ٹکڑے تیار کیے جاسکیں۔ پھر ان کو جوڑ کر زرّہ بنالی جائے۔ لیکن یہ زرّہ بہت بھاری ہوتی تھی اور چند قوی ہیکل نفوس کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل تھا۔ اس کو پہن کر میدان جنگ میں چلنا آسان نہ تھا۔[۴۱]

حضرت داوٗدؑ پہلے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا کی کہ انھوں نے وحی کی تعلیم کے ذریعے ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک حلقوں سے تیار کی جاتی تھیں اور ان کے ہلکے اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی ان کو بدن پر سجانے کے بعد آسانی سے نقل و حرکت کر سکتا تھا اور دُشمن سے محفوظ رہ سکتا تھا۔[۴۲]

صحیح بخاری شریف میں ہے۔ حضرت داوٗدؑ پر تورات اس قدر آسان کر دی گئی تھی کہ آپؑ اپنی سواریوں کو زین کسنے کا حکم دیتے اور سواریوں کے کسے جانے سے پہلے پڑھ کر فارغ ہو چکے ہوتے تھے۔[۴۳] آپؑ کے اس معجزہ کا تعلق حرکت زبان سے ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ حضرت داوٗدؑ کے لیے زمانہ کو اس مدّت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ وہ عام حالت میں گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے۔[۴۴]

آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق حضرت داوٗدؑ کا روزہ اللہ کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے۔ ایک دن روزہ رکھتے، ایک دن ناغہ فرماتے اور آپ کی نماز بھی اللہ کے نزدیک بہت پیاری ہے کہ آدھی رات تک سوتے اور تہائی رات نماز تہجد پڑھتے اور رات کے چھٹے حصہ میں پھر سو جاتے۔[۴۵]

حضرت داوٗدؑ کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے بھی ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے اعتبار سے اہم گنے جاتے ہیں۔ پہلا مقام سورۃ الانبیاء کی آیت:

وَداودَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ج وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِيْنَo فَفَهَّمْنَا هَا سُلَيْمٰنَ ج وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْماً وَّ عِلْماً۔[۴۶]

ترجمہ: اور داوٗدؑ کو یاد کرو جب کہ کھیتی کا ایک جھگڑا چکاتے تھے۔ جب رات کو اس میں کچھ لوگوں کی

بکریاں چھوٹیں اور ہم ان کے حکم کے وقت حاضر تھے۔ ہم نے وہ معاملہ سلیمان کو سمجھا دیا اور دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا۔

دوسرا مقام تورات اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤدؑ کے بارے میں بیان کردہ مضحکہ خیز اور بے ہودہ حکایات و روایات ہیں جن کو پڑھ کر حضرت داؤدؑ کے بارے میں نبی و رسول ہونے کا یقین تو درکنار یہ بھی باور کیا جا سکتا کہ وہ با اخلاق ہستی ہیں۔

تورات کے صحیفہ سموئیل میں حضرت داؤدؑ کے بارے میں ایک طویل داستان ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے محل سے ایک نہاتی ہوئی عورت دیکھی۔ جو اوریاہ کی بیوی تھی۔ اُسے بلایا اور اس سے صحبت کی۔ وہ حاملہ ہو گئی۔ حضرت داؤدؑ نے اُس کے شوہر کو ایک جنگ میں بھیج کر مروا دیا اور اُس عورت کو محل میں بلا کر بیوی بنا لیا جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیٹے حضرت سلیمانؑ تھے۔[۴۷] لیکن مفسرین نے اس تمام قصے کو من گھڑت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اصل واقعہ توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔[۴۸] اور حضرت داؤدؑ کو صرف بادشاہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جبکہ تورات کے برعکس قرآن پاک میں حضرت داؤدؑ کو صاحب علم اور مومن بندوں میں شمار کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًاo[۴۹]

ترجمہ: اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی

سورۃ سبا میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا[۵۰]

ترجمہ: اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنا بڑا افضل دیا۔

سورہ نمل میں ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًاۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَo[۵۱]

ترجمہ: اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنا بڑا افضل دیا اور بے شک داؤد اور سلیمان کو بڑا علم عطا فرمایا۔ دونوں نے کہا سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت بخشی۔

مذکورہ بالا تمام آیات میں قرآن پاک نے سابقہ کتب میں تحریف و تبدیل شدہ واقعات و خیالات کی تصحیح فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بنی اسرائیل کی مقدس ہستیاں اور اللہ کے پیغمبر و رسول ہیں۔ ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مکمل پاک اور مقدس

ہیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ بعض مفسرین قرآن نے اوریاہ والے واقعہ کو قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر دیا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ آئندہ زمانے میں وہ آیات قرآنی کی تفسیر وتشریح سمجھی جائے گی اور اُمت کے لیے فتنہ کا سبب بنے گی۔ یہ واقعہ سورہ صٓ میں موجود حضرت داوٗدؑ کے واقعہ سے متعلق بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں حضرت داوٗدؑ کی آزمائش کا ذکر ہے کہ دو آدمی عبادت خانے کی دیوار پھاند کر اندر گھس آئے۔ ایک شخص نے دوسرے کے بارے میں بتایا کہ اُس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک۔ جبکہ وہ ایک بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ حضرت داوٗدؑ نے کہا کہ وہ اپنی دنبیوں میں تیری دُنبی ملانے کا جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ سوائے نیکوں اور اچھے اعمال کرنے والوں کے۔[۵۲]

حضرت داوٗدؑ نے اپنے معمولات کو چار دنوں میں اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ ایک دن خالص اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ ایک دن مقدمات کے فیصلے کے لیے، ایک دن خالص ذات کے لیے اور ایک دن بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے۔[۵۳] ویسے تو حضرت داوٗدؑ کا کوئی دن بھی عبادت سے خالی نہ تھا لیکن مخصوص یوم عبادت اہمیت کا حامل تھا۔ اس دن دوسرا کوئی کام سرانجام نہ دیتے تھے۔ حجرہ کا دروازہ بند کر لیتے تھے۔ عام دنوں کے برعکس اس دن ان تک پہنچنا دُشوار ہوتا۔

حضرت داوٗدؑ کی یہ تقسیم ایّام اگرچہ زندگی کے نظم اور تقسیم عمل کے لحاظ سے قابلِ تعریف تھی لیکن اس میں سے ایک دن عبادت کے لیے مقرر کر لینا کہ اللہ کی مخلوق سے تعلق کٹ جائے اُن کے ''منصب نبوت'' اور ''منصب خلافت'' کے برخلاف تھا۔ اس لیے اللہ نے ان کو اس طرح آزمائش میں مبتلا کیا کہ دو فریق عبادت کے مخصوص دن میں دیوار پھلانگ کر فیصلہ کے لیے آئے۔ حضرت داوٗدؑ فوراً سمجھ گئے کہ آزمائش ہے۔ وہ اللہ کے حضور سجدہ میں گر گئے۔[۵۴] روایت ہے کہ آپؑ چالیس دن سجدے میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھاس اُگ کر سر کے اوپر آ گئی اور مٹی نے پیشانی کو کھا لیا۔ اللہ کی طرف سے بخشش کی ندا پر سر اٹھایا۔[۵۵]

حضرت داوٗدؑ کا دورِ حکومت ۴۰ سال پر مشتمل ہے۔[۵۶] آپؑ کا اقتدار سب بادشاہوں سے بڑھ کر تھا آپؑ کا قلعہ اور شاہی محل کی نگرانی ہر رات چھتیس ہزار سپاہی کرتے تھے۔[۵۷] آپؑ نے ۱۰۰ سال کی عمر میں پیر یا بدھ کے روز وفات پائی۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت آدمؑ نے آپؑ کو اپنی حیات سے چالیس سال عطا فرمائے تھے۔ وفات کے وقت بھی آپؑ کا سر سجدہ میں تھا۔ حضرت سلیمان کے حکم سے پرندے آپؑ کی میت پر اور حاضرین پر اپنے پروں سے سایہ کیے ہوئے تھے۔[۵۸]

حضرت داوٗدؑ کی سیرت و کردار کا جائزہ بتایا ہے کہ آپ بے پناہ اوصاف کے مالک تھے۔ آپ کو نبوت و حکومت دونوں بیک وقت عطا ہوئی تھیں لیکن آپ کا اہم معجزہ ''مزامیرِ زبور'' تھا۔ جس نے اسلامی ادب میں ''نغمہ داوٗد'' کے نام سے جگہ پائی۔ کلامِ اقبال میں بھی اس نام سے جلوہ گر ہے۔

حضرت داوٗدؑ کی قرأت کی تاثیر و نغمگیت مسلم ہے۔ اقبال ''نغمۂ داوٗد'' کی تاثیر سے متاثر ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی خاک کو ''نغمۂ داوٗد'' کے نور سے منور کر دے اور اُس کے ہر بن مو سے محبت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔[۵۹]

اقبال کی خواہش ہے کہ اُن کا وجود ایسے ہی سراپا محبت بن جائے جیسا کہ حضرت داوٗدؑ کا وجود تھا تا کہ موجودہ اُمت مسلمہ اُن کے نغمہ کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا لے یعنی اُن کی ہمنوا ہو جائے۔

زبورِ عجم کی نظم ''دعا'' میں کہتے ہیں:

خاکم بہ نورِ نغمۂ داوٗد بر فروز
هر ذرّہ مرا پر و بالِ شرر بدہ[۶۰]

ترجمہ: میری خاک کو نغمۂ داوٗد سے چمکا دیجیے، میرے بدن کے ہر ذرہ کو شرر بنا دیجیے تا کہ وہ اڑتا پھرے۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے ہاں نغمہ داوٗدی اپنے اصل مفہوم کے ساتھ ساتھ محبت کی علامت کے طور پر اُبھرا ہے۔ اقبال اس کی تاثیر اور سوز کو اپنی ذات کا حصہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔[۶۱] نغمۂ داودی کے سوز کو پانے کی خواہش اور خصوصی دعائیں بلاشبہ کوئی انسان کامل ہی کر سکتا ہے۔ ''نغمۂ داوٗدؑ'' کے مجموعہ ''زبور'' سے اقبال اتنے متاثر ہوئے کہ زبور کو اپنے شعری مجموعہ کے نام کا حصہ بنا ڈالا۔ اقبال کے نزدیک نغمہ داوٗدؑ زندگی سے بھرپور ہے۔ اپنے کلام کو بھی زندگی سے بھرپور تصور کرتے ہیں۔ لیکن انھیں افسوس ہے کہ ہند کی خاک کے لیے نوائے حیات کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ مسلمانان ہند روحانی طور پر مردہ ہیں۔ روحانی طور پر مردہ افراد کو میں تو کیا نغمۂ داوٗدؑ بھی زندہ نہیں کر سکتا۔

بقول نسیم امروہوی:

> علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرا کلام بھی ایک طرح کا نغمہ ہے۔ یہ حضرت داوٗدؑ کا کام تو کر سکتا ہے مگر مردے زندہ نہیں کر سکتا۔[۶۲]

بخاک ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نکردد ز نغمۂ داوٗد[۶۳]

ترجمہ: ہند کی خاک میں زندگی (کے گیت) کی آواز بے اثر ہے، (کیونکہ) نغمۂ داوٗد بھی مردہ کو زندہ نہیں کر سکتا۔

مردہ غلاموں کو زندہ و بیدار کرنے کے کا کام نوائے محبوبی سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے صورِ اسرافیل کا سا تلخ آواز والا نغمہ ضروری ہے۔

مری نوا میں نہیں ہے نوائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ اسرافیل دل نواز نہیں[۶۴]

اقبال نے نغمۂ داؤد سے مردہ کو زندہ نہ کر سکنے کا جو تاثر دیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے نغمۂ داؤد گایا ہے مگر برصغیر کے غلام مردوں کو یہ زندہ نہیں کر سکا۔ اس سے زم کا یہ پہلو نہیں نکلتا کہ علامہ زبور کی کسی کوتاہی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بلکہ زبور کے الفاظ میں ایک الوہی ترنم، روحانی کیف و سرور اور ایک انقلاب کی بازگشت موجود ہے۔ زبور کے نغموں میں خدا کی توحید، خدا سے انسان کے تعلق کو استوار کرنے اور خدا کی رضا و مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا پیغام موجود ہے۔ یہ ایک وحی کردہ الہامی ترنم ہے۔ اس کی بازگشت ہم قرآن کی تلاوت اور قرأت میں دیکھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی استعارہ ملتا ہے کہ اسلام روح کو ترفعّ اور بالیدگی دینے والی نغمگی اور موسیقی کے خلاف نہیں۔ زبور کو اپنے مجموعہ کلام کا نام دینا اور اس کی تاثیر اپنے لیے طلب کرنا حضرت داؤدؑ سے اقبال کی بے پناہ محبت اور تعلق پر دلالت کرتا ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ ، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص: ۶۱/۶۴۹

۲- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعمادالدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۵۰۔ نیز دیکھیے نعیمی، مولانا مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، جمادی الاوّل، ۱۳۸۷ھ، ص: ۶۵۴

۳- تورات، سموئیل، باب: ۱۷، آیت ۱۴، سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء

۴- نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۳، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۷

۵- ابنِ کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعمادالدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۲، ص ۳۵۰۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعمادالدین دمشقی، قصص الانبیاء عربی مکتبہ طیبہ المدینۃ المنورۃ طبعۃ جدیدہ، ص: ۵۷

۶- سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴۶
۷- تورات، سموئیل، باب:۱۶، آیت:۱-۱۳
۸- قریشی، ڈاکٹر اکبر حسین، مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۴۰۰
۹- ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص:۱۰۲
۱۰- البقرۃ:۲، آیت:۲۵۱۔ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ: اللہ نے انھیں مملکت اور حکمت عطا کی
۱۱- تورات: سموئیل، باب، آیت:۱-۱۳
۱۲- البقرۃ:۲، آیت:۲۴۷
۱۳- تورات، سموئیل:۱، باب:۱۶، آیت ۱۴-۲۳۔ نیز سموئیل:۱، باب:۱۷، آیت:۱۵
۱۴- البقرۃ:۲، آیت:۲۴۹۔ ابن اکثیر، اسماعیل، ابوالفدا اءعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۱، پ:۲، ص ۱۲۷ پر لشکریوں کی تعداد ۸۰ ہزار لکھی ہے۔ ۷۶ ہزار نے پانی پی لیا۔ صرف چار ہزار نے پانی نہ پیا اور وہی پار اترے۔ اسی صفحہ پر ابنِ عازب کے حوالے سے ۳۱۳ تعداد بیان کی گئی ہے۔ واللہ اعلم
۱۵- تورات، سموئیل:۱، باب:۱۷، آیت:۱-۱۱، ۱۶
۱۶- البقرۃ:۲، آیت:۲۴۹
۱۷- ابنِ کثیر، اسماعیل ابولفداءعمادالدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۲، ص:۳۴۶۔ نیز دیکھیے: المولی، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتۃ، السید، قصص القرآن عربی المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، الطبعۃ العاشرہ، ۱۹۶۹ء، ص:۱۸۱، ۱۸۳۔ پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص:۵۶۷
۱۸- حوالہ مذکورہ بالا، البدایہ والنہایہ و تفسیر مظہری
۱۹- تورات، عہد عتیق، سموئیل:۱، باب:۱۷، آیت:۲۹-۵۱
۲۰- البقرۃ:۲، آیت:۲۵۱
۲۱- تورات، عہد عتیق، سموئیل:۱، باب:۱۷، آیت:۱
۲۲- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱-۲، حصہ دوم، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص ۵۳
۲۳- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار ششم، ۱۹۸۸ء، ص:۸۰-۱۷۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، ص:۱۰۶۔ نیز دیکھیے: سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۶۰
۲۴- حوالہ مذکورہ بالا

۲۵- ص:۳۸، آیت:۲۰

۲۶- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، ص ۶۱۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص:۱۰۸

۲۷- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۶۲

۲۸- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۱، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار سترھواں، ۱۹۸۰ء، ص: ۴۲۵،۴۲۴

۲۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۳۹/۳۱۵

۳۰- ابنِ کثیر، اسماعیل ابوالفدا اعماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۲، ص:۳۵۶

۳۱- ص:۳۸، آیت:۱۹،۱۸

۳۲- ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۲، ص۳۵۳۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ابولفداءعماد الدین، قصص الانبیاء عربی، ص:۵۷۳

۳۳- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱، ص:۵۶۷

۳۴- ابن کثیر، ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۴، پ:۲۲، ص۴۶

۳۵- ص:۳۸، آیت:۱۹،۱۸۔

۳۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۴۴/۳۱۴

۳۷- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج:۲، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار دوم، ۱۹۷۹ء، ص:۲۹۸

۳۸- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، کتابفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، چاپ بسیت وپنجم، تیر، ۱۳۶۰ھ، ص:۵۹۷

۳۹- ابن اکثیر، اسماعیل ابوالفدا اعماد الدین دمشقی، قصص الانبیاء عربی، ص ۵۷۱۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۷، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص ۵۲۸۔ ۷۔ ابن کثیر، اسماعیل ابوالفدا اعماد الدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۴، پ:۲۲، ص:۴۶

۴۰- السبا:۳۴، آیت:۱۰، ۱۱

۴۱- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص۷۳۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳، ص:۱۷۶،۱۷۵

۴۲- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۷، ص:۵۲۸-۷ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۷۳

۴۳- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج:۲، ص:۲۹۸، ۸۳۳، ۸۳۴

۴۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۷۴

۴۵- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج:۱، ص:۴۵۵

۴۶- الانبیاء:۲۱، آیت:۷۸، ۷۹

۴۷- تورات، عہد عتیق، سموئیل:۲، باب:۱۱، آیت:۲-۲۷۔

۴۸- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، ص ۳۲۷-۳۳۰۔ نیز دیکھیے: پی. وورہو (P.Voorhoeei)، داؤد علیہ السلام، ج:۹، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص:۱۸۹

۴۹- بنی اسرائیل:۱۷، آیت:۵۵

۵۰- سبا:۳۴، آیت:۱۰

۵۱- نمل:۲۷، آیت:۱۵

۵۲- صٓ:۳۸، آیت:۲۱-۲۴

۵۳- المولیٰ، محمد احمد جاد، ابراہیم، محمد ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید، قصص القرآن عربی، ص۱۹۰۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص۹۱، ۹۳۔ کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص۲۳۲۔

۵۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۸۹، ۹۰

۵۵- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص۱۰۰۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴۶

۵۶- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱، ص۳۴۶۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص:۳۴۶

۵۷- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص۹۱

۵۸- ابنِ کثیر، اسماعیل ابوالفدا ءعماد الدین، البدایہ و النہایہ، ج:۲، ص۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۱

۵۹- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح زبورِ عجم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۲۵

۶۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۹۶/۴

۶۱- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ امم اور اقبال، ص:۲۵۵

۶۲- امروہوی، نسیم، فرہنگ اقبال فارسی، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۳۷۵

۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۴۴/۳۱۴

۶۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۸/۳۳۰

☆☆☆☆

حضرت سلیمان علیہ السلام

اقبال کے نزدیک ملت کی تربیت اور کردار سازی کے لیے سلسلۂ نبوت کی نمائندہ ہستیوں میں سے ایک ہستی حضرت سلیمانؑ کی بھی ہے انھیں ملت کے افراد کے سامنے بطور نمونہ پیش کرنا اہم ہے۔ یہ اعلیٰ ہستی امتیازی شان کی حامل ہے کیونکہ یہ نبوت وحکومت دونوں صفات سے متصف ہے۔اوائل عمر ہی سے عقل ودانائی کی اتھاہ گہرائیوں کی مالک اور ان اعلیٰ خوبیوں سے مزین ہے جو اُمت کے لیے ہر لمحہ باعثِ رہنمائی ہیں۔

انسانی زندگی کے عملی پہلوؤں میں سے حکومت کو بھی سر عنوان کی حیثیت حاصل ہے۔ حکومت چلانے کے لیے عملی رہنمائی اور عملی نمونوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ عملی نمونہ حضرت سلیمانؑ کے روپ میں جلوہ گر ہے۔

اقبال کے ہاں یہ احساس بڑی شدت سے اور بے حد نمایاں ہے کہ میدانِ عمل میں اُترنے والے افراد ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ وقت کی نبض پر ان کا ہاتھ مضبوط ہوتا ہے اور آئین فطرت اور نظام کائنات کے تمام تقاضے بھی انھی کے طفیل پورے ہوتے ہیں۔[۱]

حضرت سلیمانؑ کی شخصیت وکردار کے بے شمار پہلو ہیں جو اہل قلب ونظر کے لیے مرکز نگاہ بننے کے لائق ہیں اور جن کو سمیٹنا آسان نہیں۔اقبال کی نظر بھی اُن کی سیرت وشخصیت کے متعدد حسین اور پُرکشش پہلوؤں پر تھی لیکن افرادِ اُمت کی سیرت سازی کے سلسلہ میں ان کی سیرت کے جو پہلو اقبال کے لیے دلچسپی کا باعث بنے اور جن سے اُنھوں نے مختلف نکات اخذ کیے وہ ''خاتمِ سلیمان'' اور ''مورِ بے مایہ'' کی تلمیحات ہیں جنھیں ''سلمانیت'' میں اور کلامِ اقبال میں اہم مقام حاصل ہے لیکن اقبال نے ان کو صرف حضرت سلیمانؑ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ آفاقی رنگ عطا کر دیا ہے۔

بانگِ درا کی نظم ''صبح کا ستارہ'' اقبال کی قوتِ تخیل کا زبردست کرشمہ ہے۔اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر کسی کو حیاتِ ابدی کی خواہش ہو تو وہ اپنے اندر عشق کا سوز پیدا کرے۔ اس

حقیقت کو اقبال نے ''صبح کے ستارہ'' کی زبان سے ادا کیا ہے۔ صبح کا ستارہ اپنی موجودہ طرزِ زندگی سے غیر مطمئن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ہر روز سحر کے وقت سورج نکلنے سے پہلے نمودار ہوتا ہوں لیکن صبح ہوتے ہی فنا ہو جاتا ہوں۔ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں اختر کی بجائے گوہر بن جاتا اور کسی بیگم کے تاج کی زینت بنتا۔ دیکھ لو! گوہر سلیمانؑ (بادشاہ اور نبی مراد ہے) کی انگوٹھی میں جگہ پاتا ہے لیکن گوہر کا انجام بھی فنا ہے:

ایک پتھر کے ٹکڑے کا نصیبا جاگا
خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کر رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست
ہے گہر ہائے گرانمایہ کا انجام شکست[۲]

''اخترِ صبح'' کہتا ہے کہ وہ دائمی زندگی چاہتا ہے۔ اس لیے اُس کی خواہش ہے کہ وہ کسی محبِ وطن شخص کی بیوی کا آنسو بن جائے جو اُس کے شوہر کی جنگ کے لیے رخصتی کے وقت فرطِ محبت کے اظہار کے لیے اُس کی آنکھ سے گرے اور محبت کی وجہ سے آنسو ہونے کے باوجود زندہ جاوید ہو جائے۔

مذکورہ بالا نظم میں اقبال نے عشق کے دائمی ہونے کی صفت کا ذکر ستارے کی زبانی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اس ذیل میں وہ حضرت سلیمانؑ کی ''خاتم'' کا ذکر بھی لائے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اُن انبیاء کرامؑ میں سے ایک ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ لیکن جہاں تک ''خاتمِ دستِ سلیمانؑ'' کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں کوئی معلومات میسر نہیں ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کی تلمیح کا ماخذ کیا ہے اور انھوں نے اس تلمیح کے ذریعے افرادِ ملت کو کیا پیغام اور درس دیا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے حضرت سلیمانؑ کی سیرت اور کردار کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ حقیقت تک رسائی ہو سکے۔

حضرت سلیمانؑ کا نسب نامہ یہ بیان کیا گیا ہے:۔

سلیمان بن داؤد بن ایشا بن عوید بن عابر بن سلمون بن تحشون بن عمینا داب بن ارم بن حصرون بن فارص بن یہودا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔[۳]

ان کی والدہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ تورات نے بتشابع بنت الٰی عام نام بتایا ہے جو اوّل اوریاہ کی بیوی تھی پھر حضرت داؤد کی زوجیت میں آئی اور حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ لیکن یہ

لغو قصہ ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے۔[۴]

قرآن پاک نے حضرت سلیمانؑ کا واسطہ حضرت یعقوبؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک بتایا ہے۔[۵] اور آپ کا ذکر سورۃ بقرہ، النساء، الانعام، الانبیاء، سباء، اور سورۃ صٓ میں کل سولہ مقامات پر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو عقل و نادانی اور مقدمات کے لیے اصابتِ رائے کا کمال فطرت ہی سے عطا کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی اوائل عمر کا ایک واقعہ روشن دلیل ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ملتا ہے۔

وَدَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَکُنَّا لِحُکْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا[۶]

ترجمہ: اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کو یاد کرو جب کھیتی کا ایک جھگڑا چکاتے تھے جب رات کو اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں چھوٹیں اور ہم ان کے حکم کے وقت حاضر تھے۔ ہم نے وہ معاملہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا اور دونوں کو حکومت اور علم عطا کیا۔

مفسرین نے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤدؑ پیر سالخوردہ کی خدمت میں کچھ لوگ ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے مدعی نے دعویٰ کی تفصیل یہ بتائی کہ مدعا علیہ کی بھیڑوں کے گلّے نے چر کر اُس کی تمام کھیتی تباہ برباد کر دی۔ حضرت داؤدؑ نے اپنے علم و حکمت کے مدنظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعا علیہ کے بھیڑوں کے گلّے کے برابر ہے۔ اس لیے پورا گلّہ دعویٰ کرنے والے کو دے دیا جائے۔ جہتِ علم و حکمت میں برتری رکھنے والے کم عمر حضرت سلیمانؑ باپ کے قریب ہی تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے اگرچہ آپؑ کا فیصلہ درست ہے مگر فیصلہ کی اس سے بھی زیادہ موزوں شکل یہ ہے کہ مدعا علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اُس کے دودھ اور اُون سے نفع اُٹھائے اور مدعا علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس عرصہ میں مدعی کے کھیت کی خدمت کرے۔ جب کھیت اپنی اصلی حالت پر آ جائے تو کھیت کو مدعی کو واپس دے کر اپنا ریوڑ لے لے۔ حضرت سلیمانؑ کا یہ استحسانی فیصلہ حضرت داؤدؑ کو اپنے قیاسی فیصلہ کے مقابلے میں زیادہ پسند آیا۔[۷]

اس وقت حضرت سلیمانؑ کی عمر گیارہ سال تھی۔[۸] یہ فیصلہ اس امر کی ابتدا تھا کہ آپؑ اپنے والد کے بہتر خلیفہ ثابت ہوں گے۔[۹]

حضرت داؤدؑ نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا تھا۔ اس لیے بچپن ہی سے اُنھیں سلطنت

کے معاملات میں شریک کرنے لگے۔ خاص طور پر مقدمات کے فیصلے کرنے میں اُن سے ضرور مشورہ لے لیا کرتے تھے۔

مؤرخین کے مطابق حضرت داؤدؑ کی وفات کے بعد حضرت سلیمانؑ کو نبوت وحکومت دونوں میں جانشین بنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ سن رُشد کو پہنچ چکے تھے۔[۱۰]

وَ وَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ[۱۱]

ترجمہ: اور سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث ہوا۔

حضرت داؤدؑ کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بھی یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند وپرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔ یقیناً یہ علم اسباب دینی سے بالاتر قدرت الٰہی کے خاص فیضان کا نتیجہ تھا جو انھیں بطور شان عطا ہوا تھا۔[۱۲]

حضرت سلیمانؑ کی نبوت کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے لیے ہوا کو مسخر و زیر فرمان کر دیا تھا[۱۳] چنانچہ حضرت سلیمانؑ جب چاہتے صبح کو ایک مہینہ کی مسافت کی مقدار سفر کر لیتے تھے۔[۱۴] سفر کرتے ہوئے زمینی بستیوں کا جائزہ بھی لیتے جاتے تھے اور بوقت ضرورت فیصلے بھی کرتے تھے۔[۱۵] قرآن حکیم میں حضرت سلیمانؑ کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔

۱- یہ کہ ہوا کو سلیمانؑ کے لیے مسخر کر دیا گیا۔

۲- ہوا ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز وتند ہونے کے باوجود ان کے حکم سے آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ اس وجہ سے رساں بھی ہو جاتی تھی۔

۳- نرم روی کے باوجود حضرت سلیمانؑ کا صبح اور شام کا جدا جدا سفر مسلسل ایک مہینے کی مسافت کے برابر ہوتا تھا۔[۱۶] اس مسافت میں آپؑ کا لاؤ لشکر بھی ہمراہ ہوتا تھا۔[۱۷]

اس کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کو ایک اور امتیاز بھی حاصل تھا جو اس کائنات میں کسی کے حصہ میں نہ آیا تھا۔ صرف انسان ہی ان کے تابع نہ تھے بلکہ جن اور حیوانات بھی احکامات کی اطاعت و پیروی کرتے تھے۔[۱۸] یہ سب اس لیے ہوا کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی:

رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ ہَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَہَّابُ ۝[۱۹]

ترجمہ: (عرض کی) اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی کے

لائق نہ ہو، بے شک تو بڑی دین والا ہے۔

مذکورہ بالا دعا میں حضرت سلیمانؑ نے خلافت کا کامل ترین مظہر ہونے کی عرضی اللہ کے حضور پیش کی۔ درحقیقت یہ دعا آپ کی مکمل صلاحیت کی ترجمان ہے اور یہ صلاحیت اللہ کی عطا کردہ ہے جو آپ کو مانگنے پر عطا ہوئی۔[۲۰] حضرت سلیمانؑ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انھوں نے جنوں سے خدمت لے کر اپنی حکومت کے چوتھے سال، ۱۰۷۸ قبل مسیح[۲۱] میں بیت المقدس کی تعمیر کا وہ کام اپنی نگرانی میں مکمل کروایا جو ان کے والد حضرت داؤدؑ نہ کروا سکے تھے۔[۲۲] بیت المقدس کو پورا کرنے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے بڑی بڑی قربانیاں اور ذبیحے کیے اور بنو اسرائیل کو خوب کھلایا پلایا۔ چنانچہ وحی نازل ہوئی کہ تو نے میرے حکم کی اطاعت کے لیے سب کچھ کیا ہے جو کچھ مانگے گا پائے گا۔

حضرت سلیمانؑ نے تین سوال کیے:-

۱- مجھے ایسا فیصلہ دے جو تیری رضا کے مطابق ہو۔

۲- ایسا ملک دے جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔

۳- جو کوئی اس گھر میں نماز کے ارادے سے آئے اُس کو ایسا پاک کر دے گویا آج ہی پیدا ہوا۔

ابنِ کثیر کہتے ہیں اِن میں سے پہلی دو چیزیں تو اُنھیں مل گئیں اور مجھے امید ہے تیسری بھی انھیں مل گئی ہوگی۔[۲۳]

قوم جن نے بیت المقدس کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کے لیے اور بھی بہت سی عجیب و غریب چیزیں بنائیں جن کا ذکر قرآن پاک[۲۴] اور تورات دونوں میں ہے۔[۲۵]

حضرت سلیمانؑ اتنی دولت و ثروت کے باوجود اپنی روزی ٹوکریاں بنا کر حاصل کرتے تھے۔[۲۶] وہ عظیم الشان عمارات اور پرشوکت و پرہیبت قلعوں کی تعمیر کے دلدادہ تھے اور ایسی تعمیرات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مضبوطی کے لیے گارے اور چونے کی بجائے پگھلی ہوئی دھات استعمال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اُن کے لیے دھات کے چشمے پگھلا دیتا تھا۔ یہ حضرت سلیمانؑ کے لیے ایک نشان تھا۔ اس سے قبل کوئی دھات پگھلانا نہیں جانتا تھا۔[۲۷] ابن کثیر کی نقل شدہ روایت کے مطابق یہ تانبے کے چشمے یمن میں تھے۔ جو صرف حضرت سلیمانؑ پر ظاہر تھے۔[۲۸] تورات میں حضرت سلیمانؑ کے اس خصوصی امتیاز کا ذکر نہیں ملتا۔

علاوہ ازیں قرآن پاک میں سورہ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کی گھوڑوں سے دلچسپی و محبت[۲۹]

کی آزمائش کا ذکر بھی ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمَانَ وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا اَنَابَ o قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ o [۳۰]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے سلیمانؑ کو جانچا اور اس کے تخت پر ایک بے جان بدن ڈال دیا پھر رجوع لایا اور عرض کی اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو بیشک تو ہی بڑی دین والا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں حضرت سلیمانؑ کی ایک آزمائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ آزمائش کیا تھی؟ اس کے بارے میں صرف اتنا سا اشارہ ملتا ہے کہ اُن کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا گیا۔ احادیث میں بھی اس کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف واقعات بیان کیے ہیں جن میں سے چند ایک تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت سلیمانؑ سخت بیمار ہو گئے۔ جب اُٹھا کر تخت پر بٹھائے گئے تو جسم بے جان معلوم ہوتا تھا۔ صحت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور لاثانی حکومت کی دعا کی جو انھیں مل گئی۔ [۳۱]

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جنات نے کہا کہ اگر یہ زندہ رہا تو ہم جبری فرمانبرداری سے چھٹکارا نہ پاسکیں گے۔ لہٰذا اسے قتل کر دینا یا پاگل بنا دینا چاہیے۔ حضرت سلیمانؑ کو پتہ چلا تو انھوں نے جنات کے فریب کے ڈر سے بچہ کو لے جا کر بادل میں چھپا دیا۔ پھر آپ کو بچہ کی خبر نہ ہوئی جب تک اُسے کرسی پر مردہ حالت میں پڑا ہوا نہ پایا یہ حضرت سلیمانؑ کو ان کی غلطی پر تنبیہ تھی کہ انھوں نے رب پر بھروسہ نہ کیا۔ [۳۲]

بعض نے اس آزمائش کی تفسیر ایک حدیث بتائی ہے جس کے مطابق حضرت سلیمانؑ کی ساٹھ بیویاں تھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے یہ کہہ کر سب سے صحبت کی کہ اس صحبت سے ہر بیوی حاملہ ہو کر جو بچہ جنے گی وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا۔ لیکن ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ اس لیے ایک ناتمام بچہ جنا۔ [۳۳] بعض نے کہا ہے یہ ناتمام بچہ اُن کے سامنے اس وقت لایا گیا جب وہ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے اور یہ آزمائش تھی۔ ان واقعات کے علاوہ اور بھی کئی واقعات کتب تفاسیر میں درج ہیں جن کا اسلامی روایات سے دور کا واسطہ نہیں۔ وہ تمام تر یہودی قصص اور اسرائیلی خرافات کا مجموعہ ہیں۔ خلاصہ ان کا یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا۔ اس کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان کیا گیا ہے

کہ حضرت سلیمانؑ کی ایک بیوی امینہ بت پرست تھی۔ وہ اپنے باپ کا بت بنا کر خود بھی اس کی پرستش کرتی تھی اور باندیوں سے بھی کرواتی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی اس مدت تک وہ بادشاہت سے محروم کر دیے گئے۔ ان کی وہ انگوٹھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا، ان کی لونڈی جرادہ کے ذریعے شیطان تک پہنچ گئی اور وہ سلیمانؑ کی شکل میں تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔ اتنا عرصہ حضرت سلیمانؑ کا حال نہایت خراب رہا۔ پھر مقررہ مدت ختم ہونے پر انگوٹھی شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی۔ اُسے ایک مچھلی نے نگل لیا وہ مچھلی کسی سبب سے شکار ہو کر حضرت سلیمانؑ کے پاس آئی۔ پیٹ چاک کرنے پر اُنھیں انگوٹھی مل گئی۔ اس طرح اُنھوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔[۳۴]

تورات میں بھی اسی سے ملتا جلتا قصہ مذکور ہے۔[۳۵]

سلطنت کے چھن جانے کا ذکر اقبال یوں کرتے ہیں:

آنکہ یک دست برد ملکِ سلیمانے چند
بافقیراں دو جہاں باختنش را نگرید[۳۶]

ترجمہ: جو ذات ایک ہی ہاتھ سے ملکِ سلیمان جیسی کئی سلطنتیں چھین لیتی ہے۔ اس کا اپنے فقیروں کو دونوں جہاں بخش دینا دیکھیے۔

اسرائیلی روایات میں اکثر اولوالعزم پیغمبروں کی جانب خرافات اور ذلیل واقعات کی نسبت کی گئی ہے۔ اسے ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا اسلام کی تعلیمات سے کیا تعلق ہے۔ یہ تمام قصہ از اوّل تا آخر اہل کتاب کی کہانیوں سے لیا گیا ہے جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے جن میں ابن کثیر، امام رازی، قاضی عیاض، شیخ بدر الدین عینی اور ابن حبان نے علاوہ محققین و محدثین اور مفسرین کا ایک جم غفیر شامل ہے۔ اس قصہ سے متعلق روایات کو اہل کتاب کی ہذلیات ظاہر کیا ہے اور اسلامی روایات کے دامن کو اس گندگی سے پاک کیا ہے۔[۳۷] سچ تو یہ ہے کہ خاتم سلیمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی حضرت سلیمانؑ کے کمالات کسی خاتم یا انگشتری کا کرشمہ تھے اور نہ ہی شیطان کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیاءؑ کی شکل میں آ کر اللہ کی مخلوق کو گمراہ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی بھی نبی کی خطا کی سزا کو اتنی فتنہ بھری شکل دے دے جس سے ابلیس نبی بن کر پوری امت کا بیڑا غرق کر دے۔[۳۸]

اس تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اقبال کا ''خاتم سلیمان'' کا ماخذ اسرائیلیات ہے۔ لیکن اقبال نے اس کے تذکرے کو صرف واقعاتی بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس میں آفاقی پہلو غالب آ گیا ہے۔ وہ ''سلیمان'' مسلمان کے لیے ''خاتم'' مسلمان کی شخصیت کے لیے اور ''نگیں'' اُس کی اُس قوت اور طاقت کے لیے استعارۃً لائے ہیں جسے سلیمانؑ (مسلمان) نے اپنی غفلت سے گنوا دیا[۳۹] اور حکومت کھو دی جس کا اقبال کو سخت رنج ہے۔

''تضمین بر شعرِ ابو طالب'' میں کہتے ہیں:

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوا یا وہ نگیں![۴۰]

اقبال نے اسی ''خاتمِ سلیمان'' سے ایک اور منفرد نکتہ پیدا کیا ہے اور مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ اس ''خاتم'' کو ہی کافی نہ سمجھیں بلکہ دیگر ''اعجاز سلیمان'' بھی سیکھیں۔ کیونکہ موجودہ اہرمن (دشمنانِ دین) ان پر آنکھ لگائے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا ایمان کو بچانا اور اس کی حفاظت کرنا لازم ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان از سرِ نو اپنے اندر دُشمنانِ دین کو مسخر کرنے کی طاقت پیدا کر لیں۔[۴۱]

اے مسلماں دگر اعجازِ سلیماں آموز
دیدہ بر خاتمِ تو اہرمنے نیست کہ نیست[۴۲]

ترجمہ: اے مسلمان دوبارہ سلیمانؑ کا اعجاز سیکھ، کیونکہ کوئی ایسا اہرمن نہیں جس کی نظر تیری انگوٹھی پر نہ ہو۔

مشہور ہے کہ سلیمانؑ کی انگوٹھی شیاطین لے گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہی۔

آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ
ہم بجبریلِ امینے نتواں کرد گرو[۴۳]

ترجمہ: وہ قیمتی نگینہ جو تو نے شیطانوں کو ہار دیا ہے۔ اسے تو جبریل امیں کے پاس بھی گروی نہیں رکھا جا سکتا۔

ہماری کم مائیگی سے میکدہ رسوا ہو گیا ہے، پیالہ اٹھا ہوش مندی سے پی اور آگے چل۔

اقبال نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ تم نے اپنے ضمیر و ایمان اور دل و دماغ کو اس کے اہرمنوں (دُشمنان دین مُراد طاغوتی طاقتیں (ابلیس) کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ اتنا قیمتی ہے کہ اسے جبریل امینؑ کے حوالہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔[۴۴]

دراصل اقبال نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ حرکت وعمل سے کام لیں۔ خود اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں اور اپنی متاعِ دین کی حفاظت کریں۔

قرآن مجید میں سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا ایک واقعہ تفصیل سے ملتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمت کے لیے موجود رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ نے دربار سجایا ہوا تھا۔ آپ نے جائزہ لیا تو ہد ہد نظر نہ آیا۔ فرمایا اگر وہ غیر حاضر ہے تو غیر حاضری کی معقول وجہ بتائے بغیر چھوٹ نہ سکے گا۔ تھوڑی دیر بعد ہد ہد آیا اور دیر سے آنے کی وجہ بتائی کہ وہ ایک نئی خبر لایا ہے۔ ملکِ سبا میں ایک ملکہ حکمران ہے جو خدا کی تمام نعمتیں رکھتی ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا قیمتی تخت ہے۔ ملکہ اور اُس کی قوم اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے اور ان کو راہ حق سے روک رکھا ہے۔[۴۵]

حضرت سلیمانؑ نے ہد ہد کی سچائی کا امتحان لینے کے لیے اُسی وقت ایک خط لکھ کر ملکہ سبا کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اُن سے علیحدہ رہ کر معلوم کرے کہ اُن کا جواب کیا ہے؟

ہد ہد نے خط ملکہ کو پہنچا دیا۔ ملکہ نے خط پڑھ کر اپنے درباریوں کو خط میں دیے گئے پیغام توحید کے بارے میں بتایا اور اُن سے مشورہ طلب کیا۔ ایک روایت کے مطابق ۱۲ ہزار ارکان دولت نے جنگ کا مشورہ دیا[۴۶] اور تمام معاملہ ملکہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ دور اندیش ملکہ نے جنگ کے دونوں پہلوؤں فتح اور شکست کو سامنے رکھتے ہوئے قاصدوں کے ذریعے تحائف بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ قاصد حضرت سلیمانؑ کی شوکت وعظمت اور اس کی طاقت کا اندازہ کر آئیں۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر واقعی وہ زبردست طاقت وشوکت کا بادشاہ نکلا تو ہمارا اس سے لڑنا بے فائدہ ہوگا۔ درباریوں نے ملکہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ ملکہ نے قاصدوں کو بیش قیمت تحائف دے کر حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا۔ حضرت سلیمانؑ نے تحائف لینے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ میرا مقصد ملک، حکومت اور مال ودولت کا حصول نہیں بلکہ ''اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہو جائیں۔ جاؤ اور ملکہ سے کہہ دو کہ اگر میرے نصب العین میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ آؤں گا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے گا۔ قاصدوں نے واپس جا کر ساری داستان سُنائی اور حضرت سلیمانؑ کی ہیبت، عظمت وشوکت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔

چنانچہ ملکہ سبا نے خود سلیمانؑ کی خدمت میں پہنچنے کا ارادہ کرلیا تا کہ حضرت سلیمانؑ کے احوال کا خود مشاہدہ کرے۔ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کی آمد کی اطلاع پا کر درباریوں کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ ملکہ کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت یہاں پہنچا دیا جائے۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم پر ایک کتاب کا علم رکھنے والا عالم چشمِ زدن سے پہلے تخت لے کر پہنچ گیا۔[۴۷] حالانکہ مشہور ہے کہ ملکہ نے اپنے اس تخت کو سات محلوں میں مقفل کیا تھا اور اپنے خلیفہ کو اس کی حفاظت کی خاص تاکید کی تھی۔[۴۸]

حضرت سلیمانؑ نے خدا کے اس عطا کردہ "اعجاز" کو دیکھا تو رب کا عظیم الشان فضل و کرم قرار دیا اور اُس کا شکر بجالائے۔ بلاشبہ یہ اعجاز حضرت سلیمانؑ کی نبوت و رسالت کا نشان ہے۔ اقبال نے "اعجازِ سلیمان" کہہ کر اسی طرف تلمیحی اشارہ مہیا کیا ہے۔ اور مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ بھی بیدار ہوں اور اپنی کھوئی ہوئی حکمرانی پھر سے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس کے لیے دین و مذہب سے رشتہ استوار کرنا اور اطاعتِ شریعت بجالانا لازمی اور بنیادی نکتہ ہے۔[۴۹]

کچھ عرصہ بعد ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں حاضر ہوئی تو اُس سے تخت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا اُس کا تخت ایسا ہی ہے؟ عقل مند ملکہ نے جواب دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے۔ ملکہ سبا نے مزید یہ کہا کہ مجھے آپ کی بے نظیر اور عدیم المثال قوت و طاقت کا پہلے ہی سے علم ہو چکا ہے۔ اس لیے میں مطیع و فرماں بردار بن کر آئی ہوں۔ "اعجاز سلیمان" کو دیکھنے کے باوجود اُس کی سورج پرستی "پیغام سلیمانی" کو سمجھنے کی راہ میں حائل ہوئی اور وہ ہدایت یاب نہ ہوئی۔ اس لیے اب حضرت سلیمانؑ نے دوسرا لطیف انداز اختیار فرمایا۔ انھوں نے جنوں کی مدد سے ایک عالی شان شیش محل تیار کروایا اور ملکہ سے کہا کہ محل میں جائے۔ ملکہ نے اس محل (ساخت) کو دیکھا تو سمجھی گہرا پانی بہہ رہا ہے۔ یہ خیال کر کے اُس نے گزرنے کے لیے اپنی پنڈلیاں کھولیں تو کسی نے کہا یہ تو ایک محل ہے جس میں آبگینے جڑے ہیں۔ یہ سُنتے ہی ملکہ تائب ہوئی اور اللہ تعالیٰ اور حضرت سلیمانؑ پر ایمان لے آئی۔[۵۰] حضرت سلیمانؑ کا مقصد بھی یہی تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے خط میں کر دیا تھا لیکن ملکہ سبا حقیقت توحید اور دین اسلام سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ کے مطلب کو نہ سمجھ سکی تھی۔

تورات میں بھی حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی ملاقات کا تذکرہ ملتا ہے۔[۵۱] لیکن قرآن پاک کے بیان کے برعکس تورات میں حضرت سلیمانؑ کو صرف بحیثیت بادشاہ دکھایا گیا ہے۔

اس بیان میں اولوالعزم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔[۵۲]

کتب تفاسیر میں ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا سے نکاح کر لیا اور اُسے اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دے دی۔ گاہے گاہے ملاقات کرنے جاتے رہے۔[۵۳] لیکن قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعہ کا بیان نہیں ہے۔

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانوروں کی بولیاں سمجھنے کا علم رکھتے تھے۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ قرآن پاک میں ملتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ جن وانس اور جانوروں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ عسقلان جا رہے تھے۔[۵۴] راستے میں جب لشکر کے ہمراہ ''وادی نملہ'' میں پہنچے[۵۵] تو حدس[۵۶] نامی ایک چیونٹی نے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر چیونٹیوں کو مخاطب کیا اور کہا تم فوراً اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ کہیں سلیمانؑ اور اُن کا لشکر بے خبری میں تمھیں کچل ڈالے۔ ابھی حضرت سلیمان چیونٹیوں سے تین میل دور تھے۔[۵۷] چیونٹی کی یہ بات سن کر حضرت سلیمانؑ ہنس پڑے اور کہنے لگے: اے پروردگار! مجھ کو توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ۝ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۝ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ۝[۵۸]

ترجمہ: اور جمع کیے گئے سلیمان کے لیے اس کے لشکر جنوں اور آدمیوں اور پرندوں سے۔ تو وہ روکے جاتے تھے یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے نالے پر آئے ایک چیونٹی بولی! اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں چلی جاؤ تمھیں سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے۔ تو اس کی بات سے مسکرا کر ہنسا اور عرض کی اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ بھلا کام کروں جو تجھے پسند آئے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے ان بندوں میں شامل کر جو تیرے قربِ خاص کے سزاوار ہیں۔

رموز بے خودی میں ''حکایت سلطان مراد و معمار در معنی مساواتِ اسلامیہ'' ہے جس میں اقبال نے سلطان مراد اور معمار کی حکایت بیان کی ہے۔ معمار نے بادشاہ کے حکم پر ایک مسجد

تعمیر کی۔ بادشاہ کو اُس کی تعمیر پسند نہ آئی لہٰذا اُس نے معمار کا ہاتھ خنجر سے کاٹ دیا۔ معمار قاضی کے پاس جا کر عدل کا طلب گار ہوا۔ قاضی نے فوراً بادشاہ کو بلایا اور قصاص کا حکم دیا۔ بادشاہ نے اپنا ہاتھ آستین سے نکال کر آگے بڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر مدعی نے عدل و احسان کی آیت پڑھی اور بادشاہ کو اللہ اور اس کے رسول کی خاطر معاف کر دیا۔ اقبال اس واقعہ کو نظم کرنے کے بعد کہتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است[۵۹]

ترجمہ: پیغمبر کے آئین کی شان دیکھیے ایک چیونٹی نے سلیمانؑ پر فتح پائی۔ قرآن پاک کی نظر میں بحیثیت انسان آقا و غلام برابر ہیں۔ کوئی بوریا نشیں ہو یا تخت کا وارث ان میں کوئی فرق نہیں۔

اقبال مندرجہ بالا شعر میں ''مورے'' معمار کے لیے اور ''سلیمانے'' بادشاہ کے لیے لائے ہیں۔ مقصود معمار کو حقیر اور بادشاہ کو 'اعلیٰ' ظاہر کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس شعر میں حضرت سلیمانؑ کے قرآن میں مذکورہ واقعہ کی طرف بھی اشارہ مہیا کیا ہے کہ ان تلمیحی اسما سے ذہن سورۃ نمل میں مذکور اُس واقعہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اقبال نے مور کی تلمیح کم حیثیت افراد ہی کے لیے استعمال نہیں کی بلکہ انھوں نے پوری امت کو بھی ''مورِ بے مایہ'' اور بادشاہ وقت کو ''سلیمان'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ان دونوں تلمیحات کا استعمال بڑا معنی خیز اور ہمہ جہت ہے۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی حیثیت ''مورِ بے مایہ'' سے زیادہ نہیں ہے۔ جب جس کا دل چاہے انھیں پاؤں تلے روندتا چلا جائے۔ وہ کسی روک ٹوک یا مزاحمت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔[۶۰] لیکن شاعر کی آرزو ہے کہ یہ ''مورِ بے مایہ'' قوم انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے اور اپنی مفلسی و حقارت کو ختم کرنے کی سعی کرے تا کہ اپنی کھوئی ہوئی ''سلیمانیت'' حاصل کر کے ''ہمدوشِ سلیمان'' ہو جائے۔ شاعر کی یہی آرزو ''شکوہ'' میں دُعا میں ڈھل گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے[61]

شاعر ''مورِ بے مایہ'' (مسلمان) کو ''ہمدوشِ سلیماں'' یعنی بادشاہانِ وقت کے برابر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اُن کی یہ تمنا اس لیے بھی شدید ہے کہ ماضی میں مسلمان اس ''سلیمانیت'' کی بدولت دُنیا میں پرچم توحید بلند کرتے رہے۔ اقبال اب بھی توحید کا وہی بول بالا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ توحید کا علم بردار غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ الصمد سے دل لگا لیتا ہے۔ اللہ سے دل لگانے کے بعد اُسے اسباب کی تمام حدود کو پھلانگ جانا چاہیے اور سراپا خیر بننا چاہیے۔ نیز اُسے کسی دولت مند یا بادشاہ وقت کے سامنے اپنی حاجت بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ چاہے وہ کتنا ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو۔ اسرار رموز میں ''اللہ الصمد'' میں اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے بھی اقبال ''مورو ہم بے بال و پر'' اور ''سلیمانے'' کی تلمیح لائے ہیں اور دو گونہ مفہوم بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر
حاجتے پیشِ سلیمانے مبر[62]

ترجمہ: اگر تو بے بال و پر چیونٹی ہو تو بھی سلیمانؑ کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کر۔

ایسے ہی بانگِ درا کی نظم خضرِ راہ میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورے بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر[63]

دراصل ان دونوں تلمیحات کے ذریعے اقبال نے امتِ مسلمہ کو خودداری کا سبق دیا ہے اور ان پر زور دیا ہے کہ بادشاہِ وقت کے سامنے حاجت پیش کرنے سے گریز کریں۔ کسی کے سامنے حاجت پیش کرنا خودی کی کمزوری کا باعث ہے۔ اس سے خودی کے اجزا بکھر جاتے ہیں۔ خودی کا نخلِ سینا تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس سے مفلسی اور حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حاجت مند نادار ہو جاتا ہے۔ اس لیے حاجت مند کو اپنی مشتِ خاک کو پراگندہ نہ کرنا چاہیے اور چاند کی طرح اپنے پہلو سے رزق حاصل کرنا چاہیے۔ چاہے وہ مصائب کے سیلاب کے منجدھار میں پھنسے ہوں۔ اُن پر لازم ہے کہ عین دریا میں اپنے پیمانے کو بلبلہ کی طرح آسانگوں رکھیں۔ تاکہ کل کو رسول پاک ﷺ

کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے اور دُنیا میں بھی ملت اسلامیہ کی آبرو برقرار رہے۔[۶۴]

حضرت سلیمانؑ وہ واحد نبی ہیں جن کی حیات کے ساتھ ساتھ وفات کے واقعہ کی تفصیلات بھی قرآن پاک کی سورۃ سبا میں ملتی ہیں۔ ان تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے جنوں کی ایک بڑی جماعت عظیم الشان عمارات بنانے میں مشغول تھی کہ حضرت سلیمانؑ کو موت کا پیغام آ پہنچا۔ مگر جن اس سے بے خبر اپنی خدمات میں مصروف رہے۔ جب ایک عرصہ کے بعد حضرت سلیمانؑ کی لاٹھی کو دیمک نے چاٹ لیا تو حضرت سلیمانؑ کا توازن خراب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ لاٹھی سے ٹیک لگائے نظر آتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے گرنے پر جنوں کو انتقال کا علم ہوا اور وہ کہنے لگے کہ افسوس ہم معلوم نہ کر سکے۔ کاش ہم علمِ غیب رکھتے تو عرصہ تک اس محنت مشقت میں نہ رہتے جس میں حضرت سلیمانؑ کے خوف سے مبتلا رہے۔[۶۵]

وفات کے وقت حضرت سلیمانؑ کی عمر ۵۳ سال بیان کی گئی ہے[۶۶] تورات میں مذکور ہے کہ آپ نے چالیس سال حکومت کی اور وفات کے بعد اپنے باپ دادوں کے ساتھ صیہون میں دفن کیے گئے۔[۶۷]

حیات و سیرت سلیمانؑ اور اقبالی نقطۂ نظر کا پہلو بہ پہلو جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اقبال نے ''سلیمانیت'' کے تمام اہم پہلوؤں کو سمیٹا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اسرائیلی روایات کو بھی اشعار میں سمو کر اُن سے خوب سے خوب تر نکات اخذ کیے اور امت مسلمہ کو اکسایا کہ بحیثیت مسلمان ایسے کارنامے سرانجام دیں جن کو سرانجام دینا اور جن کے بارے میں سوچنا بھی غیر مسلم کے لیے محال ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں کے قلوب پر علمبردارانِ توحید کا رعب و دبدبہ بیٹھ جائے اور وہ عقل کی کسوٹی پر جانچ کر اقرارِ توحید کرنے پر بخوشی تیار ہو جائیں۔ یہی ہمارا فرض ہے اور یہی ہماری فتح۔

اقبال کے زمانے کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کو ''سلیمانیت'' کی امثال پیش کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ ایک کمزور (مورے بے مایہ)، بے بس اور ذہنی و جسمانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی قوم کو بیدار کرنے کے لیے اور اسے اس کی خودی کا احساس دلانے کے لیے، کھویا ہوا مقام پھر سے پانے کی سعی کرنے کے لیے شاندار امثال کی اشد ضرورت تھی۔ جن کو سامنے رکھتے ہوئے وہ پھر سے میدانِ عمل میں سرگرم ہو جائیں۔ اقبال نے یہ فریضہ ''سلیمانیت'' کے ذریعے نبھایا اور خوب نبھایا۔ انھوں نے بلاواسطہ اور بالواسطہ امت

مسلمہ کو نبوت کی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ انھیں تعلیم دی کہ اس مقام کے حصول کے لیے پھر سے سرگرم عمل ہو جائیں، اپنی حقیقت کو پہچانیں اور اسی میں ان کی کامیابی ہے۔ انھیں اپنی کم حیثیتی اور کم وقعتی سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ نبوت کا وارث ہونے کی وجہ سے ''جہاں بانی'' کا حق صرف اور صرف اُن کا ہے۔ وہ اپنی غفلت، نادانی اور بے عملی کی وجہ سے اس کی اصل سے ناآشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ خود سے بیگانے حقیر و ذلیل زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر سے حکومت کے حصول کے لیے انھیں غفلت ترک کر دینی چاہیے۔ مستعدی اور خود احتسابی ضروری ہے کہ اُسی سے اُن میں حیاتِ نوجنم لے سکتی ہے اور وہ دوبارہ سے ''سلیمانیت'' حاصل کر سکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ مسلمانانِ ہند نے اُن کے اس پوشیدہ پیغام کی روح تک رسائی پالی۔ اُن میں بیداری کی ایک نئی لہر نے جنم لیا جس کا نتیجہ آج پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجوم ہدایت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۶۵

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۸۶/۸۶

۳- ابن کثیر، اسماعیل، ابوالفداء عمادالدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج: ۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۶۴

۴- تورات، عہد عتیق، سموئیل: ۲، باب: ۱۱، آیت: ۱-۲۷

۵- الانعام: ۶، آیت: ۸۴

۶- الانبیاء: ۲۱، آیت: ۷۸، ۷۹

۷- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ دوم، پروگریسو بکس لاہور، بار اوّل، ۱۳۶۰ھ، ص: ۷۵

۸- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج: ۷، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص: ۴۹۲

۹- المولی، محمد احمد جاد، البجاوی، علی محمد ابراہیم، محمد ابوالفضل شحاتہ، السید، قصص القرآن (عربی) المکتبۃ

التجاریۃ الکبریٰ، بمصر الطبعۃ العاشرۃ ۱۹۶۹ء، ص: ۲۰۳

۱۰- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۰۰، ۱۰۱۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج: ۷، دینی کتب خانہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۷ء، سن ندارد، ص ۵۳۶ ۷ میں درج ہے کہ حضرت سلیمانؑ جب بادشاہ بنے ان کی عمر ۱۳ سال تھی۔ پانی پتی، علامہ قاضی محمد، ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج: ۹، سعد ایچ۔ ایم کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۵۹ میں بھی عمر ۱۳ سال ہی بیان کی گئی ہے۔ ابن کثیر، امام ابوالفداء اسماعیل، قصص الانبیاء (عربی) ج: ۱-۲، الطبعۃ الاولیٰ، دارالفکر للطباعۃ والنشر والتواریخ، لبنان، بیروت، میں بھی عمر ۱۳ سال بتائی گئی ہے

۱۱- النمل: ۲۷، آیت: ۱۶

۱۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: سورۃ النمل: ۲۷، آیت: ۱۶

۱۳- الانبیاء: ۳۱، آیت: ۸۱

۱۴- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۰۳، ۱۰۴

۱۵- ابن کثیر، اسماعیل، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ و النہایہ، ج: ۱-۲، ص ۳۷۰

۱۶- ص: ۳۸، آیت: ۳۵۔ نیز دیکھیے: سبا ۳۴، آیت: ۱۲

۱۷- ابن کثیر اسماعیل، ابوالفداء عماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص: ۳۶۴

۱۸- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۰۳

۱۹- ص: ۳۸، آیت: ۳۵

۲۰- ابن عربی، بابا ذہین شاہ تاجی (مترجم)، فصوص الحکم، شیخ اکبر محی الدین، مکتبہ تاج کراچی، ۱۹۷۶ء، ص: ۴۷۹، ۴۸۰

۲۱- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی ج: ۱-۲، از نشریات کتاب فروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، بار ۲۵، ۱۳۶۰، ص: ۶۱۰

۲۲- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج: ۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۰۷، ۱۰۸۔ نیز دیکھیے: ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج: ۲، ص ۳۷۵۔ کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج: ۱، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، بار اوّل، رمضان المبارک، ۱۴۰۲ھ، ص: ۲۵۴۔

۲۳- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین دمشقی، تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، پ: ۲۳، ص: ۶۲۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج: ۹، ص: ۴۵۶، ۴۵۷

۲۴- السبا: ۳۴، آیت: ۱۳، نیز دیکھیے: صٓ: ۳۸، آیت: ۳۷

۲۵- تورات، عہد عتیق، سلاطین: ۱، باب: ۹، آیت: ۱۵-۲۰۔ نیز دیکھیے: حوالہ مذکورہ بالا، باب: ۸، آیت: ۱۱-۱۵

۲۶- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۱۱۰

۲۷- ایضاً، ص:۱۱۰، یہ چشمے تین دن یا سال بھر بہے

۲۸- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص ۱۱۱

۲۹- صٓ:۳۸، آیت:۳۱-۳۳

۳۰- صٓ:۳۸، آیت:۳۴، ۳۵

۳۱- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص: ۱۱۷، ۱۱۸۔ نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد، ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ، ص:۲۴۲

۳۲- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، سعید ایچ۔ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص:۱۱۶

۳۳- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، بخاری شریف، ج:۳، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص:۸۸۹

۳۴- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو ج:۱-۲، حصہ دوم، ص ۱۲۲۔ نیز دیکھیے: پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، اُس بیوی کا نام جرادہ بیان کیا گیا ہے اور شیطان کا نام صخر اور آزمائش کی مدت ۴۰ دن بیان کی گئی ہے۔ تفسیر مواہب الرحمن نے جن کا نام متمرد بتایا ہے۔ دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی، مواہب الرحمن، ج:۷، دینی کتب خانہ، ص: ۹۳۱۔ ابن کثیر نے صخر یا آصف یا صردلکھا ہے

۳۵- تورات، عہد عتیق، سلاطین:۱، باب:۱۱۔ مکمل، آیت:۱-۴۰

۳۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۶/۴۲۸

۳۷- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص:۱۲۱

۳۸- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، مکتبہ تعمیر انسانیت، بار ندارد، ۱۹۸۰ء، ص:۳۳۶

۳۹- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح بانگِ درا، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص:۴۱۷۔ نیز دیکھیے: نذیر احمد، پروفیسر، تشبیہاتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۲۹۱

۴۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۲۲۱/۲۲۱۔

۴۱- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۵۱۳

۴۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۸۱/۳۵۱

۴۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۳۰/۵۲۲

۴۴- ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، کامران پبلیکیشنز، لاہور، ص:۲۴۸

۴۵- النمل:۲۷، آیت:۲۰-۲۴

۴۶- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ج:۹، ص:۴۲

۴۷- النمل:۲۷، آیت:۲۷-۴۴

کہا جاتا ہے کہ یہ تخت سونے سے منڈھا ہوا تھا اور جڑاؤ مروارید کی کاریگری اُس پر ہوئی تھی۔ یہ ۸۰ ہاتھ اونچا اور ۴۰ ہاتھ چوڑا تھا۔ دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل ابولفداء عماد الدین، تفسیرابن کثیر، ج:۴، پ:۱۹، ص:۶۵، ۶۶

۴۸- حوالہ مذکورہ بالا، ص:۶۹

۴۹- ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۳۹

۵۰- النمل:۲۷، آیت:۴۴

تفسیر ابن کثیر، ج:، پ:۱۹، ص ۶۵، پر ملکہ کا نام بلقیس بیان کیا گیا ہے جبکہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اسلامی روایات کے مطابق ملکہ کا نام بلقیس اور یہودی روایات کے مطابق ماکدہ بیان کیا گیا ہے۔

۵۱- تورات، عہدعتیق، ملوک:۱، باب:۱۰، آیت:۱-۱۰

۵۲- تورات، عہدعتیق، اخبار:۱، باب:۹، آیت:۱-۱۰

۵۳- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناء اللہ، تفسیر مظہری، :۹، ص ۵۵، ۵۶۔ اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، ص:۶۱۸

۵۴- موسوی، سید محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء فارسی، ج:۱-۲، کتابفروشی، صدوق، تہران، باروسن ندارد، ص ۳۵۸۔

۵۵- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، ص:۶۲۰

۵۶- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عمادالدین، تفسیر ابن کثیر، ج:۴، پ:۱۹، ص:۶۳

۵۷- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، س۔ن، ص:۶۵۷

۵۸- النمل:۲۷، آیت:۱۷-۱۹

۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرارو رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۸/۱۰۸

۶۰- ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اقبال کی طویل نظمیں، ص:۳۸، ۴۵

۶۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۶۹/۱۶۹

۶۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرارو رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۵۸/۱۵۸

۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۶۵/۲۶۵

۶۴- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح اسرارِ خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵

۶۵- سبا:۳۴، آیت:۱۴

۶۶- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۹، ص ۵۹

۶۷- تورات، عہدعتیق، ملوک:۱، باب:۱۱، آیت:۴۳

☆☆☆☆

حضرت الیاس علیہ السلام

کاروانِ نبوت کا وہ قافلہ جن کی سیرت وتعلیمات سے علامہ نے اپنے کلام کو زینت بخشی ہے۔ان میں ایک نام حضرت الیاسؑ کا بھی ہے۔بالِ جبریل کی نظم ''جبریل وابلیس'' میں معلم الملکوت (ابلیس) کی ملاقات روح القدس حضرت جبرائیلؑ سے ہوتی ہے تو وہ اپنے ''ہمدم دیرینہ'' سے اُس کے نئے میدانِ عمل کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔تمہیدی حال پرُسی کے بعد حضرت جبریلؑ اپنے آفاقی کردار کے مطابق ابلیس سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے اُسے توبہ اور اصلاح احوال کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا جواب ابلیس کی طرف سے مثبت کی بجائے منفی اور غرور وتکبر سے بھرپور ہے۔حقائق کے مشاہد، وحی الٰہی کے قاصد،سراپا عرفان، جبریلؑ، ابلیس کی اس منطق کا جواب منطق سے دینے کی بجائے ایک مرتبہ پھر اپنی آبروئے ملکوتیت کا حوالہ وواسطہ دے کر ابلیس کو توبہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ابلیس کی توبہ کرنے سے ان کا نصیحت ورہنمائی کا فریضہ وحق ادا ہوجائے:

کھو دیے انکار سے تُو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

لیکن یہ سب سُن کر ابلیس کی آتشِ وجود یک لخت شعلہ بن کر بھڑک اُٹھتی ہے۔وہ بہت زیادہ نافرمانی وسرکشی اور شیخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غرور سے بھرپور جواب دیتا ہے:

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تُو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟

خِضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم ، دریا بہ دریا جُو بہ جُو !
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!
مَیں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو! [۱]

اس نظم میں علامہ محمد اقبال نے کائنات کی ''علاماتِ شر'' کے آفاقی کردار کی موثر نقش گری اُسی کی زبانی کروائی ہے۔ ابلیس، قوتِ شر کا مجسمہ، پستی فطرت کی تاریخی اور شر کی کائناتی علامت ہے جس کا آغاز و انجام، اس کی تمام طاقت و قوت فتنہ پردازیوں کے باوجود شکست اور مایوسی ہے۔[۲]

ابلیس کی زبانی علامہ اقبال نے نیکی کی دو قوتوں کا ذکر کروایا ہے۔ یعنی حضرت خضرؑ اور مردِ نیک حضرت الیاسؑ ۔ یہ قوتیں بظاہر ابلیس کے مقابلے میں بے بس ہیں۔ جبکہ نیکی کی علامت کی وجہ سے حقیقت میں زور آور، مخلص بندے اور رسول ۔ جیسا کہ قرآن پاک میں حضرت الیاسؑ کے بارے میں ارشاد ہے:

وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ [۳]

ترجمہ: اور زکریا اور یحییٰؑ اور الیاسؑ تمام صالحین میں سے ہیں۔

اور

اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ [۴]

ترجمہ: بے شک الیاسؑ رسولوں میں سے ہیں۔

یہ دونوں شیطان مخالف نیک شخصیات ہیں۔ جنھیں ابلیس اپنی شیطانی قوت اور زور آوری کے سامنے بے بس تصور کرتا ہے۔ نادان ابلیس اپنے شر کے سمندر میں غوطہ زن سمجھتا ہے کہ اُس کے بحرِ ہستی میں طوفان برپا کرنے کی بدولت عوام تو عوام خواص (خضرؑ و الیاسؑ) بھی بے دست و پا ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حضرت خضر و حضرت الیاس علیہما السلام تو عبدیت کے اُس اعلیٰ مقام پر فائز ہیں جہاں تک پہنچنا اور فائز ہونا ابلیس مردود کے بس کی بات نہیں ہے۔

علامہ اقبال اس پاک پیغمبر کی شخصیت و سیرت کے مطالعہ میں کن کن گہرائیوں سے

گزرے اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے صرف دو اشعار میں سمویا۔ اس کو جاننے کے لیے اس پیغمبر کی حالاتِ زندگی پر ایک نظر ڈالنا مناسب اور موقع کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث کے برعکس تاریخی و اسرائیلی روایات اس نکتہ پر متفق ہیں کہ حضرت الیاسؑ پیغمبرانِ بنی اسرائیل سے ہیں۔ آپؑ ان ہی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔ موجودہ محققین کے مطابق آپ ۸۵۰ تا ۸۷۵ ق۔م کے درمیانی زمانہ میں حضرت الیسعؑ سے پہلے اور حضرت حزقیلؑ کے بعد کارِ نبوت سرانجام دینے کے لیے مقرر فرمائے گئے۔ آپ اردن کے علاقے جلعاد کے رہائشی تھے۔[۵] آپؑ کا نسب نامہ: الیاس بن یاسین بن فنحاص بن یعزار یا اعیز ار یا عازر بن ہارون بن عمران ہے[۶] اگرچہ بعض کتب تفسیر میں اس نسب نامہ میں معمولی فرق بھی ہے۔[۷]

حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد اسرائیلی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی لیکن دونوں حصوں میں قیام پذیر ۱۲/ اسرائیلی قبائل محکم شریعت ہونے کے باوجود بگاڑ کی راہ پر چل رہے تھے۔ حالانکہ ہر قبیلے کی رہنمائی کے لیے اُسی قبیلے سے پیغمبرانِ خدا مبعوث ہوتے تھے۔[۸] انھی قبائل میں سے ایک قبیلہ بعلبک اور اُس کے اطراف میں رہائش پذیر تھا جو حضرت الیاسؑ کی رسالت و ہدایت کا مرکز بنا۔ اہل بعلبک اور ان کا بادشاہ اُجب یا اُحب یا اخی اب سب مظاہر پرست تھے۔[۹] اور بعل بت ان کا مقبول دیوتا جو مربیانہ عطا و نوال کی وجہ سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا تھا اور اس کی پوجا کے لیے مختلف موسموں میں بڑی مجالس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربان گاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے کاہن مقرر تھے جو مختلف اقسام کی دھونی دیتے اور خوشبوئیں چڑھاتے۔ کبھی کبھی انسانی جانوں کا چڑھاوا (قربانی) بھی چڑھایا جاتا تھا۔[۱۰]

ان دگرگوں حالات میں حضرت الیاسؑ نے دعوتِ حق کا آغاز کیا۔ آپؑ نے قوم کو مظاہر پرستی چھوڑنے اور ''اللہ احد'' کے سامنے جھکنے کی تلقین کی لیکن بت پرست قوم پر آپ کی پند و نصائح کا ذرا بھی اثر نہ ہوا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَO اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَO اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَO اَللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَO فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَO اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَO [۱۱]

ترجمہ: اور بے شک الیاسؑ پیغمبروں میں سے ہے۔ جب اس نے اپنی قوم سے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں

کیا بعل کو پوجتے ہو اور چھوڑتے ہو سب سے اچھا پیدا کرنے والے اللہ کو جو رب ہے تمھارے اگلے باپ دادا کا۔ پھر انھوں نے اِسے جھٹلایا تو وہ ضرور پکڑے آئیں گے مگر اللہ کے چُنے ہوئے بندے۔

ان آیات کریمہ پر غور وخوض سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ حضرت الیاسؑ کو بھی دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح اپنی قوم کے ساتھ بہت کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔

قرآن مجید کا مقصد چونکہ قصص کے بیان سے صرف اور صرف تذکیر اور عبرت وموعظت ہے۔ اس لیے وہ اُسی حد تک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے جس حد تک وہ حیاتِ انسانی پر اثر انداز ہو کر اُس کی فلاح واصلاح کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ تاریخ نگاری چونکہ قرآن کا موضوع نہیں ہے اس لیے حضرت الیاسؑ کی بابت قرآن اور حدیث دونوں میں زیادہ توضیح نہیں ملتی۔ آپؑ کی سیرت وشخصیت کے زیادہ تر واقعات اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں جن کی نہ تکذیب کی جاسکتی ہے اور نہ تصدیق۔[۱۲]

بنی اسرائیل کا دستور تھا کہ بادشاہ رعیت وملک کی اصلاح اور دیگر امور کے تمام فیصلے کرنے میں خود مختار ہوتا تھا لیکن رہنمائی مبعوث پیغمبر سے حاصل کرنا اور اُسی کے مطابق چلنا ضروری تھا۔ حضرت الیاسؑ نے بحیثیت مرشد جب بادشاہِ وقت کی شخصیت اور اس کے احکامات کی اصلاح کی کوشش کی تو بادشاہ کی انبیاء دشمن وقاتلہ انبیاء بیوی ازبیل نے سخت بُرا منایا۔ کیونکہ وہ شریعت اور بادشاہ کی مرضی کے برخلاف مزدکی نامی ایک شخص کو قتل کر کے شاہی محل سے ملحقہ اس کی ملکیت ایک خوبصورت باغیچہ پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ کی طویل عرصے تک ملک سے غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ازبیل نے مزدکی کے خلاف بادشاہ کو گالی دینے کی جھوٹی شہادت تیار کروا کے اپنے زمانہ کی مروجہ سزا قتل سنائی اور اُس کے قتل کے بعد باغیچہ پر قبضہ کر لیا (اس مردِ مومن کے قتل پر وہ لوگ اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے)۔

اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ حضرت الیاسؑ بادشاہ اور اُس کی قوم کو بتایا کہ ولی اللہ (مزدکی) کے قتل ناحق پر اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہے اور اُس نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ اگر شاہی خاندان نے باغیچہ مزدکی کے ورثا کو واپس نہ کیا تو وہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے اور اُن کے مردہ جسم باغیچے کے اندر پھینک دیے جائیں گے۔[۱۳]

بادشاہ ودیگر نے نصیحت وعبرت پکڑنے کی بجائے حضرت الیاسؑ کے قتل کا منصوبہ بنا لیا لیکن بحکمِ ربی آپؑ ایک مخصوص مدت تک پہاڑوں کی چوٹیوں اور بیابانوں میں روپوش ہو گئے[۱۴] لہٰذا شاہی خاندان اپنی مذموم کوشش میں ناکام ہو گیا۔

مخصوص مدت پوری ہونے پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو منظرِ عام پر آنے اور قوم سے انتقام لینے کی اجازت فرمائی۔ چنانچہ بادشاہ کا لاڈلا بیٹا شدید بیمار ہوا۔ بادشاہ نے ''بعل'' معبود سے دعا کی اور اس کی خدمت پر مامور چار سو خدام سے دعا کروائی لیکن بے سود۔ (کیونکہ اللہ نے شیطان کو بعل کے پیٹ میں گھس کر بولنے کی اجازت نہ دی) خدام (حواریوں) نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شام کے اطراف میں بسنے والے انبیاء کو دعا کے لیے بلایا جائے کیونکہ بعل آپ سے حضرت الیاسؑ کے قتل میں کوتاہی کی وجہ سے ناراض معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد بادشاہ نے بعل کے خدمتگاروں کو ملک شام کے بتوں کے پاس بیٹے کی تندرستی کی دعا کے لیے بھیجا۔ جب وہ پہاڑوں کے سامنے سے گزرنے لگے تو بحکمِ الٰہی حضرت الیاسؑ نے پہاڑوں سے نکل کر پیغام توحید دیا۔ آپ نے قوم کو شرک سے منع کیا اور اُنھیں بتایا کہ بادشاہ کے بیٹے کی موت ضرور آئے گی۔ خوفزدہ حواری حضرت الیاسؑ کا پیغام سُن کر وہیں سے بادشاہ کے پاس لوٹ آئے اور حضرت الیاسؑ کے بارے میں کہنے لگے کہ وہ ایک دُبلا پتلا، بغیر بالوں کے سر والا آدمی ہے۔ بدن کی کھال کھردری ہے۔ وہ بالوں کے بنے چُغے اور کرتے میں ملبوس ہے جس کا گریبان کانٹوں سے بنا ہوا ہے۔ اس کے باوجود وہ انتہائی رعب و دبدبے کا مالک ہے کہ اُس کے رعب و دبدبے کی وجہ سے ہم آگے نہیں جاسکے۔[۱۵] حضرت الیاسؑ کے اس کرتہ کو علامہ نے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے لیکن جداگانہ انداز میں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے۔

جاوید نامہ میں ''سوئے افلاک'' کی ذیل میں ''حرکت بہ کاخِ سلاطینِ مشرق'' درحقیقت ایک مکالمہ کا جواب ہے۔ سفر سوئے افلاک میں نادر ایرانیوں کی موجودہ حالت دریافت کرتا ہے۔ ''زندہ رود'' ایرانیوں کے وہ تمام رجحانات اس کے سامنے بیان کرتا ہے جو ان کو ''اسلامیت'' اور ''عربیت'' سے ہٹا کر ایرانیت کی طرف لے جا رہے ہیں اور فرنگی قومیت کی تقلید پر آمادہ کر رہے ہیں۔ زندہ رود کے جواب دینے کے دوران ہی ناصر خسرو علوی کی روح نمودار ہو کر ایک مستانہ وار غزل گا کر غائب ہو جاتی ہے:

''نمودار می شود روح ناصر خسرو علوی وغزلے مستانہ سرائیدہ غائب میشود''

''دست را چوں مرکب تیغ و قلم کر دی مدار
ہیچ غم گر مرکب تن لنگ باشد یا عرن

از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید ہنر
اے برادر ہمچو نو نور از نار و نار از نارون
بے ہنرداں نزدِ بے دیں ہم قلم ہم تیغ را
چوں نباشد دیں نباشد کلک و آہن لا ثمن
دیں گرامی شد بدانا و بناداں خوارگشت
پیشِ ناداں دیں چو پیشِ گاو باشد یاسمن!
ہمچو کرپا سے کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید و زدگر نیمہ یہودی را کفن"[۱۶]

ترجمہ: ناصر خسرو علوی کی روح ظاہر ہوتی ہے اور مستانہ وار غزل گا کر غائب ہو جاتی ہے۔
جب تو نے اپنے ہاتھ کو تیغ و قلم کا مرکب بنالیا تو پھر اگر تیرا بدن لنگڑا یا لولا ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں۔
اے برادر شمشیر کی نوک اور قلم کی زباں سے ہنر پیدا ہوتا ہے جیسے آگ سے نور اور ناردن (لکڑی) سے آگ۔
اگر بے دین کے ہاتھ میں قلم اور تیغ آجائے تو اسے بے ہنر شمار کر کیونکہ دین نہ ہو تو قلم یا تیغ کی کوئی قیمت نہیں۔
دین دانا سے عزت پاتا ہے اور نادان کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے۔ نادان کے سامنے دین اس طرح ہے جیسے گائے کے سامنے چنبیلی۔
اس کپڑے کی مانند جس کے نصف سے حضرت الیاسؑ کا کرتہ بنتا ہے اور باقی نصف سے یہودی کا کفن بنتا ہے۔

ناصر خسروی علوی کی زبان سے علامہ اقبال نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ کسی قوم کی ترقی تلوار اور قلم دونوں پر منحصر ہے۔ فن حرب سے بیگانہ عالم فاضل قوم کچھ عرصہ تک ہی آزاد رہ سکتی ہے۔ انجام کار غلامی اُس کا مقدر ہے۔ جبکہ ''تیغ و علم'' رکھنے والی قوم ہی دُنیا میں سربلند و کامران ہے۔ یہ دونوں اشیا ہوں تو قوم کی زندگی کامیاب کہلاتی ہے۔ ہنر صرف قلم سے نہیں جنم لیتا، تلوار کا ہونا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ برسرِ اقتدار حکمران کی قوم ہی فارغ البال اور آسودہ حال ہو سکتی ہے۔ غلامی اور مفلسی لازم و ملزوم ہیں لیکن ایسی قوم جس کا کوئی مذہب یا دین نہیں وہ تیغ و قلم کا غلط استعمال کر کے اُسے بے وقعت کر دیتی ہے۔ زیورِ علم سے آراستہ قوم کا فرد دین کے مطابق محترم و معزز ہو جاتا ہے۔ دین ویسے تو باعث رحمت ہے لیکن جاہل قوم کے لیے باعث

زحمت ۔ اپنے اس بیان کو زور آور کرنے کے لیے علامہ اقبال نے ایک کپڑے ''کرپاس'' کی مثال دی ہے۔ ''کرپاس'' معمولی سا سوتی کپڑا نیک آدمی حضرت الیاسؑ کا کرتہ بن کر معزز و محترم اور قیمتی ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہودی کا کفن بن کر حقیر و ذلیل ، قابلِ نفرت اور قابلِ اجتناب ہے[۱۷] کپڑے کو یہ امتیاز دین نے عطا کیا نہ کہ دولت نے۔

سیرت الیاسؑ کے مزید مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ نے دو مرتبہ دو طاقتور جماعتوں کو تیار کر کے حضرت الیاسؑ کے قتل کے لیے بھیجا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی اور اُن دونوں جماعتوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

کافر بادشاہ نے پھر ایک نئی چال چلی۔ اُس نے اپنی بیوی کے صاحب ایمان معتمد کے سامنے ایمان لانے کا جھوٹا ڈھونگ رچایا اور اُسے حضرت الیاسؑ کو لینے بھیجا تا کہ بہانے سے بلا کر قتل کر سکیں۔ یہ صاحب ایمان مع ایک جماعت کے حضرت الیاسؑ سے ملاقات کرنے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو اس صاحب ایمان سے ملاقات کی اجازت عطا فرمائی۔ ملاقات کے دوران اِس صاحب ایمان نے آپ کے ہمراہ جانے کی درخواست کی اور بتایا کہ اگر وہ اُن کے بغیر تنہا گیا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت الیاسؑ کو ان کی حفاظت کا مژدہ سُنا کر صاحب ایمان کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی بادشاہ کے بیٹے کی موت کی خبر سنا دی اور حکم دیا کہ لڑکے کی موت کے بعد واپس چلے آنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ حضرت الیاسؑ کے پہنچتے ہی بادشاہ کا بیٹا مر گیا اور وہ حضرت الیاسؑ کے قتل کے مذموم ارادے پر عمل پیرا نہ ہو سکا۔ غم سے فرصت پا کر مومن سے آپ کے بارے میں دریافت کیا لیکن اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔[۱۸]

قوم کی طویل نافرمانی سے تنگ دل ہو کر حضرت الیاسؑ نے اللہ تعالیٰ سے موت کی دعا مانگی لیکن اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ وہ زمین اور اہل زمین کو اُن سے خالی نہیں فرمانا چاہتا۔ کیونکہ زمین کا قیام اور بہبودی اُن سے اور اُن کے اچھے ساتھیوں کی وجہ سے ہے۔ تب حضرت الیاسؑ نے مخصوص مدت تک بارش کے خزانے اپنے قبضے میں لینے کی درخواست کی کہ آپؑ کی دعا کے بغیر کوئی بدلی نہ برسے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اختیار دے کر قوم سے نافرمانی کا بدلہ لینے کی اجازت دے دی۔ بحکم الٰہی آپؑ کو پرندوں کی جماعت کے ذریعے رزق پہنچتا رہا اور آپؑ قوم سے روپوشی کی زندگی گزارتے رہے اور قوم پانی نہ ہونے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا رہی۔ پھر

اللہ کے حکم سے آپؑ نے قوم کے سامنے جا کر تمام صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ اُنھیں بت پرستی چھوڑنے اور ایک اللہ پر ایمان لانے کا کہا اور بتایا کہ اُن کی مشرکانہ حرکتوں کی وجہ سے بارش نہیں ہو رہی۔ ثبوت درکار ہو تو اپنے بتوں کو میدان میں لا کر بارش کی دعا کروائیں۔ اگر بارش آ گئی تو ٹھیک وگرنہ جان لیں کہ وہ مشرک قوم ہیں۔ قوم بعل نے بتوں کو میدان میں لا کر دعا کی لیکن بے سود۔ پھر حضرت الیاسؑ نے اپنے مومن ساتھیوں اور بعض تفاسیر کے مطابق حضرت الیسعؑ کے ساتھ دعا کی۔ فوراً سطح سمندر سے ایک بدلی اُٹھ کر آسمان پر چھا کر برسنے لگی لیکن اس معجزے کو دیکھ کر بھی بادشاہ، اُس کے اہل خانہ اور قوم ایمان نہ لائی۔ بلکہ آپس میں سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص کوئی ماہر نجوم ہے اور ہمارے معبودوں کے بارش کے لیے مقرر کردہ وقت کے قریب اس نے یہ دعویٰ پیش کیا ہے۔[19]

بادشاہ اور اُس کی بیوی یہ معجزہ دیکھ کر اپنی سلطنت کے بارے میں فکر مند ہو گئے اور ایک مرتبہ پھر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''بئر سبع'' کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا اور پھر وہاں سے بھی ''جبل حوریب'' کی طرف جانے کا۔[20]

وہاں آپؑ کو کبریائی حق کے جلال و جمال کے آثار کا عظیم ترین مشاہدہ کروایا گیا اور اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل کو شدید ترین عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ بادشاہ اور اس کی بیوی پر پوشیدہ دُشمن کو غلبہ عطا کیا گیا۔ اس نے دونوں کو مومن مزدکی کے باغ میں قتل کر دیا اور لاشوں کو وہیں چھوڑ دیا حتیٰ کہ وہ گل سڑ گئیں اور گوشت پارہ پارہ اور ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں۔ یوں حضرت الیاسؑ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔

اُدھر حضرت الیاسؑ نے ایک بار پھر قوم سے مایوس ہو کر موت کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو، حضرت الیسعؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرنے اور مخصوص جگہ پہنچنے کا حکم دیا۔ آپؑ مقررہ دن وہاں پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آتشیں رنگ کا گھوڑا بھیجا، ہوائے نفسانی کو آپؑ سے جدا کر دیا گیا اور آپ نور کا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر بلندی کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر آپؑ کو زمین پر پھرنے والے ملائکہ میں شامل کر دیا اور انسان بھی رکھا۔ اس روایت کو تحریر کرنے کے بعد ابن کثیر نے اسے اسرائیلیات کی من گھڑت کہانیوں سے گردانا ہے اور کہا ہے کہ ایسا بعید از قیاس ہے۔[21]

لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ آپ ایک بگولے میں آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے۔ محمد باقر موسوی اور سید ہاشم رسول محلاتی نے اپنی کتاب تاریخ انبیاء میں اور اوپر اُٹھائے جانے کی تاریخ ۸۸۰

ق۔م تحریر کی ہے۔[۲۲] لیکن موجودہ یہ محققین کے متعین کردہ زمانے کے مطابق درست قرار نہیں پاتی۔

روایات تاریخ اور احادیثِ ضعیفہ کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ چار نبی زندہ ہیں۔ دو زمین پر حضرت الیاسؑ اور حضرت خضرؑ اور دو آسمان پر حضرت ادریسؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔[۲۳]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت الیاسؑ نے حضرت خضرؑ کی طرح آب حیات پی رکھا ہے۔ حضرت الیاسؑ بیابانوں میں اور حضرت خضرؑ سمندروں کی ڈیوٹی پر متعین ہیں۔ اوّل الذکر جنگلوں میں بھٹکنے والوں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور موخوالذکر سمندری مسافروں کی رہنمائی کا۔[۲۴]

علاوہ ازیں یہ کہ حضرت الیاسؑ اور حضرت خضرؑ ایک مدت تک ہر سال ماہِ رمضان میں بیت المقدس میں اکٹھے ہو کر احکام شریعت بجا لاتے رہے اور روزہ افطار کرتے ہوئے آبِ زم زم پیتے رہے۔ حضرت الیاسؑ و حضرت خضرؑ کا نبی پاک ﷺ کی وفات پر اہل بیت نبوی سے اظہار تعزیت کرنا وغیرہ ایسی ضعیف روایات بھی ہیں۔ لیکن ابن کثیر نے بعد از تحقیق ان تمام روایات و واقعات کو بعید از قیاس قرار دیا ہے اور انھیں اسرائیلی روایات سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ جبکہ در حقیقت یہ دونوں شخصیات وفات پا چکی ہیں اور یہی قول درست ہے۔[۲۵]

حضرت الیاسؑ کی حیات وسیرت اور حضرت خضر کے بارے میں مشہور روایات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے حضرت الیاسؑ اور حضرت خضرؑ (نیکی کی قوتوں) کا اکٹھے ایک ہی شعر میں ذکر انھی اسرائیلی روایات ضعیفہ کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شیطان کے مقابل اِن دونوں ہستیوں کے نام لانے کی بنیاد بھی یہی روایات ہو سکتی ہیں۔ شیطان تا قیامت حالتِ دائمی سے موصوف ہے۔ یہ نیک ہستیاں بھی حالتِ دائمی سے موصوف ہیں۔ لیکن شیطان راندۂ بارگاہ الٰہی ہے اور یہ ہستیاں اللہ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ۔

اس حالت دائمی سے موصوف ہونے کے بارے میں ابن عربی و دیگر کی رائے موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک غلبۂ نور کی وجہ سے دونوں گروہوں (انسان و ملائکہ) سے آپؑ کو ایسے ساتھی مل گئے تھے جن سے مانوس ہونے کے سبب آپؑ روحانیت کے اُس مقام پر فائز ہو گئے تھے جہاں موت اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس لیے آپؑ اُس حالت دائمی سے موصوف ہو گئے جس سے حضرت خضرؑ اور حضرت عیسیٰؑ موصوف ہیں۔[۲۶]

اسرائیلی روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرت الیاسؑ کی سیرت کا جائزہ لیا جائے تو ظاہراً

یہی نظر آتا ہے کہ آپؑ کفار و منکرین سے بے بس ہو کر زیادہ وقت روپوش رہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے پورے شعر کی بجائے صرف ''الیاسؑ بھی بے دست و پا'' کی ترکیب ہی میں اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت الیاسؑ کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا نبی، نیکی کا نمائندہ کبھی بھی بے دست و پا نہیں ہو سکتا۔

دنیا کے تمام مذاہب کے صحیفوں اور بالخصوص قرآنِ پاک پر جو دُنیا کی نبوت کی سب سے آخری اور مکمل کتاب ہے نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ دُنیا کے تمام پیغمبروں میں نبوت و رسالت کی حقیقت اور خصائص و لوازم یکساں پائے جاتے ہیں جو انھیں دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ نیز تمام انبیاء کرامؑ کی تاریخ اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ کفر و شرک اور بُرے افعال سرانجام دینے والی گمراہ قوموں میں مبعوث ہوئے۔ ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں۔ تکلیفیں سہتے رہے۔ مصیبتیں برداشت کیں اور آخر کار تاریکی کو روشنی میں، جہالت کو علم میں اور کفر کو مٹا کر توحید کا بول بالا کر کے رہے۔[۲۷] گویا فتح انبیاءؑ کا مقدر اور شکست کفر و شیطانیت کا نصیب ہے۔ اس لیے نیکی کے نمائندگان کو کبھی بھی ''بے دست و پا'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انبیاء کرامؑ عام انسانوں سے بالاتر ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جن کے ہاتھ پر ''یداللہ''[۲۸] ہوتا ہے اور یہ جو فعل سرانجام دیتے ہیں وہ فعل الٰہی بن جاتا ہے۔ دیکھیے:

فَلَمْ تَقْتُلو هُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى [۲۹]

ترجمہ: تو تم نے انھیں قتل نہ کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی تم نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی اور اس لیے کہ مسلمانوں کو اس سے اچھا انعام عطا فرمائے۔

یہ اور کئی آیات اس پر شاہد ہیں۔ نیکی اور بدی میں ازل سے جنگ جاری ہے لیکن فتح نیکی کی ہی ہے۔ حضرت الیاسؑ نیکی کے علمبردار ہیں۔ درحقیقت یہی غالب آنے والے ہیں۔ یہ اللہ کے محبوب بندے ہیں اور اللہ اپنے محبوب بندوں کو بالآخر کامیابی و کامرانی سے فیض یاب کرتا ہے۔ دنیا و آخرت میں فلاح سے سرفراز فرماتا ہے۔ شیطان نے شدید مایوسی کے عالم میں اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے انھیں ''بے دست و پا'' قرار دیا ہے سچ تو یہ ہے کہ حضرت خضرؑ اور حضرات الیاسؑ قوتِ حق، سچائی حق، دینِ حق کے نمائندے ہیں۔ طاقت کے خلاف ایک Symbol ہیں جو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والے اور اللہ سے ملانے والے ہیں۔

یہ نمائندگانِ حق دینی رہنما ہیں اور دینی رہنما ہونے کے سبب ان سے متعلقہ اشیا بھی قابل

ادب و احترام اور قابل وقعت ہیں۔ انبیاء کرامؑ کے جسم سے چھو جانے کے بعد عام سوتی کپڑا جب قابل تحسین و تکریم ٹھہرا تو وہ شخص جو تعلیمات نبوی کی پیروی کرے اس کی عزت و تکریم کا اندازہ کیجیے کہ کس درجے کی ہوگی۔

رہا ذکر ''کرتے'' کا تو علامہ اقبال حضرت الیاسؑ کے ''کرتے'' یا ''الیاسؑ'' کو علامت بنا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی شے بھی ''دین الٰہی'' کے حامل کے پاس آ کر عزت و تکریم والی ہو جاتی ہے جبکہ ''غیر'' کے پاس بے وقعت، گھٹیا و رذیل ہی رہتی ہے۔ بالکل ایسے ہی عام غیر مسلم شخص بھی دین حق اسلام کی حدود میں داخل ہو کر وقعت و قدر والا بن سکتا ہے اور بے قیمت سے قیمتی۔ گویا اشیا کی قدر حامل اشیا سے ہے نہ کہ قیمت سے جیسا کہ نبی کے پاس آ کر ''کرپاس'' پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی اور یہودی کے کفن کا حصہ بن کر دوزخ میں جلنا اُس کا مقدر بن گیا۔ ایسے ہی وہ انسان جس نے دینِ اسلام قبول کر لیا اور توحید و رسالت کا صدقِ دل سے اقرار کر لیا وہ گروہِ انبیاء میں شریک ہو گیا۔ اُس پر جنت لازم اور آتشِ دوزخ حرام ہوگئی اور وہ جو دوسرے مذہب کا پیروکار رہا اُس پر آتش دوزخ لازم کر دی گئی کہ وہ توحید و رسالت کا منکر رہا۔

حضرت الیاسؑ کا کرتہ Symbol ہے اسلامی قوت کا اور یہودی Symbol ہے اسلام مخالف قوت کا۔ اسلام مخالف تمام قوتوں کا ٹھکانہ جہنم ہے نہ کہ جنت۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک حقیقی اصلی مذہب اسلام ہے اور دوسرے مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو آخرت میں کچھ صلہ نہ ملے گا۔ کیونکہ اُن کی پیروی دین ناحق کی پیروی یعنی شیطان کی پیروی ہے اور شیطان کا انجام ہم آپ سبھی جانتے ہیں۔

مآخذ و مصادر

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۴۴/۴۳۶۔

۲- عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار دوم ۱۹۹۹ء، ص: ۳۰۷

۳- الانعام:۶،آیت:۸۵

۴- الصّٰفّٰت:۳۷،آیت:۱۲۳

۵- مودودی،مولانا ابوالاعلیٰ،تفہیم القرآن،ج:۴،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور،طبع ششم،۱۹۸۸ء،ص:۳۰۲۔ نیز دیکھیے: شفیع،مفتی مولانا محمد،معارف القرآن،ج:۷،ادارۃ المعارف،کراچی،۱۹۹۸ء،ص:۴۷۰
قدیم زمانے میں جلعاد اُس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اُردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے۔ ماخوذ از تفہیم القرآن،ج:۴،ص:۳۰۲

۶- الیاسؑ عجمی نام ہے دیکھیے نعمانی،مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن،ج:۱-۲،دارالاشاعت،اردو بازار،کراچی،۱۹۸۶ء،ص:۲۳۳۔ نیز دیکھیے: موسوی،محمد باقر،غفاری،علی اکبر،تاریخ انبیاء فارسی ج:۱-۲،نشریات کتاب فروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، ایران، بار پچیس، ۱۳۴۰ء،ص:۱۹۰۔ عبدالرحمٰن،محمد،سیرت انبیائے کرام،ادارہ اسلامیات،لاہور،۱۹۹۰ء ص:۵۹۶

۷- امیر علی،مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن،ج:۲،دینی کتب خانہ،لاہور، سن ندارد،ص: ۳۸۔ نیز دیکھیے: پانی پتی،ثناءاللہ،علامہ قاضی محمد،تفسیر مظہری،ج:۱۰،سعید ایچ ایم کمپنی،ادب منزل،پاکستان چوک کراچی،۱۹۷۹ء،ص۵۳۔ ابن کثیر،اسماعیل،ملا امام ابی الفداء،قصص الانبیاء (عربی) مکتبہ طیبہ، المدینۃ المنورہ،سن ندارد،ص:۲۵۱،۲۵۲،مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن،ج:۴،ص:۳۰۲

۸- مودودی،مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن،ج:۴،ص:۳۰۲

۹- پانی پتی ثناءاللہ،علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری،ج:۱۰،ص۵۳۔ نیز دیکھیے: شفیع مفتی،مولانا محمد، معارف القرآن،ج:۷،ص۴۷۱۔ مودودی،مولانا ابوالاعلیٰ،تفہیم القرآن،ج:۴،ص۳۰۳۔ امیر علی،مولانا مولوی سید،مواہب الرحمن،ج:۷،ص۸۳۶۔ ابن عربی،شیخ اکبر محی الدین،مترجم، بابا ذہین شاہ تاجی،فصوص الحکم،مکتبہ تاج،کراچی،۱۹۹۶ء، میں ص۶۱۳ پر بعل بت کا نام اور بک بادشاہ کا نام بھی بتایا گیا ہے جس کے نام پر شہر مشہور ہوا

۱۰- پانی پتی،ثناءاللہ،علامہ محمد، تفسیر مظہری،ج:۱۰،ص۵۳، نیز دیکھیے :مودودی،مولانا ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن،ج:۴،ص۳۰۳،سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن،حصہ اوّل،دوم، پروگریسو بکس،لاہور،۱۳۶۰ء حصہ دوم،۲۹،۳۰

۱۱- الصّٰفّٰت:۳۷،آیت:۱۲۳،۱۲۸

۱۲- نعمانی،عبدالرشید،مولانا محمد، لغات القرآن، ج:۱-۲،ص۲۳۰، ۲۳۱۔ نیز دیکھیے :امیر علی مولانا مولوی،سید،مواہب الرحمن،ج:۷،ص۸۳۵۔ دائرہ معارف اسلامیہ،ج:۳،ص۲۱۳۔ پرولہاؤزن کی کتاب (History of Irreal) کے حوالے سے درج ہے حیرت کی بات ہے کہ الیاسؑ تنہا پورے جاہ و جلال سے اپنے دور پر چھائے رہے لیکن ان کی شخصیت تاریخ کی بجائے افسانوی

روایات میں محفوظ ہے دیکھیے: دانش گاہ پنجاب، لاہور، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۳، دانش گاہ پنجاب، لاہور، باراوّل ۱۹۶۸، ص:۲۱۳

۱۳- پانی پتی، ثناء اللہ، علامہ محمد قاضی، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص۵۴۔ نیز دیکھیے: میر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۷، ص:۸۳۵ـ۷، ۸۳۹ـ۷، ۸۴۰ـ۷

یہ مخصوص مدت بعض کتب میں بیس دن یا چالیس دن اور بعض میں سات یا دس سال بیان کی گئی ہے

۱۴- اصفہانی، عمادالدین، حسین، تاریخ انبیاء یا قصص قرآن فارسی ج:۱-۲، کتاب بفروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، ایڈیشن ۲۵، سن ۱۳۶۰ھ۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل، امام ابی الفداء، قصص الانبیاء (عربی) ص۵۵۲۔ امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۷، ص:۸۴۰ـ۷

۱۵- پانی پتی ثناء اللہ، علامہ محمد، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص:۵۶

۱۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص:۶۳ـ۷۶۳/۷۶۴/۷۶۵ـ۷/۷۶۶

۱۷- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۱۰۸۴، ۱۰۸۵

۱۸- پانی پتی ثناء اللہ، علامہ محمد، تفسیر مظہری، ج:۷، ص:۵۶-۶۰

۱۹- پانی پتی ثناء اللہ، علامہ محمد، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص:۵۶۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۷، ص:۸۴۱ـ۷

۲۰- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء، ج:۱-۲، ص:۶۷۹، ۶۸۰

بئر سبع، یہ فلسطین کے شہر سبع میں ہے اور حضرت ابراہیمؑ کی نشانیوں میں سے ہے اس مقام مقدس پر پیغمبروں پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کی تجلیات نمودار ہوئی ہیں

جبل حوریب: یہ پہاڑ وادی ایمن میں کوہِ طور کے دائیں طرف واقع ہے۔ اس کے ایک درخت پر حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑنے سے بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے (ماخوذ از تاریخ قصص الانبیاء، ص:۶۷۹، ۶۸۰)

۲۱- ابن کثیر، ابوالفداء عمادالدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، اس مخصوص جگہ کا نام فصوص الحکم، ص۶۱۴ پر لبنان بتایا گیا ہے۔ نیز دیکھیے: امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمن، ج:۷، ص۸۴۲ـ۷

۲۲- موسوی، سید محمد باقر، غفاری، علی اکبر، تاریخ انبیاء، فارسی، ج:۱-۲، ص۱۹۰

۲۳- ابنِ عربی، شیخ اکبر محی الدین، بابا ذہین شاہ تاجی (مترجم)، فصوص الحکم، ص:۶۱۴

۲۴- پانی پتی ثناء اللہ، علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری، ج:۱۰، ص۶۳۔ نیز دیکھیے:
Knappert Jan, *Islamic Legends*, Vol: 1, E.J. Brill. Leiden. 1985, P.10

۲۵- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عمادالدین، قصص الانبیاء (عربی)، ص:۵۵۲

۲۶- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین، تاجی، بابا ذہین شاہ (مترجم)، فصوص الحکم، ص ۹۰۶۔ نیز دیکھیے: سیوطی علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴۷

۲۷- نعمانی، علامہ شبلی ندوی، علامہ سلیمان، سیرۃ النبیؐ، ج:۴، مکتبہ مدینہ، لاہور، صفر المظفر، ۱۴۰۷ھ، ص:۳۶، ۱۰۵

۲۸- یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ الفتح:۴۸، آیت:۱۰۔ ''اُن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے''۔

۲۹- الانفعال:۸، آیت:۱۷

☆☆☆☆

حضرت زکریا علیہ السلام

علامہ اقبال کے نزدیک نظامِ زندگی اور نظامِ دنیا ایک کشش و جذب کی کیفیت کا احسان مند ہے جسے جذبۂ عشق سے تعبیر دی جاسکتیہے۔ یہی جذبۂ عشق وہ محرک قوت یا سوزِ دروں ہے جو ہر گھڑی اس نظام کے لیے ایڑ کا کام دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک نظام حیات میں سرگرمی عمل کی تمام قوتیں اسی سوز دروں کا نتیجہ ہیں اور نظام کائنات بھی خالقِ کائنات کے حکم کے مطابق ایک سوزِ دروں کے ساتھ چل رہا ہے۔[۱] عشق کے جذبۂ شہادت اور سوز دروں کے ساتھ ساتھ بلاو آزمائش اور مصائب کی بھٹی میں جل کر کُندن بننے کے بعد جو کردار اُبھرتا ہے۔ علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں اُسے ''ارہ ائیت'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ''ارہ ائیت'' حضرت زکریاؑ سے منسوب ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں آپؑ کی سیرت کے صرف اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

جاوید نامہ درحقیقت ایک تمثیلی نظم ہے۔ اس کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ''تمہیدِ آسمانی'' ہے۔ پھر ''تمہید زمینی'' ہے۔ نظم کا یہ حصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی میں آسمانی سیاحت کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے اس کا آغاز مولانا روم کی ایک غزل گا کر کیا ہے۔ غزل گاتے ہوئے شام ہو جاتی ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی ''روحِ رومی'' منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے پہلے تو شاعر دنگ رہ جاتا ہے لیکن پھر رومی سے فلسفیانہ سوالات کرتا ہے۔ اس سوال و جواب کے بعد شاعر کے بدن کا ہر ذرّہ پروازِ افلاک کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ ''فلکِ قمر'' میں شاعر کی اپنی معراج کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے رومی شاعر کو دنیا کے خوفناک پہاڑ دکھلاتا ہے۔ کچھ دور جا کر دونوں کی ملاقات قمر کے ایک غار میں ہندوستان کے ایک قدیم عارف رام چندر کے استاد ''وشوامتر'' جہاں دوست سے ہوتی ہے۔ دورانِ گفتگو سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر اور اُس کا رہنما ''وادی یرغمید'' میں داخل ہوتے ہیں جو فرشتوں کی زبان میں ''وادیٔ طواسین'' کہلاتی ہے۔ ''طواسین رُسل'' میں چار طواسین ہیں۔ ان

چار میں سے ایک ''طاسین زرتشت را آزمائش کردن اہرمن زرتشت را'' ہے۔ اس میں علامہ اقبال نے پاس ادب ملحوظ رکھتے ہوئے پیغمبروں سے گفتگو کی بجائے اُن کی تعلیمات کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ''طاسین زرتشت'' میں انبیا کرامؑ پر پیش آمدہ مصائب کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ذکر ہے۔ انبیاء کرامؑ پر آنے والے مصائب کا ذکر کر کے اہرمن زرتشت کو بتاتا ہے کہ اللہ کے وعدوں پر اعتبار کر کے فریضہ پیغمبری ادا کرنا نادانی ہے کہ اس کے صلے میں انبیاءؑ و رُسلؑ کو راحت کی بجائے مصائب و تکالیف ہی ملی ہیں۔ مثال دیکھیے:

زہرہا در بادۂ گلفام اوست
ارّہ و کرم و صلیب انعامِ اوست[۲]

ترجمہ: اس کے بادۂ گلفام کے اندر زہر بھرے ہیں۔ اس کے انعامات آرہ، کٹہرے اور صلیب ہیں۔

مندرجہ بالا شعر میں ''ارّہ'' حضرت زکریا کے لیے ''کرم'' حضرت ایوبؑ کے لیے اور ''صلیب'' حضرت عیسٰیؑ کے مصائب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (حضرت ایوبؑ کا ذکر ہو چکا اور حضرت عیسٰیؑ کا ذکر اپنے اپنے محل پر آئے گا۔) کہتا ہے کہ نبوت کا انعام آرے سے کٹ جانا، بدن میں کیڑے پڑنا اور پھانسی چڑھ جانا ہے۔ یعنی انبیا کرامؑ کی عرصہ دراز کی تبلیغ کا نتیجہ چونکہ صفر ہی ہے۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ وہ اصلاح خلق کی بجائے اپنے نفس کی اصلاح کی طرف توجہ دے اور رہبانیت اختیار کر لے کیونکہ پیغمبری بے معنی اور دردِ سر ہے۔ اس کے بعد زرتشت کا اہرمن کو جواب ہے جس میں وہ رہبانیت کو رد کرتا ہے کہ یہ خودی کے اظہار میں رکاوٹ ہے اور انسانی طاقت، قوت اور صلاحیت کی جانچ پرکھ میں سدِّ راہ۔ رہبانیت کا مطلب ہے دُنیا سے کٹ جانا اور دُنیا سے کٹ جانے کے سبب خودی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ جبکہ مصائب و تکالیف سہنے سے خودی مضبوط ہوتی ہے۔ اللہ کے بندوں پر نازل ہونے والے مصائب سے ان کی اصلاح اور پائیدار زندگی مقصود ہے نہ کہ تباہی و بربادی اور ناپائیدار زندگی۔ مصائب و امتحانات تو خودی مضبوط ہوتی ہے اور بندے میں خدائی صفات جنم لیتی ہیں۔ پھر مردِ حق رب کی رضا کو سامنے رکھتا ہے اور اگر جان بھی قربان کرنی پڑے تو بخوشی قبول کر لیتا ہے۔[۳] کہ اقبال کے نزدیک عاشق کا خود اپنے لہو میں تڑپنا ہی عشق کی معراج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشق آرے، صلیب اور پھانسی کو اپنے لیے عید یں جانتا ہے:

عشق را درخوں تپیدن آبروست
ارّہ و چوب و رسن عیدینِ اوست![۴]

ترجمہ: خون میں تڑپنے ہی سے عشق کی آبرو ہے، آرہ اور دار و رسن اُس کی عیدیں ہیں۔

''ارّہ'' کی پیغمبری تلمیح استعمال کر کے علامہ اقبال مخاطب کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔اس بحث کو مزید آگے بڑھانے سے پہلے حضرت زکریاؑ کی سیرت و شخصیت کا جائزہ ضروری ہے تا کہ درست نظریہ و نتیجہ پر بہ آسانی پہنچا جا سکے۔

حضرت زکریاؑ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبروں میں سے ہیں[۵] زکریاؑ عجمی اسم ہے اور مد اور کسر دونوں سے بولا جاتا ہے۔[۶] آپ کا سلسلہ نسب حضرت سلیمانؑ سے ملتا ہے۔[۷] آپ حضرت یحییٰؑ کے والدِ محترم ہیں آپؑ کی زوجہ کا نام ایشع تھا جو حضرت ہارونؑ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔قرآن پاک میں آپ کا تذکرہ سورۂ آل عمران، الانعام، مریم اور الانبیاء میں ملتا ہے۔[۸]

آپ کا نسب یہ ہے:

زکریا بن اُدن (ازن) یا دان یا لدن یا ابن برخیا بن حلم بن صدوق بن حبشان بن سلیمان بن داوٴد۔[۹]

حضرت زکریا شریعتِ موسوی کے تابع و مبلغ تھے۔آپؑ 'کاہن' کے معزز مذہبی عہدے پر فائز تھے۔آپ کے ذمہ ہیکل کی مقدس رسوم کی ادائیگی تھا۔[۱۰]

حضرت زکریا کے خاندان میں عمران بن ناشی اور اُن کی بیوی حنہ بنت قاقوز بھی تھیں۔ عمران بن ناشی بھی حضرت سلیمان بن داوٴدؑ کی نسل سے تھے۔[۱۱] آپؑ اس پاک ہیکل کے امام تھے۔آپؑ بے اولاد تھے۔حنّہ کی دعا سے جب اللہ تعالیٰ نے اولاد کی امید لگائی تو دورانِ حمل حضرت عمران وفات پا گئے۔پھر حنّہ کے ہاں ایک لڑکی نے جنم لیا جس کا نام مریم رکھا گیا۔حنّہ نے اپنی مانی ہوئی منت کے مطابق حضرت مریم کو ہیکل کی نذر کر دیا۔تمام کاہنوں نے (ان کی تعداد ۲۷ بیان کی جاتی ہے) آپؑ کی کفالت کی ذمہ داری اُٹھانے کی کوشش کی۔ان میں حضرت زکریاؑ بھی تھے۔انھوں نے خالو ہونے کے ناطے زیادہ حق جتایا تو باقی کاہنوں نے بغیر قرعہ ڈالے دینے سے انکار کر دیا۔[۱۲] دریائے اردن پر قرعہ ڈالا گیا جو حضرت زکریاؑ کے نام نکل آیا اور وہ حضرت مریم کے کفیل بن گئے۔[۱۳] حضرت مریمؑ کے جوان ہونے پر مسجد کے ساتھ عبادت کے لیے ایک کمرہ بنا دیا۔لیکن حضرت زکریاؑ ابھی تک بے اولاد تھے۔بے اولاد ہونے سے زیادہ

انھیں اس بات کی فکر تھی کہ انھیں اپنے اہل خاندان بالخصوص چچا کی اولاد میں سے کوئی بھی اپنے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے والا نظر نہ آتا تھا۔ انھیں یہ خوف بھی تھا کہ اگر اُن کے چچا کی اولاد میں سے کوئی بھی جانشین بن گیا تو وہ دین و شریعت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ لہٰذا وہ بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لیے فرزندِ ارجمند کے خواہش مند تھے۔[14]

پیر محمد کرم شاہ رقم طراز ہیں:

> اور یہ بات اہل نظر سے مخفی نہیں کہ جب شاہین کا نشیمن زاغ و زغن کے تصرف میں آجاتا ہے تو پھر دینی رسومات کتنی پژمردہ اور بے جان ہو جاتی ہیں اور اخلاقی قدروں کی کس بے دردی سے تحقیر کی جاتی ہے۔[15]

اُس وقت حضرت زکریاؑ کی عمر بقول بعض ۵۰[16] یا ۶۰ یا ۷۰[17] یا ۷۵[18] یا ۷۷[19] یا ۹۰[20] یا ۹۲[21] یا ۱۱۰ یا ۱۲۰ سال تھی۔ (آخری قول زیادہ قوی ہے)[21] اور ان کی بیوی بالاتفاق ۹۸ سالہ بانجھ خاتون تھیں۔[22] لہٰذا اولاد ہونے کے تمام ظاہری اسباب مسدود تھے۔ ایک روز حسب عادت معبد خانہ تشریف لے گئے اور عبادت کے بعد حضرت مریمؑ کا حال دریافت کرنے گئے تو دیکھا کہ حضرت مریمؑ تو عبادت میں مشغول تھیں اور اُن کے پاس بے موسم کے پھل موجود تھے۔ اُن کے پاس کسی کا آنا جانا نہ تھا۔ اس لیے بطور کفیل آپؑ نے دریافت کیا کہ اُن کے پاس یہ پھل کہاں سے آئے۔ حضرت مریمؑ نے بتایا کہ یہ خاص فضلِ ربی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حد وحساب رزق دیتا ہے۔[23] یہ دیکھ کر حضرت زکریاؑ کے دل میں جوش نے جنم لیا اور آپؑ نے اللہ کے حضور اولاد کی دعا کی۔ آپؑ کی دعا کو فوراً شرف قبولیت مل گیا۔ کیونکہ آپؑ کی دعا اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تھی۔

حضرت زکریاؑ معبد میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اُن کے پاس حاضر ہوا اور اُنھیں حضرت یحییٰؑ کی خوشخبری دی۔ یہ خوشخبری سن کر حضرت زکریاؑ بہت خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ یہ بشارت کیسے پوری ہوگی، اس کی نشانی کیا ہے؟ اللہ کی طرف سے وحی کی گئی کہ اس کی نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک بات نہ کر سکو گے[24] اور صبح و شام کثرت سے اللہ کی عبادت کرنا۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر آپ پہلے سے بھی زیادہ عبادت میں مصروف ہو گئے۔ تفسیر نعیمی میں مذکور ہے کہ بشارت اور خوشخبری کے حصول میں ۱۳ یا ۱۹ سال کا فاصلہ ہے۔[25] حضرت زکریاؑ کی دعا کے بارے میں ''لوقا کی انجیل'' کی معلومات بھی قرآنی معلومات سے مشابہ ہیں۔[26]

آپ کی دعا کی مقبولیت کی وجہ قرآن پاک میں سورۃ الانبیاء میں مذکور ہے:

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ؗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝[۲۷]

ترجمہ: اور زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر اور وارث (ہے)۔ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحیٰ عطا فرمایا اور اس کے لیے اس کی بی بی سنواری۔ بے شک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں پکارتے تھے امید اور خوف سے اور ہمارے حضور گڑگڑاتے ہیں۔

آپؑ سخی تھے۔ رغبت اور امید و خوف سے اللہ کے حضور گڑگڑانے والے تھے۔ آپؑ گڑگڑانے کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر اکثر رویا کرتے تھے۔[۲۸]

ولادت کی بشارت جہاں آپؑ کے لیے باعث صد مسرت تھی۔ وہاں بنی اسرائیل کے لیے بھی خوشی کا باعث تھی۔ اس لیے کہ حضرت زکریاؑ کا ایک صحیح جانشین اور علم و حکمت و نبوت کا ایک سچا وارث عالمِ وجود میں آنے والا تھا۔ پھر حضرت یحیٰؑ پیدا ہوئے جو آپؑ کی دعا کے عین مطابق، نیک و صالح، عبادت گزار اور شریعت کے محافظ تھے۔

یہی واقعات ہیں جو قرآن پاک و احادیث صحیحہ میں ہیں اور قابل اعتبار بھی۔ اس کے علاوہ اسرائیلی روایات ہیں جو زیادہ تر اس مسئلے میں قرآن پاک سے مطابقت رکھتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار یا بعض وہ آثار جو روایت اور درایت کے اعتبار سے نا قابل حجت اور غیر مستند ہیں۔

رہا ذکر آپؑ کی شہادت کا تو اس کے بارے میں مختلف روایات و وجوہات بیان کی گئی ہیں جن کا مختصر تذکرہ علامہ اقبال کے اشعار کی وضاحت کے لیے از حد ضروری ہے۔

علماء سیر و تاریخ کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی رہا ہے کہ زکریاؑ طبعی طور پر فوت ہوئے یا شہید کیے گئے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ دونوں گروہ وہب بن منبہ سے سند پاتے ہیں۔ وہب کی ایک روایت کے مطابق جب یہود نے حضرت یحیٰؑ کو شہید کر دیا تو پھر حضرت زکریاؑ کی طرف توجہ کی تاکہ اُنھیں بھی شہید کر دیں۔ حضرت زکریاؑ نے جب یہ دیکھا تو بچاؤ کے لیے باغ کی طرف بھاگے۔ سامنے ایک درخت آ گیا۔ آپؑ اس کے شگاف میں گھس گئے۔[۲۹] بعض مقامات پر لکھا ہے کہ درخت قدرتِ حق سے شق ہو گیا اور آپؑ اندر چلے گئے۔ شیطان نے تعاقب میں آنے

والے کفار کو خبر دار کر دیا تو اُنھوں نے آپؑ کو باہر نکلنے پر مجبور کرنے کی بجائے درخت پر آرہ چلانا شروع کر دیا۔ جب آرہ حضرت زکریاؑ تک پہنچا تو اللہ کی طرف سے وحی کی گئی اور کہا گیا کہ اگر تم نے ذرا بھی آہ و فریاد کی تو ہم یہ تمام زمین تہس نہس کر دیں گے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو بھی یہود (کفار) پر فوراً غضب نہ اُتارا جائے گا۔ چنانچہ حضرت زکریاؑ نے صبر سے کام لیا۔ آپؑ نے آہ تک نہ کھینچی اور یہود نے درخت کے ساتھ ساتھ آپ کے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔[۳۰]

شہادت کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعثت حضرت عیسیٰؑ سے تورات کے جو احکام منسوخ ہوئے ان میں سے ایک بھتیجی سے نکاح تھا۔ بنی اسرائیل کا ایک بادشاہ ہیرودس اپنے بھائی کی بیٹی سے نکاح کا خواہش مند تھا۔ حضرت یحییٰؑ چونکہ شریعتِ مسیح پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے منع کیا۔ تب بادشاہ کے حکم پر اُن کو عبادت خانے میں شہید کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت زکریاؑ نے بھاگ کر ایک باغ کے درخت میں پناہ لے لی۔ جہاں وہ آرے سے چیر دیے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہودیوں نے آپؑ پر حضرت مریمؑ کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا اور آپؑ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ آپؑ بھاگ کر ایک جنگل یا باغ میں پہنچے جہاں آرے سے کاٹے جانے والا واقعہ رونما ہوا۔[۳۱] لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپؑ طبعی موت دنیا سے رخصت ہوئے۔ آرے والا واقعہ حضرت یحییٰؑ سے متعلق ہے۔[۳۲] آپ بیت المقدس میں دفن ہوئے[۳۳] بہر حال مشہور قول یہی ہے کہ آپؑ کو یہود نے شہید کر دیا۔ کیسے، کیوں؟ اس کے متعلق یہی کہنا درست ہے کہ وَاللہُ اَعْلَمُ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت زکریاؑ کی سیرت کے تین پہلو نمایاں ہیں (۱) سخاوت (۲) امید و خوف سے گریہ زاری (۳) راہِ حق میں کفار کے ہاتھوں آرے سے شہادت اور آرے سے کٹتے ہوئے پہنچنے والی تکلیف پر صبر۔ ان تینوں پہلوؤں میں سے علامہ اقبال کو راہِ حق میں آرے سے کٹ جانے کی صفت نے اپنی طرف زیادہ مائل کیا۔ آپؒ کو اس میں عشق کی معراج نظر آئی۔ اس لیے آپ نے اسی وصف کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا۔

علامہ کے ہاں ''ارّہ ائیت'' دیوانِ شعر کا سرِ مطلع اور عنوان ہے۔ آپؒ کو اس ''ارّہ ائیت'' کے تمام پہلوؤں کا صحیح ادراک بھی ہے اور اس کی لامحدود اور بے پناہ قوت سے بھی آپ واقف ہیں۔ اس لیے آپؒ اُمت کو بھی اس کی حقیقت و اصلیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ توحید و رسالت کی تلقین اور زندگی کے میدان عمل میں فولادی عزم و قوت کی ثابت قدمی کے لیے اشد

ضروری ہے۔ نیز اس سے مومن کے قلب وجگر کو بھی قوت ملتی ہے اور اس کی زندگی میں انقلاب جنم لیتا ہے اور وہ عشق کے مرتبہ کمال تک پہنچنے کا متمنی ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اُس میں اتنی قوت آ جاتی ہے کہ بقول یوسف سلیم چشتی:

وہ بنی آدم کی عقلی اور جذباتی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔[۳۴]

علامہ اقبال شاعرِ انقلاب ہیں۔ وہ صرف ملتِ اسلامیہ میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ انقلاب جذبۂ عشق سے جنم لیتا ہے۔ حکمت اور مفاد کوشی کبھی بھی نظمِ حیات میں تبدیلی لانے کا سبب نہیں بن سکتی۔ علامہ نظم حیات میں تبدیلی چاہتے ہیں اور یہ عشق کی بدولت ہی ممکن ہے۔ اسی لیے وہ عشق میں بھی انقلاب کے متمنی ہیں کہ یہ افراد واقوام کی زندگی کا منبع و ماخذ ہے۔ وہ اسے جامد بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔[۳۵] کہ دنیائے عمل میں رونق ورنگینی اسی کی بدولت ہے۔ اس کے بغیر سب باطل ہے۔

عشق ہو یا سوزِ جگر یا جذب وشوق، ان کا عملی اظہار قربانی سے منسلک ہے۔ یہی جذبۂ قربانی ہے جس کی بدولت انسان نہ صرف اپنے ابنائے جنس کے قلوب میں گھر کر سکتا ہے۔ بلکہ انسانی سیرت وشخصیت کے عملی نقوش بھی صفحۂ تاریخ پر ثبت کر سکتا ہے[۳۶] علامہ اسے ''ارّہ ائیت'' سے وابستہ تصور کرتے ہیں اور اپنی اُمت کے تمام افراد میں اسی جذبہ کو دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس لیے انھوں نے اسی کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ اُن کے نزدیک اپنے لہو میں تڑپنے میں ہی آبرو ہے اور خاموشی وصبر سے جان فدا کر دینا ہی عشق کی معراج تک لے جانے کا ذریعہ ہے۔ اس عشق کی معراج کو پانے اور خودی کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہی تو عاشق آرے سے کٹ جانے اور پھانسی چڑھ جانے کو بھی عیدین سے کم نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ان کی برکت سے اُسے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جس کی بدولت وہ ابوالوقت اور ابوالحال بن جاتا ہے۔ زمین وآسمان اُس کے قبضے میں آ جاتے ہیں۔ وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ جن وملائکہ اُس کے صید زبوں ہیں اور اُس کے تمام کارنامے حیات دوام کے حامل کہ:[۳۷]

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام[۳۸]

علامہ اقبال کو عشق کی یہ معراج حضرت زکریاؑ کی زندگی میں عروج پر نظر آئی کہ پیغمبر حقیقی معنوں مردِ خدا و طالب اللہ ہوتا ہے اور اپنے اس فعل میں مرتبۂ کمال تک پہنچ کر ہی تبدیلی لانے

کا سبب بنتا ہے۔[۳۹] علامہ اقبال کے ہاں یہ مرتبۂ کمال 'ارّہ ائیت' ہے۔اس لیے وہ مسلمانوں کو ارّہ ائیت (عشق میں مرتبۂ کمال اور مضبوط خودی) کے حصول کی تلقین کرتے ہیں۔لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔اس راہ میں بلا و آزمائش کا پیش آنا یقینی ہے مگر مردِ مومن کو ان بلا و آزمائش سے بالکل نہیں گھبرانا کہ راہ عشق میں جو جسمانی اذیت و دکھ پیش آئے وہ عین راحت ہے۔اُسے ہر حال میں فریضۂ پیغمبری ادا کرنے کے لیے ڈٹے رہنا چاہیے۔وہ وارثِ زکریّا و وارثِ ''ارّہ ائیت'' ہے۔اُسے اس دُنیا میں انقلاب لانا اور درجۂ کمال حاصل کرنا ہے۔

دراصل علامہ اقبال مومن کے دل میں عشق حقیقی کی تڑپ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اُسے بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا واحد راستہ شہادت ہے۔اس طرح سے وہ اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کو رُخِ یار کا نظارہ کروانے کے بعد اُسے شہادت کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔کیونکہ اُن کی باریک بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مسلمانوں میں اسلاف کے سے کارنامے سرانجام دینے کا شوق نہیں رہا۔وہ موت سے خوفزدہ ہیں۔دُنیا میں منہمک ہو کر آخرت کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔یہ ایک ایسا نقصان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ''والعصر'' یعنی زمانے کی قسم کھا کر واضح کیا ہے کہ تمام انسان بلاشبہ نقصان میں ہیں سوائے اُن کے جو ایمان لائے، نیک اعمال کیے، حق کی وصیت کرتے رہے اور اللہ کی راہ میں مشقتیں اٹھانے پر خود بھی صابر رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ہماری موجودہ بے کیف و بے عمل حیات دین و دنیا کے نقصان کا باعث ہے۔علامہ مسلمانوں کو اس نقصان سے بچانا چاہتے ہیں۔اس لیے اُن کی شدید خواہش ہے کہ اُمت مسلمہ کا ہر فرد ''ارّہ ائیت'' کی طرف مائل ہو جائے تا کہ دین و دنیا میں کامیابی اُس کا مقدر بن جائے۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجوم ہدایت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۹۱

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص:۶۳۷/۴۹

۳- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص ۵۰۵، ۵۰۶

۴۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۵۰/۶۳۸

۵۔ نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۳-۴، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۵۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۵ء، ص:۲۰۶

۶۔ نعمانی، مولانا محمد عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۳-۴، ص ۱۳۶۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴۸

۷۔ ادارہ تصنیف وتالیف، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، انوار انبیاء، ص:۲۰۶

۸۔ آل عمران:۳، آیت:۳۷۔۴۱۔ الانعام:۶، آیت:۸۵۔ مریم:۱۹، آیت:۲۔۱۱۔ الانبیاء:۲۱، آیت:۸۹-۹۰

۹۔ نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۶۵۵۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین دمشقی، البدایہ والنہایہ، ج:۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۰۰۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، ج:۳، پ:۱۶، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، کراچی، ص:۲۰

۱۰۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ، ص ۲۵۱۔ نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۲، ادارۃ المعارف، کراچی، ایڈیشن ندارد، ۱۹۹۸ء، ص:۵۸

۱۱۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص:۲۵۲

۱۲۔ پانی پتی، ثناء اللہ، علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری، ج:۲، سعید ایچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۹۔ نیز دیکھیے: شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۲، ص:۵۸

۱۳۔ دیکھیے: آل عمران:۳، آیت:۳۷، ۴۴

۱۴۔ پانی پتی، ثناء اللہ، علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری، ج:۲، ص ۲۳۱۔ نیز دیکھیے: کرم شاہ، پیر محمد ایم۔ اے، ضیاء القرآن، ج:۳، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، پنجم ۱۳۹۹ھ، ص:۶۶۔ نیز دیکھیے: سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، حصہ دوم، ص:۲۵۵

۱۵۔ کرم شاہ، پیر محمد ایم۔اے، ضیاء القرآن اردو، حصہ دوم، ص:۲۵۵

۱۶۔ نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۳، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد، ص:۴۷۸

۱۷۔ کرم شاہ، پیر محمد ایم۔اے، ضیاء القرآن اردو، حصہ دوم، ص:۶۶

۱۸۔ نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۳، ص:۴۷۸

۱۹۔ اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲، نشریات کتاب فروشی اسلام، بازار شیرازی، تہران، بار ۲۵، ۱۳۶۰ھ، ص:۳۰۴

۲۰۔ سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم، ص ۲۵۵۔ نیز دیکھیے: سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص:۳۴۸

۲۱- پانی پتی، ثناء اللہ، علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری، ج:۱،ص۲۳۴۔نیز دیکھیے: ابن کثیر، اسماعیل، ابولفداء عماد الدین، البدایہ والنہایہ، حصہ دوم،ص: ۴۹، دانش گاہ پنجاب لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۱۰،ص۱۷۱۔نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۳،ص:۴۷۸

۲۲- پانی پتی، ثناءاللہ، علامہ قاضی محمد، تفسیر مظہری، ج:۲،ص:۲۳۱

۲۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: مریم:۱۹، آیت:۱-۱۱

۲۴- آل عمران:۳، آیت:۳۸-۴۱

۲۵- نعیمی، مفتی احمد یار خاں، تفسیر نعیمی، ج:۳،ص:۴۷۱

۲۶- تفصیل کے لیے دیکھیے: مقدس لوقا کی انجیل، باب:۱، آیت:۵-۲۴، ۵۷، ۵۸، سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۸۵ء

۲۷- الانبیاء:۲۱، آیت:۸۹، ۹۰

۲۸- ابن کثیر، اسماعیل، ابوالفداء عماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۲،ص:۴۰۴

۲۹- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۱-۲، حصہ دوم،ص:۲۵۵، ۲۷۴

۳۰- امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال فارسی، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء،ص:۱۲

۳۱- دانش گاہ پنجاب، لاہور، دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۱۰،ص:۴۷۳

۳۲- ابن کثیر، اسماعیل، ابوالفداء عماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۲،ص:۴۰۱

۳۳- اصفہانی، عماد الدین حسین، قصص الانبیاء فارسی، ج:۱-۲،ص:۱۳۷، ۱۴۷

۳۴- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ،ص:۵۰۹، ۵۱۰

۳۵- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۳ء،ص:۱۳۶، ۱۳۷

۳۶- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجوم ہدایت،ص:۶۱

۳۷- فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، اقبال اور محبتِ رسول ﷺ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء،ص:۲۵

۳۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۹۴/۳۸۶

۳۹- چشتی، یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ،ص:۵۰۹، ۵۱۰

☆☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اقبال کے ہاں حضرت عیسیٰؑ کی ممتاز حیثیت کا بین ثبوت یہ ہے کہ دیگر انبیاء کرامؑ کے برعکس ان کا ذکر نظم ونثر دونوں میں ملتا ہے۔ اگر چہ تذکرہ میں وہ شان اور جوش بیان مفقود ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ کے بیان ملتا ہے لیکن بحیثیت پیغمبر وہ اقبال کے نزدیک اہم ہیں اور قابل تعریف۔ اسی لیے تو اقبال اُنھیں نسل یہود کے عظیم ترین انسان اور عظیم ترین معلم قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ وہ فطین ہستی ہیں جنھوں نے زندگی کی عمیق ترین حقیقتوں کو سادہ حکایتوں اور تمثیلوں کی شکل میں واضح کیا ہے اور محبت کی ماہیت کا درست ادراک کیا ہے۔[۱]

حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کلام میں سیاق وسباق کے ساتھ بھی ملتا ہے اور علامتی سطح پر بھی۔ اس سبب سے یہ شخصیت اپنے بنیادی تصور کے ساتھ ساتھ اور تلازمات بھی ذہن میں اُبھارتی ہے۔ ''مسیحیت یا عیسائیت'' اپنی اصلی حقیقی اور بنیادی شکل میں روحانیت سے وابستہ ہے۔ ''روحانیت'' ایک مکمل اکائی اور نظام ہے۔ اس لحاظ سے مسیحیت اور ''مسیحائی'' کلام اقبال میں اہم مقام کی حامل ہے۔

جہاں کی روحِ رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟[۲]

اس کائنات کی اصل توحید ہے۔ مسیح، میخ اور چلیپا کا ماجرا کیوں بیان کیا جائے۔

آیئے مسیح، میخ اور چلیپا کی تفصیل جاننے کے لیے حضرت عیسیٰؑ کی سیرت پاک کا جائزہ لیں۔

حضرت عیسیٰؑ وہ جلیل القدر نبی ورسول ہیں جن پر انجیل نازل ہوئی۔ یہ درحقیقت تورات کی تکمیلی شکل ہے۔ حضرت محمد ﷺ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ درمیان کا یہ دور تقریباً ۵۷۰ سال پر مشتمل ہے۔[۳]

قرآن پاک نے حضرت عیسیٰؑ کے حالات وواقعات کو بسط وتفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ

تفصیل قرآنِ عزیز کی تیرہ سورتوں البقرہ، آل عمران، النسآء، المائدہ، الانعام، التوبہ، مریم، المؤمنون، الاحزاب، الشوریٰ، الزخرف، الحدید، الصّف میں ملتی ہے۔ ان سورتوں میں آپؑ کا ذکر کسی جگہ نام مبارک عیسیٰؑ (یسوع) سے اور کسی جگہ "مسیح" اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی جگہ کنیت "ابنِ مریم" کے اظہار کے ساتھ ملتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ حضرت مریم بنت عمران کے بیٹے ہیں[۴] اور ان اولعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں جن کے آنے سے قبل انبیاء کرامؑ اُن کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی خوشخبری سناتے چلے آئے ہیں۔ بائیبل مقدس اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود اُن کی آمد کی خوشخبری اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے۔[۵]

قرآن پاک میں آپ کی پیدائش کے واقعہ کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۃ آلِ عمران اور سورۃ مریم میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ آل عمران میں ہے:

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ وَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَo وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَ كَهۡلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَo قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُo وَ يُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ التَّوۡرٰةَ وَ الۡاِنۡجِيۡلَo وَ رَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآئِيۡلَ o[۶]

ترجمہ: اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا، اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح مریم کا بیٹا رودار (باعزّت) ہوگا دُنیا اور آخرت میں اور قرب والا اور لوگوں سے بات کرے گا پالنے میں اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا۔ بولی اے میرے رب! میرا بچہ کہاں سے پیدا ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا فرمایا اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اس سے یہی کہتا ہے ہو جا، وہ فوراً ہو جاتا ہے اور اللہ سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف۔

حضرت جبرائیلؑ نے بشری صورت میں خوشخبری سُنا کر حضرت مریمؑ کے گریبان میں پھونک ماردی[۷] اور اللہ پاک کا کلمہ پہنچا دیا کچھ وقت بعد حضرت مریمؑ نے اپنے آپ کو حاملہ محسوس کیا تو گھبرا گئیں۔[۸] مدت حمل ختم ہونے کے قریب کے زمانہ میں وہ بدنامی اور بہتان

طرازی کے خوف سے سوچ سمجھ کر یروشلم سے تقریباً نو میل کو ہِ سراۃ کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب ''بیت اللحم'' کے نام سے مشہور ہے۔[9] ۱۹۳۱ء میں اقبال نے حضرت عیسیٰؑ کے اس مقام پیدائش کی زیارت کی تھی اور بہت متاثر ہوئے تھے۔[10]

پیدائش کے قریبی لمحات میں جب دردِزہ شروع ہوا تو حضرت مریمؑ گھبرا گئیں لیکن فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور حضرت عیسیٰؑ جیسے برگزیدہ بچے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں[11] لیکن ہر وقت پریشان رہتیں کہ قوم کو کیا جواب دیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے ذریعے پیغام دے کر پاس پریشانی کو دور کر دیا اور فرمایا کہ جب قوم میں جائیں تو تفتیشی سوالات کا جواب دینے کے بجائے بچے کی طرف اشارہ کر دیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ جب قوم میں گئیں تو ایک بڑا ہجوم آپ پر ٹوٹ پڑا۔ آپ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں بچے کی طرف اشارہ کر دیا تو قوم والے کہنے لگے کہ گود کا بچہ کیسے بولے گا۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ فوراً بول اٹھے۔

سورۃ مریم میں ہے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ قف اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّاo وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّاo صلے وَّ بَرًّا م بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّاo وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّاo[12]

ترجمہ: بچہ نے فرمایا میں ہوں اللہ کا بندہ اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے غیب کی خبریں بتانے والا (نبی) کیا اور اُس نے مجھے مبارک کیا۔ میں کہیں ہوں اور مجھے نماز و زکوٰۃ کی تاکید فرمائی جب تک جیوں اور اپنی ماں سے اچھا سلوک کرنے والا اور مجھے زبردست بد بخت نہ کیا اور وہی سلامتی مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اُٹھایا جاؤں۔

قوم چالیس یوم کے[13] دودھ پیتے بچے کی زبان سے حکیمانہ کلام سن کر سمجھ گئی کہ بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً اللہ کی جانب سے ایک ''نشان'' ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے نوزائیدگی کی عمر میں کلام کرایا تاکہ جب یہ بچہ بڑا ہو کر نبوّت کے عہدہ سے سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس بات کی گواہی کے لیے موجود رہیں کہ اس مقدس انسان میں وہ ایک حیرت انگیز معجزے کا نظارہ کر چکے ہیں۔[14] حضرت عیسیٰؑ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپ پیدائش کے وقت شیطان کے چھونے سے محفوظ رہے۔ حالانکہ حدیث کے مطابق ہر بنی آدم کے پیدا ہوتے وقت شیطان ٹھوکے مارتا ہے سوائے حضرت عیسیٰؑ کے کہ شیطان ٹھوکا مارنے گیا مگر اس کا ہاتھ ان

کے جسم تک نہ پہنچ سکا۔[۱۵]

قرآن پاک نے حضرت مسیح کی صدیوں سے معمہ بنی ہستی کے متعلق واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ مریمؑ کے بیٹے اور اللہ کے رسول ہیں۔ بن باپ کے اللہ کے کلمہ سے اُن کی تخلیق ہوئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی مقرب روحوں میں سے ایک پاک روح ہیں۔ اللہ ایک ہے۔ تثلیث کا عقیدہ غلط ہے جس پر سب عیسائی فرقے متحد ہیں۔ اگرچہ اس بات پر سب عیسائی فرقوں کی متفقہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ بحیثیت جوہر ایک ہے اور اقانیم کی حیثیت سے تین ہیں (وجود، علم اور حیات کو اقانیم کہتے ہیں اقانیم کا واحد اقنوم ہے) وجود کو باپ، علم کو بیٹا اور حیات کو روح القدس کہتے ہیں۔ ان کا اختلاف اس میں ہے کہ ان تین اقانیم کا تعلق جوہر سے کس نوع کا ہے۔

۱۔ ایک فرقہ اس مذہب پر اعتقاد رکھتا ہے کہ تین اقانیم اور جوہر جدا جدا ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خدا ہے اور اقنوم ثانی (یعنی علم) حضرت عیسیٰؑ کے بدن سے مل گیا بالکل ایسے جیسے شراب اور پانی مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا عیسیٰؑ بھی ازلی قدیم ہے اور مریم نے ازلی قدیم کو جنم دیا ہے۔

۲۔ ایک اور فرقہ اس مذہب پر اعتقاد رکھتا ہے کہ بیٹا یعنی حضرت عیسیٰؑ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک لاہوتی اور ایک ناسوتی۔ اس حیثیت سے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے وہ خدائے کامل ہے اور اس حیثیت سے کہ اس جسدِ عنصری میں ظاہر ہوا انسان کامل ہے۔ اس لیے یہ قدیم بھی ہے اور حادث بھی اور قدیم و حادث کا یہ اتحاد نہ تو قدیم پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ حادث کے حدوث پر۔

۳۔ ایک گروہ کا نظریہ یہ بھی ہے کہ کلمہ یعنی اقنوم ثانی گوشت اور لہو میں تبدیل ہو گیا اور خدا مسیح کی شکل میں ظاہر ہوا۔

۴۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ الہٰ قدیم کے جوہر اور انسان حادث کے جوہر میں یوں امتزاج ہوا جیسے نفسِ ناطقہ بدن کے ساتھ مل جاتا ہے اور دونوں ایک شے بن جاتے ہیں۔

یہ سلسلہ طویل ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود عیسائی عقیدہ تثلیث پر متفق ہیں۔ تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ تمام مشرکانہ مذاہب میں مشترک ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ''تری مورتی'' یعنی برہما، وشنو اور شیو کی عبادت ہوتی ہے۔ چین میں ''تاوو'' تین اقانیم والا خدا ہے۔ قدیم مصر میں معبد منفیس کے قسیس ثالوث مقدس کی تعلیم دیتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ پہلے نے دوسرے کو اور دوسرے نے مل کر تیسرے کو تخلیق کیا۔ اُن کے عقیدے میں اقنوم ثانی کو کلمہ، نیز دوسرا خدا اور اللہ کا پلوٹھی کا بیٹا کہا جاتا تھا اور یورپ میں

بھی مسیحیت سے قبل تثلیث کا عقیدہ مروّج تھا۔ چنانچہ یونانی ایک ایسے خدا کو مانتے تھے جن کی تین اقانیم تھیں۔ روم کے پرانے بتوں کے پجاری بھی عقیدہ تثلیث کے قائل تھے۔ اُن کا اللہ، کلمہ اور روح پر ایمان تھا۔ اس مطالعہ سے یہ نتیجہ بآسانی نکل آتا ہے کہ جب عیسائیت مشرقِ اوسط سے یورپ میں آئی اور قسطنطین شاہ روم نے اسے قبول کیا تو اہل یورپ کے عقیدہ میں غیر معلوم زمانے سے آنے والا عقیدۂ تثلیث بھی منتقل ہو کر ایک ایسے دین کا حصہ بن گیا جو مکمل طور پر توحید کا علمبردار تھا۔ انجیل مقدس آج بھی یہ اعلان کر رہی ہے کہ اس سچے دین اور اس کے پیغمبر کا دامن شرک کی آلودگیوں سے پاک ہے۔[16]

انجیل یوحنا میں ہے:

ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو، جسے تُو نے بھیجا ہے، جانیں۔[17]

اقبال نے اسی عقیدۂ تثلیث کی بنا پر عیسائیوں کو ''تثلیث کے فرزند'' کہہ کر پکارا ہے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل[18]

حضرت عیسٰیؑ کے زمانے میں یہودی بادشاہ ہیرودیس تھا۔ وہ آپؑ کا دشمن بن گیا۔ وہ نبی دشمن پہلے ہی حضرت یحییٰؑ کو اپنی محبوبہ کے کہنے پر قتل کر چکا تھا۔ حضرت مریمؑ اپنے بعض خیر خواہوں کے کہنے پر حضرت عیسٰیؑ کو وہاں سے لے کر مصر اور پھر وہاں سے ناصرت چلی گئیں۔[19] جب حضرت عیسٰیؑ تیرہ سال کے ہوئے تو حضرت مریمؑ اُنھیں واپس بیت المقدس لے آئیں۔[20] اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو آپ کی حفاظت کے لیے مامور کر رکھا تھا۔[21]

حضرت عیسٰیؑ درمیانہ قد کے مالک تھے۔ آپ کا رنگ گندم گوں سرخ تھا۔[22] آپؑ اِنتہائی حسین تھے۔ آپؑ کے بال بھی خوبصورت[23] اور دونوں کندھوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ آپ کا سینہ کافی کشادہ تھا۔[24] آپؑ کا چہرہ چاند کی طرح روشن رہتا تھا۔ آپؑ کے بالوں اور بدن سے خوشبو نکلتی تھی۔ جدھر سے گذرتے دور دور تک مشک کی خوشبو بکھر جاتی تھی۔ آپؑ کے بدن پر صرف سینے پر ہی مٹھی بھر بال تھے۔ گردن سے پاؤں تک سیال چاندی کی مانند ایک روشنی بہتی نظر آتی تھی۔[25]

منقول ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کا سن ولادت وہ نہیں جس سے مسیحی تقویم کا آغاز ہوا بلکہ اس سے تین سال بعد کا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا سن ولادت ۳ء بنتا ہے۔[26]

کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ بہت ہی نرم دل تھے اور خلقِ خدا پر رحم کرنے والے۔ یہی اثر

آپؑ کے حقیقی پیروکاروں میں سرایت کر چکا تھا۔لیکن حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ کے باقی لوگ ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے شرف رسالت سے بامشرف ہونے کے بعد جب پیغام حق سنایا تو اُس وقت علم طب اور علم الطبیعیات کا شہرہ تھا۔یونانی اطبا و حکما اپنی حکمت و کمال کا اظہار تو کر رہے تھے۔لیکن وہ توحید اور دینِ حق کی روشنی سے محروم تھے۔[۲۷] پس ان حالات میں حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے انجیل اور حکمت سے نوازا اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق چند ایسے نشان بھی عطا فرمائے جو اُس زمانے کے اربابِ کمال اور اُن کی اطاعت کرنے والوں پر اثر انداز ہوں۔

حضرت عیسیٰؑ کے پانچ معجزات کا ذکر قرآن پاک میں وضاحت سے ملتا ہے۔

۱۔ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔

۲۔ وہ اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تھے۔

۳۔ وہ مادرزاد نابینا کو بینا اور کوڑھی کو بھلا چنگا کر دیتے تھے۔

۴۔ وہ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو اللہ کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔[۲۸]

۵۔ وہ لوگوں کا کھایا، پیا، خرچ کیا ہوا اور گھر میں محفوظ کیا ہوا سب کے بارے میں بتا دیتے تھے۔[۲۹]

پروفیسر محمد منور معجزات عیسیٰؑ کے بارے میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

......وحی کا چیلنج اور اسی طرح معجزہ کا چیلنج متعلقہ علم و فکر با کمال کے ماہرین کے لیے ہوتا ہے، مثلاً حضرت عیسیٰؑ کا یہ اعجاز کہ وہ کوڑھیوں کو ہاتھ لگائیں اور وہ صحت یاب ہو جائیں یا وہ اندھوں کی آنکھوں پر ہاتھ پھیریں اور وہ بینا ہو جائیں یا وہ قبر پر کھڑے ہو کر کہیں ''قم باذن اللہ'' اللہ کے حکم سے کھڑے ہو۔ یہ بات عوام کے قائل کرنے کی نہیں، عوام سحر اور اعجاز میں فرق نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰؑ کے معجزے ان کے معاصر اہل علم اور خصوصاً اہل طب ہی سمجھ سکتے تھے۔ وہی جانتے تھے کہ علم طب کہاں ختم ہوتا ہے اور معجزہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل فکر و نظر کا ایمان سوچا سمجھا ایمان ہوتا ہے اور پھر ان کی مثال عوام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ورنہ عوام از خود مداری، ساحر اور صاحب اعجاز میں تفریق روا نہیں رکھ سکتے۔ ہوسکتا ہے انھیں مداری کا مداری پن، کرامت معجزہ سے زیادہ متاثر کرے۔[۳۰]

اقبال حضرت عیسیٰؑ کے معجزات اور اُن کی تاثیر سے متاثر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں ان معجزات کی طرف نہ صرف اشارے مہیا کیے ہیں بلکہ اس سے کئی نکات بھی اخذ کیے ہیں۔

بالِ جبریل میں ایک نظم ''خانقاہ'' ہے۔ اس میں بھی اقبال نے حضرت عیسیٰؑ کے مردوں کو ''قم باذن اللہ'' کہہ کر زندہ کرنے والے معجزہ کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان رمز و ایما کے پردے ہٹا کر حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں ''قم باذن اللہ'' کہنے والے ختم ہو گئے ہیں۔ یعنی وہ افراد ناپید ہو گئے ہیں جو روحانی طاقت و قوت کے علمبردار تھے۔ اور اُن کی زبانوں میں اتنی قوت و تاثیر تھی کہ وہ ناممکن کو اللہ کے حکم سے ممکن کر سکتے تھے۔ یعنی مضبوط و مستحکم خودی کے حامل تھے اور توحید کی تعلیمات پر پختہ یقین و عمل کی بدولت اُن کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ بن چکے تھے۔ اُن کی زبان اللہ کی زبان بن چکی تھی۔ یہ آج کے مسلمانوں کے آبا و اجداد تھے۔ لیکن افسوس آج کے مسلمان اس صفت سے تہی ہیں، اس لیے تو علامہ کہتے ہیں:

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رُخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن![۳۱]

اقبال امید و رجائیت کے شاعر ہیں۔ اگر کہیں اُن کے کلام میں مایوسی کا شائبہ آتا ہے تو فوراً امید اُس پر غلبہ پا لیتی ہے۔ وہ مسلم ہیں اور مسلم نا امید نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ اس ''قم باذن اللہ'' کے ذریعے ہی مسلمانوں کو آباؤ اجداد کے نقش قدم پر عمل پیرا ہونے کے لیے ابھارتے ہیں۔ وہ نظم ''قم باذن اللہ'' میں یوں گویا ہوتے ہیں:

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے، قم باذن اللہ
وہی زمیں، وہی گردوں ہے، قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قم باذن اللہ[۳۲]

اے مسلمان! سچ تو یہ ہے کہ جہاں دگرگوں ہے یعنی حالات سازگار نہیں ہیں۔ تو مشکلات و مصائب کا شکار ہے لیکن تو پرواہ مت کر، ہمت سے کام لے اور سرگرم عمل ہو جا۔ دُنیا کے حالات بے شک تیرے موافق نہیں ہیں لیکن تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ۔ حالات بدل گئے ہیں تو کیا ہوا۔ ہوا، زمین اور آسمان تو وہی ہیں یعنی فطرت کے قوانین تو نہیں بدلے۔ اللہ کا قانون اٹل ہے کہ

جو شخص بھی راہ خدا میں جدو جہد کرتا ہے اللہ اُس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ اُٹھ اور عمل کے لیے تیار ہو جا۔
یہ جہاں تیرے لیے بنا ہے تو جہاں کے لیے نہیں بنا۔ اس کو مسخر کرنے کے لیے مستعد ہو جا۔

حضرت عیسٰیؑ کے معجزات دیکھ کر سعید روحوں نے دعوت حق پر لبیک کہا اور ایمان لے آئے، انھوں نے حق کی سر بلندی کے لیے اپنی جان و مال وقف کر دیا۔ اکثر و بیشتر حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ مل کر تبلیغ و دعوتِ حق کا فریضہ سر انجام دینے لگے۔ اس صفت کی وجہ سے وہ ''حواری''[۳۳] اور ''انصار اللہ''[۳۴] کے مقدس القاب سے ملقب ہوئے۔

قرآن پاک نے حضرت عیسٰیؑ کے حواریوں کی تعریف بیان کی ہے۔ اس کے برعکس انجیل مقدس میں بعض مقامات پر ان حواریوں کی تعریف ہے اور بعض جگہ ان کو بزدل اور منافق قرار دیا گیا ہے۔[۳۵]

انجیل مقدس میں ہے:

''اس پر سارے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے''[۳۶]

انجیل اور قرآن پاک کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انجیل میں ان من گھڑت واقعات کا اضافہ صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ عقیدۂ ''صلیب مسیح'' سے متعلق داستان کو درست ثابت کیا جا سکے۔[۳۷]

حضرت عیسٰیؑ کے پیرو کار غربا و فقرا اور حواریوں کی صادق الایمان اور راسخ العقیدہ جماعت نے از راہ سادگی حضرت عیسٰیؑ سے غیب سے دستر خوان کے نزول کی دعا کی درخواست کی اور بے حد اصرار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ کے حواریوں نے اپنی حاجت اور فقر کی وجہ سے سوال کیا تھا کہ ہر روز خوان نازل ہوا کرے تا کہ وہ کھا کر عبادت کے لیے قوت حاصل کر سکیں۔ اُن کے اس سوال پر حضرت عیسٰیؑ نے کہا اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ کا خوف کھاؤ اور ایسا سوال مت کرو۔ رزق کے لیے اللہ پر بھروسہ کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی چیز تمھارے لیے آزمائش بن جائے۔ تب حواری کہنے لگے کہ ہم غذا کے محتاج ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کھانے کے لیے چاہیے۔ جب ہم آسمان سے مائدہ اُترتا دیکھیں گے تو ہمیں اطمینان ہو جائے گا اور آپؑ پر ایمان زیادہ ہو جائے گا۔ نیز آپؑ کے رسول ہونے کا یقین کامل ہو جائے گا اور ہم خود اس کے گواہ بن جائیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی ہے اور حضرت عیسٰیؑ کی نبوت کی واضح دلیل۔[۳۸] تب حضرت عیسٰیؑ نے مائدہ کے لیے دعا کی جس کا ذکر سورۂ مائدہ کے رکوع ۱۵ میں ہے۔[۳۹]

حضرت عیسٰیؑ پاکباز، ذہین، ہوشیار اور عبادت گزار تھے۔ انھوں نے نہ تو گھر بنایا اور نہ ہی

شادی کی۔ شہر شہر اور گاؤں اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔ جہاں رات آ جاتی بغیر کسی سامانِ راحت کے رات گزار لیتے۔ اقبال نے آپ کے اس وصف کو فقر کے نام سے یاد کیا ہے۔

علامہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:

علم فقیہہ و حکیم ، فقر مسیحؑ و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ[۴۰]

علم فقیہہ اور حکیم ہے اور فقر مسیح اور کلیم ہے۔ علم راہ کو تلاش کرتا ہے اور فقر دانائے راہ ہے۔

مخلوق خدا کو حضرت عیسیٰؑ سے جسمانی اور روحانی فیض پہنچتا تھا۔ اس لیے آپؑ جس طرف سے گزرتے ایک بڑا گروہ عقیدت کے لیے ساتھ ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر فدا ہونے کو تیار رہتا تھا۔ یہود اس دعوت حق کے دشمن تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے گھبرا گئے اور سب نے مل کر سازش کی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے انھیں دار پر چڑھا دیا جائے۔[۴۱]

حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ہیرودیس بادشاہ تھا جو بت پرست تھا۔ یہود اگرچہ اس سے متنفر تھے مگر حضرت عیسیٰؑ کے خلاف حسد کی آگ میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں گئے اور حضرت مسیحؑ کو ختم کرنے کے لیے زور ڈالا۔ پلاطیس نے آپؑ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ یہ سن کر یہود بہت خوش ہوئے اور آپس میں مبارکباد دیں۔[۴۲]

حضرت عیسیٰؑ کو یہود کی معاندانہ سرگرمیوں کا احساس ہوا تو حواریوں کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کے خطرناک منصوبوں کا تمھیں علم ہو گا۔ اب آزمائش اور امتحان کے لمحات میں کون اللہ کے دین کا مددگار بننے کو تیار ہے۔ سب نے بیک زبان کہا کہ ہم سچے دل کے ساتھ آپؑ کے ساتھ ہیں۔ ہم اللہ اَحد کے پرستار ہیں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب پر اور اس کے نبی و پیغمبر پر ایمان لا چکے ہیں۔ ہم اسی کی حمایت و مدد کریں گے۔

حضرت عیسیٰؑ کی دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن و انجیل کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن بعد کے پورے قِصّہ کے بیان میں قرآن و انجیل میں اختلاف ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں کا مشترکہ بیان ہے کہ یہودی سردار اور کاہن حضرت عیسیٰؑ کو تنہائی میں پکڑنے کے موقع کی تلاش میں تھے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے

ساتھ علیحدہ مکان میں موجود ہیں تو انھوں نے چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ اُن کو سولی پر لٹکائیں۔ پیلاطیس نے حضرت عیسیٰؑ کو بے قصور جان کر آزاد کر دینا چاہا لیکن بنی اسرائیل کے شر پسندوں کے اصرار کے سامنے مجبوراً اُنھیں سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کر کے مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں کیلیں ٹھونک دیں۔ سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا۔ اُنھوں نے اسی کس مپرسی کی کیفیت میں یہ کہتے ہوئے جان دے دی۔

"اِلَا ھِیَ اِلَا ھِیَ لِمَا شَبقُتَانِی" جس کا ترجمہ یہ ہے میرے خدا میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔[۴۳]

اقبال نے "مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے" کہہ کر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تفصیل میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی ملتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت انتہائی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دردانگیز طریقہ سے ہوئی۔ یہ بندگانِ خدا کے لیے کوئی عجب بات نہیں۔ ایسی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے من گھڑت ہونے پر قوی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک اور اولوالعزم پیغمبر کی طرح اس واقعہ کے رونما ہونے پر صبر نہیں کیا بلکہ ایک مایوس انسان کی طرح "اِلَا ھِیَ اِلَا ھِیَ لِمَا شَبقُتَانِی" کہتے کہتے جان دے دی۔ یہ صورت حال کسی بھی طرح پیغمبرانہ شان کے مطابق نہیں۔ یہود کی اس من گھڑت داستان کو نصاریٰ نے تسلیم کر لیا۔ پھر قرآن پاک نے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کر کے فریضۂ تجدید و اصلاح سر انجام دیا اور بتا دیا کہ جس وقت مخالفین اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مشغول تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے بارے میں حق کے مخالفین کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اللہ کی قدرت کاملہ کی خفیہ تدابیر کے سامنے سب بے بس رہیں گے۔[۴۴]

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ۔[۴۵]

ترجمہ: اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے اُن کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر چھپی تدبیر والا ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ [46]

ترجمہ: یاد کرو جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰؑ میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا اور تجھے کافروں سے پاک کردوں گا اور تیرے پیروؤں کو قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے تو میں تم میں فیصلہ فرما دوں گا جس بات میں جھگڑتے ہو۔

جب حضرت عیسیٰؑ کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ سخت گھیراؤ کے باوجود عدو اُن کی جان نہ لیں سکیں گے اور وہ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیے جائیں گے۔ اس طرح دُشمنانِ حق کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ رہیں گے تو اُنھیں اطمینان ہو گیا۔ اس جگہ دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کس طرح ہوا [47] اور واقعہ نے کیا شکل اختیار کر لی۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ کے مطابق آپؑ کو صلیب پر لٹکا کر مار دیا گیا۔ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل اور صلیب کی پوری کہانی کو غلط اور من گھڑت قرار دیا۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی طرف اٹھا لیا گیا [48] تو اس کے بعد دُشمن مکان کے اندر گھس آئے اور اُنھیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ حضرت مسیح کہاں چلے گئے۔ سورۃ النساء میں ہے:

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ [49]

ترجمہ: اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰؑ بن مریم اللہ کے رسول کو شہید کیا اور ہے یہ کہ انھوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی دی بلکہ ان کے لیے ان کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا اور اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ضرور اس کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں انھیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں مگر یہی گمان کی پیروی اور بے شک انھوں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآن پاک کے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بیان اور یہود و نصاریٰ کے من گھڑت فسانہ کو سامنے رکھا جائے اور تورات و انجیل کے متضاد بیانات پر غور کیا جائے۔ دور رس نگاہوں سے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی تمام کڑیوں کو باہم اکٹھا کر کے اس

مسئلہ کا مطالعہ کیا جائے تو تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ سامنے آئے گا کہ ''مصلوب مسیحؑ'' کی داستان تضاد کی حامل اور من گھڑت ہے اور قرآن کا بیان برحق ہے۔ اقبال نے نظم ''سر گذشتِ آدم'' میں اس واقعہ کی حقیقت ایک شعر میں سمو کر پیش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے [۵۰]

جاوید نامہ میں ''طاسین مسیح'' میں اقبال نے حکیم طالسائی کے ذریعے ایک فرضی داستان بیان کی ہے۔ حکیم موصوف نے کوہسار ہفت مرگ کی ایک تیرہ و تاریک وادی میں سیماب ایک کی نہر رواں دیکھی۔ اُس میں ایک شخص (یہودی قوم مراد ہے) کمر تک غرق نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ وہ پیاسا تھا لیکن سیماب سے پیاس کیسے بجھائے۔ اس نے نہر کے کنارے ایک حسین عشوہ طراز نازنیں کو دیکھا تو اُس سے اُس کا نام پوچھا۔ اُس حسینہ نے اپنا نام ''افرنگیں'' (مسیحی قوم مراد ہے) اور پیشہ جادوگری بتایا۔ دورانِ گفتگو اچانک چاندی کی نہر ٹھنڈی یخ ہوگئی۔ اُس نوجوان کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں اور وہ بے اختیار نالہ و فریاد کرنے لگا۔ اُس کے نالہ و فریاد کو سن کر افرنگین نے نوجوان سے کہا یعنی مسیحی قوم نے یہودی قوم کو طعنہ دیا:

گفت افرنگین ''اگر داری نظر
اند کے اعمالِ خود را ہم نگر
پورِ مریم آں چراغِ کائنات
نورِ او اندر جہات و بے جہات!
آں فلاطوس، آں صلیب، آں روئے زرد
زیرِ گردوں توچہ کردی او چہ کرد!
اے بجانت لذتِ ایماں حرام
اے پرستارِ بتانِ سیمِ خام
قیمت روحُ القُدُس نشناختی
تن خریدی، نقدِ جاں در باختی!'' [۵۱]

ترجمہ: افرنگین نے کہا: اگر تو نظر رکھتا ہے تو ذرا اپنے اعمال دیکھ
مریمؑ کا بیٹا چراغ کائنات تھا اور جس کا نور مکان و لامکان میں ہے۔
اس کا زرد چہرہ، صلیب اور افلاطوس کو پیش نظر رکھ پھر مجھے بتا کہ دنیا میں اس نے کیا کیا اور تو نے کیا کیا۔
اے وہ شخص جس کی جان پر لذت ایمان حرام ہے۔ اے وہ شخص جو بتانِ سیم خام کا پجاری ہے۔
تو نے روح القدس کی قیمت نہ پہچانی بدن خرید لیا اور روح ہار دی۔

اس نازنین نے اُس نوجوان سے کہا! اے نوجوان تجھے جو کچھ اذیت پہنچی ہے۔ یہ سب تیری بداعمالیوں کی سزا ہے۔ تو ذرا اپنے اعمال پر نظر کر! کچھ یاد ہے تو نے حضرت مریمؑ و جناب مسیحؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ذرا غور تو کر! وہ حضرت مسیحؑ کا زرد چہرہ، وہ افلاطوس کی عدالت، وہ یہودی قوم کا اصرار کہ یہ شخص مفتری علی اللہ ہے اس لیے واجب قتل ہے۔ ذرا سوچ تو! حضرت مسیحؑ نے تیری قوم پر کس قدر احسانات کیے اور تیری قوم نے اُن احسانات کا کیا بدلہ دیا۔ تذلیل، توہین، تکفیر اور تصلیب!! اے نوجوان سچ تو یہ ہے کہ تو نے روح القدس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی یعنی حضرت مسیحؑ کے پیغام کو رد کر دیا۔ اپنی روح ضائع کر کے بدن خرید لیا۔ یعنی دُنیا کے لیے دین و آخرت کو تباہ کر دیا۔

نازنین کے اس طعنہ کو سن کر وہ یہودی نوجوان آپے سے باہر ہو گیا اور کہنے لگا اے مکار، اے عیار، اے گندم نما جو فروش! اے بے ایمان منافق ضمیر فروش تو نے شیخ اور برہمن دونوں کو ملت فروشی اور غدّاری کا سبق پڑھایا! تو نے تمام قوموں کو الحاد کا درس دیا! تیری عیاریوں اور ابلیسانہ چالبازیوں کی وجہ سے عقل اور مذہب دونوں ذلیل و خوار ہو گئے۔ تو نے اولادِ آدم کو عشق و محبت کے پاک جذبات سے بیگانہ کر کے ہر قوم کو تجارت سکھا دی۔ تو نے روح اور اخلاق سے قطع نظر صرف جسمانی لذات کو مقصدِ زندگی بنا لیا۔ تیری محبت تکلیف کا باعث ہے۔ اگر تو عداوت پر آ جائے تو پھر چاروں طرف سے مرگِ ناگہانی مسلط ہو جائے۔

اے عیار عورت! تو نے مادہ پرستی اور جسمانی لذات کو زندگی کا مقصد بنا لیا ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے بندوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اللہ نے تجھے حکمت اور عقل بنی آدم کے سامان راحت کے لیے دی تھی۔ تو نے اس کی چنگیزیت کو دُنیا میں از سرِ نو قائم کرنے کے لیے استعمال کر لیا۔ ہر عقل مند آدمی مانے گا کہ تیرا جرم میرے جرم سے سنگین ہے۔ تو نے حضرت عیسٰیؑ کی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ حضرت عیسٰیؑ کی تعلیمات سے مردے زندہ ہو گئے لیکن تیرے طرزِ عمل سے زندہ مردہ ہو گئے۔ ہم یہودیوں نے جو کچھ حضرت عیسٰیؑ کے جسم کے ساتھ کیا۔ تو نے یعنی

ملتِ مسیحؑ نے وہی کچھ اُن کی تعلیمات کے ساتھ کیا۔ اے عیارہ اگر تو مر جائے تو اقوام عالم بالخصوص اقوام شرق از سرِ نو زندہ ہو جائیں۔

از دم او رفتہ جاں آمد بتن
از تو جاں را دخمہ می گردد بدن
آنچہ ما کردیم با ناسوتِ او
ملتِ او کرد با لاہوتِ او[۵۲]

ترجمہ: عیسیٰؑ کی پھونک سے بدن سے نکلی ہوئی جان واپس آ جاتی تھی اور تیری وجہ سے بدن جان کا قبرستان بن گیا۔

جو کچھ ہم نے عیسیٰؑ کے بدن کے ساتھ کیا، عیسائیوں نے اسؑ کی روح کے ساتھ وہی کچھ کیا۔

مذکورہ بالا نظم بظاہر طالسائی کا خواب ہے لیکن درحقیقت اقبال نے نہ صرف اس میں حضرت مسیحؑ کی سیرت کے تمام اہم واقعات کی طرف اشارے مہیا کیے ہیں بلکہ حضرت مسیحؑ کے پیروکاروں کو بتا دیا ہے کہ انھوں نے تعلیمات مسیحؑ کو فراموش کر دیا ہے۔ ان کی موجودہ تعلیمات روحانیت سے عاری ہیں۔ اگر وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات ہی کی پیروی کر لیں تو کامیابی اُن کے قدم چوم لے اور وہ مادی و روحانی سطح پر عروج حاصل کر لیں۔

روایات کچھ بھی ہوں لیکن قرآن پاک سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا گیا تا کہ وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ رہیں۔ لیکن قرآن پاک نے صرف اس مسئلہ کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ موقع کے مطابق یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی لمبی زندگی اور آسمان کی طرف اٹھائے جانے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے تا کہ اہل ایمان کے قلوب ایمان کی تازگی سے لبریز ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا۝[۵۳]

ترجمہ: اور کوئی کتابی ایسا نہیں جو اُس کی موت سے پہلے اس پر ایمان لائے اور قیامت کے دن وہ اُن پر گواہ ہوگا۔

یہود و نصاریٰ دونوں حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے اور قتل ہونے پر متفق ہیں لیکن دونوں کے عقائد متضاد بنیادوں پر قائم ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰؑ کو مفتری، کاذب اور دجال سمجھتے ہیں۔ اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھایا اور مار ڈالا۔ اس کے

برخلاف نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدمؑ دنیا کے پہلے انسان تھے اور گناہگار تھے۔ اس لیے ساری دنیا گناہگار تھی۔ جب اللہ کی رحمت نے دُنیا کو گناہوں سے نجات دلانے کا ارادہ کیا تو اس کی صفت ''رحمت'' نے ''ابنیت'' کی شکل اختیار کی اور اُسے دُنیا میں بھیجا تا کہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور قتل ہو جائے اور اس طرح سے پوری گزری ہوئی دنیا اور آنے والی دُنیا کے گناہوں کا کفارہ بنے اور دُنیا کو نجات دلائے۔

سورہ نساء کی آیات میں قرآن پاک میں واضح اعلان کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کا دعویٰ کرنا چاہے اس کی بنیاد عقیدے پر ہو ذلت کا باعث ہے۔ خدا کے پیغمبر کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنا غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب قرآن کے اعلان کے مطابق حضرت ''عیسیٰؑ ملاءِ اعلیٰ'' سے کائنات ارضی میں لوٹیں گے اور یہود و نصاریٰ کا ہر فرد اُن پر ایمان لائے گا۔[۵۴]

قرآن پاک میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان کی طرف اُٹھائے جانے کے متعلق تصریحات کی ہیں، احادیث میں بھی اس کی تفصیل ملتی ہے۔ قیامت کا دن مقرر ہے۔ قرآن پاک اور احادیث نے چند ایسی نشانیاں بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی۔ جن سے قیامت کے قریب ہونے کا پتہ چل سکتا ہے۔ ان میں سے نزول مسیحؑ بھی ایک نشانی ہے۔[۵۵] نزول مسیحؑ کے بارے میں اقبال کے ذہن میں مختلف سوالات اُبھرتے رہتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے ساتھیوں سے خطوط میں بھی کیا ہے۔[۵۶] یہ حقیقت ہے علامہ اقبال حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ نزول کے بارے میں مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> بزرگوں کی آمدِ ثانی کا نظریہ تمام مذہبی گروہوں میں پایا جاتا ہے یہ صرف مسلمانوں سے مختص نہیں۔ اس میں یہ مصلحت رکھی گئی ہے کہ جب کوئی مصلح و مجدد کھڑا ہو، وہ لوگوں کے اس انتظار و اعتقاد سے فائدہ اُٹھا کر ان کو ایک مرکز پر لا سکے۔ مسلمانوں کی مسیح و مہدی کی آمد بھی اسی قبیل سے ہے، ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن اس بارے میں قطعاً خاموش ہے۔[۵۷]

محمد حسین عرشی مضمون ''اقبال کی صحبت میں'' میں رقم طراز ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال نے حضرت مسیحؑ کی آمدِ ثانی کے بارے میں ایک بیان شائع کروایا جس سے احمدی حضرات نے ناجائز فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا۔ علامہ عرشی امرتسری، میاں مولا بخش کے ہمراہ اسی موضوع پر گفتگو کے لیے اقبال کے ہاں حاضر ہوئے۔ دونوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ احمدیوں نے یہ

مشہور کر رکھا ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے مسیحؑ کی آمد ثانی کا عقیدہ مجوسیوں سے لیا ہے۔ اقبال نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ انھوں نے ایسا کچھ نہیں لکھا پھر ان دونوں حضرات نے درخواست کی کہ وہ ایسا بیان لکھ دیں جس سے یہ پتہ چل جائے کہ آپ نے ایسا کچھ نہیں لکھا۔ علامہ اقبال نے قلم کاغذ منگوا کر مطلب کی تحریر لکھ دی۔ ان دونوں حضرات نے کہا کہ ایک سطر کا اضافہ کر دیں جس کا مطلب ہو کہ آپ حدیث کے مطابق مسیح کی آمد پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا ''میرا یہ اعتقاد نہیں ہے'' انھوں نے کہا کہ وہ اعتقادی معاملات میں صرف قرآن پر یقین رکھتے ہیں''۔[۵۸]

بالِ جبریل کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اقبال نے ان واقعات کو صرف دو اشعار میں سمیٹ کر پیش کر دیا ہے، دیکھیے:

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کی صفات؟[۵۹]

اقبال نے سوالیہ انداز اختیار کر کے مخاطب کو غور و خوض کی دعوت دی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال نے ''عیسائیت یا مسیحیت'' کو کئی اور پہلوؤں سے بھی لیا ہے اور اس کی کئی اور جہتوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ان جہتوں میں سے ایک جہت روحانی کمالات کی ہے۔ روحانی کمالات کی قوت مسلم ہے۔ ان کا اثر مکان و لامکان پر محیط ہے۔[۶۰] یہی سبب ہے کہ اقبال موجودہ نوجوان نسل کو اس قوت سے مزین دیکھنے کے متمنی ہیں، اس لیے اسے استعارۃً ''کلیم، مسیح، خلیل اور محمد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس سے مقصود افرادِ ملت کی غیرتِ ایمانی اور قوّتِ ایمانی کے جذبہ کو بیدار کرنا ہے تا کہ وہ ان صفات کو پروان چڑھا کر موجودہ زمانے کے کلیمؑ، مسیحؑ، خلیلؑ اور محمدؐ بن جائیں۔

او کلیمؑ و او مسیحؑ او خلیلؑ
او محمدؐ، او کتاب و او جبریلؑ![۶۱]

ترجمہ: وہی کلیمؑ ہے وہی مسیحؑ ہے وہی خلیلؑ ہے۔ وہی محمدؐ وہی کتاب ہے، وہی جبریلؑ ہے۔

مسیحیت، حقیقت سے بھی عبارت ہے۔ اس لیے اقبال کے ہاں وہ زیادہ اہم ہے، حکما

مردہ اور حقیقت سے نابلد ہیں۔ داستانیں بھی مردہ اور قیاسی بیان کرتے ہیں[۶۲] وہ ''یدِ موسیٰؑ اور دمِ عیسیٰؑ'' سے محروم ہیں۔ اس لیے وہ مسیحیت کو کیا جانیں:

حکیماں مردہ را صورت نگارند!
یدِ موسیٰؑ دمِ عیسیٰؑ ندارند![۶۳]

ترجمہ: فلاسفہ مردے کے بدن کی آرائش کرتے رہے کیونکہ ان کے پاس نہ یدِ بیضا تھا، نہ دمِ عیسیٰؑ

اقبال نے مسیحیت پر اخلاقیات کے حوالے سے بھی گرفت حاصل کی ہے۔ اخلاقی تعلیمات درحقیقت مذہبی تعلیمات ہیں اور مذہبی تعلیمات عشق سے عبارت ہیں۔ عشق اور مذہب ہم معنی ہیں۔ عشق کے بالمقابل عقل ہے۔ عقل ایک راہزن ہے جس کا کام بھولے بھٹکے مسافروں کو لوٹنا ہے۔ یورپ نے عقل پرستی کی وجہ سے بہت ترقی کی لیکن ان بنیادوں پر جو تہذیب پروان چڑھی اُس نے مسیحیت کی قابلِ قدر مذہبی اخلاقی تعلیمات کو نقصان پہنچایا۔

اقبال کے نزدیک عیسائیت کے بانیوں کی خطا یہ تھی کہ انھوں نے اپنے مذہب کی بنیاد مصیبت کی حقیقت کی بنیاد پر رکھی اور دوسرے عوامل کی طرح اخلاقی قدر کو بھول گئے[۶۴] بالکل ویسے ہی جیسے حضرت عیسیٰؑ اور مہاتما بدھ نے محبت کی ماہیت کا بالکل درست ادراک کیا لیکن اخلاقی عینیت کے جوش میں وہ زندگی کی حقیقتوں کو نظرانداز کر گئے۔[۶۵] جسے اقبال ''خاک بچشم پسرِ مریم زاد'' کا نام دیتے ہیں۔ اقبال عیسائیوں کے ہاتھوں کلیسا کے شعلہ کے بجھ جانے پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ عیسائی قوم نے عیسائیت کو باوجود امن و آتشی اور صلح کا مذہب ہونے کے ٹھکرا دیا ہے۔ حالانکہ اس کا بانی تصورِ مساوات کا عظیم پیکر ہے۔[۶۶]

ایک وقت تھا یہی نصرانیت جب رائج ہوئی تو آئین چلیپا کی رو سے ہسپانی، فرانسیسی، اطالوی، جرمن، انگریز، نصرانی ہونے کی وجہ سے ایک قوم تھے۔ لیکن مذہب کے بالمقابل وطنیت اور قومیت کا شوشہ چھوٹتے ہی مذہب کی گرفت سے آزاد ہو کر دہریت کی طرف مائل ہو گئے۔[۶۷] مسیحیت کی روح سے بے خبر ہو کر اسے ضائع کر دیا۔ بدن خرید لیا یعنی دُنیا کے لیے دین و آخرت دونوں کو برباد کر دیا۔ تعلیمات مسیحی کی اصلیت کو مسخ کر دیا حالانکہ یہی تعلیمات مردہ روحوں کو حیات بخشنے والی ہیں:

قصہ دینِ مسیحائی فسرد
شعلۂ شمعِ کلیسائی فسرد

قوم عیسےٰ بر کلیسا پازدہ
نقدِ آئین چلیپا وازدہ[۶۸]

ترجمہ: دینِ عیسوی کا قصہ ختم ہوا اور شمعِ کلیسا کا شعلہ بجھ گیا۔
عیسائی قوم نے کلیسا کو ٹھکرا دیا، اس عیسائی مذہب کے سکون کو رد کر دیا۔

اقبال نے مسیحؑ یا عیسیٰؑ کو علامتی طور پر آج کل کے معالجوں اور طبیبوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی بیماروں کو شفا دیتے تھے اور موجودہ معالجین و طبیب بھی بیماروں کو شفا دیتے ہیں۔ نظم ''شفا خانۂ حجاز'' میں حضرت عیسیٰؑ کے اس وصف کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے یہ کہا کہ جدہ میں شفا خانہ قائم ہو رہا ہے۔ چونکہ تو حجاز کی سرزمین سے الفت رکھتا ہے اس لیے اس نیکی کے کام میں دل کھول کر چندہ دے تاکہ وہاں ایک شاندار ہسپتال قائم ہو سکے:

دارالشفا حوالیِ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰؑ میں چاہیے[۶۹]

اقبال نے یہ سب سن کر جواب دیا کہ میں عاشق ہوں اور عاشق موت سے نہیں ڈرتا۔ اُس کے نزدیک موت تجدیدِ زندگی کا نام ہے اور معشوق سے ملنے کا وسیلہ۔ اس لیے وہ مریضِ عشق جسے حجاز میں موت آ جائے وہ خوش نصیب ہے:

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا؟[۷۰]

حضرت عیسیٰؑ پر کہے گئے تمام اشعار کو ایک خاص ترتیب سے پڑھا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اقبال ان اشعار کے ذریعے بالخصوص عیسائیوں کو ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں اور وہ پیغام ہے مسیحؑ کی سچی، حقیقی اور اصلی تعلیمات کی پیروی کا کہ اگر عیسائی صرف حضرت عیسیٰؑ کی ان سچی، حقیقی اور اصلی تعلیمات کی پیروی کر لیں تو اُن کی تقدیر بدل جائے۔ کامیابی اُن کا مقدر بن جائے۔ اقبال کی نظر میں عیسائیت کی حقیقی اصلی تعلیمات درحقیقت اسلام ہی کی تعلیمات ہیں کہ اسلام از آدمؑ تا محمد ﷺ ایک ہی ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان بھی عیسائیت کی سچی تعلیمات کی پیروی کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے مسلمان کے دل میں عشقِ رسول ﷺ موجزن ہونا ضروری

ہے کہ اسی کی بدولت وہ انسانیت کی مسیحائی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے:

نفس گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کرا[۱]

تیرے سینے میں اگر عشقِ رسول، نفس گرم کی آگ بھڑک رہی ہے تو تُو لوگوں کو زندہ کرسکتا ہے یعنی لوگوں کو عمل پر اُبھار سکتا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے مسیحائی کو زندگی سے تعبیر دی ہے۔ یعنی تعلیماتِ انبیاء زندگی سے بھرپور ہیں اور کامیابی کی ضامن بھی۔ انھی کے ذریعے عشق ومحبت کا سبق پڑھا جاسکتا ہے۔ یہی نفوس کو حرارت عطا کرتی ہیں اور عمل پر اُبھارتی ہیں۔

☆☆☆☆

مآخذ ومصادر

۱- ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتب)، افتخار احمد صدیقی (مترجم)، شذراتِ فکر اقبال، اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۹۲، ۱۰۶، ۱۱۵

۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۵/۶۶۷

۳- سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج: ۳-۴، حصہ چہارم، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۸ھ، ص ۱۴۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارپنجم ۱۹۸۵ء، ص: ۲۳۹

۴- ابن کثیر، حافظ ابوالفدا ءعمادالدین، البدایہ والنہایہ، ج: ۱-۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۱۰، ۴۱۱

۵- انجیل مقدس بمطابق متی: باب: ۱، آیت: ۱۹-۲۳، سوسائٹی آف سینٹ پال روما ۱۹۵۸ء۔ نیز دیکھیے: باب: ۲، آیت: ۱-۶

۶- آلِ عمران: ۳، آیت: ۴۵-۴۹

۷- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج: ۵، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد، ص: ۵۰۴۶ پر ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے گریبان میں یا آستین میں یا منہ میں یا دور سے پھونکا اور حضرت مریمؑ حاملہ ہو گئیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۳ سال سے زائد اور بیس سے کم تھی

۸- انجیل مقدس، متی: باب: ۲، آیت: ۵۔ مواہب الرحمن، ج: ۵، ص ۵۰۴۸ پر یروشلم اور ''بیت اللحم'' کا فاصلہ ۸ میل بیان کیا گیا ہے

۹- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج: ۵، ص: ۵۰۴۸

۱۰- افضل، محمد رفیق، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۴۵

۱۲- مریم:۱۹،آیت:۳۰-۳۳

۱۳- پانی پتی،علامہ قاضی محمد ثناء اللہ،تفسیر مظہری،ج:۷،سعید ایچ ایم کمپنی،کراچی،۱۹۷۷ء،ص:۳۰۹

۱۴- مودودی،ابوالاعلیٰ،تفہیم القرآن،ج:۳،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور،بار ہشتم،۱۹۸۸ء،ص:۶۷

۱۵- بخاری،ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل،صحیح بخاری شریف،ج:۲،تعمیر انسانیت،لاہور،بار روم، ۱۹۷۹ء،ص:۲۴۰

۱۶- کرم شاہ،پیر محمد،ضیاء القرآن،ج:۱ ضیاء القرآن پبلیکیشنز،لاہور،بار پنجم ۱۹۷۸ء،ص:۴۲۶،۴۲۷،۴۲۸

۱۷- انجیل یوحنا،باب:۱۷،آیت:۳

۱۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بانگِ درا،کلیاتِ اقبال اردو، غلام علی اینڈ سنز،لاہور،بار سوم ۱۹۹۶ء، ص:۲۶۴/۲۶۴

۱۹- انجیل مقدس متی،باب:۲،آیت:۱۵،۱۶،۲۳

۲۰- سیوہاروی،مولانا محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن اردو،ج:۳-۴حصہ چہارم،ص:۴۸۔ابن کثیر، ابوالفدا ءعمادالدین نے البدایہ والنہایہ،ج:۲،ص۴۲۲ پر ہے کہ حضرت مریمؑ،حضرت عیسیٰؑ کو لیے بارہ سال تک مصر میں ٹھہری رہیں

۲۱- پانی پتی،علامہ قاضی محمد،تفسیر مظہری،ج:۸،سعید ایچ ایم کمپنی،لاہور،۱۹۷۹ء،ص:۱۹۱،۱۹۲

۲۲- بخاری،ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل،صحیح بخاری شریف،ج:۲،ص:۳۰۸

۲۳- حوالہ مذکورہ بالا،جلد۳،مکتبہ تعمیر انسانیت،لاہور،بار دوم ۱۹۷۹ء،ص:۷۰۸

۲۴- حوالہ مذکورہ بالا،ج:۲،ص:۳۰۹

۲۵- ابنِ کثیر،حافظ ابوالفدا ءعمادالدین،البدایہ والنہایہ،ج:۲،ص:۴۲۷

۲۶- قریشی،ڈاکٹر اکبر حسین،مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۶ء،ص:۳۹۷

۲۷- سیوہاروی،محمد حفظ الرحمٰن،قصص القرآن اردو،ج:۳-۴،حصہ چہارم،ص:۶۷

۲۸- مائدہ:۵،آیت:۱۱۰

۲۹- آل عمران:۳،آیت:۴۹

۳۰- منور،پروفیسر محمد،برہان اقبال،اقبال اکادمی،لاہور،۱۹۸۲ء،ص:۷۴،۷۵

۳۱- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل،کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۵۳/۱۶۱

۳۲- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،ضربِ کلیم،کلیاتِ اقبال اردو، ص:۵۲۳/۶۵

۳۳- مائدہ:۵،آیت:۱۱۱

۳۴- الصّف:۶۱،آیت:۱۴

۳۵- انجیل مقدس،متی،باب:۱۳،آیت:۲۱-۲۷،باب:۲۷،آیت ۴۶

۳۶- انجیل مقدس،متی،باب:۲۶،آیت:۵۶

۳۷- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۳-۴، حصہ چہارم، ص:۸۳، ۸۴

۳۸- ابن کثیر، اسماعیل ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابنِ کثیر، ج:۲، پ، ۷، نور محمد کارخانہ کتب آرام باغ، کراچی، سن ندارد، ص ۳۷۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ اقبال، ص:۲۲۹

۳۹- مائدہ:۵، آیت:۱۱۲، ۱۱۷

۴۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۶۹/۷۷

۴۱- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۳-۴، حصہ چہارم، ص ۸۹، ۹۰۔ نیز دیکھیے: ادارہ تصنیف و تالیف، انوارِ انبیاء، ص:۲۲۵

۴۲- انجیل یوحنا، باب:۱۱، آیت:۴۷-۵۱

۴۳- انجیل مرقس، باب:۱۵، آیت:۲-۳۴

۴۴- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۳-۴، حصہ چہارم، ص:۹۷، ۹۸، ۹۹

۴۵- آل عمران:۳، آیت:۵۴

۴۶- آل عمران:۳، آیت:۵۵

۴۷- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۳-۴، حصہ چہارم، ص:۱۰۱

۴۸- امیر علی، مولانا مولوی سید، مواہب الرحمن، ج:۵، ص ۵۰۶۳ پر ہے کہ ملاءِ اعلیٰ پر اُٹھائے جانے سے پہلے کے وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی۔ مصنف البدایہ والنہایہ نے حصہ دوم ص:۴۲۶ پر ۳۳ سال ہی لکھی ہے۔ ایک قول کے مطابق ۱۳۰ سال تھی کیونکہ چالیس سال سے پہلے کسی کو بھی نبوت نہیں ملی۔ لیکن مفتی احمد یار خاں نعیمی، تفسیر نعیمی، ج:۳، ص ۵۰۵ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو نبوت ۳۰ سال ۱۱ ماہ میں ملی۔ تین سال، تین مہینے آپ نے تبلیغ فرمائی پھر آسمان پر تشریف لے گئے۔ المولی، محمد احمد جاد، ابراہیم ابوالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاتہ، السید نے قصص القرآن (عربی) میں ص ۲۵۹ پر نبوت ملنے کی عمر ۳۰ سال لکھی ہے۔ وَلَمَّا بَلَغِ الثلاثین من عمرہ هبط علیه الرُّوح الامین، فکان ذلك بدء الرسالة وفاتحة النبوّہ۔ اور جب وہ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو اُن پر روح الامین اُترے یہ رسالت و نبوت کا آغاز تھا

۴۹- النساء:۴، آیت:۱۵۷، ۱۵۸

۵۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم ۱۹۹۶ء، ص:۸۲/۸۲

۵۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۴۰/۵۲

۵۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۶۴۱/۵۳

۵۳- النساء:۴، آیت:۱۵۹

۵۴- سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن اردو، ج:۳-۴، حصہ چہارم، ص:۱۲۹، ۱۳۰

۵۵- بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، بخاری شریف، ج:۲، ص:۳۰۸، ۳۱۱

۵۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، سید مظفر حسین برنی، مرتب، کلیات مکاتیبِ اقبال، ج:۴، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۸ء، ۱۷۵
۵۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مرتب ابواللیث صدیقی، ملفوظات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۷۲
۵۸- ایضاً، ص:۷۷
۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۶۵۲/۱۶
۶۰- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح جاوید نامہ، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۱۱۹۹
۶۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۰۷/۹۵
۶۲- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح زبورِ عجم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص: ۵۴۷، ۵۴۸
۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۵۴۸/۱۵۶
۶۴- ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال (مرتب)، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مترجم)، شذراتِ فکر اقبال، ص۱۴۳۔
۶۵- ایضاً، ص۱۱۵
۶۶- ایضاً، ص۱۳۰
۶۷- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح رموز بیخودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۱۶۳
۶۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۱۶/۱۱۶
۶۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۹۸/۱۹۸
۷۰- ایضاً
۷۱- ایضاً، ص۲۷۹/۲۷۹

☆☆☆☆

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم

فکرِ اقبال میں اقبال کا بنیادی تصور خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا خودی مطلق ہے۔ جس نے انسان کو اپنی صورت اور خواص پر پیدا کیا۔ خودی اُس وقت تکمیل پاتی ہے جب کوئی انسان یا فرد اپنے اندران خدائی صفات کی تکمیل کرتا ہے۔ جوں جوں کوئی خودی خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کرتی ہے توں توں وہ استحکام کی منزل کو پہنچتی چلی جاتی ہے۔ جو خودیاں خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب نہیں کرتیں وہ ناقص خودیاں استحکام سے محروم ہو کر معدوم ہو جاتی ہیں۔ انسان اللہ کا بندہ ہے۔ اتنی بڑی ہستی کا بندہ ہونا کوئی عام بات نہیں۔ جو فرد اس بات کو جان لیتا ہے زندگی کے تمام حقائق اس پر بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بندۂ خدا ہونے کے سبب اپنے آپ کو عناصر کا حکمران گردانتا ہے۔ خود کو ان کا محکوم نہیں جانتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ جہاں اُس کے لیے بنا ہے نہ کہ وہ جہاں کے لیے۔ اُسے دنیا کی قوتوں کو تسخیر کرنا ہے۔ اُن کے آگے سرنگوں نہیں ہونا۔ وہ اللہ کا تابع فرماں ہے اور اس کائنات کی تمام قوتیں اسی کے تابع ہیں۔ اس کو توحید کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص یا اپنے کسی ہم جنس یا کائنات کی کسی اور شے کے آگے سر جھکاتا ہے۔ کسی شے کو معبود جان لیتا ہے یا خدائی صفات کا حامل جان لیتا ہے تو گویا اس نے اپنے آپ کو اپنے اصلی مقام سے گرا لیا۔ اُس نے نہ توحید کی رمز کو سمجھا اور نہ خودی کو۔ گویا خودی ذات کا عرفان ہے، خود آگاہی ہے، ایمان و یقین کی گہرائی ہے۔ عزم واستقلال، ذوقِ تسخیر اور کائنات کو مسخر کرنے والی شے ہے اور سب سے بڑھ کر توحید کو آشکارا کرنے والی قوت ہے۔[1]

خودی کا سرِّ نہاں لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ[2]

جو فرد خودی کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس کے تابع ہوتی جاتی ہیں۔

گویا خودی اللہ کی اطاعت سے مضبوط اور اللہ کی نافرمانی سے کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جو اللہ کا بندہ بن جاتا ہے اللہ بھی اُس کا ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کی اشیا پر اپنے اصول قربان نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو مقصد نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ وہ جس طرف بڑھتا ہے مانندِ تیغ باطل کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ عشقِ حق میں سراپا حق بن جاتا ہے:

از نگاہِ عشق خارا شق بود
عشقِ حق آخر سراپا بود[۳]

نگاہِ عشق خارا کو شق کر دیتی ہے اور اللہ سے محبت کرنے والا اس کا سراپا بن جاتا ہے۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق!
اُس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحب آفاق![۴]

اس بندۂ مولا صفات یا خدا کی صفاتِ خودی کا کامل اطلاقی ظہور جس واحد شخصیت میں ہوا ہے وہ حضرت محمد ﷺ کی ذات ہے۔ جنھیں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قرآنِ ناطق کہا اور جو معراج کے ذریعہ خودی کے سب سے برتر مرتبے سے شادکام ہوئے۔

اقبال کا ''اسرارِ خودی'' میں مردِ مومن یا فرد مصدقہ کا جو تصور ہے وہ اطلاقی دنیا میں نبی پاک ﷺ ہیں، یعنی حضرت محمد ﷺ کی ذات ہی ''اسرارِ خودی'' میں ایک کامل انسان کے طور پر اقبال کے پیشِ نظر ہے اور اس فرد وحید کے خدا کی ذات سے اتصال کے بعد جب عمرانی دنیا میں اُس کا نزول ہوتا ہے تو وہ ایک عمرانی انقلاب برپا کرتا ہے۔ اُسی کو نمونے کے طور پر اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' میں پیش کیا ہے یعنی نبی پاک ﷺ کی ذات اور صفات کا کامل ظہور ''اسرارِ خودی'' میں ہے اور اُن کی خوبیوں کے عمرانی اور معاشرتی ظہور کا نمونہ ''رموزِ بے خودی'' میں ہے جو نبی پاک ﷺ نے ایک مثالی معاشرہ کی صورت میں مدینہ میں قائم کیا۔ یوں نبی پاک ﷺ کی فردیت اور شخصیت اور اُن کے معاشرتی نظریات ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' میں اقبال کے پیشِ نظر ہیں۔

نبی پاک ﷺ کی نبوت اور رسالت کے ساتھ ساتھ اُن کے شخصی اور عمرانی حاصلات اقبال کی نظر میں نوعِ انسانی کے لیے ہمیشہ سے مشعل راہ ہیں۔ انھی سے اقبال نے وہ اصول و قواعد منضبط کیے ہیں جو آج کے انسان کو روحانی استخلاص اور فوز و فلاح سے بہرہ ور کر سکتے ہیں۔ یہی

اقبال کا پیغمبرِ اسلام سے ایک منفرد تعلق ہے جو اُنھیں اپنی پوری فکر ونظر میں رہنمائی دیتا نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہم رسول پاک ﷺ کی سیرت کے انفرادی اور اجتماعی خواص کو بیان کرتے ہیں کہ آج کے عہد کا انسان کس طرح نوعِ انسان کے لیے اعلیٰ تصورات کا مبدا و منبع بن سکتا ہے اور کس طرح ایسا انسان ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہے۔ اقبال کا یہ تصور نہ یونانی فلسفہ سے اخذ کردہ ہے نہ مغربی فلسفہ سے اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ کسی اور تہذیب و تمدن سے انھوں نے inspiration لی ہے بلکہ اس کا سوتا فکری سطح پر قرآن ہے اور عمل کی سطح پر نبی پاک ﷺ اور اُن کا عمرانی انقلاب ہے جس پر اقبال نے کہا کہ نبی پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی سے دُنیائے قدیم کے ایک عہد کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے بقول اقبال:

> پیغمبرِ اسلام کی حیثیت دُنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سر چشمہٗ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے تازہ سر چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔[۵]

ذیل کے مقالہ میں ہم نبی اکرم ﷺ کو اسی فکر و نظر سے دیکھیں گے اقبال کی نظر میں رسول پاک ﷺ کی ہستی ان گنت بے مثال خصوصیات و صفات کی حامل ہے۔ اس ہستی نے اللہ سے عشق کے ذریعے اپنی خودی کو مستحکم کیا ہے۔ اس ہستی میں صفاتِ حقیقتِ مطلق بہ کمالِ اتم موجود ہیں۔ یہ ہستی دُنیا کے تمام انسانوں سے جدا ہے۔ اس سے عشق عاشقوں کے دلوں کو توانائی عطا کرتا ہے جس کی بدولت عاشقوں کا مرتبہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ آپ ﷺ ہر مومن کے دل میں موجود ہیں۔ آپ ﷺ کے نام سے ہماری آبرو ہے:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسب افزایش از ذاتش ابد[۶]

ترجمہ: حضور ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے حضور ﷺ ہی کے نام سے ہماری آبرو ہے۔

طور آپ ﷺ کے گھر کے غبار کی ایک ہی موج ہے، آپ ﷺ کا حجرہ مبارک کعبہ کے لیے بیت الحرم (حرمت والا گھر) ہے۔

ابد آپ ﷺ کے اوقات کے ایک لمحہ سے بھی کمتر ہے، بلکہ ابد نے آپ ﷺ کی ذات (مستودہ صفات) سے اپنی ابدیت پائی ہے۔

طور آپ ﷺ کے گھر کے غبار کی ایک موج ہے۔ آپ ﷺ کا حجرہ مبارک کعبہ کے لیے حرمت والا گھر ہے۔ ابد آپ ﷺ کے اوقات کے ایک لمحہ سے بھی کمتر ہے۔ بلکہ ابد نے آپ ﷺ کی ذات ہی سے ابدیت پائی ہے۔ یعنی آپ ﷺ زمان و مکان کے حکمران ہیں۔ آپ ﷺ نے وجود تا حیات سادگی اختیار کیے رکھی اور اپنے غلاموں کی تربیت بھی اسی انداز میں فرمائی کہ انھوں نے بھی قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے۔ مشرق و مغرب میں اسلام کا ڈنکا بجا دیا۔ رسول پاک ﷺ کی ذات بابرکات اس قابل ہے کہ اُس سے عشق کیا جائے۔ اس لیے کہ اس ہستی نے اپنی خودی کے ممکنات کو وجود پذیر کر کے اپنی خاکِ پاک کو باعثِ رشکِ افلاک کیا ہے۔ اس ہستی کے ساتھ عشق و محبت سے خودی کمتر نہیں ہوتی بلکہ معشوق کی خودی کا رنگ بھی عاشق پر چڑھ جاتا ہے۔[۷]

سیرتِ رسول پاک ﷺ شاہد ہے کہ آپ ﷺ اکثر غور و فکر، تدبر اور مراقبہ و مجاہدہ کے لیے غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور کئی کئی روز یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو پھر گھر تشریف لے جاتے اور چند روز قیام کے بعد واپس آ کر پھر مراقبہ میں مشغول ہو جاتے۔[۸] بعض اوقات آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمہات المومنین حضرت خدیجہؓ خورد و نوش کا سامان دے آتیں۔ یہیں آپ ﷺ پر پہلی وحی کا نزول ہوا اور آپ ﷺ کو منصب نبوت و رسالت سے نوازا گیا تاکہ آپ ﷺ اُمت کی رہنمائی و ہدایت کا فریضہ سرانجام دیں۔ قرآنِ پاک میں اس ہدایت کا جگہ جگہ ذکر ہے:

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥[۹]

ترجمہ: بیشک اللہ ہی کی بدولت ہدایت ہے اور ہمیں حکم ہے ہم اس کے لیے گردن رکھ دیں جو رب العلمین ہے۔

اقبال کی فکر رسا نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا کہ رسول پاک ﷺ نے شبستانِ حرا میں تنہائی میں بیٹھ کر اپنی خودی کے جوہر کو چمکایا۔ قوم، آئین اور حکومت اسی جوہر کی کرنیں ہیں۔ دین کا جوہر ان معنوں میں عشق یا محبت ہے کہ مردِ مومن تمام افراد اور اشیا سے دلی تعلق پیدا کرتا ہے اور کائنات کی خودیٔ وحدت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دوسروں سے محبت کرنے اور دوسروں کو ہم

ذات سمجھنے ہی سے خودی مستحکم، وسیع اور قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔[۱۰] رسول پاک ﷺ کی اس ریاضتِ شاقہ کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے:

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید[۱۱]

ترجمہ: آپ نے شبستانِ حرا میں خلوت فرمائی۔ قوم، آئین اور حکومت بنائی۔

وہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں:

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید
از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر، جویندہ تر، یابندہ تر[۱۲]

ترجمہ: جناب رسولِ پاک ﷺ نے غارِ حرا میں خلوت اختیار فرمائی اور مدت تک اپنے سوا کسی اور کو نہ دیکھا کم آمیزی سے قلب کے اندر زندگی، جستجو اور یافت بڑھتی ہے۔

رسول پاک ﷺ کے دل میں جب ملت کی تخلیق کے جذبہ نے جنم لیا تو آپ ﷺ نے خلوت اختیار فرمائی۔ آپ نے تین سال سے زائد عرصہ تک غارِ حرا میں اپنے علاوہ کسی کو نہ دیکھا۔ یعنی آپ ﷺ جلوت (عوام سے اختلاط) سے مجتنب رہے۔ اقبال نے اس مثال کے ذریعے بتایا ہے کہ کم آمیزی سے انسان کے تخیل میں بہت زیادہ طاقت اور تخلیق کی قوت جنم لیتی ہے۔

اقبال کا مقصد اور مسلک یقیناً زندگی سے فرار اور عالم کو شر سمجھ کر اسے ترک کر دینا نہیں ہے۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خودی یا حقیقت کے انکشاف اور دنیا کو درست انداز سے دیکھنے کی نظر پیدا کرنے کے لیے قوتوں کو اکھٹا کیا جائے۔ خلوت ہمیشہ کے لیے نہیں منتخب کی جاتی اور کم کھانے وغیرہ کا مقصد بھی آغاز میں جمیت خیال اور یکسوئی کا حصول ہے۔ اقبال نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:[۱۳]

گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست
خلوت آغازست و جلوت انتہاست[۱۴]

ترجمہ: اگرچہ اللہ تعالیٰ خلوت اور جلوت دونوں میں ہے مگر خلوت آغاز ہے اور جلوت انتہا ہے۔

جب خلوت میں بھی اللہ ہی ظاہر ہے تو اس کے ترک کرنے کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے۔ البتہ

جلوت میں مشاہدہ کرنے والی نظر کو جنم دینے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے شروع میں جلوت ضروری ہوتی ہے۔

پھر اقبال کہتے ہیں:

اند کے اندر حرائے دل نشیں
ترکِ خود کن سوے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن!
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق
جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق [۱۵]

ترجمہ: تھوڑی دیر کے لیے اپنے دل کے غارِ حرا میں خلوت اختیار کر، اپنے آپ کو چھوڑ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر۔

پھر اللہ تعالیٰ کی محبت سے محکم ہو کر اپنی طرف واپس آ اور ہوس کے بتوں (لات و عزیٰ) کا سر توڑ دے۔

عشق کی قوت سے لشکر تیار کر اور عشق کے فاران کی چوٹی پر جلوہ گر ہو۔

کچھ دیر کے لیے دل کے غارِ حرا میں بیٹھ جا۔ اپنے آپ کو چھوڑ کر حق کی طرف ہجرت کر۔

ان تین اشعار میں اقبال نے رسول پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

رسول پاک ﷺ نے اپنی ذات کو اللہ کی محبت میں مکمل طور پر فنا کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مقام محبوبیت عطا فرما دیا اور آپ ﷺ کی مرضی اللہ کی مرضی ہو گئی۔ [۱۶]

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ص [۱۷]

ترجمہ: البتہ پھیریں گے تجھ کو قبلہ کی جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے۔

آپ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن گیا:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ج [۱۸]

ترجمہ: اللہ کا ہاتھ ہے اوپر اُن کے ہاتھ کے۔

جن مومنوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ان کے ہاتھ پر آپ ﷺ کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اللہ کا ہاتھ تھا اور آپ ﷺ کا فعل اللہ کا فعل بن گیا۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى [۱۹]

ترجمہ: اور جنگ بدر میں آپ ﷺ نے کنکریاں پھینکیں تو وہ آپ ﷺ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔

اقبال اسے خودی کا استحکام قرار دیتے ہیں اور جب خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو:

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود[20]
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دونیم
رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم[21]

ترجمہ: اس کا پنجہ حق کا پنجہ بن جاتا ہے اور اُس کی انگلی سے چاند دوٹکڑے ہو جاتا ہے وہ ذات جس نے چاند کو دوٹکڑے کیا۔ اُس کی رحمت عمومی ہے اور اُس کا اخلاق عظیم ہے۔

اقبال نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مضبوط، مستحکم خودی زمین پر اور اہلِ زمین پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی اس کی حدیں بہت وسیع ہیں۔ یہ اہلِ افلاک پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ چاند کو دو ٹکڑے کرنا اُس کا معمولی کارنامہ قرار پاتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کار ساز[22]

رسول ﷺ شب بیدار تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک رات آپ ﷺ نے نماز کی نیت باندھ لی اور رونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ سینۂ مبارک آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ پھر رکوع اور سجدہ میں روتے رہے۔ غرض کہ صبح تک یہی کیفیت رہی۔ حتیٰ کہ بلالؓ صبح کی نماز کے لیے بلانے آ گئے[23] آپ ؐ کی زندگی از ولادت تا وصال شجاعت، بہادری اور بے خوفی کی امثال سے پُر ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب غزوۂ بدر میں زدگان (لڑائی) پڑا تو ہم سب لوگوں نے آپ ﷺ کی آڑ میں آ کر پناہ لی۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ ﷺ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ حنین میں رسول پاک ﷺ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ ہم لوگ سخت جنگ میں آپ ﷺ کے پہلو میں آ کر پناہ لیتے تھے۔ ہم میں سب سے بڑا وہ گنا جاتا تھا جو آپ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔

اقبال آپ ﷺ کے ان اوصاف کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی تلوار جنگ میں آہن گداز اور خارا شگاف تھی۔ تاہم اس بہادری اور اولوالعزمی و بلند ہمت کے باوجود جب اللہ تعالیٰ کے حضور نماز میں منہمک ہوتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہوتیں۔ جب

کبھی ہنگامۂ کارزار ہوتا تو آپ ﷺ بے حد خشوع وخضوع اور اطمینانِ قلب سے دعا فرماتے اور اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے۔ اقبال کے نزدیک جنگ کے وقت آپ ﷺ کی آہن گداز تلوار دُشمن کو شکست دینے اور اُمت کو دنیاوی وجاہت دلانے کا باعث تھی۔ جبکہ نماز میں آپ ﷺ کی اشک باری امت کے گناہوں کو دھونے کا سبب بن گئی۔[۲۴]

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعاے نصرت آمین تیغِ او
قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او[۲۵]

ترجمہ: جنگ کے دوران آپ ﷺ کی تلوار لوہے کو بآسانی کاٹ کے رکھ دیتی ناز کے دوران آنجناب ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔

نصرت کی دعا کے ساتھ آمین کہتے ہی آپ ﷺ اپنی تلوار میان سے باہر نکال لیتے (صرف دعا پر اکتفا نہ فرماتے) (چنانچہ) آنجناب ﷺ کی تلوار نے پادشاہت کا سلسلہ ختم کر دیا۔

یعنی رسول پاک ﷺ جب بھی فتح ونصرت کے لیے دعا فرماتے تو آپ ﷺ کی تلوار امین کا فعل سرانجام دیتی تھی۔ دوسرا وصف آپ ﷺ کی تلوار کا یہ ہے اُس تلوار نے دُنیا سے سلاطین کی نسل کو ختم کر دیا۔ اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے یوسف سلیم چشتی رقم طراز ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو دین آپ ﷺ نے دُنیا کو عطا فرمایا۔ اُس کی تعلیم یہ ہے کہ دُنیا میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ کوئی انسان دوسروں پر حکمرانی نہیں کرسکتا۔[۲۶]

رسول پاک انسانی تفریق کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی نظر میں امیر وغریب، صغیر وکبیر، آقا وغلام سب برابر تھے۔[۲۷] امارت وغربت کی بنا پر امتیاز نہ برتتے تھے۔[۲۸] حتیٰ کہ آپ ﷺ کو اپنے لیے بھی امتیاز ناپسند تھا۔ اپنے لیے کوئی خاص جگہ مخصوص نہ کرنے دیتے تھے۔[۲۹] اقبال نے آپ ﷺ کے اس وصف کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بریک خواں نشست[۳۰]

ترجمہ: آپ ﷺ کی نگاہ میں پست و بالا ایک درجہ رکھتے تھے (عزت کی بنیاد صرف تقویٰ تھا)۔ چنانچہ آپ ﷺ غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

رسول پاک ﷺ مخلوقِ خدا پر شفقت و رحمت فرماتے تھے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تعریف یوں بیان فرمائی ہے۔

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِیْمٌ[۳۱]

ترجمہ: بے شک تمھارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمھارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمھاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان، مہربان۔

ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَo[۳۲]

اور ہم نے تمھیں سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مہربانی اور رحم کرنا آپ ﷺ کے مخصوص اوصاف و فضائل میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو نام عطا فرمائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا محبوب ایمان والوں پر رؤف اور رحیم ہے۔ امت پر آپ ﷺ کس درجہ مہربان تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ قریش نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور پیغامِ الٰہی کو قبول کرنے سے انکار کیا تو جبرائیلؑ نے رسول پاک ﷺ کے حضور حاضر ہو کر عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے قوم کی طرف سے آپ ﷺ کو دیا جانے والا جواب سُن لیا ہے۔ پروردگار عالم نے پہاڑوں کے نگران فرشتے کو بھیجا ہے۔ یہ آپ ﷺ کی طرف سے جاری ہونے والے حکم کی تعمیل کرے گا۔ ملکِ جبال نے حاضر ہو کر عرض کیا اگر حکم ہو تو تعمیل ارشاد میں پہاڑ کو اُٹھا کر قریش کے ان کفار پر رکھ دوں۔ یہ سُن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان نسلوں میں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور صرف اُسی کی عبادت کریں گے۔ میں اس کے متعلق پُر امید ہوں[۳۳]

آپ ﷺ کا یہ رحم صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا بلکہ غیر مسلموں پر بھی یوں ہی رحمت و شفقت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا رحیم ہونا ایک حقیقت ہے جس کا انکشاف خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ سچائی کا ایک خزانہ ہے جس کی بشارت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔[۳۴]

رسول پاک ﷺ مسلسل تیرہ سال مکہ میں تبلیغ کرتے رہے لیکن چند سو سے زیادہ لوگ مسلمان نہ ہوئے۔[۳۵] مشرکین مکہ کے ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے قتل کے ناپاک منصوبے بنا لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم

دیا۔ آپ ﷺ چونکہ ''امین'' تھے۔ اس لیے آپ ﷺ کے پاس لوگوں کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے وہ سب امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کیں تا کہ وہ لوگوں کو واپس کر دیں۔ مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے گردونواح کے قبائل سے معاہدے کیے۔ قریشِ مکہ نے اپنی سازشیں ختم نہ کیں۔ وہ مسلسل حملے کرتے رہے اور کئی طے شدہ معاہدے توڑ ڈالے۔ مجبوراً رسول پاک ﷺ نے ۸ ھ میں مسلمانوں کے ہمراہ ماہِ رمضان میں مکہ پر فوج کشی کی۔ وجہ یہ ہوئی کہ ۶ ھ میں جو معاہدہ قریش نے رسول پاک ﷺ سے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔ اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ دس سال تک جنگ نہ ہوگی۔ اس شرط میں جو قومیں رسول پاک ﷺ کی طرف ملنا چاہیں وہ اِدھر شامل ہو جائیں اور جو قومیں قریش سے ملنا چاہیں وہ اُدھر ہو جائیں۔ اس معاہدہ کے مطابق بنی خزاعہ رسول پاک ﷺ کی طرف سے چلے گئے اور بنو بکر قریش سے مل گئے۔ اس معاہدہ کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ بنو بکر نے قریش کی مدد سے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور انھیں بے دریغ تہ تیغ کیا۔ انھوں نے کعبہ میں بھی پناہ لی۔ خدا کے واسطے دے کر رحم کی درخواست کرتے رہے لیکن وہ نہ مانے اور جواباً کہا لَا اِلٰہَ اَلْیَوْمَ، بچے کچھے چالیس مظلوم جان بچا کر رسولِ پاک ﷺ کے پاس پہنچے اور تمام واقعات گوش گزار کیے۔ معاہدے کی پابندی، مظلوم فریق کی دادرسی اور دوست قبائل کی حفاظت کی غرض سے دس ہزار افراد کے ہمراہ مکہ کی جانب چلے۔ راستے میں آپ ﷺ کو ابوسفیان بن الحارث اور عبداللہ بن ابوامیہ ملے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے آپ ﷺ کو سخت ایذائیں دی تھیں اور اسلام کو مٹانے میں سخت کوششیں کی تھیں۔ آپ ﷺ نے انھیں دیکھ کر اپنا رخ مبارک موڑ لیا۔ ام المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ نے عرض کی کہ یہ چچا زاد اور پھوپھی زاد ہیں، قریبی ہیں۔ انھیں رحمت سے محروم نہ فرمائیں۔ پھر ان دونوں اصحاب نے حضرت علیؓ کے کہنے پر آپ ﷺ کے حضور جا کر معافی کے لیے یہ آیت پڑھی۔[۳۶]

تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ o[۳۷]

ترجمہ: قسم اللہ کی البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تھے چوکنے والے۔

تو رسول پاک ﷺ نے جواب میں فرمایا:

لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ط یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ[۳۸]

ترجمہ: کچھ الزام نہیں تم پر آج بخشے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے مہربان۔

رسول پاک ﷺ نے اپنے ذاتی دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ مکہ فتح کرنے کے بعد رسول

پاک ﷺ نے گردن زنی اور قتل کے قابل لوگوں کی جماعت کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

اے جماعت قریش! خدا نے تمھاری جاہلانہ نخوت اور آباؤ اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا۔ (سچ تو یہ ہے) کہ لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور گوت قبیلے سب پہچان کے لیے بنا دیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اُس کی زیادہ عزت ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہے۔

پھر فرمایا: اذھبوا فانتم الطقاء لا تثریب علیکم الیوم

ترجمہ: جاؤ تم آزاد ہو اور تم پر آج کوئی مواخذہ نہیں۔[۳۹]

اقبال نے آپ ﷺ کے اس ذاتی وصف کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

آں کہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغام لا تثریب داد[۴۰]

ترجمہ: وہ (حضرت محمد ﷺ) ذات جنھوں نے دشمنوں پر بھی رحمت کی اور تمام اہل مکہ کو لا تثریب کا پیغام دیا۔

آپ ﷺ نے اس خطاب میں بتا دیا کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک متقی اور پرہیز گار کی عزت ہے۔ نہ کہ اعلیٰ حسب نسب رکھنے والے کی اقبال اس وصف کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت
چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست[۴۱]

ترجمہ: حضور اکرم ﷺ نے نسلی امتیازات (مفاد) کو یکسر جلا دیا۔ حضور آنجناب ﷺ نے ان خس و خاشاک سے باغ دنیا کو پاک کر دیا۔

گل صد برگ کی مانند ہماری خوشبو ایک ہی ہے۔ نظام اسلام کی جان حضور اکرم ﷺ اور آپؐ ایک ہیں۔

اقبال کے نزدیک رسولِ پاک ﷺ ایک ایسے انسانِ کامل ہیں جن کی پیروی عام انسان کو مثالی انسان بنا کر اس کے سر پر ابدیت کا تاج سجا دیتی ہے مثلاً حضرت بلال حبشیؓ کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے[۴۲]

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟[۴۳]

۹ ھ میں یمن کے قبیلہ بنی طے نے بغاوت کر دی اس وقت اس علاقہ کے حاکم حضرت علیؓ تھے۔ انھوں نے فسادیوں کو گرفتار کروا کر مدینہ منورہ بھیج دیا۔ ان میں مشہور سخی عدی بن حاتم طائی کی بیٹی تھی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یوں عرض کیا۔

''میں سردار قوم کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ رحم و کرم میں مشہور تھا۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا کرتا، غریبوں پر رحم کرتا۔ وہ مر گیا۔ بھائی شکست کھا کر بھاگ گیا۔ آپ مجھ پر رحم کریں۔''

یہ سن کر رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

''تیرے باپ میں مومنوں جیسی صفات تھیں۔''

اس کے بعد اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا اور زادِ راہ اور لباس بھی عطا فرمایا۔[۴۴]

اقبال نے رسول پاک ﷺ کی اس رحمت و شفقت کا ذکر کیا ہے۔ آپ ﷺ کے حضور عرض گزار ہوئے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے امتی قبیلہ طے کی اس بی بی سے زیادہ برہنہ ہیں۔ اقوام عالم کے مقابلہ میں بے ساز و سامان ہیں۔ اس بے چارگی کے عالم میں ہماری تمام امیدیں آپ ﷺ سے وابستہ ہیں۔ روزِ محشر آپ ہی ہماری پردہ داری کریں گے اور ہماری عزت و آبرو رکھیں گے۔ آپ ﷺ کا لطف و قہر سب رحمت ہی رحمت ہے:

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر
دخترِ سردار طے آمد اسیر
پائے در زنجیر وہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک راچوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوام جہاں بے چادریم
روز محشر اعتبار ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لطف و قہر او سراپا رحمتے
آں بیاراں ایں باعدا رحمتے[۴۵]

ترجمہ: جنگ کے دوران اس بلند مرتبت شخصیت ؐ کے سامنے حاتم طائی کی بیٹی قیدی بن کر پیش ہوئی۔
اس کے پاؤں میں زنجیر تھی۔ وہ باپردہ لباس نہ ہونے کے باعث شرم وحیا سے گردن جھکائے تھی۔
حضور اکرم ﷺ نے جب اس لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو اپنی چادر سے اس کا سر ڈھانپ دیا۔
ہم (اس دور کے مسلمان) قبیلہ طے کی اس خاتون سے زیادہ عریاں ہیں۔ اقوامِ دنیا کے سامنے ہم بھی (عزت واحترام کی) چادر کے بغیر ہیں۔
روز قیامت آپ ﷺ ہی (کی شفاعت) پر ہمارا بھروسا ہے، اس دنیا میں بھی آپ ﷺ ہی ہمارے عیب ڈھانپنے والے ہیں۔
حضور ﷺ کا لطف وکرم اور قہر دونوں سراپا رحمت ہیں، لطف دوستوں کے لیے رحمت ہے اور قہر دشمنوں کے لیے (انھیں برائی اور گناہ سے بچاتا ہے)۔

رسول پاک ﷺ جب تبلیغ عالم کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔ اس زمانہ میں تمام عالم پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا۔ بنی اسرائیل کی حالت دگرگوں تھی۔ تبلیغ مسیح کی مسخ شدہ تعلیمات میں آدمیت کی تربیت کے لیے کچھ نہ تھا۔ یورپ کی حالت بھی خراب تھی۔ وہ زمانے کے اثر سے بت پرست بن چکے تھے۔ انگلستان برئن اور سیکسن وحشی قوموں کے قبضہ میں تھا۔ نارتھمبر، مڈلینڈ، کون ٹیز، نارفوک، سوفوک، ساسکس، ورڈن بت کی پوجا ہوتی تھی۔ فرانس، برن ہلڈ، سگ فرٹ، فرے دی گوئن دی ہل ہیرک وغیرہ میں پادریوں کے ایما پر بے ہودگیاں جاری تھیں۔ فرانسیسیوں اور سیکسن قوم میں ہر وقت لڑائی جاری رہتی تھی۔ ایران پر مزدکیہ کا زور تھا۔ جنھوں نے زن، زر اور زمین کو وقفِ عام کر رکھا تھا۔ اخلاقی اور انسانی ترقی ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ ہندوستانیوں میں پرانوں کے زمانہ کا آغاز تھا۔ اور بام مارگی فرقے کا غلبہ تھا۔ وہ مندروں میں برہنہ مرد و زن کی تصاویر لگا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ عبادت خانوں میں ایسی فحش تصاویر بنائی جاتیں کہ جن کا تصور ایک مہذب آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ چینی اپنے ملک کو اللہ کے بیٹے کی بادشاہت جان کر اللہ کو بھلا بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہر کام کے جدا جدا بت بنا رکھے تھے۔ مصر میں عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ عیسائیت کے مختلف فرقے بنے ہوئے تھے جو مخالفین کو آگ میں جلانے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ یہ تو ان ممالک کی حالت ہے جہاں

بادشاہتیں اور شریعتیں تھیں، لیکن عرب ایک ایسا ملک تھا جہاں صدیوں سے کوئی بادشاہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی قانون۔ ایسے میں رسول پاک ﷺ کو اس بے علم، جاہل قوم کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا گیا اور آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اصلاحِ عالم کا آغاز کیا اور اسلام کی تبلیغ شروع کی اور چند سالوں میں ان عربوں کی کایا پلٹ دی۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ پاک صاف رہیں۔ لباس کو میل کچیل سے اور زبان کو گندی گفتگو سے، قلب کو جھوٹے اعتقادوں سے پاک رکھیں، وعدہ کی پابندی کریں۔ لین دین میں دھوکہ نہ کریں۔ اللہ کی ذات کو نقائص سے پاک سمجھیں۔ کائنات اور اُس کی تمام اشیا اللہ نے پیدا کی ہیں۔ اس لیے سبھی اس کے محتاج ہیں۔ دعائیں قبول کرنا، بیمار کو صحت و تندرستی دینا، مرادیں پوری کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر فرشتے اور نبی بھی کچھ نہیں کر سکتے۔[۴۶]

اقبال آپ ﷺ کے اس ذاتی وصف کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد[۴۷]

ترجمہ: آپ ﷺ نے دنیا میں نیا آئین رائج فرمایا، اقوامِ قدیم ایران و روما کی (بالادستی کی) مسندیں لپیٹ دیں۔ آپ ﷺ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔

رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ الفقر فخری (فقر میرا فخر ہے)

حضرت جنید بغدادی کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا کو فنا کر دینا، غیر اللہ سے اپنے قلب کو فارغ کر لینا، جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر قناعت کرنا اور اللہ کے راستے میں ریاضت کرنا یعنی مشقتیں سہنے کا نام فقر ہے۔[۴۸]

رسول پاک ﷺ نے تمام عمر دولت اکٹھی نہ کی جو کچھ آپ ﷺ کے پاس آتا محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک ایک ماہ تک گھر میں آگ نہ جلتی،[۴۹] فتح خیبر اور کئی دیگر علاقوں کی فتح کے بعد مسلمانوں کی حالت بہتر ہوگئی لیکن رسول پاک ﷺ نے اُسی حالت کو پسند فرمایا۔ جو کچھ ملتا تقسیم کر دیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے نہ ملتا تو صبر کرتے اور روزہ رکھتے۔[۵۰]

اقبال رسول پاک ﷺ کی ہستی پاک کو انفاس عفو کی منزل پر فائز دیکھتے ہیں۔ شخصی یا ذاتی ملکیت کے تصورات کا سیرت پاک میں شائبہ تک موجود نہیں۔ دوسروں کو نصابِ زکوٰۃ کا درس دینے والی ہستی اسلامی حکومت کا سربراہ ہونے کے باوجود پوری زندگی اس قابل نہیں ہو پاتی کہ خود صاحبِ نصاب بن جائے۔ یہی اس ہستی کی اور اس کے پالنے والے کی پسندیدہ صورت ہے۔ یہی رسول پاک ﷺ کا مقصود ہے جسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام پیروکاروں میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ منزل ''قل العفو'' ہے جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے۔[۵۱]

جو حرفِ قُلِ العَفوُ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار![۵۲]

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ایک دن رسول پاک ﷺ خرما کے بوریے پر سو کر اٹھے تو بدن پر چٹائی کے نشان ظاہر ہو گئے۔ صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی اجازت سے آپ کے لیے گدا بنوا دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ایسی آسائشوں سے کیا مطلب! دنیا میں میری زندگی بسر کرنے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی سوار جو ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق فرماتے ہیں ایلا کے زمانہ میں میں گھبرا کر رسول پاک ﷺ سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ایک تہ بند باندھے برگِ خرما سے بنی ایک کھردری چارپائی پر لیٹے ہیں اور بوریا کے نشان آپ ﷺ کے پہلوئے مبارک پر نمایاں ہیں۔ سرہانا بھی خرما کی چھال کا ہے۔ رسول پاک ﷺ کے خزانہ میں ایک مٹھی بھر جو، تین کھالوں اور سلم کے پتوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ یہ سب دیکھ کر رونے لگے۔ رسول پاک ﷺ نے دریافت کیا تو عرض کی کیوں نہ روؤں بوریا کے نشان آپ ﷺ کے پہلوئے مبارک پر ہیں اور یہ آپ ﷺ کا خزانہ ہے۔ قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے اُڑائیں اور اللہ کے رسول ﷺ اس حال میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ آخرت ہمارے واسطے اور دنیا ان کے لیے ہو۔ اقبال آپ ﷺ کے اس ذاتی وصف کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:[۵۳]

بوریا ممنونِ خواب راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش[۵۴]

ترجمہ: آپ ﷺ خوابِ راحت کے لیے بوریا کو ممنون فرماتے۔ (دوسری طرف) آپ ﷺ نے کسریٰ کا

تاج پاؤں تلے روند ڈالا۔

قرآن جس فقر کی تلقین کرتا ہے، وہ مست ہو کر ناچنے گانے کا نام نہیں بلکہ ہر لمحہ زندگی کا احتساب کرنے کا نام ہے۔ رسول پاک ﷺ کی زندگی اس فقر کا نمونہ ہے۔

ایک رات مدینہ کے لوگ شور کی وجہ سے ڈر گئے۔ آپ ﷺ حضرت ابوطلحہؓ کے سست رفتار اور سرکش گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر چلے گئے اور پتہ کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ صحابہ کرام کو آواز کی طرف جاتے پایا۔ آپ ﷺ نے اُنھیں تسلی دی اور گھوڑے کی نسبت فرمایا بہت تیز رفتار ہے۔[۵۵] یعنی آپ ﷺ اردگرد کے حالات پر نظر رکھتے تھے اور جہاں بھی کوئی فتنہ سر اٹھاتا اس کا قلعہ قمع کر دیتے تھے۔ گویا فقر مردہ دلی کا اور زندگی سے فرار کا نام نہیں بلکہ زندگی کی سختیوں کو ذوق و شوق سے سہنے اور اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکانے کا نام ہے اور یہی وصفِ خاص رسول پاک ﷺ کی متاع ہے:[۵۶]

فقرِ ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیؐ ست
گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دم او گرمیِ صد انجمن[۵۷]

ترجمہ: فقر ذوق وتسلیم ورضا کا نام ہے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی متاع ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔
اگرچہ فقیر بزم میں کم بات کرتا ہے مگر اس کی ایک بات سینکڑوں انجمنوں کو گرما دیتی ہے۔

فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ[۵۸]

ترجمہ: فقر عریاں غزواتِ بدر وحنین کی گرمی ہے۔ فقرِ عریاں حضرت حسینؓ کی تکبیر کی آواز ہے۔

فقر ذوق وشوق اور تسلیم ورضا کا نام ہے۔ یہ نبی پاک ﷺ کا سرمایہ ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ اگرچہ محفل میں فقیر کم گو ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے ایک سانس سے سینکڑوں محفلوں کو گرمی میسر آتی ہے۔ فقر جب ظاہر ہوتا ہے تو بدر وحنین کی گرمی اور امام حسینؓ کی زبان سے نکلتی ہوئی ’’اللہ اکبر‘‘ کی آواز بن جاتا ہے۔ اقبال رسول پاک ﷺ کی اسی صفت کو امت کے افراد میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس لیے کہ حاملِ فقر اپنی ذات میں بادشاہ بن جاتا ہے۔ وہ بادشاہوں کی شان وشوکت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی نگاہ بلند سے بلند تر مقاصد پر مرکوز رہتی

ہے۔ اس لیے سریر و سلطنت اُسے کمتر نظر آتے ہیں۔ بادشاہ کے برعکس فقیر ایسی گدائی کا طلب گار ہوتا ہے جو زر و جواہرات کو بے وقعت سمجھتی ہے۔ چونکہ یہ اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کا سینہ نور ایمان سے روشن ہوتا ہے۔ اس لیے دُنیا کی کوئی شے اس کی نگاہوں میں نہیں جچتی۔ بقول اقبال:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے[۵۹]

محمد معصوم عابدی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اقبال اپنے تصور عشق و فقر کے ذریعے انسان کو بے نیازی کی دولت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے اور یہ سرفرازی ایسی ہے کہ جس کے سامنے کج کلایانِ وقت کی سروری، شان و شوکت، جاہ و جلال اور مال و منال کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔[۶۰]

اسی بنیاد پر اقبال فقرِ رسولِ پاک ﷺ کی مدح سرائی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را[۶۱]

اپنے مقصد کی سچائی پر پختہ عزم انسان کو عمل پر اُبھارتا ہے اور مقصد میں کامیابی کی امید کی وجہ ہی سے انسان مختلف النوع مصائب و مشکلات سہنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ○[۶۲]

ترجمہ: ناامید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

امید اور یقین محکم کامیابی کی کنجی اور زندگی کی مشکلات کو آسان بنانے اور خودی کے استحکام کا ذریعہ ہیں جبکہ ناامیدی، خوف اور غم خودی کے زوال اور زندگی کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی فرد کے ناامید ہونے کا مطلب ہے کہ اس کا اللہ پر پختہ یقین نہیں ہے۔[۶۳] یاس و ناامیدی کے علاوہ غم بھی انسان کی قوتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ سینے سے حرارتِ ایمانی کا خاتمہ کرتا ہے۔ انسان کی کام کرنے کی قوت شل ہو جاتی ہے۔ وہ بظاہر زندہ لیکن روحانی طور پر مردہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہی انسان کو غم سے آزاد کر کے عمل پر آمادہ کرتا ہے۔

رسولِ پاک ﷺ نے جب اعلانِ حق کیا تو قریش نے آپ ﷺ کی سخت مخالفت کی۔ جب آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی آپ کا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے اُن سے یوں فرمایا:

''چچا جان! اللہ کی قسم! اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ میں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں

رکھ دیں تا کہ میں اس کام کو چھوڑوں، تب بھی اس کام کو نہ چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ خدا اسے غالب کر دے یا میں خود اس میں ہلاک ہو جاؤں۔"[۶۴]

مشرکین مکہ نے حضور پاک ﷺ کے قتل کے ناپاک منصوبے بنانے شروع کیے اور ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو اللہ تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا۔ رسول پاک ﷺ نے ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تین رات غار ثور میں قیام فرمایا۔ کفار آپ ﷺ کو تلاش کرتے کرتے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمگین ہوئے اور آپ سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ انھوں نے اپنے قدم پر نظر ڈال لی تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا غم نہ کریں اللہ ہماری ساتھ ہے۔

یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق کے دل کو اطمینان ہو گیا اور آپ غم سے آزاد ہو گئے۔[۶۵]

اقبال نے رسول پاک ﷺ کے ایمانِ محکم کے اس وصف کی طرف اشارہ کیا ہے اور اُمت مسلمہ کو آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا ہے کہ غم نہ کرنے کی تعلیم حاصل کرو۔ اللہ پر پختہ یقین رکھو۔ کم و بیش کے خیال سے خود کو آزاد کر لو۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لا تحزن بگیر
از رضا مسلم مثالِ کوکب است
در رہِ ہستی تبسم بر لب است
گر خدا داری زغم آزاد شو!
از خیالِ بیش و کم آزاد شو[۶۶]

ترجمہ: اے وہ شخص جو غم کے قید خانے میں اسیر ہے جناب رسول پاکؐ کے ارشاد لاتحزن (غم نہ کھا) سے سبق حاصل کر۔

راضی برضا رہنے سے مسلمان ستارے کی مانند راہِ حیات میں ہمیشہ متبسم رہتا ہے۔

اگر اللہ پر ایمان ہے تو ہر طرح کے غم اور نفع و نقصان کے خیال سے آزاد ہو جا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ کے پاس بحرین سے بہت زیادہ مال آیا۔ آپ ﷺ جب اس کو تقسیم کرنے بیٹھے تو آپؐ کے چچا عباسؓ بھی آ کر مال کے طلب گار ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لے لو۔ حضرت عباسؓ دونوں ہاتھوں سے اپنے کپڑے میں ڈال لیا لیکن اُٹھا نہ سکے تو رسول پاک ﷺ سے فرمایا کہ کسی سے کہیں کہ اُٹھا کر مجھ پر رکھ دے۔ آپ ﷺ نے

فرمایا میں کسی کو اٹھانے کو نہیں کہتا۔ پھر کہنے لگے کہ خود اُٹھا کر مجھ پر رکھ دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں خود بھی نہیں اُٹھاتا۔ اُس نے پھر ایک مرتبہ کہا کہ کسی سے کہہ کر مال اُٹھوا دیں لیکن رسول پاک ﷺ نے انکار فرمایا، حتیٰ کہ حضرت عباسؓ نے مال کو کافی کم کیا اور خود ہی اُٹھا کر چلے گئے۔[۶۷]

آپ ﷺ سوال کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ارشاد فرماتے اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر لائے اور بیچ کر اپنی عزت و آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے لوگوں سے سوال کرے۔

صحیح بخاری میں ہے:

حکیم بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے۔ رسول پاک ﷺ سے طلب کیا۔ آپ ﷺ نے عطا فرمایا پھر دوسری مرتبہ مانگا، عطا فرمایا۔ تیسری مرتبہ مانگنے پر فرمایا ''اے حکیم یہ دولت سبز و شیریں ہے جو استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے۔ اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرتا ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے۔[۶۸]

اقبال اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

فطرتے کو بر فلک بند و نظر
پست میگردد ز احسانِ دگر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخلِ سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدیہ گر نادار تر[۶۹]

ترجمہ: وہ فطرت جو آسمان پر نظر رکھتی ہے دوسرے کے احسان سے پست ہو جاتی ہے۔
سوال کرنے سے خودی کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور خودی کا نخل سینا تجلی سے محروم ہو جاتا ہے۔
سوال سے مفلسی اور ذلیل ہو جاتی ہے، گدائی سے گداگر نادار ہو جاتا ہے۔

رسول پاک ﷺ کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے دین حق کو غالب کرنے کا فریضہ لگا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی و جسمانی قوت و طاقت سے نوازا تھا۔ تاکہ آپ ﷺ کو کسی مرحلہ پر ہزیمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایک مرتبہ حضور پاک ﷺ سے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ نے مطالبہ کیا کہ اگر آپ ﷺ اسے کشتی میں شکست دے دیں تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ آپ ﷺ

نے فوراً دو مرتبہ اُسے پچھاڑ دیا۔ رکانہ فتح مکہ میں ایمان لائے۔ ایسے ہی آپ ﷺ نے طاقتور ابوالاسود جمجی کو بھی پچھاڑا لیکن وہ ہارنے کے باوجود ایمان نہ لایا۔[۷۰]

مسلمان مدینہ سے عمرہ کے لیے مکہ آئے۔ کفار نے مسلمانوں کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھ کر کہا کہ مسلمان مدینہ جا کر کمزور ہو گئے ہیں۔ تب رسول پاک ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں دایاں بازو ننگا کر کے اکڑ اکڑ کر چلیں اور بھاگ بھاگ کر چکر لگائیں تا کہ کفار کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور انھیں پتہ چل جائے کہ مسلمان اپنے اندر جان رکھتے ہیں۔[۷۱]

ترا یک نکتۂ سَربستہ گویم
اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری، گر بہ تن جانے نہ داری
وگر جانے بہ تن داری، نمیری[۷۲]

ترجمہ: اگر تو زندگی کا سبق مجھ سے حاصل کرے تو میں تجھ کو راز کی ایک بات بتاتا ہوں اگر تو جسم میں قوت نہیں رکھتا تو تو مر جاتا ہے اگر تیرے جسم میں جان (قوت) ہو تو تو نہیں مرتا:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات![۷۳]

اقبال کہتے ہیں کہ ہمت و جرأت کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔ دُنیا میں بزدل اور کم ہمت کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ جہاں جرأت کی ضرورت ہو وہاں دولت و اسلحہ کام نہیں آ سکتا۔ ہمت اور دلیری ہو تو ان کے بغیر بھی بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔ کوئی امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا وزیر جرأت کے بغیر کوئی بڑا اور اہم کارنامہ نہیں دکھا سکتا:[۷۴]

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ![۷۵]

اقبال نے رسول پاک ﷺ کی سیرتِ پاک سے امثال پیش کی ہیں اور اُمّتِ مسلمہ کے افراد کو سبق دیا ہے کہ وہ مردِ کامل بننے کے لیے ان تمام صفات کو اپنی ذات کا حصہ بنائیں۔ کلامِ اقبال کا جائزہ لیں تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال مردِ کامل یا مرد مومن میں جن صفات کو دیکھنا چاہتے ہیں یہ وہی صفات ہیں جو رسول پاک ﷺ کی ذات کا حصہ ہیں۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر رقم طراز ہیں:

رسول اکرم ﷺ کی ذات کی صورت میں ان کے سامنے مکمل ترین انسان کا نمونہ موجود تھا اور اسی پر انھوں نے اپنے مردِ مومن کا تصور اُستوار کیا ہے۔[۷۶]

اسی لیے تو اقبال رسول پاک ﷺ کو آیۂ کائنات کا معنی دیریاب کہتے ہیں:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تُو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو![۷۷]

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان رسول پاک ﷺ کے ذاتی خصائص کو اپنی ذات کا حصہ بنانے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔ اس کے لیے اقبال تربیت خودی پر زور دیتے ہیں۔ اسرار و رموز میں اقبال نے تربیتِ خودی کا ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے جو تین مراحل پر مشتمل ہے۔

۱- اطاعت: اقبال کے یہاں تنظیمِ ذات یا تربیتِ خودی کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ اطاعت کا مفہوم خود اختیاری اطاعت کا ہے اور شعور کی اعلیٰ کیفیات میں اس بات کا مکمل امکان ہے کہ انسان خارجی حرکت کی بجائے داخلی حرکت کے حوالے سے اظہار کے قابل ہو۔ اقبال اس داخلی حرکت کو خود اختیاری کے حوالے سے دیکھتے ہیں:[۷۸]

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا شد اختیار[۷۹]

ترجمہ: اے غفلت کوش تو بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوشاں ہو کیونکہ ضبط ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔

اطاعت کا اصل مقصد اطاعت کو اختیاری بنانا ہے[۸۰] اقبال نے اطاعت کو اُونٹ کی مثال سے پیش کیا ہے۔ اُونٹ، صبر و استقامت اور خدمت و محنت کا مجسمہ ہے، لق ودق صحرا کو چیرتا ہے لیکن آرام وآسائش کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیتا۔ کم کھاتا ہے، کم آرام کرتا ہے اور محنت زیادہ کرتا ہے بلکہ صحرا کے سفر میں بعض اوقات کئی روز بغیر چارہ کھائے اپنے وجود سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ یوں باطنی سطح پر ہی وہ قوت و توانائی کا حامل وجود بن کر اُبھرتا ہے۔ دوسری طرف اچھے برے حالات میں آقا کی اطاعت کرتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ابتدائی مرحلہ پر انھیں خصوصیات وصفات کو اپنے اندر جنم دینا چاہیے۔ کیونکہ اسی طریقہ سے وہ غلبہ خیر کے مقصد کے لیے اپنی توانائیاں اکٹھی کرسکتا ہے جو اُس کی اوّل غایت ہے۔

اقبال کی فکر میں اطاعت کو ایک رویہ کی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کو رویہ زندگی کے طور پر قبول کرنے سے تنظیمِ ذات ہوتی ہے۔ اسی تنظیم سے تخلیق کا عمل وجود پزیر ہوتا ہے اور

خودی طاقت ور و توانا ہوتی ہے۔[۸۱] اقبال اطاعت کو خاص آئین کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں۔ مقصد اطاعت کو مسرت و شادمانی کی لذت سے آشنا کرنا ہے۔[۸۲] مخصوص آئین کی پابندی کے بغیر ترقی و شادمانی کا حصول ناممکن ہے۔ آئین کی اطاعت ہی سے انسان میں آگے بڑھنے کی قوت و صلاحیت جنم لیتی ہے اور یہ آئین کیا ہے؟ خودی کی تربیت کا وسیلہ جو اسے شر میں نہ ڈھلنے دے بلکہ خیر کا مجموعہ بنا دے۔ خیر کا مجموعہ بننے کے لیے اطاعتِ آئین رسول پاک ﷺ ضروری ہے۔ اقبال کے نزدیک رسول پاک ﷺ کا دیا ہوا آئین ہی اپنے اندر یہ قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کی پابندی کی جائے اور اس کی سختی کی شکایت سے گریز کیا جائے۔

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیؐ بیروں مرو[۸۳]

ترجمہ: قانون کی سختی کی شکایت نہ کر جنابِ رسول پاک ﷺ کی حدود سے باہر نہ جا۔

اطاعت کے بعد ضبطِ نفس کی منزل ہے۔ ضبطِ نفس، نفس کی قوت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے[۸۴] اور اس کے ذریعہ انسان اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا سیکھتا ہے۔[۸۵] خواہشات پر قابو نہ پانا کبھی بھی مفید نہیں ہوسکتا۔ خواہشات کے تھپیڑے کھاتے رہنے سے جسم و نفس کی مثبت قوتیں بکھر جاتی ہیں جبکہ ایک نکتہ پر مرکوز رہنے سے ان میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پر حکومت نہ کر سکنے والا شخص دوسروں پر کبھی بھی حکم نہیں چلا سکتا۔[۸۶]

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پزیر از دیگراں[۸۷]

ترجمہ: جو اپنے اوپر حکم نہیں چلاتا اسے دوسروں کی حکم برداری کرنا پڑتی ہے۔

اقبال کے نزدیک نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے خوفِ دُنیا، خوفِ عقبٰی، خوفِ جان اور خوفِ آلامِ زمین سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی بعض اشیا کی محبت سے بچنا لازم ہے۔ مثلاً حُبِّ مال و دولت، حُبِّ وطن، حُبِّ عزیز و اقربا، حُبِّ زن یہی محبتیں بعض اوقات اِنسان سے خودی کے لیے مضر ثابت ہونے والے کام بھی کرواتی ہیں۔ ان محبتوں اور خوف سے بچنے کے لیے:

۱: لا الٰہ کی تلوار تھام لی جائے۔

۲: نماز سے قلب کو طاقتور بنا لیا جائے۔

۳: روزہ کی مدد سے تن پروری سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔
۴: حج کی مدد سے وطن پرستی کو ختم کیا جائے اور ہجرت کا سبق لیا جائے۔
۵: دولت کی محبت کو زکوٰۃ سے ختم کیا جائے۔

ان پانچ اشیا پر عمل کے ذریعے انسان اپنے نفس کے اونٹ کو قابو کر کے اُس پر سواری کے قابل ہو جاتا ہے۔[۸۸]

اقبال نے اسلامی عبادات کے اجتماعی پہلو پر خصوصاً زور دیا ہے کیونکہ یہ رُخ ایک طرف تو معاشرتی عمل کے اثبات وقیام کے لیے اہم ہے تو دوسری طرف اجتماعی سطح پر حاصل شدہ روحانی یا مادی قوت، معرکۂ حیات میں انفرادی قوت وتوانائی سے زیادہ اہم ہے۔یہی نکتہ رسولِ پاک ﷺ کی تعلیمات میں بھی مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔کئی مقامات پر رسول پاک ﷺ نے جماعت کی فضیلت اور برکات کا تذکرہ کیا ہے۔[۸۹]

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر[۹۰]

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کے کہے کو حرزِ جاں بنالو، شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔

اقبال نے اپنی فکر میں اسلامی عبادات کو جگہ دی ہے تو اس کا مقصد اُن کے نزدیک یہی ہے کہ وہ انسان کو روحانی اور مادی قوتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔درحقیقت عبادات ہی وہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعے انائے مطلق سے فرد کا رابطہ قائم ہوتا ہے اور اس طرح اخذ وجذب کے عمل سے گزر کر ذاتِ واحد سے قوت وتوانائی اور استحکامِ ذات پاتا ہے۔اس روحانی تعلق سے انسانی اتحاد واجتماع کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اُس نے ایک نئی قوت پالی ہے۔[۹۱]

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست
پختۂ محکم اگر اسلام تست
اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اُشترِ خاکی شوی[۹۲]

ترجمہ: یہ سب تمھاری شخصیت کو مستحکم کرنے کے ذرائع ہیں، اگر تیرا اسلام محکم ہے تو تیری شخصیت بھی پختہ ہے۔
یا قوی کے ورد سے صاحبِ قوت بن جاتا کہ اپنے خاکی بدن کے اونٹ پر سواری کر سکے۔

ان دو مراحل سے گزرنے کے بعد تیسرا اور آخری مرحلہ ''نیابتِ الٰہی'' کا ہے جو آدم کی تخلیق کا مقصود ہے۔ اس مرحلہ کے اظہار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے یہاں اطاعت اور ضبطِ نفس کے ذریعہ ذات کے استحکام کا عمل شخصی نہیں ہے کہ فرد اپنی ذات میں مکمل و اکمل اور توانا بن جائے بلکہ ان کا تنظیمِ ذات سے مقصود اس فرد کے ذریعہ حکومت الٰہیہ کا قیام ہے۔[۹۳] اس لحاظ سے وہ نائب حق ہے جو کائنات میں اپنا حکم جاری کرتا ہے۔ خدا کی صفات کو اپنی ذات کا حصہ بناتا ہے اور نیابت الٰہی کے مرتبہ پر فائز ہو کر تسخیر کائنات کے فریضہ سے عہدہ برآں ہوتا ہے:

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچوں جانِ عالم است
ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است[۹۴]

ترجمہ: دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہونا اور عناصرِ فطرت پر حکمرانی کرنا کیا خوب ہے۔
نائب حق اس کائنات کی جان کی مانند ہے اس کا وجود اسم اعظم کا سایہ ہے (اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات منعکس ہوتی ہیں)۔

یہ انسان کامل صرف علم و عرفان ہی نہیں رکھتا بلکہ ہیبت و دبدبہ اور قوت و قہار کی صفات سے بھی مزّین ہوتا ہے جس کے تحت وہ عناصر کا حکمران بنتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس کائنات کے کامل ترین انسان رسول پاک ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ایک نئے معاشرے اور ملت کی بنیاد رکھی۔ یہ معاشرہ اور ملت دُنیا کے قائم شدہ تمام معاشروں سے جداگانہ خصائص کا حامل ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ آپ ﷺ کی ہستی پاک، منفرد اور اعلیٰ خصائص کی حامل تھی۔ اس منفرد اور برگزیدہ ہستی پاک نے اس معاشرہ اور ملت کی بنیاد رنگ و نسل یا وطن پر نہ رکھی بلکہ نظریۂ توحید پر رکھی۔ اس نظریۂ کے مطابق کلمہ طیبہ پڑھتے ہی نو مسلم کو وہ تمام حقوق مل جاتے ہیں جو باقی تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اسلام میں برتری کی بنیاد تقویٰ ہے۔ جتنا کسی شخص کا اللہ پر یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے وہ مقبول بارگاہ الٰہی بن جاتا ہے۔ ایک بار دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد انسان دیگر تمام مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے چاہے وہ دُنیا کے کسی بھی کونے سے تعلق رکھتا ہو۔ رسولِ پاک ﷺ نے مسلمانوں کو ایک ملت اور قوم بنا دیا چاہے وہ دُنیا کے کسی بھی خطے میں رہائش پزیر ہوں۔ رسولِ پاک ﷺ کی تعلیمات کے مطابق مسلمان کا اپنے

آپ کو کسی علاقے اور ملت سے منسوب کرنا سخت حماقت و نادانی ہے۔[۹۵]

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
برنسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملت مارا اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم
مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست
طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست
ماز نعمتہائے او اخواں شدیم
یک زباں و یک دل و یک جاں شدیم[۹۶]

ترجمہ: ہم مسلم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد ہیں۔ اگر تو دلیل چاہے تو قرآن کی آیت مِلَّةَ اَبِیۡكُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ سے دلیل حاصل کر۔

قوم کی بنیاد وطن میں دیکھنا کیسا! ہوا، پانی اور مٹی کی پرستش کرنا کیا۔ نسب پر فخر کرنا حماقت ہے۔

اس کا تعلق جسم سے ہوتا ہے اور جسم فانی ہے۔ ہماری قوم کی بنیاد دوسری ہے۔

یہ بنیاد ہمارے دل کے اندر پوشیدہ ہے۔ ہم حاضر ہیں لیکن ہم نے دل کو غائب سے لگا رکھا ہے

پس ہم ایسی ویسی پابندی سے آزاد ہیں۔

ہمارا مقصد اور انجام ایک ہے۔ ہمارے طور طریقے اور ہمارا خیال ایک ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ ہم یک زبان، یک دل اور یک جان ہو گئے۔

آپ ﷺ نے جس ملت کی بنیاد رکھی۔ اس کی بنیاد کلمہ توحید پر تھی۔ اس کے افراد میں ایسی اخوت و محبت تھی کہ دوسری اقوام کے حقیقی بھائیوں میں ایسی محبت کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

حضرت بلالؓ سیاہ رنگ کے تھے۔ حضرت صہیبؓ روم کے رہائشی تھے لیکن رسول پاک ﷺ کی محفل میں قریش کے خاندان کے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا امتیاز نہ رکھا جاتا تھا کیونکہ سب کا محبوب ایک تھا:

اسود از توحید احمر می شود
خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود[۹۷]

ترجمہ: توحید کی برکت سے حبشی سرخ رنگ والوں کے برابر ہو جاتا ہے اور فاروقؓ و ابوذرؓ کا رشتہ دار شمار ہونے لگتا ہے۔ (حضرت بلالؓ کی مثال سامنے ہے۔)

توحید کے ذریعے کالا گورا بن جاتا ہے یعنی گورے آدمی کا ہمسر بن جاتا ہے اور عمر فاروقؓ اور حضرت ابوذرؓ کا قرابت دار ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم رقم طراز ہیں:

کلمۂ توحید ہی ملت بیضا کے تن میں بطورِ جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے۔ اسی سے زندگی میں قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے تو دۂ گِل دل بن جاتا ہے اور دل میں سے اگر یہ نکل جائے تو دل مٹی ہو جاتا ہے مسلمان کی اصلی دولت یہی ہے۔[۹۸]

یہ رسول پاک ﷺ کا عطا کردہ تصور ہے جس کی بدولت مسلمان اپنے آپ کو کسی علاقے سے وابستہ تصور نہیں کرتا۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست[۹۹]

ترجمہ: ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے ایک بہت بڑے شاعر حضرت کعبؓ اسلام لانے سے پہلے رسول پاک ﷺ کو بہت تکلیف دیتے تھے۔ مکہ فتح ہونے کے بعد طائف کی طرف چلے گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد آ کر اپنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگ کر اسلام لے آئے اور آپ ﷺ کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ حضرت کعبؓ نے اس قصیدے میں رسول پاک ﷺ کو "سَیفٌ مِّنْ سُیُوْفِ الْهِند" ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار کہا۔ رسول پاک ﷺ نے اُنھیں اس قصیدہ کے بدلے ایک چادر عطا فرمائی اور ساتھ ہی اصلاح فرمائی اور کہا کہ "سَیفٌ مِّنْ سُیُوْفِ الْهِند" کی بجائے "سَیفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰه"، یعنی اللہ تعالیٰ کی تلوار کہو۔ گویا رسول پاک ﷺ نے اپنے آپ کو کسی ملک کی طرف منسوب کرنا ناپسند فرمایا:

جوہر ما بمقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست[۱۰۰]
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو[۱۰۱]

ترجمہ: ہمارا جوہر کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کی سخت شراب کسی ایک جام تک محدود نہیں ہے۔

مچھلی کی مانند سمندر میں آزاد رہ یعنی کسی مقام کی قید سے آزاد ہو جا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت مصلحت اور غایت غور و تدبر چاہتی ہے۔ آپ ﷺ کی حکمت ایک ایسی ملت کا قیام ہے جو سارے عالم کو سمیٹے ہوئے ہو۔ آپ ﷺ نے اس ملت کی بنیاد کلمۂ طیبہ پر استوار کی۔ آپ ﷺ کا ایک احسان و انعام یہ بھی ہے کہ تمام روئے زمین ہمارے لیے مسجد قرار دے دی گئی۔ اب سوچیے وہ ذات جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں فرمائی۔ جس کی جان کی حفاظت کی ضمانت خود خدا نے دی۔ وہ ذات جو دُشمن سے رتی بھر نہ ڈرتی تھی بلکہ جس کے رُعب سے دُشمنوں کے اجسام لرزنے لگتے تھے۔ اپنے باپ دادا کے دین کو خیر باد کہہ کر کیوں چلی گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ دشمنوں سے خوفزدہ ہو کر نہ گئے تھے۔ دراصل اصل حقیقت راویوں نے ہماری نظروں سے اوجھل کر دی ہے۔ انھوں نے ہجرت کا مفہوم خود ہی درست نہیں سمجھا۔ ہجرت تو مسلمانوں کی حیات میں ایک بنیادی اُصول ہے اور مسلمان کی زندگی کی بقا اور اثبات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کم سمائی سے وسعت کی طرف گامزن ہونا۔ شبنم کو چھوڑ کر سمندر کو مسخر کرنا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کوئی قیدِ اطراف و جہات سے آزادی پا گیا۔ وہ فلک طرح شش جہات پر چھا گیا۔ اپنے زمانے کی مکر و فریب سے ہوشیار ہو جا کہ یہ وہ ڈاکو ہے جو تیری بٹ ماری پر آمادہ ہے:

عقیدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

تاز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود
آں کہ حفظِ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش
پس چرا ز مسکنِ آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنئ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است[۱۰۲]

ترجمہ: ہمارے آقا نامدارﷺ نے وطن سے ہجرت کر کے قومیت مسلم کا عقدہ حل فرما دیا۔
آپﷺ کی حکمت نے کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک عالمگیر ملت کی بنیاد رکھی۔
یہی وجہ ہے کہ اس سلطان دین کے کرم سے ساری زمین ہمارے لیے مسجد بنا دی گئی۔
آپﷺ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں آپﷺ کی تعریف فرماتے ہیں اور آپﷺ کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔
آپﷺ کی ہیبت سے دشمنوں کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے تھے۔ آپﷺ کے رعب سے ان کے بدن پر لرزہ طاری جاتا تھا۔
تو پھر آپﷺ نے اپنے آبا کا مسکن کیوں چھوڑا؟ کیا تیرا یہ گمان ہے کہ آپﷺ نے دشمنوں سے ڈر کر ہجرت کی۔ قصہ گو واعظوں نے سچی بات ہم سے چھپائی ہے وہ ہجرت کے معنی غلط سمجھے ہیں۔
ہجرت مسلمانوں کی زندگی کا آئین ہے اور ان اسباب میں سے ایک سبب ہے جن سے مسلم کے وجود کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے وطن کو ملت کی بنیاد بنا لیا ہے۔ انھوں نے بنی نوع انسان کے لیے فساد کے نئے راستے کھول دیے۔ انسانی جسم باقی ہے لیکن آدمیت ختم ہوگئی ہے۔ انھوں نے وطن کو

بنیاد بنا کر انسانوں کو مختلف قبیلوں میں بانٹ دیا ہے۔ کلمۂ توحید پر ملت کی بنیاد جنت کے مترادف تھی لیکن لوگوں نے اس کی جگہ دوسرے ذرائع ڈھونڈ کر دوزخ میں جنت ڈھونڈی ہے۔ یہ کس طرح کے لوگ ہیں جنھوں نے جنت کو جہنم سے بدل لیا ہے۔ ان کا یہ قول قرآن مجید کے اس قول کے مصداق ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ۙ جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ؕ وَ بِئۡسَ الۡقَرَارُ[۱۰۳]

ترجمہ: کیا تم نے اُنھیں نہ دیکھا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو ناشکری سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں لا اُتارا۔ دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے اور ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے:

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند
جنتے جستند در بئس القرار
تَا اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارُ الْبَوَار
مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند[۱۰۴]

ترجمہ: اہلِ مغرب نے اس طرح اخوت کی جڑ کاٹی ہے کہ وطن کی بنا پر قوم کی تعمیر کی ہے۔

وطن کو شمعِ محفل بنانے سے نوعِ انساں مختلف قبائل میں تقسیم ہو گئی ہے۔

انھوں نے جہنم میں جنت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔

انسانیت دنیا میں افسانہ بن کر رہ گئی۔ آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا بدن سے روح نکل گئی اور صرف ڈھانچہ رہ گیا۔ آدمیت گم ہو گئی اور قومیں باقی رہ گئیں۔

انھوں نے اخوت کے رشتے کو اس طرح توڑا ہے کہ وطن پر قوم کی تعمیر کر ڈالی ہے۔ جب

انھوں نے وطن کو شمعِ محفل بنا دیا تو بنی نوع انسان کو قبیلوں میں تقسیم کر ڈالا۔

مسلمان اپنے قلب سے تمام تعصّبات نکال کر صرف مسلمان ہونے میں ہی فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے قابل فخر شے ایمان کی دولت ہے۔ وہ افغانی، ترک، ایرانی، ہندوستانی یا پاکستانی بعد میں ہوتا ہے پہلے مسلمان ہوتا ہے:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم[۱۰۵]

ترجمہ: ہم نہ افغانی ہیں نہ تاتاری۔ ہم ایک چمن اور ایک شاخسار سے ہیں۔
ہم پر رنگ و بو کی تمیز حرام ہے۔ ہم ایک نئی بہار کے پروردہ ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے کسی نے نسب کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ''مسلمان بن اسلام''۔ یعنی مسلمان ہونے کے بعد نسب کوئی قابلِ فخر شے نہیں رہتا۔ بلکہ اسلام کا بخشا ہوا شرف اور عزت ہی اُس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب شام فتح ہوا تو عیسائیوں نے بیت المقدس کی چابیاں حوالے کرنے کے لیے شرط رکھی کہ خلیفۃ المسلمین خود تشریف لائیں گے۔ حضرت عمرؓ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے جب نزدیک پہنچے تو ابوعبیدہؓ اور صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ استقبال کے لیے چشم براہ تھا۔ آپ کے پاس سواری کا ایک اونٹ تھا۔ جس پر آپ اور آپ کا غلام باری باری سوار ہوتے تھے۔ اتفاق سے بیت المقدس کے نزدیک حضرت عمرؓ کی باری پیدل چلنے کی تھی۔ آپ کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ حالت دیکھ کر عرض کی کہ اسے امیر المومنین آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں اور نیا لباس زیب تن کر لیں۔ یہاں کے لوگ آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے راہ تک رہے ہیں۔ وہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ جواباً حضرت عمرؓ نے فرمایا ہماری عزت و عظمت لباس سے وابستہ نہیں۔ اسلام نے ہمیں جو شرف بخشا ہے وہ ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ چنانچہ آپ اسی حال میں شہر میں داخل ہوئے۔ عیسائی رہنماؤں نے آپ کو دیکھتے ہی چابیاں آپ کے حوالے کر دیں اور کہا ہماری کتب میں فاتح بیت المقدس کی جو جو نشانیاں درج ہیں وہ سب آپ کی ذات میں موجود ہیں:[۱۰۶]

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے[۱۰۷]

مغربی اقوام کا انحصار رنگ، نسل، زبان یا وطن پر ہے۔ یہ معیار قوم فتنہ فساد کا موجب ہوتا ہے۔ اسلام ان تمام امتیازات کا قلع قمع کرتا ہے اور اس کو انسانیت کے لیے ضرر رساں جانتا ہے۔ مدینہ میں ایک مرتبہ قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے افراد کے درمیان لڑائی ہوگئی۔ یہ دونوں قبائل دیرینہ عداوت کے لیے مشہور تھے اور کئی خونریز لڑائیاں آپس میں لڑ چکے تھے۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد اسلام کی برکت سے آپس میں بھائی بھائی اور ایک دوسرے کے خیر خواہ بن گئے۔ خزرج قبیلہ کے آدمیوں نے اپنے عزیزوں کو قبیلہ کے نام پر آواز دی تھی۔ قریب تھا کہ یہ دونوں قبائل پھر لڑ پڑتے۔ رسول پاک ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا قبیلہ کے نام پر پکارنا شیطان کی آواز ہے میں امن وسلامتی کی دعوت دیتا ہوں اور تم اسلام کی طرف لوٹنا چاہتے ہو۔ تم اپنے قبیلوں کے سبب سے نہیں بلکہ اسلام کی دولت سے بھائی بھائی بنے ہو۔ انھوں نے غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لی۔[۱۰۸]

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی[۱۰۹]

علامہ فرماتے ہیں کہ زندہ اقوام کے لیے ایک مرکز محسوس ناگزیر ہے اور مسلمان قوم کا مرکز بیت الحرام ہے۔ مسلمانوں کو اس سے وابستہ رہنا چاہیے اور کسی جگہ کو مرکز قرار نہیں دینا چاہیے۔ مسلمان جب تک بیت الحرام سے وابستہ رہیں گے اور اس کا طواف کرتے رہیں گے دنیا میں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے اور جب اس کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیں گے تو ان کا شیرازہ بکھر جائے گا:

ہم چناں آئینِ میلادِ اُمم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چوں جا در پیکر است
خطِ او در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے
راز دارد و رازِ ما بیت الحرم
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طوافِ او کنی پایندۂ[۱۱]

ترجمہ: قوموں کے قیام کا دستور بھی یہی ہے، مرکز ہی سے ان کے اندر جمعیت پیدا ہوتی ہے۔

دائرے کے لیے مرکز وہی حیثیت رکھتا ہے جو بدن کے لیے جان

دائرے کا محیط اس کے مرکز میں مضمر ہے۔ قوم کا ربط اور نظام مرکز سے وابستہ ہے، مرکز ہی سے اس کی زندگی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔

ہماری (قومی زندگی کا راز) اور ہماری (توحید) کا راز دار بیت اللہ شریف ہے، ہمارا سوز بھی اسی سے ہے اور ہمارا ساز بھی اسی سے ہے۔

تو حرم شریف کے ساتھ تعلق کی وجہ سے زندہ ہے، جب تک اس کا طواف کرتا رہے گا۔ پائندہ رہے گا۔

قوم ایک مرکز کے ساتھ ہی مربوط اور منظّم ہوتی ہے۔

اس کی حیات مرکز ہی سے دوام حاصل کرتی ہے۔ راز دار اور راز بیت الحرم ہے۔

تو بیت الحرم وابستگی کے ذریعے زندہ ہے جب تک تو اس کا طواف کرتا رہے گا قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں ہے:

لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ط اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ[۱۱۱]

ترجمہ: ہر ایک اُمّت کے لیے وقت مقرر ہے۔ جب اس کا یہ مقرر وقت آ جاتا ہے تو اس وقت ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹیں گے نہ آگے بڑھیں گے۔

جس طرح افراد پر موت طاری ہوتی ہے ایسے ہی قومیں بھی وقتِ مقررہ پر ختم ہو جاتی ہیں اور نئی اقوام جنم لیتی رہی ہیں۔ لیکن رسول پاکؐ نے جو اُمتِ مسلمہ تشکیل دی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امت قیامت تک کے لیے ہے۔ اس لیے کہ یہ قوم میثاقِ اوّل اَلَستُ بِرَبِّکُمْ کی پابندی کر رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل تمام روحوں سے لیا تھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں

ہوں تو سب نے بیک زبان کہا تھا کہ بے شک تو ہی ہمارا رب ہے۔ اسی سبب انسان کی سرشت میں یہ شے موجود ہے کہ وہ اپنے حقیقی خالق کو پہچان لیتا ہے۔ کوئی انسان اپنے ضمیر کی آواز کو جان بوجھ کر دبائے اور اس کے برخلاف فعل سرانجام دے تو علیحدہ بات ہے ورنہ عقل سلیم سے کام لے کر حقیقت تک با آسانی رسائی ہوسکتی ہے۔

دیگر صحائف و کتب کے برعکس رسول پاکؐ پر نازل شدہ کتاب قرآن پاک کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس لیے یہ کتاب قیامت تک اپنی اصلی حالت میں موجود رہے گی۔ قرآن پاک میں ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ [۱۲]

ترجمہ: ہم نے اتارا ہے یہ قرآن اور بے شک ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

دُنیا میں مسلمان قوم کو فتنوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے مٹانے کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ لیکن کوئی بھی اسے ختم نہ کرسکا۔ ایسا سوچنے والوں کے ارادے خاک میں مل گئے۔ قدیم یونانی، مصری اور رومی تہذیبیں دُنیا سے مٹ گئیں لیکن اسلامی تہذیب ہر زمانے میں کسی نہ کسی رنگ میں قائم رہی:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا [۱۳]

چونکہ ہمارے سینوں میں امانتِ توحید ہے اس لیے ہمیں اس دنیا سے مٹایا نہیں جا سکتا:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا [۱۴]

اللہ تعالیٰ کفار و مشرکین کے متعلق ارشاد فرماتا ہے:

یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ [۱۵]

ترجمہ: چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے موٗنھوں سے بجھادیں اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا پڑے اگرچہ برا مانیں کافر۔

اُمّتِ مسلم ز آیاتِ خداست
اصلش از ہنگامۂ قَالُوۡا بَلٰی ست
از اجل ایں قوم بے پرواستے
استوار از نَحۡنُ نَزَّلۡنَا ستے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است

ز دوام او دوام ذاکر است
تا خدا اَنْ یُّطْفِؤُا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است
در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست[۱۱۶]

ترجمہ: مسلمان قوم اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ہے۔ اس کی بنیاد "قالو بلیٰ" ہے۔
یہ قوم موت سے بے پرواہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت کی وجہ سے مستحکم ہے۔
ذکر اپنے ذاکر کے قائم رہنے سے ہی قائم رہتا ہے۔ اس کی ہمیشگی کی وجہ سے ذاکر کو بھی ہمیشگی حاصل ہو جاتی ہے۔
چونکہ اللہ تعالیٰ نے "اَنْ یُّطْفِؤُا" فرمایا ہے۔ اس لیے یہ چراغ بجھنے سے آسودہ ہے۔
دنیا میں بانگِ اذاں ماضی میں بھی بلند ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ رسولِ پاک ا کی قائم کردہ ملت ماضی میں بھی موجود تھی اور اب بھی ہے۔

نبی پاک ﷺ نے یہ فرما کر کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اسلام کی شیرازہ بندی کر دی۔ جو بھی مسلمان ہوگا وہ آپ ﷺ کا اُمتی ہی ہوگا اور اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کر کے امت میں انتشار ڈالنے کا سبب بنے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا سمجھا جائے گا اور کوئی سچا مسلم اس دعویٰ کو تسلیم نہ کرے گا۔ آپ ﷺ کی اُمت آخری امت ہے اور آپ ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات کی وجہ سے مسلمان ایک ملت ہیں۔ آپ ﷺ جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور آپ ﷺ کی تشکیل دی ہوئی امت تمام دنیا کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد
خدمت ساقی گری ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا است

پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست[۱۱۷]

ترجمہ: دین فطرت ہم نے رسول پاک ﷺ سے سیکھا۔ ہم نے حق کے راستے میں مشعل روشن کی۔
اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کر دی۔ ہمارے رسول ﷺ نے رسالت ختم کر دی۔
ساقی گری کی خدمت ہم نے چھوڑ دی۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جو آخری جام تھا اُس نے ہمیں دے دیا۔
رسول پاک ﷺ کا فرمان ''لا نبی بعدی'' (میرے بعد کوئی نبی نہیں) خدا کا ہم پر احسان ہے اور یہ دینِ مصطفیٰؐ کی آبرو کا پردہ ہے۔
اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بعد نبوت کے ہر دعوے کے نشان کو مٹا دیا اور ابد تک اسلام کی شیرازہ بندی کر دی۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱۔ ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصور دین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۱۰۱، ۱۰۲
۲۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵/۴۷۷
۳۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵/۴۷۷
۴۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۷۴/۵۳۶
۵۔ سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدیدِ الٰہیات اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۱۹۳
۶۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۹/۱۹
۷۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۳ء، ص:۳۸۱
۸۔ منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رَحۡمَةٌ لِّلۡعَالَمِیۡن ﷺ، ج:۱، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۴۷
۹۔ الانعام:۶، آیت:۱۷
۱۰۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال، ص:۳۸۱
۱۱۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۹/۱۹
۱۲۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۹/۶۵۷، ۷۰/۶۵۸
۱۳۔ سید اسعد گیلانی، مرتب، تصوراتِ اقبال، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۷۷
۱۴۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۵۱/۶۳۹
۱۵۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۲/۲۲
۱۶۔ چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح اسرارِ خودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۳۱۵
۱۷۔ البقرہ:۲، آیت:۱۴۴
۱۸۔ الفتح:۴۸، آیت:۱۰
۱۹۔ الانفال:۸، آیت:۱۷
۲۰۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۵/۲۵
۲۱۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۳۲/۱۳۲
۲۲۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۷/۳۸۹
۲۳۔ سورۃ ترمذی، حافظ محمد بن عیسیٰ بن (مترجم)، مولانا محمد زکریا، شمائل ترمذی مع اردو شرح خصائلِ نبویؐ، میر محمد کتب خانہ مرکزِ علم و ادب، کراچی، سن ندارد، ص:۲۱۵

۲۴- وحید الزماں، علامہ، صحیح مسلم شریف، جلد ۵-۶، نعمانی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص:۵۲
۲۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۱۹/۱۹
۲۶- چشتی، پروفیسر یوسف سلیم، شرح اسرارِ خودی، ص:۲۹۱
۲۷- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، مولانا سید سلیمان، سیرۃ النبیؐ، ج:۲، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد، ص:۳۳۳
۲۸- ایضاً، ص ۳۷۱
۲۹- ایضاً، ص ۳۳۸
۳۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۵۵/۶۴۳
۳۱- التوبہ:۹، آیت:۱۲۸
۳۲- الانبیاء:۲۱، آیت:۱۰۷
۳۳- نبہانی، علامہ یوسف، جواہر البحار، ج:۱، مکتبہ حامدیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۹۹
۳۴- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رَحمۃٌ لِلعَالَمِین، ج:۳، ص:۱۰۴
۳۵- ایضاً، ج:۱، ص ۸۹
۳۶- ایضاً، ج:۱، ص ۱۱۴-۱۱۷
۳۷- یوسف:۱۲، آیت:۹۱
۳۸- یوسف:۱۲، آیت:۹۲
۳۹- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رَحمۃٌ لِلعَالَمِین، ج:۱، ص:۱۲۰
۴۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۲۰/۲۰
۴۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۰/۲۰
۴۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۴۱/۲۴۱
۴۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۰۵/۱۰۵
۴۴- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رَحمۃٌ لِلعَالَمِین، ج:۱، ص:۲۲۴
۴۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۲۰/۲۰
۴۶- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رَحمۃٌ لِلعَالَمِین، ج:۱، ص:۵۱، ۵۲
۴۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۹/۱۹
۴۸- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، ص:۱۱۳/۱۱۴
۴۹- سورۃ ترمذی، حافظ محمد بن عیسیٰ بن، مترجم مولانا محمد زکریا، شمائل ترمذی مع اردو شرح خصائلِ نبوی، ص:۳۳۳
۵۰- توکلی، علامہ نور بخش، سیرتِ رسولِ عربی ﷺ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، بار اوّل، ۱۹۸۵ء، ص:۳۷۷، ۳۷۸

۵۱- عابدی،محمد معصوم، تصورِ انسانِ کامل،سید اسعد گیلانی(مرتب)،تصوراتِ اقبال،ص:۲۲۱،۲۲۲
۵۲- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۵۹۸/۱۳۶
۵۳- توکلی،علامہ نور بخش،سیرتِ رسولِ عربی ﷺ،ص:۳۷۸،۳۷۹
۵۴- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۱۹/۱۹
۵۵- توکلی،علامہ نور بخش،سیرتِ رسولِ عربی ﷺ،ص:۳۷۴،۳۷۵
۵۶- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصورِ دین،ص:۱۱۷
۵۷- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۸۱۶/۲۰
۵۸- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۸۱۸/۲۲
۵۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۳۴۰/۴۸
۶۰- عابدی،محمد معصوم، تصورِ عشق و فقر،سید اسعد گیلانی(مرتب)،تصوراتِ اقبال،ص:۱۷۸
۶۱- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۱۸۰/۱۸۰
۶۲- یوسف:۱۲،آیت:۸۷
۶۳- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصورِ دین،ص:۱۲۸
۶۴- توکلی،علامہ نور بخش،سیرتِ رسولِ عربی ﷺ،ص:۳۷۵
۶۵- نعمانی،علامہ شبلی،ندوی،مولانا سید سلیمان،سیرۃ النبیؐ،ج:۱،ص:۲۷۱،۲۷۲
۶۶- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی،ص۹۵/۹۵
۶۷- توکّلی،علامہ نور بخش،سیرتِ رسول عربی ﷺ،ص:۲۶۸
۶۸- ابو عبد اللہ،محمد بن اسماعیل بخاری،صحیح بخاری شریف،ج:۱،مکتبہ تعمیرِ انسانیت،لاہور،باردوم، ۱۹۷۹،ص:۵۵۱
۶۹- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی ص:۲۳/۲۳
۷۰- توکلی،علامہ نور بخش،سیرت رسولِ عربی ﷺ،ص:۳۷۷
۷۱- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصورِ دین،ص:۱۴۰
۷۲- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی،ص:۲۰۳/۳۳
۷۳- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۴۴۹/۱۵۷
۷۴- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن،اقبال کا تصورِ دین،ص:۱۴۴
۷۵- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۳۶۰/۹۸
۷۶- اختر،ڈاکٹر ملک حسن،اطرافِ اقبال،بزمِ اقبال،لاہور،باردوم،۱۹۹۲،ص:۱۹۹
۷۷- اقبال،ڈاکٹر علامہ محمد،بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو،ص:۴۰۴/۱۱۲
۷۸- شاہد،محمد ایوب،اقبال کا تصورِ توانائی،المدینہ پبلشرز،سرگودھا،۱۹۸۲ء،ص:۹۰

۷۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار ششم، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۱/۴۱

۸۰- عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۸۳

۸۱- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ۱۹۸۲ء، ص: ۹۱، ۹۲

۸۲- ارشد، شاہد، مضمون تصورِ خودی، مشمولہ، سید اسعد گیلانی، تصوراتِ اقبال، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۸۹

۸۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۱/۴۱

۸۴- عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ، فکرِ اقبال، ص: ۳۸۴

۸۵- ارشد، شاہد، مضمون تصورِ خودی، ص: ۱۸۹

۸۶- اختر ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور بار دوم، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۲

۸۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۲/۴۲

۸۸- اختر ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص: ۱۳۲

۸۹- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص: ۹۷

۹۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۸۲/۸۲

۹۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، سید نذیر نیازی، مترجم، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۳۸

۹۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۳/۴۳

۹۳- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ۲ء، ص: ۱۰۰

۹۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۴/۴۴

۹۵- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، ص: ۵۷

۹۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۹۳/۹۳

۹۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۹۲/۹۲

۹۸- عبدالحکیم، ڈاکٹر، خلیفہ، فکرِ اقبال، ص: ۵۲۹

۹۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۲۹/۲۹۹

۱۰۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۲/۱۱۲

۱۰۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۴/۱۱۴

۱۰۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۴/۱۱۴

۱۰۳- ابراہیم: ۱۴ آیت: ۲۸، ۲۹

۱۰۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۱۱۵/۱۱۵، ۱۱۶/۱۱۶

۱۰۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۵۲/۲۲۲

۱۰۶- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، ص:۶۴، ۶۵
۱۰۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۶۰/۱۶۰
۱۰۸- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، ص:۶۵
۱۰۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۴۸/۲۴۸
۱۱۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۳۵/۱۳۵
۱۱۱- یونس:۱۰، آیت:۴۹
۱۱۲- الحجر:۱۵، آیت:۹
۱۱۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۸۳/۸۳
۱۱۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۵۹/۱۵۹
۱۱۵- الصّف:۶۱، آیت:۸
۱۱۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۱۹/۱۱۹، ۱۲۰/۱۲۰
۱۱۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۲/۱۰۲

☆☆☆☆

باب چہارم

اقبال کی فکر پر انبیاء عظامؑ کے اثرات

انبیاء کرامؑ کی حیات، سیرت و کردار اور تعلیمات کے براہ راست مطالعہ نے اقبال کی فکر و اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اقبال کی فکر سیرتِ انبیاءؑ کے رنگ میں رنگ گئی۔ اُنھوں نے ان ہستیوں کو ہر لحاظ سے اپنے لیے مشعل راہ بنا لیا۔ اقبال کی نظم و نثر میں وہ تمام اساسی تصورات جو اسلام کے نظامِ عقائد اور طرزِ حیات کے حوالے سے تشکیل پاتے ہیں انبیاء کرامؑ کی سیرت و کردار میں ان کی جھلک موجود ہے۔ یہ وہ عملی نظائر ہیں جن کو قرآن نے بھی مشعل راہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال نے اپنے بنیادی معتقدات و تصورات کی تشکیل کے لیے انھی ہستیوں سے رہنمائی پائی اور انھی کی تعلیمات کو عام کرنا اپنا مشن حیات قرار دیا۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کی فکر میں تصورِ توحید کو اہم مقام حاصل ہے۔

توحید اللہ تعالیٰ کو ذات وصفات کے حوالے سے یکتا و بے مثل ماننا ہے جو مکمل قوت کا مالک ہے اور کائنات کی جملہ فعلیتوں پر قابض ہے۔ وہ الٰہ بھی ہے۔ رب بھی اور مالک بھی۔ چنانچہ اقبال انسانی خودی کو بھی اسی کے حوالے سے طاقت وقوت اور توانائی کا منبع ٹھہراتے ہیں اور اصول وحدت کی حیثیت سے تخلیقی فعلیت اس کا نمایاں فعل ہے۔ انتشار اور بد نظمی تخلیقی فعلیت کو جاری رکھنے میں مانع ہوتے ہیں۔ اصولِ وحدت ہونے کے لحاظ سے اس کی شرکت فرد کی زندگی میں ہوتی ہے تو یہ فرد کی ذات کی تعمیر اسی انداز سے کرتا ہے کہ فرد کی یکتائیت اور انفرادیت اس پر آشکارا ہو جائے۔ زندگی میں پائیداری اور استحکام کے لیے انسانی فکر و عمل میں یکسانیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ ذہنی سطح پر ثنویت کا شکار رہے تو کسی بھی معمولی یا بڑی سطح پر فردیت یا قوت کا اظہار کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔[۲] چنانچہ جب فرد اس اصولِ وحدت سے تعلق جوڑ لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اسی

کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔اس لیے کہ تمام اعلیٰ قدریں اور فعلتیں اسی سے ہیں:

لَآ اِلٰہَ سرمایۂ اسرارِ ما
رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۳]

ترجمہ: لا الہ ہمارے (روحانی) اسرار کا سرمایہ ہے اسی سے ہمارے افکار کی شیرازہ بندی ہے:

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش[۴]

ترجمہ: جس کے اندر حق تعالیٰ جاں کی طرح بسا ہوا ہے اس کی گردن باطل کے آگے نہیں جھکتی۔

اسی مقام پر پہنچ کر فرد توحید کی قوت کو پانے کے بعد اپنی تمام اعلیٰ اقدار اور قوتوں کو بیدار کرنے کے بعد زندگی کی ان اعلیٰ سطحوں کو چھوتا ہے جو تخلیق کا مقصود ہیں۔اقبال چاہتے ہیں کہ فرد اعلیٰ اور بلند سطح پر پہنچے۔ اس کے لیے بندگی اور عبادت ضروری ہے فرد کی شخصیت کو یہی پائیداری اور استقلال عطا کرتی ہے۔[۵] فرد نفسی سطح پر اکائی حاصل کر لیتا ہے اور خارجی سطح پر اس کا اظہار پوری قوت سے کرتا ہے۔

اقبال خطبات میں تحریر فرماتے ہیں:

توحید کا یہ اصول ہماری حیاتِ عقلی و جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کر لے۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں نہ کہ ملوک وسلاطین کی۔[۶]

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں[۷]
یہی توحید تھی جس کی نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا[۸]
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے[۹]

چنانچہ عملی زندگی میں توحید کو جزوِ ذات بنانے کے بعد انسانی شخصیت پر بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس سبب سے حیاتِ انسانی، خوف، لالچ، مایوسی، اور بے اعتقادی ایسی نفسیاتی بیماریوں سے مکمل نجات پا لیتی ہے۔ یوں جب فرد توحید کو قدرِ مطلق کے حوالے سے قبولیت دے لیتا ہے اور تمام امکانات و اختیارات کو ذاتِ واحد میں مان لیتا ہے تو اس کی شخصیت میں ایسی بے نیازی اور بے خوفی جنم لے لیتی ہے جس کے سبب سے وہ کسی طاقت وقوت کی بالا دستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ بے خوفی اور بے نیازی کا یہ رویہ توحید کا عطا کردہ ہے اور یہی انسانیت کا شرف ہے۔[۱۰]

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات![۱۱]

اقبال نے اسرارِ خودی میں توحید کے اسرار و رموز کو ''سورۃ اخلاص'' کے حوالے سے پیش کیا ہے جو بہت پر اثر ہے۔نجی وجود کی مانند اجتماعی وجود کو بھی توحید کی بحیثیت قدرِاعلیٰ ضرورت ہے۔ اقبال جماعتی زندگی کے قیام و بقا اور غلبہ واقتدار کے لیے بھی توحید کو ہی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

اقبال کے ہاں اجتماعی عمل کی بہت اہمیت ہے ۔وہ ''خودی'' کو بھی ایثار وقربانی پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی انفرادیت سے دست کش ہو کر اجتماعی عمل میں شرکت کر لے اور اس کا حصہ بن جائے۔لیکن اقبال انفرادی خودیوں کو اجتماعی عمل کا حصہ کیوں بنانا چاہتے ہیں ؟ جماعتی وحدت کا راز کیا ہے؟ اقبال کا جواب ہے نبوت و رسالت ۔ رسالت ہی افراد کو قومیت کا ایک احساس عطا کر کے ان کی انفرادی زندگیوں کو اجتماعی وجود میں ڈھال دیتی ہے اور اس کے تحت یہ اجتماعی وجود قوت وتوانائی کا اعلامیہ بن جاتا ہے:[۱۲]

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو[۱۳]

ترجمہ: یہی چیز ملت کے لیے سرمایۂ قوت اور وحدت ملت کے بھید کی حفاظت کرنے والی ہے۔

اقبال کے نزدیک نبوت ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنے پیروکاروں کو طاقت وقوت عطا کرتا ہے۔اسی طاقت وقوت کی بدولت مسلمانوں نے قلیل مدت میں قیصر وکسریٰ جیسی عظیم سلطنتوں کو ختم کر دیا اور کاہنوں، سلطانوں، پاپاؤں اور امیروں کی غلامی سے افراد کو آزادی عطا کی اور تمام پرانی روایات اور پرانے نظاموں کو ختم کر ڈالا۔[۱۴]

تا امینے حق بحقداراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبارِ کاربنداں را فزود
خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست[۱۵]

ترجمہ: ان حالات میں جناب رسول پاک تشریف لائے اور انھوں نے امین بن کر حقداروں کا حق ان کے سپرد کر دیا۔ پادشاہ کا تخت رعیت کے حوالے کر دیا۔

آپ ﷺ نے انسانیت کی مردہ راکھ سے (زندگی کے) شعلے پیدا کیے اور کوہ کن (مزدور) پرویز (بادشاہ) کا مرتبہ عطا فرمایا۔ آپ ﷺ نے مزدور کی وقعت بڑھا دی اور آقاؤں سے خواجگی چھین لی۔

آپ ﷺ کی قوت نے ہر پرانا ڈھانچہ توڑ دیا اور آپ ﷺ نے نوعِ انسان کے اردگرد ایک نیا حصار تعمیر کر دیا۔

اقبال کا کہنا کہ رسول پاک ﷺ نے ادنیٰ پست افراد کو ''شعورِ ذات'' سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ محنت کش طبقہ (کار بنداں) کو سرمایہ داری اور جاگیرداری (خواجگی) سے نجات بخشی، یہ محض نظری بات نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اقبال اس کو بحیثیت واقعہ بیان نہیں کر رہے اور نہ عشقِ رسول ﷺ کی رو میں بہہ کر یہ سب کہہ رہے ہیں بلکہ توحید و رسالت یا اسلام کا اسلوب فکر بھی یہی ہے جس کو اقبال کی فکر میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب میں ایسی حریت اور مساوات کے اعلیٰ تصور کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس قسم کی مثالیں کسی دوسرے مذہب یا تہذیب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی اندازِ فکر کی بدولت مسلمانوں کے اندر غلاموں اور کمزوروں کو دنیوی زندگی کی سب سے برتر جگہ پر کھڑا کیا۔[۱۶]

اقبال لکھتے ہیں:

سب سے پہلے نبی عرب ﷺ نے انسان کو انسان کی فطری آزادی کو تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت دُنیا محسوس کر رہی ہے۔ حکیم عرب ﷺ کی اس مبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہوئے، غلاموں کو اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہوئے غرض کہ اس قبیح امتیاز کے مٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندان کے آدمی کے ساتھ عقلی مقابلہ کر سکتا تھا اور اس مقابلے میں کامیاب ہو کر اعلیٰ ترین منصب تک پہنچ سکتا تھا۔[۱۷]

یہ رسول پاک کا بہت بڑا اور لازوال کارنامہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو یکساں معیار کی سطح پر لانے کے لیے ادنیٰ و اعلیٰ کے مروجہ معیار ختم کر دیے اور غلام اور آقا ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ توحید و رسالت کو اقبال کی فکر میں ایک سرچشمۂ

توانائی کی حیثیت حاصل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بقول اقبال انسان اصلاً ایک توانائی یا قوت یا قوتوں کا سرچشمہ ہے تو اسے تحرک آشنا کیسے کیا جا سکتا ہے اور وہ سرچشمۂ توانائی (اللہ تعالیٰ) سے کیسے قوت و طاقت کو اخذ و جذب کر سکتا ہے۔

اقبال کی فکر کا مرکزی نکتہ یہ بھی ہے کہ انسان کو پوشیدہ صلاحیتوں کو نصب العین کے حوالے سے ہی پیرایہ اظہار میں لایا جا سکتا ہے۔ اقبال اس نصب العین یا مقصد کے لیے ''آرزو'' کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی بھی انسان طلب صادق کے بغیر کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے بغیر وہ بے یقینی اور انتشار کا شکار رہے گا۔ چنانچہ یہ حقیقت کی طلب ہی ہے جو فرد کی ذات کے اندر نصب العینی ذات کی ضرورت کو جنم دیتی ہے۔ لہٰذا انسانی فعل کا پہلا محرک آرزو ہے۔ اسرار و رموز کے دوسرے باب میں ''آرزو'' کو ایک تخلیقی فعلیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ فرد جو تخلیقی نصب العین کو سامنے نہیں رکھتا اور صرف جبلی خواہشات کی تسکین کو کافی سمجھتا ہے۔ اس کے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا تخلیقی عمل ختم ہو جاتا ہے اور نفیِ تمنا کی صورت حال جنم لیتی ہے۔ نفیِ تمنا سے کیسے بچا جائے اور نصب العین کے ساتھ تعلق کو کیسے قائم کیا جائے۔ اقبال کی فکر نے انبیاء کرامؑ کی سِیَر اور اعمال و افعال کے مطالعہ کے بعد ''عشق'' یا ''آرزو'' کو ایک ایسے بنیادی ذریعہ کے طور پر اخذ کیا ہے جو فرد کی ذات کی پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں میں تحرک لانے کا سبب ہے اور نصب العینی سطح تک رسائی کرنے کا وسیلہ بھی۔ نصب العینی سطح کی طرف اپنے سفر میں فرد عظمت کی طرف سفر کرتا ہے[۱۸] اور انائے مطلق سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اقبال کی فکر میں ''عشق'' اپنے تخلیقی اور توانا پہلو کی وجہ سے مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر ملک حسن اختر:

> ''اقبال کی عشق سے شیفتگی بڑھتی گئی اور پھر انھیں عشق سے عشق ہو گیا۔''[۱۹]

اس عشق کی بدولت انفرادی خودی ذاتِ مطلق سے اخذ و جذب کرتی ہے۔ اقبال اگرچہ اس کے قائل ہیں لیکن وہ خود خودی کا اپنا وجود کسی صورت بھی قربان نہیں کرتے۔ یہ بات غالباً زندگی کی تخلیق کے راز سے مکمل مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ خودی کائنات میں مستقل وجود رکھتی ہے اور کائنات کی تخلیق کے مقاصد اُسی وقت پورے ہو سکتے ہیں کہ خودی اُن تمام مقاصد کو ایک با اختیار اور ذمہ دار وجود کی حیثیت سے تسلیم کر لے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب خودی اپنے آپ کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرے، سعی و عمل سے کام لے۔ سخت کوشی کو شعار بنا لے، تن آسانی ترک کر

دے کہ تن آسانی عمل کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اگر انسان عمل کی دولت سے محروم ہو جائے تو یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔[۲۰] عمل اور سختی کوشی ہم معنی ہیں۔ اقبال سخت کوش ہیں۔ اسی لیے سخت کوشی کی حمایت کرتے ہیں۔ اُن کی فکر نے یہ نکتہ انبیاء کرامؑ کی سیر اور کرداروں کے مطالعہ سے اخذ کیا ہے۔ اُن کے نزدیک نرمی اور بے عملی کی زندگی خودی کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔[۲۱] اس لیے وہ نرمی سے متنفر اور سخت کوشی کے عاشق ہیں۔[۲۲] یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف خود سخت کوش رہے بلکہ مسلمانوں کو بھی سخت کوش بننے کی تلقین کرتے رہے اور اس حقیقت کو مختلف پیرائے میں سمجھاتے رہے:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی![۲۳]

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا![۲۴]

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو![۲۵]

اقبال سخت کوشی کو اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ یہ دین کی حفاظت کے لیے از حد ضروری ہے۔ ایک سخت کوش مسلمان ہی اس فریضہ کو احسن طریقہ سے نبھا سکتا ہے[۲۶] اور اللہ کے بھروسہ پر ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے۔ نا اُمیدی کا لفظ اُس کی لغت سے خارج ہوتا ہے۔ اقبال کے افکار میں یاس و نا اُمیدی کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔ وہ ''لاتقنطوا'' پر یقین رکھتے ہیں اور مخاطب کو بھی یہی ''تعلیم الانبیاءؑ'' دیتے ہیں۔[۲۷]

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات[۲۸]

اقبال کے کلام کا زیادہ حصہ جہد و کوشش کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ مصیبت اور تکلیف محض اعتبارات ہیں۔ درحقیقت یہی سب انسان کی تکمیل اور بقائے دوام کا سبب ہیں:

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است[۲۹]

ترجمہ: یہاں ساحل پر بزم آراستہ نہ کر، یہاں زندگی کی نوا مدھم ہے۔
دریا میں کودو اور اس کی موجوں سے زور آزمائی کر کہ حیاتِ جاوداں کشمکش میں ہے۔

مقصود یہ ہے کہ عیش وعشرت کی زندگی قوائے عمل کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ دُنیا بھر کی نحوست و بدنصیبی کا پیش خیمہ اور موت کا پیغام ہے۔ حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کے لیے مصائب و آلام کا ڈٹ کر سامنا کرنا لازم ہے کہ ہمت و استقلال اور جدوجہد کی بدولت مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔ اقبال ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ پروانہ اپنے آپ کو شمع پر فدا کر کے زندگی کی کشاکش سے چھٹکارا پا لیتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ ہیچ ہے۔ میں تو اس پروانہ کو پروانہ سمجھتا ہوں جس کی جان سخت کوش ہے اور شعلہ نوش بھی۔[۳۰]

من آں پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است[۳۱]

ترجمہ: مَیں تو اس پروانے کو پروانا سمجھتا ہوں جو اتنا سخت کوش ہو کہ شعلے کو کھا جائے۔

اقبال کے نزدیک سخت کوش خودی وجود سے گریز کی راہ منتخب نہیں کرتی۔ اگر وہ ایسا کرے، اپنے انتخاب واختیار کو بوجھ محسوس کرے تو ظاہر ہے وہ نائب حق کے فریضہ سے عہدہ برآں نہیں ہوسکتی اور اقبال نے اسی بات کو رد کیا ہے۔ گویا اقبال کا عشق مقاصد کی تخلیق کرتا ہے اور پھر ان کی تسخیر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کا عشق غاروں میں روپوش ہو جاتا ہے۔ جبکہ اقبال کا عشق ستاروں پر کمند ڈالنے کے منصوبے بناتا ہے اور پھر ان سے بھی آگے نکل کر اپنی منزل ڈھونڈتا ہے۔[۳۲]

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں[۳۳]

عشق امتحان اور خطرات سے نہیں ڈرتا۔ یہ عمل کو نڈر بنا دیتا ہے اور تمام اندیشوں سے کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات خودی کا مترادف دکھائی دینے لگتا ہے:[۳۴]

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دم جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام[۳۵]

اقبال خودی کو عشق کے ذریعے مستحکم کرتے ہیں اور اُس کی بقا اور تخلیق کا سامان مہیا کرتے

ہیں۔ یہ عشق ہی ہے جو تنظیمِ ذات کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔فکر کی بدنظمی اور انتشار سے محفوظ رکھتا ہے۔ پھر وحدت کی تشکیل کر کے اُسے تخلیقی عمل میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اقبال کی فکر نے تنظیمِ ذات یا تربیتِ خودی یا توانائیوں کو مرکزیت عطا کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل اسرار و رموز میں پیش کیا ہے۔ وہ بھی تعلیماتِ انبیاءؑ سے اثر انگیزی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ایک اہم بات یہاں جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اقبال کی فکر تحصیلِ علم کو بھی عبادت کا ہی ایک رُخ ٹھہراتی ہے۔ ان کے خیال میں علم کی جستجو چاہے کسی بھی رنگ میں ہو عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ اس لیے فطرت کا علمی مشاہدہ کرنا بھی ویسا ہی عمل ہے جیسا حقیقت کو طلب کرنے کا عمل۔ اقبال کا یہ خیال تعلیماتِ انبیاءؑ یا با الفاظِ دیگر اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ اسلام کے نزدیک حق کو قائم رکھنے والا علم پسندیدہ اور زوال، پستی یا مصیبت کی جانب لے جانے والا علم شیطانی ہے۔ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات میں علم کی تفریق اسی بنیاد پر ملتی ہے۔ اقبال کی فکر نے بھی علم کو جب عبادت کی سطح پر قبول کیا ہے تو انھوں نے خصوصاً علم میں خیر اور شر دونوں صفات قوت کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے اور تعلیماتِ انبیاءؑ کے مطابق علم کو انتہا پسندی سے نکال کر اعتدال و توازن کی صفت سے مزین کیا ہے تا کہ علم اجتماعی خیر میں اضافہ کر سکے اور اس کائنات میں انسان کا مستقبل روشن ہو جائے۔

بقول اقبال:

اگر بصیرت کا دامن طاقت وقوت سے خالی ہے، تو اس سے اخلاق و عادات میں تو سربلندی پیدا ہو جائے گی، لیکن اس طرح نہیں ہوگا تو یہ کہ کسی زندۂ جاوید تمدن کی بنیاد رکھی جا سکے۔ بعینہٖ اگر طاقت اور قوت بصیرت سے محروم ہیں تو اس کا نتیجہ بھی بجز ہلاکت اور بیدردی کے کچھ نہیں ہوگا ہمارے لیے دونوں کا امتزاج ضروری ہے تا کہ عالمِ انسانی روحانی اعتبار سے آگے بڑھ سکے۔[۳۶]

اقبال نے بصیرت اور توانائی دونوں کے امتزاج سے زندگی کا ایک متوازن اور موزوں لائحہ عمل تشکیل دیا ہے۔ صرف فکر و بصیرت اور اندھی توانائی سے زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ درست رویہ وہی ہوگا کہ دونوں کو متوازی انداز میں قبول کیا جائے۔ مردِ مومن اسی رویّے کا علمبردار ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے وہ نائب حق ہے جو کائنات میں اپنا حکم جاری کرتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کا نائب ہے اس لیے خدا کی صفات اس کی ذات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اقبال کا انسانِ کامل اس مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور تسخیر کائنات کے فریضہ سے عہدہ برآں ہوتا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است[۳۷]

ترجمہ: جہاں میں نائب حق بننا کتنا اچھا ہے، عناصر پر حکمرانی کرنا کتنا اچھا ہے۔

یہ انسان کامل صرف علم وعرفان ہی نہیں رکھتا بلکہ ہیبت و دبدبہ اور قوت وقہاری کی ان صفات سے بھی مزین ہوتا ہے جس کے تحت وہ عناصر کا حکمراں بنتا ہے۔

اقبال اس انسانِ کامل یا فردِ مصدقہ کی آمد کے شدّت سے منتظر ہیں اور والہانہ انداز میں اسے خوش آمدید کہنے کے آرزومند ہیں۔ اقبال کو یقین کامل ہے کہ ایسے انسانِ کامل ظہور ہوگا۔ درحقیقت اقبال کا مردِ مومن خلافتِ الٰہیہ کے تصور پر مشتمل ہے۔ اس لیے وہ اپنی رہنمائی کے لیے قرآن کی طرف دیکھتے ہیں اور خاکہ میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے تعلیمات الانبیاءؑ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ اقبال نے اس خاکہ میں رنگ آمیزی کے لیے اسلامی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ عبدالکریم کے ''انسان الکامل'' سے بھی متاثر ہیں لیکن انھوں نے اُس کے تصور کے کچھ پہلوؤں سے اختلاف بھی کیا ہے۔

جیسا کہ ایک مقام پر عبدالکریم الجیلی نے لکھا ہے:

''الانسان الکامل''، تخلیق کائنات کا اصلی مقصد ہے اور حضرت رسول کریم ﷺ نے انسانِ کامل کا اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ چونکہ حقیقتِ محمدیؐ ہر زمانے میں مختلف ناموں اور لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لیے انسانِ کامل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اقدارِ حیات کا گہرا اثبات ان کی ذات میں ہوتا رہتا ہے۔[۳۸]

اقبال اس سے اختلاف رکھتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ کی شخصیت ہر مومن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی فکر کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انسانِ کامل اپنی جدوجہد سے یہ مقام پاتا ہے۔ انسانِ کامل کی زندگی آئینِ الٰہی اور تعلیماتِ انبیاءؑ کے عین مطابق ہوتی ہے۔ فطرت کی عام اشیا میں مل جاتی ہے اور اشیا کی حقیقت کا راز ان پر کھل جاتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اس کی آنکھ اللہ کی آنکھ، اس کا کلام کلام الٰہی اور اس کی حیات، حیات الٰہی بن جاتی ہے۔[۳۹]

تعلیمات انبیاءؑ، قرآن حکیم اور اسلامی فلسفہ کا اثر تھا کہ اقبال کا انسانِ کامل نطشے کے فوق البشر کے برخلاف خیر البشر بن جاتا ہے۔ اس کے باوصف نیٹشے کے فوق البشر اور اقبال کے انسانِ کامل میں مشابہت پائی جاتی ہے اور غلط فہمی سے بعض لوگوں نے اسے نیٹشے کے خیالات کا

چربہ سمجھ لیا ہے۔[۴۰] حالانکہ حقیقت میں اقبال کے انسانِ کامل اور نیٹشے کے فوق البشر میں بہت فرق ہے۔ نیٹشے اندھی قوت کا پجاری ہے۔ اس لیے وہ اپنے فوق البشر پر دوسرے لوگوں کو قربان کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کے ہاں اصل مقصد فوق البشر کا جنم ہے۔ باقی لوگ اس کے غلام اور اس کی تمناؤں اور خواہشات کی پابندی کرنے والے ہیں۔ نیٹشے کا فوق البشر بے انتہا طاقت و قوت کا مالک ہے۔ اقبال کا انسانِ کامل بھی بے حد قوت و طاقت رکھتا ہے۔ اس لیے ظاہراً دونوں میں مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ دونوں میں اختلافات کے بے شمار پہلو ہیں۔[۴۱] اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اقبال نے نیٹشے کے فوق البشر کو سامنے رکھا ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی تردید کی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے غلط مبحث کو میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔[۴۲]

حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال نے نٹشے کے فوق البشر کو سامنے نہیں رکھا بلکہ انھوں نے انبیاءؑ و رسلؑ کی سیرتوں کو سامنے رکھا ہے۔ اس لیے کہ یہی ہستیاں اور ان کی تعلیمات اقبال کے لیے نمونہ ہیں۔ بالخصوص اقبال کے سامنے حضرت محمد ﷺ کی ذات کا نمونہ موجود رہا۔ انھوں نے آپ ﷺ کی تعلیمات پر اپنی فکر کی بنیادیں اُستوار کیں۔[۴۳]

اقبال کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر قرآن پاک کا مطالعہ کریں تو اس میں بھی انبیاءؑ کے اذکار میں انسانِ کامل کی تشکیل کرنے والے ایسے عناصر ملتے ہیں جو فکرِ اقبال کا بنیادی سرچشمہ ہیں۔ ان عناصر سے تشکیل پانے والا مومن اپنے بنیادی رویہ کے اعتبار سے دوسری تمام تہذیبوں کے افراد سے مختلف ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَ لَا تَحزَنُوا وَ اَنتُمُ الْاَعلَوْنَ اِنْ كُنتُم مُّؤمِنِينَ۝[۴۴]

ترجمہ: اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تمھیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔

غور کریں تو یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ مومن کی برتری کسی خاص علاقے سے مخصوص نہیں ہے اور نہ ہی کسی رنگ و نسل اور خاص قوم کے افراد سے۔ بلاشبہ اسلام انبیاءؑ کے ذریعے ایک دائرہ کھینچتا ہے اور امتیازی دائرہ کی یہ لکیر افراد کی تقسیم کے عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام انسانیت کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ واضح طور پر دو بڑے

گروہوں میں بانٹتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں سب سے بڑی اور انوکھی بات یہ ہے کہ وہ تقسیم کے اس عمل کا سرے سے ہی انکاری ہے وہ اس لکیر کو ختم کر کے تمام بنی نوع انسان کو کلیت عطا کرنا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کسی قوم، طبقہ، مخصوص رنگ و نسل یا مخصوص خطہ کے افراد سے مخاطب ہونے کی بجائے ''النّاس'' یعنی لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔

اقبال کا انسان کامل قوت کا مجسمہ ہوتا ہے۔ وہ دنیاوی مال و دولت اور شان وشوکت میں بے مثال ہوتا ہے۔ اس کی سلطنت کی وسعت بے کراں ہوتی ہے۔ وہ جب شمشیر بکف نمودار ہوتا ہے تو کائنات کی کوئی بھی شے اُس کے بالمقابل قرار نہیں پا سکتی۔ وہ سیف اللہ بن جاتا ہے اور پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں:

دونیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی[۴۵]

اس کی زمین بے حدود، اس کا اُفق بے ثُغُور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل![۴۶]

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں![۴۷]

اقبال کے انسانِ کامل یا مردِ مومن کی طاقت وقوت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے وہ جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ روحانی قوت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ نہتا اللہ کی راہ میں لڑتا ہے:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی![۴۸]

اقبال جسمانی طاقت وفربہی اور چہرے کی سرخی کو اہم نہیں گردانتے بلکہ وہ جان پاک کے طلب گار و خواہشمند ہیں:

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ رنگ و نم، یہ لہو، آب و ناں کی ہے بیشی![۴۹]

اقبال نے اس جان پاک کی حصول کے لیے تربیت پر زور دیا ہے۔ وہ اس کے لیے اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول وعشقِ رسول ضروری قرار دیتے ہیں۔ عدالت صداقت اور شجاعت کا سبق پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فقر کی دولت پانے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

امید و جستجو اور نئے نئے مقاصد کی تلاش کے لیے سرگرداں ہونے پر زور دیتے ہیں تب کہیں گوہر مقصود ملتا ہے۔

اقبال مجرد قوت کے پرستار نہیں بلکہ وہ جلال اور جمال کا امتزاج چاہتے ہیں۔ ایک ایسا انسانِ کامل جو انسانیت کے لیے خیر و برکت اور رحمتِ خداوندی کا مظہر ہو جو سختی و نرمی کا مجموعہ ہو۔ شر کو پائمال کر دے اور احبابِ مجلس میں ریشم کی طرح نرم ہو جائے:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا![۵۰]

قرآن پاک میں واضح الفاظ میں تسخیر کائنات اور تسخیر نفس و آفاق کا حکم ملتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ ساری کائنات، آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ موجود ہے ہم نے تمھارے لیے مسخر فرما دیا ہے۔[۵۱] ظاہر ہے کہ پھر انسان کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ ان تمام اشیا کو مسخر کرے جب تک انسان مظاہر کی کامل تسخیر نہ کر لے وہ انسانِ کامل کے لقب سے بامشرف نہیں ہو سکتا۔ یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ مردِ مومن ایک ایسی ذاتِ اقدس کا پیروکار اور اطاعت کرنے والا ہے جو مومن کامل اور انسانِ کامل ہے اور یہ تمام کائنات اسی کے صدقے میں بنی ہے اسی لیے تو اقبال بھی کہتے ہیں:

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے![۵۲]

اقبال کا انسانِ کامل اطاعتِ رسولؐ میں اسوۂ رسولؐ کو سامنے رکھتا ہے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالتا ہے۔ کائنات کو مسخر کر لیتا ہے تو کائنات کے پوشیدہ راز اس پر کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ابن الوقت نہیں رہتا بلکہ ابو الوقت اور ابوالحال کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے[۵۳] اس تمام عمل میں اسے عشق کی قوتوں کے ساتھ ساتھ عقل کے نور کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ اس کی روشنی میں درست منزل کی جانب بڑھنا ممکن ہو جائے۔ چنانچہ صفاتِ انبیاءؑ کرامؑ سے مزّین یہ انسانِ کامل علم و محبت اور عقل و عشق کی ان گنت صفات کا مالک ہوتا ہے:

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ[۵۴]

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں[۵۵]

اقبال نے انسانِ کامل کی صفات اور اس کے انفرادی ارتقا کی منازل کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے اس معاشرے کی پوری تصویر بھی ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دی ہے جس میں اس انسان کامل کی تربیت کے سامان میسر ہوں۔ یہ معاشرہ تعلیمات الانبیاءؑ پر مبنی ہے جس کے اشارے پر پورے کلام میں جا بجا موجود ہیں اور قرآن وحدیث کے مطالعہ ہی سے اس کی تفہیم باآسانی ممکن ہے۔اس لیے کسی اور خارجی حوالۂ فکر کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اقبال کی فکر میں اُبھرنے والا انسان کامل دیگر تہذیبوں میں اُبھرنے والے ایسے نمونہ (Model) افراد سے مختلف ہے۔ یہ تصور سوچ کا ایک خاص رُخ متین کرتا ہے ۔اقبال نے اس تصور کی بنیادیں خالصتاً تعلیمات الانبیاءؑ پر استوار کی ہیں۔ یہ خاص وصف اقبال کی شاعری کا حصہ ہے۔ وہ اپنے اس وصف میں لاشریک ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے تمام نظریات مثلاً نظریہ وطنیت وملت، نظریہ جمہوریت، نظریہ تعلیم ،نظریہ فقر، نظریہ خودی، نظریہ عشق وعقل، نظریہ تقدیر وغیرہ کا جائزہ لیں اور ان فلسفیانہ مآ خذ تک رسائی حاصل کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے تمام نظریات اور افکار کو تعلیمات الانبیاءؑ سے اخذ کیا ہے اگرچہ اقبال نے دیگر فلاسفہ، حکما اور مفکرین سے خوشہ چینی کی ہے۔لیکن وہ یہ سب صرف اسلامی تعلیمات کی تائید کے طور پر لائے ہیں مآ خذ کے طور پر نہیں۔ گویا یہ کہنا مبنی برحقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کی عالی شان عمارت سِیر وتعلیمات الانبیاءؑ پر اُستوار کی ہے۔ یوں ان کی شاعری امر ہوگئی ہے جو رہتی دنیا تک قرآن حکیم کی مختصر اشاراتی تفسیر کا کام بھی دیتی رہے گی۔

☆☆☆☆

مآخذ و مصادر

۱- چشتی، پروفیسر سلیم، شرح رموزِ بیخودی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص:۸۱، ۸۳
۲- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، المدینہ پبلشرز، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص:۷۴، ۷۸
۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار ششم ۱۹۹۰ء، ص:۹۲/۹۲
۴- ایضاً
۵- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۷۶
۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، سید نذیر نیازی، مترجم، تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۲۲۷
۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص:۲۲/۳۱۴
۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۶ء، ص:۲۲/۳۱۴
۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، ص:۱۶۰/۱۶۰
۱۰- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۷۷، ۷۸
۱۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۹۹/۳۷
۱۲- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۷۹، ۸۳
۱۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۲/۱۰۲
۱۴- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص۸۴
۱۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۴/۱۰۴
۱۶- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۸۵
۱۷- عبدالواحد معینی (مرتب)، مقالاتِ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۲ء ص:۴۵، ۴۶
۱۸- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۸۸
۱۹- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۱۲۸
۲۰- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، ص:۸۹
۲۱- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۲۸
۲۲- امرتسری، علامہ عرشی، ڈاکٹر تصدق (مرتب)، اقبال پیامبرِ امید، فیروز سنز، لاہور ۱۹۹۰ء، ص:۱۴۹
۲۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۵۹/۲۵۹
۲۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۲/۳۲۴

۲۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۵۹/۲۵۹
۲۶- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصوّرِ دین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۱۵۲
۲۷- طارق، عبدالرحمٰن، جوہرِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص:۱۲۳
۲۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۹۶/۱۹۶
۲۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۴۵/۲۱۵
۳۰- فاضل، سید محمد عبدالرشید، مضمون علامہ اقبال ایک رفارمر کی حیثیت سے مشمولہ، اقبالیات کے نقوش، ڈاکٹر سلیم اختر (مرتب)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۷۹
۳۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۳۴/۲۰۵
۳۲- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۲۹
۳۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۶۱/۳۵۳
۳۴- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۳۰
۳۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۴/۳۸۶
۳۶- سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ، ص:۱۳۸
۳۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، سید نذیر نیازی (مترجم)، ص:۴۴/۴۴
۳۸- الجیلی، عبدالکریم، الانسان الکامل، بحوالہ ڈاکٹر ملک حسن اختر، اطرافِ اقبال، ص:۱۹۶
۳۹- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۹۶، ۱۹۷
۴۰- جیسا کہ پروفیسر براؤن نے تاریخِ ادب فارسی میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محمد اقبال نے اپنے نظریات مثنوی اسرارِ خودی میں پیش کیے ہیں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں زیادہ تر نطشے کے فلسفہ کو مغربی لباس میں پیش کیا گیا ہے
۴۱- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۹۸
۴۲- شیخ عطاالله (مرتب)، اقبالنامہ حصہ اول، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص:۶۵۸
۴۳- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، ص:۱۹۹
۴۴- آلِ عمران:۳ آیت:۱۳۹
۴۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۱۰۵/۳۹۷
۴۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۶/۳۸۸
۴۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۱/۲۷۱
۴۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۵/۳۲۷
۴۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۰/۳۲۲
۵۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۷۳/۲۷۳، ۲۷۴/۲۷۴۔

۵۱- الجاثیہ:۴۵، آیت:۱۳
۵۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۴/۳۲۶
۵۳- فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، اقبال اور محبتِ رسول، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۸۱
۵۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۹۸/۳۹۰
۵۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۴۸/۵۱۰

☆☆☆☆

باب پنجم

حاصلِ بحث

کلامِ اقبال میں مذکور انبیاء کرامؑ کی سیر و کردار اور اُن کے پیغامِ نبوّت کی روح کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اقبال نے نبوّت کے پیغام کو از سرِ نو اُمتِ مسلمہ تک پہنچایا ہے۔ اُنھوں نے تعلیمات انبیاءؑ کو اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال کر اُمتِ مسلمہ کے تمام افراد میں ولولۂ تازہ، جوشِ ایمانی اور غیرتِ ملی کا جذبہ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اقبال امید و رجائیت کے شاعر و پیامبر ہیں۔ وہ کبھی بھی ''کشتِ ویراں'' سے نا اُمید نہیں ہوئے اور نہ ہی ملت کے جوہرِ شباب سے مایوس ہوئے۔ مایوسی اُن کے نزدیک کفر کے مترادف تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ نوجوانانِ ملّت ہی اُن کی واحد اُمید تھے اور وہ اسی اُمید میں اپنے آنسوؤں سے اس مٹی کو گیلا کرتے رہے۔

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی![1]

علامہ اقبال یہ خوب جانتے تھے کہ اقوامِ عالم کی حیات میں جس طرح ان کی شاندار تاریخ اور عظمتوں کا امین ماضی فیصلہ کُن اور بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ایسے ہی اُن کے عظیم اسلاف کی عملی زندگیاں اور عظیم الشان کارنامے تعمیر و اصلاح کے لیے زوردار مہمیز اور پُرکشش دعوتِ عمل کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے شعر و فکر میں جہاں اسلام کے ہمیشہ زندہ رہنے والے اصولِ حیات اور قابلِ عمل تعلیمات کے اہم پہلوؤں کو از سرِ نو تازگی بخشی وہیں انبیاء کرامؑ کی سِیر و کردار اور پیغامِ نبوّت کے روشن ابواب کو بھی نمایاں کیا تاکہ اُمتِ مسلمہ اپنی مذہبی تاریخ سے آگاہ ہو اور بیدار ہو کر اپنے حال کا رشتہ تابناک ماضی سے جوڑ کر شاندار مستقبل کی خاطر جدوجہد کے راستے پر چل کر کامیابیاں سمیٹے۔ اس سعیٔ جمیل کی عملی شکل اور

کامیاب کوشش یہی تھی کہ نوجوانانِ ملّت کے سامنے نبوّت کی نمائندہ ہستیوں کے سِیر و کارنامے بطور نمونہ پیش کر دیے جائیں اور اتباع و پیروی کی دعوت دی جائے۔ علامہ اقبال کے فکر و شعر کے تمام تر سرمایہ کی روح یہی دعوت و پیغام ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک پورا قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ سبق آموز ہیں لیکن وہ بجا طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انبیاء کرامؑ ہی اُمت کی قیادت، رہنمائی اور اطاعت و پیروی کے لیے عظیم سرمایہ ہیں کہ اُن کا قائد خالقِ کائنات ہے۔ وہ انسانیت کا مقدر سنوارنے والے اور معمورہ جہاں میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پھیلانے والے ہیں۔ یہ انھی تعلیمات کی پیروی کر کے انسان دنیا و دین میں سرخروئی حاصل کر سکتا ہے اور کاروانِ انسانیت کی نگہبانی کے فریضہ سے بھی عہدہ برآں ہو سکتا ہے۔ کاروانِ حق کے یہی وہ اعلیٰ، برتر اور بلند ترین نفوس ہیں جن کے نقشِ پا پر چل کر انسان اشرف المخلوقات ہونے کا تاج اپنے سر پر سجا سکتا ہے۔

شخصیتِ اقبال کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تشکیل میں دو اہم مراحل کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے:

(۱) گھریلو اور تعلیمی ماحول کا مرحلہ۔

(۲) یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق اور واپسی کا مرحلہ۔

اگرچہ یہ دونوں مراحل اپنے پسِ منظر و پیش منظر کے اعتبار سے بالکل جدا نوعیت کے ہیں لیکن ان دونوں مراحل کا نتیجہ علامہ اقبال کے ہاں ایک نکلا اور وہ تھا اسلامی نظریہ حیات پر یقین کامل سے عمل[۲] کیونکہ اسی کو اختیار کرنے میں کامیابی ہے۔ لیکن یہ کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے خالص حقیقی سرچشموں سے بلا واسطہ فیض اٹھایا جائے۔ ایسے ہی اس ضابطہ حیات پر کاربند ہونے اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کے لیے جو اعلیٰ عملی نمونے مطلوب ہیں وہ صرف اسی گروہ کی حیات میں مل سکتے ہیں جس کی تعلیم و تربیت اللہ نے اپنی نگرانی میں فرمائی۔

یہ پیشِ نظر رہے کہ باکمال شاعر اقبال کا پیغام بھی اسلام کے پیغام کی طرح دائمی و عالمگیر ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام زندگی کے لامتناہی ارتقا کے لائحہ عمل پر مشتمل ہے۔ اس لیے یہ دین کبھی بھی فرسودگی کا حامل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی مرورِ ایام اس میں کہنگی کو جنم دے سکتے ہیں۔ اس پر کاربند ہونے والی ملت اپنی وابستگی کے مطابق اس سے قوت و بصیرت حاصل کرتی رہے گی۔[۳] اس لیے مشرق و مغرب کی خاک چھاننے کے بعد اور مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ابدی مذہب اسلام اپنے اندر وسیع مضمرات رکھتا ہے۔[۴] انسان کی فلاح اور رہنمائی کے لیے اسلام سے بہتر کوئی نظام زندگی اس

کائنات میں موجود نہیں لیکن انھوں نے حالات کا جائزہ لیا تو انھیں احساس ہوا کہ مشرق و مغرب کے مادہ پرستانہ مزاج اور جانبدارانہ طبیعتیں رکھنے والے وقت پرست، خود غرض، خود پسند انسان اسلام میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کی کوششیں کر کے اسے کمزور بلکہ ناکام و ختم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ صرف یہی نہیں اقبال نے دیکھا کہ دین و دنیا کے بارے میں مسلمانوں کا نکتۂ نظر بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ اسی سبب سے وہ نقصانات کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ شاندار ماضی سے رشتہ توڑ چکے تھے۔ اُن کا حال خراب تھا اور وہ مستقبل سے مایوس ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ اُن کی آرزوئیں غلط ہو چکی تھیں۔ وہ نصب العین سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ادنیٰ مفاد عاجلہ میں منہمک اور اپنی ذات سے باہر سے بے نیاز تھے۔ ان میں قلب کو تڑپانے اور روح کو گرمانے والی کوئی زندہ تمنا نہ تھی۔ نقصان دہ شعائرِ اغیار ان کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ان کے قالب میں سوز اور روح میں احساس دکھائی نہ دیتا تھا۔ زبان سے کلمہ ادا کر رہے تھے لیکن پیغامِ محمد ﷺ کے پاس سے بے نیاز تھے۔ ان کی اذانیں روحِ بلالی سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ نہ حیدری فقر رہا تھا نہ دولتِ عثمانی۔ ہر کوئی ذوقِ تن آسانی میں مست تھا۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ اس ملت نے خودکشی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ غیور و خوددار مسلمان ندارد۔ قومیں ہمیشہ اپنے نوجوانوں سے اُمیدیں وابستہ رکھتی ہیں لیکن اس ملت کے نوجوان کا یہ حال تھا۔[۵]

شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دیں سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا[۶]

اقوامِ کہن پر گرنے والی عہدِ نو کی برق نے ملتِ اسلامیہ کے پیرہن میں بھی آگ لگا دی جو صرف ایمان ابراہیمی سے بجھ سکتی تھی لیکن ملت اس ایمان سے عاری تھی۔ اقبال کو نام کے مسلمانوں میں درحقیقت غیر مسلموں کا ایک ہجوم نظر آ رہا تھا جس کا کوئی مقصود نہ تھا۔[۷]

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحب یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں!

وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح
ہو گئی ہے اس سے اب نا آشنا تیری جبیں!
دیکھ تو اپنا عمل، تجھ کو نظر آتی ہے کیا
وہ صداقت جس کی بے باکی تھی حیرت آفریں
تیرے آبا کی نگہ تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل تیرے کاشانۂ دل میں مکیں[۸]

علامہ نے محسوس کیا کہ امتِ مسلمہ کی فطرت سوئی ہوئی ہے۔ اس کے جواں بے ہمت ہیں اور بوڑھوں کے دل خفتگی کا شکار، نشو و نما کا تقاضا کرنے والا کوئی بھی نہیں رہا:[۹]

قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہلِ گلستاں کی
نہ ہے بیدار دل پیری، نہ ہمت خواہ برنائی[۱۰]

قرآن کا علم دینے والے روحِ قرآن سے بے نیاز ہیں۔ خانقاہوں میں بھی صوفیوں کے روپ میں بھیڑیے ہی دکھائی دیں گے۔ ملاّ وصوفی کے علاوہ مغرب زدہ فرنگی مآب لیڈر بھی موجِ سراب کو چشمۂ کوثر سمجھ کر بے تابانہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ سراب ان کے قلب اور ملت کے چمن کو سیراب نہیں کر سکتا۔ یہ طبقہ دین سے بیگانہ اور عشق سے تہی ہے:

ہم مسلمانِ افرنگی مآب
چشمۂ کوثر بجویند از سراب!
بے خبر از سرِ دین اند ایں ہمہ
اہلِ کین اند اہلِ کین اند ایں ہمہ![۱۱]

ترجمہ: افرنگ زدہ مسلمان بھی سراب میں سے چشمۂ کوثر ڈھونڈتے ہیں۔
یہ سب دین کے راز سے بے خبر ہیں۔ یہ اہل دین نہیں بلکہ اہلِ کین (باہمی عداوت رکھنے والے) ہیں۔

گویا تمام ملت ''ظلوماً جہولاً'' پر مشتمل تھی۔ ایسی ملت کا احیا اور نشاۃ ثانیہ کا فریضہ بڑا مشکل تھا۔[۱۲] علامہ اقبال اس زبوں حال ملت کا احیا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک افرادِ ملت میں بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ ان صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک تو صحیح قسم کے درویش منش، صاحبانِ بصیرت و ہمت اور راہبروں کی ضرورت تھی، دوسرے برباد حال مسلمانوں کے تابناک ماضی کو ان کے روشن مستقبل سے جوڑنے کی۔ علامہ کے سامنے یہی اہم مسئلہ تھا کہ وہ مسلمانوں

کے تابناک ماضی کو روشن مستقبل سے کیسے جوڑیں۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ جب ایسا مقصد سامنے ہو تو ایک زوردار تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اور تحریکیں پھر وسائل مانگتی ہیں۔ ان کا پہلا وسیلہ ہوتا ہے ایک تربیت یافتہ جماعت۔ علامہ کا مقصود بھی ایک ایسی ہی تربیت یافتہ جماعت ہے جو ملّت کی نشاۃِ ثانیہ اور انسانیت کی فلاح و ترقی کے لیے ایک اور ایسی ہی جماعت مہیا کرنے کی ضامن ہو۔ یہ جماعت:

(۱) اسلامی معاشرے کی محافظ ہو۔

(۲) قیادت کا فریضہ سرانجام دے۔

(۳) تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا اپنی ذمہ داری سمجھے۔

(۴) تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھے۔

لیکن ایسی جماعت تیار کرنے کے لیے ایک نصاب اور کچھ تربیت کے اصول ہونے چاہییں جو سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ تربیت کے اس نصاب کا ایک حصہ ایسے عملی نمونوں پر مشتمل ہو جن کی اطاعت و پیروی سے کارزارِ حیات کی ہر مشکل پر قابو پایا جا سکے اور دنیاوی و اُخروی منازل کامیابی سے طے کی جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے علامہ اقبال نے انبیاء کرامؑ کی شخصیتوں اور سیرتوں کا مطالعہ ضروری قرار دیا۔ دُنیا کی تاریخ میں جو مرتبہ ، اہمیت اور مقام ان ہستیوں کو حاصل ہے وہ کسی اور کا مقدر نہ ہوا ہے اور نہ ہی ہوگا۔ اس لیے علامہ نے ان انبیاء کرامؑ کی سیرت و کردار کے اہم پہلوؤں کو اُمت کے سامنے اُجاگر کیا تاکہ اس کے ذریعے ملت کے افراد کو معرکۂ ہائے حیات کے لیے عملاً تیار کیا جا سکے۔ اقبال کو یقین تھا کہ ملتِ اسلامیہ ایک درخشاں مستقبل کی مالک ہے۔ اسلام ہی ایک ابدی اور ٹھوس حقیقت ہے۔ اس امت کو ہی اسلام اور اس کی تعلیمات کا حامل بننا ہے[۱۴] اور فریضۂ خلافت سے عہدہ برآں ہونا ہے۔ لیکن اس کے لیے ملت اسلامیہ کے افراد کو اپنی سیرت و کردار میں وہ اوصاف جنم دینا ہوں گے جو حاملینِ نبوت کا امتیاز تھے۔ انھیں اپنے اندر حضرت آدمؑ کی شان، حضرت نوحؑ کا حوصلہ، حضرت ابراہیمؑ کی سی توحید پرستی و قربانی اور جرأت و استقلال، حضرت اسماعیلؑ کی سی تسلیم و رضا، حضرت یعقوبؑ کی سی استقامت، حضرت یوسفؑ کی سی تدبیر و معاملہ فہمی، حضرت شعیبؑ کی سی کامل رہنمائی، حضرت موسیٰؑ کی سی ضربِ کلیمی، حضرت الیاسؑ کی سی سادگی، حضرت داوٗدؑ کی سی تاثیرِ زبان، حضرت سلیمانؑ کی سی قوتِ فیصلہ، حضرت ایوبؑ کے سے صبر اور

حضرت زکریاؑ کے سے عشق، حضرت عیسیٰؑ جیسے فقر اور حضرت محمد ﷺ کے خلقِ عظیم کو اپنے اندر جنم دینا ہوگا تب کہیں جا کر وہ جوش اور ولولہ جنم لے گا جو چار دانگِ عالم میں گرمیٔ ہنگامہ کا ذریعہ ٹھہرے۔ جس کے نتیجہ میں ایک ایسا معاشرہ جنم لے جو تخلیقی صلاحیتوں، حرکت و عمل اور فلاح کے اوصاف سے مزین ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ علامہ نے جس وقت شعور کی آنکھ کھولی دُنیا ایک تہذیبی بحران سے دوچار تھی۔ انقسام و انتشار کی نشانیاں چارسو دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانیت ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ پرانی اقدار کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ نئی قدریں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل رہی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علامہ اقبال مشرقی ماحول سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معاشرہ غلامی، ذلت، جہالت اور فرسودہ رسموں میں پھنسا ہوا تھا۔ علامہ اقبال اس حالت سے سخت پریشان تھے ان کا دماغ اور مطالعہ مجتہدانہ شان رکھتا تھا۔ وہ معاشرے کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ تمنا دیگر شعرا کی طرح رومانوی نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت پر مشتمل تھی جو بہت ہی اعلیٰ ذہنی اور علمی جدوجہد کی طلب گار تھی۔ علامہ اقبال نے اس جدوجہد کا مخلصانہ آغاز کیا[۱۵] اور حتی المقدور کوشش کی۔ اس میں عمل دخل تھا ان کے گھر کے ماحول کا جس کی فضا میں تقویٰ و اخلاص، صداقت و امانت اور دینی اقدار رچی بسی تھیں۔ اس ماحول نے علامہ کی شخصیت کی تعمیر میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور اتنے مستقل، دیرپا نشانات ثبت کیے جنھوں نے آگے چل کر پائیدار بنیادوں کا کام دیا اور علامہ اقبال کی ہر موڑ پر رہنمائی بھی کی۔ اُنھوں نے اپنے گھر سے سادگی کے ساتھ خلوص اور دینِ حق کے ساتھ سچی لگن کی تربیت حاصل کی جبکہ اپنے ابتدائی اساتذہ سے اسلامی علوم حاصل کیے اور اسلام کے اصولوں پر عمل کا سبق لیا۔ آگے چل کر یہی اصول ٹھوس بنیادوں پر اُستوار ہو گئے اور اوّل و آخر اسلام ہی اُن کا مطمع نظر ٹھہرا۔ ملت اسلامیہ کی سربلندی ان کا مقصد بن گئی۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے شریعت کے اولیں سرچشموں سے سیرابی اور انبیاء کرامؑ کی سیرتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ملت کے نوجوانوں کی بیداری اور تربیت ان کی آرزو بن گئی۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم کا راستہ دکھانے کی کوشش میں مگن دکھائی دیے۔ یثرب و حجاز کا ذکر ہمیشہ ان کی زبان پر رہا کیونکہ اقبال کے نزدیک یہی ملجا و ماویٰ اور بقا کا سامان ہے اور بنی نوع انسان کو تمام بھلائیاں یہیں سے مل سکتی ہیں۔

علامہ اقبال کو پختہ یقین تھا کہ جب تک مومن کا قلب توحید و رسالت کی روشنی سے آباد

ہے تب تک اُسے کسی سے بھی نقصان کا خوف نہیں ہوسکتا۔مومن بیت اللہ کا محافظ ہے اور بیت اللہ ملت کا نگہبان:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا[۱۶]

علامہ اقبال ''یثرب'' اور ''خاکِ یثرب'' سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ روضۂ نبوی پر پہنچنے کے لیے بےقرار تھے۔لیکن بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ و اعضا اس سفر کے متحمل نہ تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ کی روح مسلسل سوئے حجاز رواں دواں رہی:

بدن واماند و جانم در تگ و پوست
سوے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست[۱۷]

ترجمہ: بدن تھک چکا ہے مگر جان ابھی تک اس شہر (مدینہ منورہ) کی جانب رواں دواں ہے۔بطحا (مکہ مکرمہ) جس کی راہ میں ہے۔

آپ یہاں (حرم شریف میں) اپنے خاص بندوں سے محبت رکھیں۔ میں تو اپنے محبوبؐ کے شہر کی خواہش رکھتا ہوں۔ (حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ خواص اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور عامی میرے لیے ہیں۔)

یوں اقبال شروع سے آخر تک حجاز کی طرف رواں دواں رہے۔''حجازیت'' ان کی فکر پر چھائی رہی۔وہ تمام عمر بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حجاز لے جانے کے لیے تگ ودو کرتے رہے۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ ان بھٹکے ہوؤں کی ذلت کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ بہترین سرمایۂ ہدایت رکھنے کے باوجود آپؐ کی پیروی واطاعت میں غفلت کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ان میں عقیدے کی پختگی اورعزم کی کمی ہے۔اقبال چاہتے تھے کہ ان مسلمانوں میں وہی صفات جنم لے لیں جو قافلہ نبوت کے ہر نمائندہ کی ذات کا حصہ تھیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے علامہ نے اپنے فکر وشعر میں ان برگزیدہ ہستیوں کے اعلیٰ کردار کے اوصاف کو اپنی ذات میں پیدا کرنے پر زور دیا۔ان کے

نزدیک انبیاءؑ کی زندگی کو معیارِ عمل ٹھہرانا اس لیے ضروری ہے کہ اس کی بدولت مطلوب خودی کی تمام نفسیاتی شرائط از خود پوری ہوتی رہتی ہیں [۱۸] اور انسان ترقی و عروج کی جانب گامزن رہتا ہے۔

تفصیلی مطالعہ کے بعد ہم جان چکے کہ علامہ اقبال نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت محمد ﷺ کی سِیر سے کافی مواد اخذ کیا ہے قرآن پاک میں بھی ان انبیاء کرامؑ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اقبال نے حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے، حضرت نوحؑ کی تبلیغاتِ شاقہ اور چشمِ حق شناس، حضرت ابراہیمؑ کے تجرباتی واقعہ سے گزرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی آزمائش پر پورا اترنے، بیٹے کو قربان کرنے، حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی تمنا، قوتِ کلیمی کے سامنے فرعون جیسی طاغوتی اور استبدادی طاقتوں کے شکست کھا جانے اور حضرت موسیٰؑ کے حضرت خضرؑ کی ہمراہی میں عجیب و غریب واقعات کی مختلف جہتوں کو نمایاں کیا ہے اور ایک ایک واقعہ کے مختلف معانی اُجاگر کیے ہیں۔[۱۹] لیکن حضرت الیاسؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یعقوبؑ کے ذکر میں علامہ اقبال نے غیر معمولی اجمال کا مظاہرہ کیا۔[۲۰] اس کا سبب بیان کرتے ہوئے عبدالسلام ندوی رقمطراز ہیں:

> خاموش اور ساکن القلب پیغمبروں مثلاً حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کی ان کی ہنگامہ خیز زندگی میں گنجائش نہیں۔[۲۱]

تفصیلی و اجمالی ذکر سے قطع نظر علامہ اقبال نے ان انبیاءؑ کی تلمیحات کے ذریعے خوب سے خوب تر نکات اخذ کیے جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اقبال کی نظر تمام معقولات و منقولات پر تھی۔ انھوں نے انبیاءؑ کی حیات، سیرت و کردار اور اُن خصوصیات اور خاص پہلوؤں کو اجاگر کیا جو ان کے نظریات کی ترجمانی و تائید کرتے ہیں [۲۲] اور اس حقیقت کے غماز کہ اقبال جس بھی نبی کے کسی خاص وصف کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس نبی کی حیات و سیرت اور دور کے تمام پہلوؤں سے آگاہ ہیں اور اُنھیں شعر کے کوزے میں بند کرنے پر مہارت رکھتے ہیں۔ بقول سید افتخار حسین شاہ:

> ''عیسیٰ کی عیسےٰ نفسی، موسیٰ کا عصا، ابراہیم کی آتش پسندی، ۔۔۔ یہ جملہ مضامین جو اقبال کو پسند آئے ہیں اور اس نے ان کو موضوع سخن بنایا ہے تو اس کے پسِ پردہ وہ قوت کارفرما ہے ۔۔۔ جس کے زیر اثر ان مضامین و مطالب کے ڈانڈے اقبال کے نظریات سے ملتے ہیں۔''[۲۳]

اقبال قوت پسند کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انبیاء کرامؑ کی حیات، سیرت و کردار سے پیش کردہ تلمیحاتی واقعات کے پسِ پست قوت و شوکت کا پیغام پوشیدہ ہے۔ ان میں تحرک پایا جاتا ہے اور حیات کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما ہو کر سرفروش ہونے کا درس ہے۔[۲۴] شاعرانہ جوش میں اُنھوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام![۲۵]

اُن کی اسی قوت پسندی نے اُنھیں عصائے موسیٰ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد![۲۶]

اقبال نے بعض مقامات پر انبیاءؑ کا ذکر تمثیلی انداز میں کیا ہے اور ان اسما مبارکہ کو مرادف کے طور پر نمونے کے مومنین کے ذکر کے طور پر بھی لائے ہیں لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندیوں میں بعض ایسے واقعات بھی اکٹھے لے آئے ہیں جو تاریخی لحاظ سے مناسبت نہیں رکھتے۔[۲۷]
مثلاً موسیٰؑ اور شعیبؑ کا اکٹھے ذکر۔ ایسے ہی موارد میں انبیاءؑ کا ذکر حق کے نمائندگان کے طور پر بھی آیا ہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیمؑ و خلیل!
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق![۲۸]

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب[۲۹]

ترجمہ: میں عجم میں بھی پھرا ہوں اور عرب میں بھی آپ ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگ نایاب ہیں۔
حق کے ان نمائندگان کے بالمقابل نمائندگانِ باطل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اگرچہ بعض جگہ جوشِ بیان میں حق و باطل کا نامناسب موازنہ بھی ہے جیسے شیطان کے بالمقابل حضرت خضرؑ و حضرت الیاسؑ کو بے دست و پا کہنا۔ لیکن اس کے باوجود اشعار کے تحقیقی و توضیحی مطالعہ کے بعد یہ کہنا درست ہے کہ اُنھوں نے شاعری میں ان مقدس ہستیوں کی مذہبی نوعیت وہی رکھی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے۔ اُنھوں نے مذہبی ہستیوں کے پیغام کی روح کو پھر سے زندہ کیا اور

اپنے اشعار میں اس طرح مصرف میں لائے کہ ان کی مذہب میں قائم شدہ شان میں اضافہ ہوا۔ علامہ کے اس طرح پیش کرنے سے ان کی تجدید ممکن ہوئی۔ اُنھوں نے اس تجدید کے لیے پر معنی اور رمزیہ کلمات کا استعمال بھی کیا۔ ان رمزیہ کلمات میں مذہبی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ اقبال مذہبی رمزیہ کلمہ استعمال کر کے شعر کے معنی میں اس طرح چھپاتے ہیں کہ قاری کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کلمہ کے مفہوم کو سمجھ کر اس کے پیچھے پوشیدہ پوری کہانی کو ذہن نشین کر لے مثلاً ''ضربِ کلیم، لن ترانی، ضربِ خلیل''، ''گریۂ ایوب''، ''گریہ پیر کنعاں''، ''عشق نوحؑ''، ''علم الاسما'' ''لاتحف'' لا تثریب وغیرہ۔ ان سب تلمیحاتی کلموں کا ماخذ خالصتاً نمائندگانِ نبوت و مذہب سے متعلق ہے لیکن مذکورہ بالا الفاظ سے براہِ راست کوئی شخصیت نہیں ابھرتی۔ ان کو سمجھنے کے لیے پس منظر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ پسِ منظر، حیات و سیرت و کردارِ انبیاءؑ کی تمام تفصیل سمجھا دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے ان الفاظ، تراکیب و تلمیحات کو اس انداز سے برتا ہے کہ ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اقبال کا حسنِ انتخاب دیکھیے کہ وہ کلامِ الٰہی اور حیات الانبیاءؑ سے ایسے الفاظ چنتے ہیں جس سے اپنے فکر و خیال کو بہ آسانی قاری تک پہنچا سکیں۔ اُن کا یہ ایک خاص زاویۂ نظر دیگر شعرا سے بالکل جدا۔ اس کا مخصوص رنگ ہے جو کسی رنگ میں شامل نہیں ہوتا۔

اقبال ان تمام واقعات کے ذریعے دراصل صبر، عزم و استقلال، اطاعت، ایثار، قربانی، شہادت، جانبازی، انقلاب انگیزی اور جفاکشی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ وہ انسانی خودی کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے قاری کے ذہن کو جھنجھوڑا ہے تاکہ وہ بلاکم و کاست ان مذہبی حقائق سے آشنا ہو کر ان پر عمل پیرا ہو اور انسان کامل بننے کی سعی کرے۔ یقیناً شاعرِ مشرق نے عظیم اور بے مثال کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی تمام عملی قوتیں، صلاحتیں اور جدو جہد اُمتِ مرحومہ کو حال کے مصائب سے نکال کر شاندار ماضی کے ساتھ ملا کر بہترین مستقبل کی روش پر ڈالنے کے لیے صرف کر دیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے تا قیامت آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی اور داد دیے بغیر نہ رہیں گی۔ دراصل ذہین و فریس اور دردمند اقبال اصلاح و تجدید کی ان صلاحیتوں کو قدرت کی طرف سے لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس بلند کردار انسان نے پیش آئند مشکلات کا اندازہ کیا اور انسانوں کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا، گمراہی، ظلمت اور تاریکی کو فکر و اندیشہ کی تابناکی سے بدل کر رکھ دیا اور انسانوں کو پھر اس آئین کا درس دیا جس کی پیروی کر کے تہذیب و تمدن کے قافلے خاص سمت اور خاص

منزل پر پہنچنے کے لیے قدم اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک وہ خاص منزل ہے توحید اور نبوت ورسالت یا اسلام۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان توحید ورسالت کے عقیدہ میں چھپی قوتوں کا راز پا کر نڈر ہو جائیں اور اس کائنات کو اپنے لیے مفتوح جانیں۔ ایجاد واختراع سے فطرت کے پردہ میں چھپے چہرے کو بے نقاب کریں۔ محسنِ حقیقی کے حضور انسانیت کی معراج پالیں کہ یہ انسانیت کی عظمت اور استحکام و بقا کی ضامن ہے اور اقبال انسانیت کی عظمت و بقا اور ارتقا کے خواہش مند ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک عقیدہ کی پختگی اور خیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ شرع کی پابندی اور اطاعتِ قانون واطاعتِ رسول ﷺ انسانی ارتقا کا اہم لازمہ ہیں۔ ارتقا ہی میں بقا ہے۔

المختصر اقبال نے اُمتِ مسلمہ کی تربیت ورہنمائی کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے سلسلہ نبوت کی نمائندہ ہستیوں (انبیاء کرامؑ) کا ذکر کر کے ثابت کیا ہے کہ:

- ان انبیاء کرامؑ کا سرچشمہ علم ایک ہے۔
- مصدر وعرفان ایک ہے۔
- منزل وسمت ایک ہے۔
- پیغامِ دعوت اور دستور العمل کی روح ایک ہے۔ اصولی اور بنیادی اختلاف ہرگز نہیں۔
- تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات روحانی ومعاشرتی تقاضوں سے بھرپور ہیں اور کارگاہِ حیات میں پیش آئند مشکلات کا حل انبیاء کرامؑ کی بتائی ہوئی تعلیمات کی اطاعت و پیروی میں پوشیدہ ہے۔ ضرورت صدقِ دل سے عمل کی ہے۔

☆☆☆☆

مآخذ ومصادر

۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع سوم ۱۹۹۶ء۔ ص:۷

۲- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجوم ہدایت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء ص:۷

۳- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور، بار پنجم، ۱۹۸۳ء، ص:۱۲۷

۴- ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی، نقوشِ اقبال، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی، بار ششم، ۱۹۷۹ء ص:۸۳

۵- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص:۱۲۶، ۱۲۷، ۱۴۹

۶۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۰۴/۲۰۴
۷۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص:۱۵۰۔
۸۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۲۱/۲۲۱
۹۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص:۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲
۱۰۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۴۴/۲۴۴
۱۱۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۹۴/۲۰۶، ۹۵/۲۰۷
۱۲۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص:۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳
۱۳۔ اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجومِ ہدایت، ص:۷، ۸
۱۴۔ عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، ص:۱۵۴
۱۵۔ عبدالغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۵ء ص:۱۲
۱۶۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۱۴۷/۱۴۷، ۱۵۹/۱۵۹
۱۷۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز فارسی، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۹۰۱/۱۹
۱۸۔ نیازی، سید نذیر، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۰ء ص:۸۹
۱۹۔ ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ امم اور اقبال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء ص:۲۹۵
۲۰۔

زہر ہا در بادۂ گلفام اوست   ارّہ و کرم و صلیب انعام اوست

ترجمہ: اس کے بادۂ گلفام کے اندر زہر بھرے ہیں۔ اس کے انعامات آرہ کٹہرے اور صلیب ہیں۔

۲۱۔ ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۲۴۸
۲۲۔ شاہ، سید افتخار حسین، اقبال اور پیروئ شبلی، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص:۱۵۵
۲۳۔ ایضاً، ص:۱۵۶، ۱۵۷
۲۴۔ فاضل، ڈاکٹر تسکینہ، مضمون اقبال اور قرآنی تلمیحات، مشمولہ، پروفیسر محمد امین اندرابی، اقبال اور قرآن، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، ص:۱۳۱
۲۵۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۵۱۸/۵۶
۲۶۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بال جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۶۲/۷۰
۲۷۔ ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ امم اور اقبال، ص:۲۹۴
۲۸۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال اردو، ص:۳۸۸/۹۶، ۴۰۴/۱۱۲
۲۹۔ اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پس چہ باید کرد، کلیاتِ اقبال فارسی، ص:۸۴۵/۴۹

☆☆☆☆

کتابیات

الہامی کُتب و کُتب احادیث

۱- قرآن مجید، ترجمہ: امام احمد رضا بریلوی، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۹ء
۲- کتابِ مقدس (تورات، انجیل) سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸ء
۳- بخاری، ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج: ۱، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بار دوم، ۱۹۷۹ء۔
۴- بخاری، ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج: ۲، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بار سوم ۱۹۸۰ء
۵- بخاری، ابوعبداللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری شریف، ج: ۳، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بار دوم، ۱۹۷۹ء

کتبِ تفسیر

۶- ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابنِ کثیر (اردو) ج: ۱، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی، سن ندارد
۷- ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابنِ کثیر (اردو) ج: ۲، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی، سن ندارد
۸- ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابنِ کثیر (اردو) ج: ۳، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی، سن ندارد
۹- ابنِ کثیر، ابوالفداء عماد الدین، تفسیر ابنِ کثیر (اردو) ج: ۴، نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی، سن ندارد
۱۰- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج: ۱، دینی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۷ء
۱۱- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج: ۲، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد
۱۲- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج: ۳، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد

۱۳- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج:۴، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد
۱۴- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج:۵، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد
۱۵- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج:۶، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد
۱۶- امیر علی، مولانا مولوی سید، تفسیر مواہب الرحمٰن، ج:۹، دینی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد
۱۷- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۹ء
۱۸- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۲، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۸۰ء
۱۹- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۳، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۸۰ء
۲۰- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۴، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، سن ندارد
۲۱- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۵، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، سن ندارد
۲۲- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۶، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۷ء
۲۳- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۷، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۷ء
۲۴- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۸، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۸ء
۲۵- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۹، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۸ء
۲۶- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۰، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۹ء
۲۷- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۱، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ، ۱۹۷۹ء
۲۸- پانی پتی، علامہ قاضی محمد ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ج:۱۲، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، ۱۹۷۹ء
۲۹- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۳، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء
۳۰- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۴، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء
۳۱- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۵، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۷ء
۳۲- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۶، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء
۳۳- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۷، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۸ء
۳۴- شفیع، مولانا مفتی محمد، معارف القرآن، ج:۸، ادارۃ المعارف، کراچی، بار پنجم ۱۹۹۸ء
۳۵- کرم شاہ، پیر محمد، تفسیر ضیاء القرآن، ج:۱، ضیاءالقرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۴۰۲ء
۳۶- کرم شاہ، پیر محمد، تفسیر ضیاء القرآن، ج:۲، ضیاءالقرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۴۰۲ء
۳۷- کرم شاہ، پیر محمد، تفسیر ضیاء القرآن، ج:۳، ضیاءالقرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۳۹۹ء
۳۸- کرم شاہ، پیر محمد، تفسیر ضیاء القرآن، ج:۴، ضیاءالقرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۳۹۹ء
۳۹- کرم شاہ، پیر محمد، تفسیر ضیاء القرآن، ج:۵، ضیاءالقرآن پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، ۱۴۰۰ء
۴۰- مودودی، ابوالاعلی، تفہیم القرآن، ج:۱، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بار سترھواں، ۱۹۸۰ء
۴۱- مودودی، ابوالاعلی، تفہیم القرآن، ج:۲، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بار بائیسواں، ۱۹۸۸ء

۴۲- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۳، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بارہشتم، ۱۹۸۸ء

۴۳- مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ج:۴، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، بارششم، ۱۹۸۸ء

۴۴- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد

۴۵- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۳، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد

۴۶- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۷، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد

۴۷- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۸، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد

۴۸- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۹، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، سن ندارد

۴۹- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۰، مکتبہ اسلامیہ، گجرات، ۱۹۸۴ء

۵۰- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۲، مکتبہ اسلامیہ، گجرات، ۱۹۷۰ء

۵۱- نعیمی، مفتی احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج:۱۳، مکتبہ اسلامیہ، گجرات، ۱۹۸۴ء

کتب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

۵۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم، ۱۹۹۶ء

۵۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بالِ جبریل، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم، ۱۹۹۶ء

۵۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، بانگِ درا، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم، ۱۹۹۶ء

۵۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ضربِ کلیم، کلیات اقبال اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بارسوم، ۱۹۹۶ء

۵۶- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ارمغان حجاز، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۵۷- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، اسرار و رموز، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۵۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پس چہ باید کرد، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۵۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، پیامِ مشرق، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۶۰- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جاوید نامہ، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۶۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، زبور عجم فارسی، کلیات اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار چہارم، دہم، ۱۹۹۰ء

۶۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، ابواللیث صدیقی (مرتب)، ملفوظاتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

۶۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، محمود نظامی (مرتب)، ملفوظاتِ اقبال، اشاعت منزل، لاہور، باردوم، سن ندارد

۶۴- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، (مرتب) اقبال اکادمی پاکستان، مکاتیبِ اقبال بنام نیاز الدین، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

۶۵- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، جسٹس جاوید اقبال (مرتب)، سید افتخار حسین صدیقی (مترجم)، شذراتِ فکرِ

اقبال، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور،۱۹۷۳ء
۶۶- عبدالغفار شکیل، سیّد، نوادرِ اقبال، سرسید بکڈ پو، علی گڑھ، ۱۳۷۷ء
۶۷- عبدالواحد معینی، سید، ترجمہ و اضافہ محمد عبداللہ قریشی، باقیاتِ اقبال، آئینہ ادب، لاہور، بار سوم، ۱۹۷۸ء
۶۸- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مرتب عطاء اللہ شیخ، اقبالنامہ حصہ اول، شیخ محمد اشرف، تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، بار وسن ندارد
۶۹- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، مرتب محمود عاصم اقبال، اقبال کے ملی افکار، مکتبہ عالیہ، لاہور، بار اول، ۱۹۷۷ء
۷۰- برنی، مظفر حسین سید (مرتب)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ج:۱، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء
۷۱- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ج:۳، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء
۷۲- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ج:۳، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء
۷۳- اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، ج:۴، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۸ء
۷۴- سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۶ء۔

English Books

Dr. Allama Muhammad Iqbal

Iqbal , Dr. Muhammad, Complied and Edited by Latif Ahmad Sherwani, *Speaches Writings and Statemens of Iqbal*. Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 4th Edition:1995.

دیگر کُتب

۷۶- آزاد، مولانا ابوالکلام، اُم الکتاب، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۹۹ء
۷۷- آزاد، مولانا ابوالکلام، انبیائے کرامؑ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، سن ندارد
۷۸- آزاد، مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن، ج:۲، ساہتیہ اکادمی، دہلی، بار چہارم، ۱۹۸۹ء
۷۹- ابن عربی، شیخ اکبر محی الدین، مترجم، بابا ذہین شاہ تاجی، فصوص الحکم، مکتبہ تاج کراچی، ۱۹۸۶ء
۸۰- ابن کثیر، علامہ حافظ ابوالفدا عماد الدین، البدایہ والنہایہ، ج:۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء
۸۱- ابوالفضل، قاضی عیاض اللہ، مترجم مولانا سید محمد ہاشمی، الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، پنڈی بھٹیاں، انجمن اصلاح المسلمین رجسٹرڈ، گوجرانوالہ، بار اول، ۱۹۸۳ء
۸۲- احمد، پروفیسر نذیر، تشبیہاتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء
۸۳- احمد، خورشید، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی، سن ندارد
۸۴- احمد، ڈاکٹر توقیر، اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۸۵- احمد، ڈاکٹر ظہور الدین، پاکستان میں فارسی ادب، ج:۵ ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۰ء
۸۶- اختر، ڈاکٹر ملک حسن، اطرافِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، باراول ۱۹۷۲ء، باردوم ۱۹۹۲ء
۸۷- ادارہ تصنیف وتالیف، انوارِ انبیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بارپنجم، ۱۹۸۵ء
۸۸- اظہر، ڈاکٹر ظہور احمد، اقبال کے نجومِ ہدایت، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
۸۹- افضل، محمد رفیق، گفتارِ اقبال، ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء
۹۰- اکبر آبادی، مولانا سعید احمد، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، باردوم، ۱۹۸۷ء
۹۱- الفلاح، محمد عبدہ (مترجم) مفردات القرآن، امام راغب اصفہانی، المکتبہ القاسمیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء
۹۲- الکاشفی، ملا معین واعظ، معارج النبوۃ، ج:۱، مکتبہ نبویہ، لاہور، باردوم، ۱۹۸۳ء۔
۹۳- امرتسری، علامہ عرشی، مرتب، ڈاکٹر تصدق حسین راجا، اقبال پیامبرِ امید، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
۹۴- امروہوی نسیم، فرہنگِ اقبال (فارسی) اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
۹۵- امروہوی نسیم، فرہنگِ اقبال (اردو) اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
۹۶- امیر علی، سید، مترجم محمد ہادی حسین، روحِ اسلام، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۸ء
۹۷- انور سدید، ڈاکٹر، مرتب، اقبال شناسی اور ادبی دنیا، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء
۹۸- بارہووی، کرنل سید نواب عالم، بصیرت اقبال، اقبال آرمی ایجوکیشن پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۰ء
۹۹- بزمِ اقبال، لاہور، منشوراتِ اقبال، بزمِ اقبال لاہور، بار وسن ندارد
۱۰۰- پرویز، اقبال اور قرآن، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، باردوم، ۱۹۷۵ء۔
۱۰۱- تاثیر، ڈاکٹر ایم۔ڈی، مرتب، افضل حق قریشی، اقبال کا فکروفن، بزمِ اقبال، لاہور، بارسوم، ۱۹۹۴ء
۱۰۲- توکلی، علامہ نور بخش، سیرت رسول عربی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۵ء
۱۰۳- جامی، نورالدین عبدالرحمٰن، مترجم، بشیر حسین ناظم، شواہد النبوۃ، مکتبہ مدینہ، لاہور، بار چہارم، ۱۹۸۴ء
۱۰۴- جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال (تشریحاتِ جاوید) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۴ء
۱۰۵- جاوید اقبال، ڈاکٹر، مئے لالہ فام، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء
۱۰۶- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح اسرارِ خودی، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۰۷- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح بالِ جبریل، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۰۸- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح بانگِ درا، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۰۹- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح پیامِ مشرق، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۱۰- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح رموزِ بیخودی، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۱۱- چشتی، پروفیسر، یوسف سلیم، شرح زبورِ عجم، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
۱۱۲- حسن اختر، ڈاکٹر ملک، اطرافِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، باردوم، ۱۹۹۲ء

۱۱۳- خاور جمیل، مرتب، ادب کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۸۶ء

۱۱۴- خاں، ڈاکٹر یوسف حسین، روحِ اقبال، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، بار دوم، ۱۹۴۴/۱۹۹۶ء

۱۱۵- دُرّانی، عطش، اسلامی تہذیب و ثقافت، شاخِ زریں، گلبرگ، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۱۶- رفیق، سعید احمد، اقبال کا نظریہ اخلاق، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۱۷- ریاض، ڈاکٹر محمد، تقدیرِ اُمم اور اقبال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۱۸- سیال، واحد بخش، روحانیتِ اسلام، بزمِ اتحاد المسلمین، جے ایس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۱۹- سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتب، اقبالیات کے نقوش، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۹ء

۱۲۰- سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتب، فکرِ اقبال کے منور گوشے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد

۱۲۱- سنبھلی، الحاج محمد اسماعیل، مقالاتِ تصوف، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۲۲- سورۃ ترمذی، حافظ محمد بن عیسیٰ بن، مترجم، مولانا محمد زکریا، شمائل ترمذی مع اردو شرح خصائل نبوی، میر محمد، کتب خانہ مرکزِ علم و ادب، کراچی، سن ندارد

۱۲۳- سیوطی، علامہ جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۲۴- سیوہاروی، سید محبوب علی زیدی الواسطی، اقبال اور حبِ بیتِ اہلِ اطہار، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۰ء

۱۲۵- سیوہاروی، محمد حفیظ الرحمٰن، اخلاق اور فلسفۂ اخلاق، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۱۲۶- سیوہاروی، محمد حفیظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج:۱-۲، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۰ھ

۱۲۷- سیوہاروی، محمد حفیظ الرحمٰن، قصص القرآن (اردو)، ج:۳-۴، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۳۶۸ھ

۱۲۸- شاہ سید افتخار حسین، اقبال اور پیروی شبلی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۷، بار دوم، ۱۹۸۳ء

۱۲۹- شاہد، محمد ایوب، اقبال کا تصورِ توانائی، المدینہ پبلشرز، سرگودھا، ۱۹۸۲ء

۱۳۰- شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب، خطباتِ بیادِ اقبال، شعبہ فلسفہ، پنجاب لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۳۱- شمل، این میری، ڈاکٹر محمد ریاض، مترجم، شہپرِ جبریل، گلوب پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۱۳۲- شیما مجید، مرتبہ، نفائسِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۳۳- صدیقی، بختیار حسین، اقبال بحیثیت مفکرِ تعلیم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۳۴- صدیقی، نعیم، محسنِ انسانیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۳۵- طارق عبدالرحمٰن، جوہرِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

۱۳۶- طارق عزیز، ڈاکٹر، مرتب، اقبال شناسی اور ایکو، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۳۷- طیب، قاری محمد، تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام، بک پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۳۸- عابد علی عابد، تلمیحاتِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۵ء

۱۳۹- عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، بار دوم، ۱۹۸۳ء

۱۴۰- عبدالحمید، خواجہ، اقبال کے چند جواہر ریزے، اقبال اکادمی لاہور، سن ندارد

۱۴۱- عبدالرحمٰن، مولانا محمد، سیرتِ انبیائے کرامؑ، ج:۱، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء

۱۴۲- عبدالمجید، آخری نبی ﷺ اور ان کی تعلیمات، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء

۱۴۳- عبدالغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۵ء

۱۴۴- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، تقاریر بیادِ اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۱۴۵- علوی، ڈاکٹر خالد، اقبال اور احیائے دین، مکتبہ علیمہ، لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۴۶- علوی، ڈاکٹر خالد، اسلام کا معاشرتی نظام، المکتبۃ العلمیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۴۷- علوی، محمد مصطفیٰ، الحقائق، ایجوکیشنل پریس، کراچی، باراول، ۱۹۶۳ء

۱۴۸- عیاض، حافظ ابوالفضل بن موسیٰ الحصینی، مترجم، مولانا محمد اظہر نعیمی، الشفاء، حصہ دوم مکتبہ نبویہ، لاہور، باراول، رجب ۱۳۹۹ء

۱۴۹- غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، اقبال اور قرآن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء

۱۵۰- فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، اقبال اور محبتِ رسول، اقبال اکادمی لاہور، باردوم، ۱۹۸۸ء

۱۵۱- فاروقی، ڈاکٹر محمد طاہر، سیرتِ اقبال، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۶۶ء

۱۵۲- فراقی، ڈاکٹر تحسین، نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء

۱۵۳- فیروز الدین، الحاج مولوی، مرتب، فیروز اللغات (اردو)، نیا ایڈیشن، فیروز سنز، لاہور، باروسن ندارد

۱۵۴- مولوی فیروز دین (مترجم)، بیان المطلوب، اردو ترجمہ، کشف المحجوب، فیروز سنز لاہور، سن ندارد

۱۵۵- کاندھلوی، محمد ادریس، سیرۃ المصطفیٰ ﷺ، مکتبہ عثمانیہ، جامعہ اشرفیہ، لاہور، باردوم، ۱۹۸۳ء

۱۵۶- قدوسی، اعجاز الحق، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور انکی تعلیمات، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۵۷- قریشی، ڈاکٹر اکبر حسین، مطالعہ تلمیحات و اشاراتِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۵۸- محمد عبداللہ قریشی، مرتب، آئینہ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۷ء

۱۵۹- مظفر حسن، ڈاکٹر ملک، مکارم اخلاق، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۶۰- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رحمۃ للعٰلمین، ج:۱، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

۱۶۱- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رحمۃ للعٰلمین، ج:۲، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

۱۶۲- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان سلمان، رحمۃ للعٰلمین، ج:۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

۱۶۳- منور، پروفیسر محمد، ایقانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بارسوم، ۱۹۸۸ء

۱۶۴- منور، پروفیسر محمد، برہانِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۶۵- منیری، حضرت شیخ شرف الدین، یحییٰ، ترجمہ مکتوباتِ صدی، ایچ، ایم، سعید کمپنی، کراچی، سن ندارد

۱۶۶- مودودی، مولانا ابوالاعلیٰ، مرتبین، نعیم صدیقی، عبدالوکیل علوی، سیرتِ سرورِ دوعالم، ادارہ ترجمان

القرآن، لاہور، بار سوم، ۱۹۸۰ء
۱۶۷- نبہانی، علامہ یوسف، جواہر البحار، ج:۱، مکتبہ حامدیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء
۱۶۸- ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن کام، ج:۲، دارالاشاعت، کراچی، بار دوم، ۱۹۷۵ء
۱۶۹- ندوی، عبدالسلام، اقبال کامل، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
۱۷۰- ندوی، مولانا محمد حنیف، بھٹی، اسحاق، مولانا محمد، چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء
۱۷۱- ندوی، مولانا سید ابوالحسن، نقوش اقبال، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، بار ششم، ۱۹۷۹ء
۱۷۲- ندوی، مولانا سید سلیمان، سیرِ افغانستان، نفیس اکیڈمی، دکن، حیدرآباد، ۱۹۴۵ء
۱۷۳- ندوی، مولانا ابوالحسن علی، منصبِ نبوّت اور اس کے عالی مقام حاملین، مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی، سن ندارد
۱۷۴- نیازی، سید نذیر، اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار سوم، ۲۰۰۰ء
۱۷۵- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی ﷺ، ج:۱، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸
۱۷۶- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی ﷺ، ج:۲، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸
۱۷۷- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی ﷺ، ج:۴، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸
۱۷۸- نعمانی، علامہ شبلی، ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی ﷺ، ج:۵، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸
۱۷۹- نعمانی، مولانا عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۱-۲، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۶ء
۱۸۰- نعمانی، مولانا عبدالرشید، لغات القرآن، ج:۳-۴، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۸۶ء
۱۸۱- نورالدین، ڈاکٹر ابوسعید، اسلامی تصوف اور اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار سوم، ۱۹۹۵ء
۱۸۲- وحیدالدین، سید فقیر، روزگارِ فقیر، ج:۱، آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
۱۸۳- وحیدالزماں، علامہ نواب، تبویب القرآن، ج:۲، خالد احسان پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء
۱۸۴- ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین، اقبال کی طویل نظمیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء
۱۸۵- ہاشمی، پروفیسر شفیق الرحمٰن، اقبال کا تصورِ دین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد
۱۸۶- یونس جاوید، مرتبہ، صحیفۂ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء

انسائیکلوپیڈیا

۱۸۷- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۲، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۰ء
۱۸۸- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۳، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۸ء
۱۸۹- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۹، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۲ء

۱۹۰- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۱۰، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء
۱۹۱- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۲۲، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء
۱۹۲- اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج:۲۳، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء

رسائل و جرائد و ماہنامے (اردو)

۱۹۳- اقبال سہ ماہی مجلّہ، مدیر محمد سعید شیخ، بزمِ اقبال، لاہور، دسمبر ۱۹۷۳ء
۱۹۴- اقبال سہ ماہی مجلّہ، مرید اعزازی، ڈاکٹر وحید قریشی، ج:۳۶، شمارہ جنوری، ۱۹۸۹ء
۱۹۵- اقبالیات رئیس ادارت، محمد سہیل عمر، مدیر، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء
۱۹۶- اقبالیات رئیس ادارت، محمد سہیل عمر، مدیر، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸ء
۱۹۷- اقبالیات رئیس ادارت، محمد سہیل عمر، مدیر، ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء
۱۹۸- جوہر شمارہ خصوصی، بیادگار علامہ اقبال، مدیر محمد حسنین، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۳۸ء، ۱۹۴۰ء
۱۹۹- حکمۃ قرآن مدیر، ڈاکٹر اسرار احمد، ج:۷ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء
۲۰۰- حکمۃ قرآن مدیر، ڈاکٹر اسرار احمد، ج:۸ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، نومبر ۱۹۸۹ء
۲۰۱- راوی نگران پروفیسر محمد منور، مدیر باصر سلطان کاظمی، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۷۴ء
۲۰۲- صحیفہ اقبال نمبر (حصہ اول)، مدیر اعزازی، ڈاکٹر وحید قریشی، شمارہ:۶۵، مجلس ترقی ادب، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء
۲۰۳- ماہنامہ ادبی دنیا مدیر محمد عبداللہ قریشی، ادبی دنیا، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء
۲۰۴- ماہنامہ بیّنات، سرپرست، مولانا محمد یوسف بنوری، مدیر محمد ادریس، ج:۳، مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن، کراچی، نومبر ۱۹۶۴ء
۲۰۵- ماہنامہ تعمیرِ انسانیت، مدیر اعلیٰ شیخ محمد انور، شائع کردہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، اپریل ۱۹۸۸ء
۲۰۶- معارف مرتب ضیاء الدین اصلاحی، دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۰ء
۲۰۷- نقوش: ج:۱، مدیر جاوید طفیل، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، ۱۹۸۲ء
۲۰۸- نقوش: ج:۲، مدیر جاوید طفیل، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، ۱۹۸۲ء
۲۰۹- ہفت روزہ ہلال ج:۲۷، ایڈیٹر محمد ممتاز اقبال، بلال روڈ، راولپنڈی، اکتوبر ۱۹۹۰ء

عربی کُتب

۲۱۰- ابنِ کثیر، امام ابوالفداء عماد الدین، قصص الانبیاء، مکتبہ طیبہ، المدینۃ المنورۃ، دار الفکر، للطباعۃ والتواریخ۔ لبنان، بیروت، سن ندارد

۲۱۱- المولیٰ، محمد احمد جاد، ابراہیم محمد ابالفضل، البجاوی، علی محمد، شحاۃ، السید، قصص القرآن (عربی) المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، بمصر الطبعۃ العاشرۃ، سن ندارد

۲۱۲- عسقلانی، الامام الحافظ احمد بن علی، فتح الباری (عربی) ج:۸، دار نشر الکتب الاسلامیہ، شارع شیش محل، لاہور، طبعۃ ممتازہ مصححۃ، ۱۹۸۱ء

فارسی کُتب

۲۱۳- اصفہانی، عمادالدین حسین، قصص الانبیاء (فارسی) ج:۱-۲، نشریات کتابفروشی، اسلام، بازار شیرازی، تہران، چاپ بیست وپنجم، ۱۳٦۰ھ

۲۱۴- موسوی سید محمد باقری، غفاری، علی اکبر، تاریخِ انبیاء (فارسی) ج:۱-۲، کتابفروشی، صدوق، تہران، سن ندارد

English Books

215. Knappert Jan, *Islamic Legends*, Vol:1, E:J, Brill. Leiden, 1985
216. Moti Lal Banaras Dass Edited by Keneth W Morgan *"Islam The Straight Path"* Dehli India 1st Edition 1987
217. The University of Chicago *"The New Encyclopedia Britannica"* Vol:143, The University of Chicago, U.S.A. Edition 15: 1986